مجلۂ عثمانیہ
مدیر
احمد خاں بی۔ اے (عثمانیہ)
شریک مدیر
سید حسین رضوی بی۔ اے (عثمانیہ)

مجلہ عثمانیہ

طلبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ماہی رسالہ

مہتمم مدیر و مدیر حصہ اردو

احمد خاں

بی اے (عثمانیہ)

شریک مدیر

سید حسین رضوی

بی۔اے (عثمانیہ)

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن فون ۳۳۰۴۴

مجلہ عثمانیہ

جلد (۱۳) شمارہ (۱) و (۲)

جلد (۱۳)　　　　**مجلس انتظامی**　　　　شمارہ (

سال تعلیمی ۱۳۴۸ف

(صدر)

قاضی محمد حسین صاحب

ام اے ال ال۔ بی (کینٹب)

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(نگران کار حصۂ اردو)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام۔ اے پی ایچ۔ ڈی
پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

مولوی عبد الحق صاحب بی۔ اے
مددگار پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

(نگران کار حصۂ انگریزی)

لیف۔ جے۔ ہارڈنگ ام۔ اے (آکسن) مددگار پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحید الرحمان صاحب بی۔ ایس سی پروفیسر طبعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد)

احمد خاں بی۔ اے (عثمانیہ) مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو مجلہ عثمانیہ

(اراکین)

ملک عبد العلی خاں صدر انجمن اتحاد　　**سید محمد تقی ہاشمی** مدیر حصہ انگریزی

سید حسین رضوی شریک مدیر حصۂ اردو　　**غلام غوث خاں** شریک مدیر حصۂ انگریزی

چندہ سالانہ پیشگی

(۱) سرکار آصفیہ و برطانیہ	۱۲ ے روپیے
(۲) ارباب جامعہ، اصحاب مقتدر اور اداروں سے	۸ ے ،،
(۳) عام خریداروں سے	۶ ے ،،
(۴) طلبائے قدیم، رفاہیہ انجمنوں اور دار المطالعوں سے	۵ ے ،،
(۵) طلبائے جامعہ عثمانیہ سے	۴ ے ،،
(۶) ممالک بیرون ہند سے	۱۵ شلنگ
(۷) بلاد یورپ کے طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ سے	۱۰ ،،
(۸) فی رسالہ	عا روپیے

ملنے کا پتہ

دفتر "مجلہ عثمانیہ" جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین مجلہ عثمانیہ

جلد (۱۳) شمارہ (۱) اور (۲)

حصۂ نظم

سلسلۂ نشان	مضمون	مضمون نگار	صفحہ

آنجہانی امیر جامعہ اور لیڈی حیدری مرحومہ کی یاد

اس سال ہمیں متواتر دو صدمے اٹھانے پڑے۔ ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ وسابق امیر جامعہ و پیشکار و صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی کا بتاریخ ۸ ہر تیر ۱۳۴۹ ف انتقال ہوا ابھی یہ زخم مندمل نہ ہونے پایا تھا کہ محترمہ لیڈی حیدری اہلیہ سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر امیر جامعہ وصدر اعظم باب حکومت سرکار عالی نے بتاریخ ۹ ہر امرداد ۱۳۴۹ ف جان جان آفرین کے سپرد کی۔

مہاراجہ بہادر کی وفات سے ہماری تمدنی و عمرانی زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے ۔ آپ کی ذات مغلیہ تمدن و تہذیب کی علمبردار تھی اور آپ کے ساتھ ہی اس قدیم تہذیب کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گل ہوگیا۔ ہندو مسلم روایات کا وہ ایک سنگم تھے اور مشرقی ثقافت کے حامل۔ دوسرے "دے کر اتراتے ہیں اور وہ دے کر شرماتے تھے"۔ ان کی شاہ پرستی ہمارے لئے مشعل راہ ہے ۔ جامعہ عثمانیہ سے آپ کو نہایت قریبی اور گہرا تعلق رہا ہے۔ تقسیم اسناد کے جلسوں کے علاوہ آپ نے اکثر ہمارے مشاعروں اور تقسیم انعامات کے جلسوں کی صدارت فرمائی یہ صحبتیں اب ختم ہوگئیں لیکن ان کی یاد ہمیں ہمیشہ بے چین کرتی رہے گی ۔ مہاراجہ بہادر کی وفات عثمانین کا "شخصی نقصان" ہے ۔ خدا ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے ۔

لیڈی حیدری مرحومہ طبقہ اناث کی ایک بے لوث اور مخلص رہبر تھیں۔ آپ نے "انجمن خواتین حیدرآباد" کے ذریعہ جس کی آپ صدر تھیں، خواتین کی تعلیمی و اخلاقی حالت کو بہتر بنانے کے لئے گراں بہا خدمات انجام دیں۔ "عثمانیہ تحریک" کی وہ ایک نہایت پرجوش و پرخلوص حامی تھیں۔ ۱۹۰۸ء کی طغیانی رود موسیٰ اور ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا میں آپ کی انسانی ہمدردی سے کئی افراد کی جانیں بچ گئیں ۔ یہ خدمات ہماری سماجی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ آپ کی زندگی خواتین کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ ہے ۔ عثمانین اپنے محترم امیر جامعہ سر اکبر اور دیگر پسماندگان کے غم میں شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں خدا مرحومہ کو غریق رحمت کرے ۔

امین

اداریہ

اس اشاعت سے مجلہ کا 'تیرھواں سال' شروع ہو رہا ہے۔ تیرہ کا عدد منحوس سمجھا جاتا ہے شاید اسی لئے مجلہ کی اشاعت میں اس مرتبہ تاخیر ہوئی ہو۔ لیکن یہ شکایت اب تو روایت بن چکی ہے۔ اردوی بہشت میں ہمیں جائزہ ملا۔ امتحان کا بھوت سامنے کھڑا تھا۔ ادھر امتحان ختم ہوا ادھر گرمائی چھٹیاں شروع ہوئیں۔ سیر و تفریح کے پروگرام کو چھوڑ کر مجلہ کے لئے مضامین لکھنا ایک خشک و بے مزہ کام تھا اور یوں بھی عام طور پر برادران جامعہ کی نظر التفات مجلہ پر پڑتی کب ہے؟۔ تین ماہ کی مسلسل و لگاتار محنت کے بعد مجلہ جلد ۱۳ کا پہلا و دوسرا مشترک شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ کو تاخیر کی شکایت ہو تو یہ ہماری قسمت۔

اس اشاعت میں ہم والاشان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر بالقابہم کی ایک نہایت مرصع غزل شائع کرنے کی عزت حاصل کر رہے ہیں یہ غزل مشاعرہ جشن یوم جامعہ پڑھی گئی تھی جس کی صدارت خود حضرت والاشان نے فرمائی تھی۔ ہم اپنے قدیم برادران جامعہ صمد رضوی اور مخدوم کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنی دلچسپ پر کیف نظمیں عنایت فرمائیں۔

اس نمبر کو حتی الامکان عثمانین کے مضامین سے مزین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "باہر" سے مضامین کا حصول اور ان کی اشاعت آسان تھی۔ اگر ایسا کیا جاتا تو مجلہ آج سے بہت پہلے شائع ہو جاتا

احمد خان بی ۔ اے (عثمانیہ)

مہتمم مدیر و مدیر حصہ اردو

لیکن شاید وہ اُس وقت "مجلہ عثمانیہ" نہ رہتا۔ شائع شدہ مضامین میں بھی طلبائے جدید کا عنصر غالب ہے تقریباً تمام شعبہ جات کی نمایندگی کا خیال رکھا گیا ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ خواہرانِ جامعہ نے بھی مجلہ کے لئے مضامین روانہ فرمائے۔ مضامین کے معیار کو میں آپ پر چھوڑتا ہوں لیکن اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ تقریباً ایک ہی معیار کے ہیں۔ اگر ان میں فرق ہے بھی تو صرف انیس بیس کا۔ "سنسکرت شاعری میں محبت کا عنصر" علی احمد صاحب کا مضمون ہے عنوان سے زیادہ مضمون جاذب نظر ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ پڑھیں گے اور لطف اٹھائیں گے۔ "انگلستان میں قانون سازی" شیخ محبوب علی صاحب کا تحقیقی مقالہ ہے۔ قانون سازی یوں بھی کوئی معمولی کام نہیں اور "عمومیتوں" میں تو یہ ایک بہت گول مول اور پیچیدہ فن بن گیا ہے انگلستان کا دستور اس وقت بہت سے ممالک کے لئے ایک نمونہ ہے۔ اس مضمون کے پڑھنے کے بعد مغربی عمومیتوں میں قانون سازی کے گوناگوں اور پیچیدہ طریقوں کا ایک واضح نقشہ آپ کے ذہن میں آجاتا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اس نمبر میں ادب لطیف کے بہت ہی اچھے نمونے آپ کو ملیں گے۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی ام اے (عثمانیہ) نے، جو حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہیں، ازراہ عنایت "ایک خط" روانہ فرمایا ہے۔ یہ ادب لطیف کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اسلوب بیان نقوی صاحبہ کا اپنا ہے۔ پیرایہ بیان اس قدر عمدہ ہے کہ مطالب دل میں اتر جاتے ہیں ہمیں امید ہے کہ مجلہ کے اوراق آیندہ بھی نقوی صاحبہ کے رشحات قلم سے معرا نہیں رہیں گے۔ ایک اور بہن نجم السحر صاحبہ نے "خواب ناز" کے عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ یہ ایک نغمۂ سحر ہے اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا زبان کی لطافت خیالات کی رفعت، تسلسل اور روانی کے لحاظ سے یہ مضمون بیحد دلچسپ ہے اور ایک خوش آئند مستقبل کی ضمانت دے رہا ہے۔ "آنسو" میں ایک اچھوتے خیال کو نرالے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مضمون جس قدر مختصر ہے اُسی قدر دلچسپ بھی ہے۔

اس شمارہ میں بعض مفید مضامین بھی آپ کو ملیں گے۔ "ہماری غذا میں حیاتین کی اہمیت" اور "ناکارہ اشیاء سے دولت کا حصول" اسی قسم کے مضامین ہیں ہمیں طلبائے شعبہ سائنس سے امید ہے کہ وہ آئندہ ایسے مضامین مجلہ کے لئے روانہ کریں گے، جو دیگر برادران جامعہ کی عام معلومات میں اضافہ کا باعث

ہوں۔ اب کی مرتبہ افسانے کثیر تعداد میں وصول ہوئے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ان کا معیار بہت پست تھا۔ وہی "عامیانہ محبت" ہر افسانہ کا مرکزی خیال تھا۔ زیر نظر شمارہ میں بہت ہی اچھے افسانے شائع کئے جارہے ہیں "ایک دوست" اشفاق حسین صاحب ام اے نے لکھا ہے۔ افسانے کی خوبی کے لئے اشفاق کا نام کافی ہے۔ ظہیر الدین حسین صاحب رونق نے "تبدیلی شکل" کے عنوان سے ایک دلچسپ طبعزاد افسانہ تحریر کیا ہے۔ رونق صاحب کے افسانے اس سے پہلے بھی مجلہ میں شائع ہوتے رہے ہیں اگر اسی طرح مشق قلم جاری رہے تو وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ثابت ہو سکتے ہیں ہم پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی و پروفیسر عبد القادر صاحب سروری کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمیں اپنے بلند پایہ مضامین عنایت فرمائے۔

جدید ہوسٹل اس سال ایک جدید ہوسٹل کا افتتاح کیا جارہا ہے اور ساتھ ہی سال اول میں شرکت کے لئے اقامت خانہ کا قیام لازمی قرار دیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ کو رفتہ رفتہ اقامتی جامعہ بنا دیا جائے۔ اقامتی زندگی کے گوناگوں فوائد سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ جامعہ میں حقیقی علمی فضا، اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کہ اساتذہ اور طلبا باہم مل جل کر ایک ہی جگہ سکونت پذیر ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ بعض پیچیدہ اور اہم مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ اقامت خانہ کے قیام کو لازمی کردینے سے اندیشہ ہے کہ کہیں بعض ذہین اور جفاکش طلبا، شرکت جامعہ سے محروم نہ رہ جائیں اس طرح یہ اصول ہماری ذہنی ترقی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اور تحدید تعلیم کے سلسلہ میں ایک اور کڑی کا اضافہ ہوجائے گا۔ ضرورت ہے کہ اس میں کچھ مستثنیات ہوں۔ علی گڈھ یونیورسٹی میں بھی جو ایک اقامتی جامعہ ہے اقامت خانہ کی شرکت پر اس قدر سختی سے عمل نہیں کیا جاتا۔ قوانین کے بنانے میں گرد و پیش کے حالات کا لحاظ بہر حال ضروری ہے۔

ہمارے خیال میں اقامت خانوں کے موجودہ نام بہت غیر موزوں ہیں۔ اردو زبان اس قدر تہی دامن تو نہیں ہے کہ اقامت خانوں کے ناموں کے لئے حروف تہجی کا استعمال کیا جائے! اس سے ہماری خوش مزاجی خوش سلیقگی اور لطافت طبع کا اندازہ ہورہا ہے۔ اب تو یہ اندیشہ بھی ہو چلا ہے کہ کہیں ان ناموں سے ہمارے روایتی برادرانہ تعلقات متاثر نہ ہوں۔ ارباب جامعہ سے ہماری پرزور درخواست ہے کہ اقامت خانوں کو

چشم و چراغ دودمان آصفی کے اسمائے گرامی سے موسوم کیا جائے۔

مہاراجہ بہادر پور فنڈ

انجمن اتحاد، ہمارے محترم نائب معین امیر جامعہ کے الفاظ میں "جامعہ کی اجتماعی زندگی کا ایک عکس ہے" اس کا مالیہ بہت مستحکم ہے کیونکہ حیدرآباد کا یہی وہ واحد ادارہ ہے جس کے پندرہ ۱۵ سو ارکین باضابطہ سالانہ چندہ ادا کرتے ہیں۔ موجودہ اقتصادی بدحالی اور بڑھتے ہوئے تعلیمی اخراجات کے مدنظر ضرورت ہے کہ انجمن کوئی ٹھوس اور تعمیری کام اپنے ذمہ لے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ یوم جامعہ اور دیگر اسی قسم کی تقاریب کے موقعوں پر جو اخراجات ہوتے ہیں ان میں کمی کرکے انجمن کے زیر سرپرستی ایک پور فنڈ ہمارے قابل احترام سابق امیر جامعہ ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی یادگار میں قائم کیا جائے؟ اس فنڈ سے اُن برادران جامعہ کی اعانت ہوگی جو اقامتی تعلیم کے کثیر مصارف برداشت نہیں کرسکتے۔ جامعہ میں مہاراجہ بہادر کی اس سے بہتر کوئی یادگار قائم نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہی ان کی زندگی کا مشن تھا۔ اس فنڈ کے قیام سے انجمن کے موازنہ پر بار ضرور پڑے گا۔ اور ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے انجمن کی بعض تقاریب میں کچھ بے نمکی پیدا ہو جائے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ قوموں کی زندگی میں "طاؤس و رباب" کو بہرحال آخر میں جگہ ملنی چاہئے۔ ہمیں توقع ہے کہ اس فنڈ کے قیام کا حیدرآباد کے روسا، امراء اور جاگیرداروں کی جانب سے پرجوش خیر مقدم کیا جائے گا۔ امید کہ کابینۂ انجمن اتحاد و ارباب جامعہ اس تحریک پر مناسب غور فرمائیں گے۔

امتحانات

بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہمارے نظام تعلیم میں امتحانات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ معاشی پستی کے اس دور نے ان کی اہمیت میں اور اضافہ کردیا ہے۔ امتحانات کے قواعد و ضوابط کی سختی زندگی کی پیچیدگیوں کو پیچیدہ تر بنا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان بندشوں کو کچھ ڈھیلا کیا جائے۔ ہمیں

توقع ہے کہ سال میں دو مرتبہ امتحان لینے کی تحریک پر ارباب جامعہ ہمدردانہ غور فرمائیں گے ۔

مجلّہ کا آیندہ نمبر

مجلّہ کا آیندہ نمبر ہمارے ہر دلعزیز سابق امیر جامعہ آنجہانی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت کی یادگار میں شایع کیا جارہا ہے ۔ اس سلسلہ میں اردو انگریزی انعامی تحریری مقابلے منعقد کئے جارہے ہیں مضامین حسب ذیل عنوانات پر لکھے جاسکتے ہیں ۔

(۱) مہاراجہ بہادر کے تعلقات اردو کے مشہور شعرا اور ادیبوں سے

(۲) مہاراجہ بہادر کی نظم و نثر ۔

(۳) مہاراجہ بہادر کے سیاسی و ملکی خدمات

(۴) مہاراجہ بہادر کی سیرت

انگریزی تحریری مقابلہ کے لئے حسب ذیل عنوانات تجویز کئے گئے ہیں ۔

(1) The Memoirs of the Maharaja.

(2) The Literary works of the Maharaja.

ہر مضمون کے لئے علحدہ علحدہ بیش قیمت انعامات دئے جائیں گے ۔ ان مقابلوں میں کلیہ اناث کی طالبات اور کلیہ جامعہ عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج بلدہ، اورنگ آباد، ورنگل، گلبرگہ کے طلبا حصہ لے سکتے ہیں مضمون فلسکیپ سائز کے ۲۰ صفحوں سے زائد نہ ہو ۔

مضامین روانہ کرنے کی آخری تاریخ ۵ رہمن ۱۳۴۹ ف ہے ۔

احمد خاں

غزل

...الشان شہ... نواب معظم جاہ بہادر بالقابہم

[illegible]   زیست اب زیست کا سہارا ہے

[illegible]   اب تو سب کچھ ہمیں گوارا ہے

ہم تو کیا تیری آرزو کرتے   آرزو بھی تیرا اشارا ہے

کاش تم حال دل سمجھ لیتے   دل تو ہر حال میں تمہارا ہے

رشک آتا ہے ہر نظر پہ مجھے   تم نے عالم کو کیوں سنوارا ہے

ان سے تسکین غم بھی کیوں چاہیں   کس کو توہین غم گوارا ہے

عشق میں صرف تم ہمارے تھے   اور باقی جو ہے تمہارا ہے

دیکھئے دل سے کیا جواب آئے   نام لے کر ترا پکارا ہے

کیا کہیں شام غم کا حال شجیع

وقت گذرا نہیں گزارا ہے

غزل

حضرت والاشان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر بابقا بہم

دِل کی قسمت میں غم تمھارا ہے
زیست اب زیست کا سہارا ہے

کچھ نہیں چاہیئے محبت میں
اب تو سب کچھ ہمیں گوارا ہے

ہم تو کیا تیری آرزو کرتے
آرزو بھی تیرا اشارا ہے

کاش تم حالِ دل سمجھ لیتے
دل تو ہر حال میں تمھارا ہے

رشک آیا ہے ہر نظر پہ مجھے
تم نے عالم کو کیوں سنوارا ہے

اُن سے تسکینِ غم بھی کیوں چاہیں
کس کو توہینِ غم گوارا ہے

عشق میں صرف تم ہمارے ہو
اور باقی جو ہے تمھارا ہے

دیکھیئے دل سے کیا جواب آئے
نام لے کر ترا پکارا ہے

کیا کہیں شامِ غم کا حال شجیعؔ
وقت گذرا نہیں گزارا ہے

بیجاپور

بیجاپور دکن کی اس مشہور سلطنت کا نام ہے جو سولہویں اور سترہویں صدی میں ایک وسیع حصے پر چھائی ہوئی تھی۔ اور اس کے حکمراں عادل شاہ کہلاتے تھے۔ اگرچہ اس سلطنت کو ختم ہوئے آج ڈھائی سو سال ہوتے ہیں لیکن مغربی دکن کے در و دیوار سے ابھی تک اسکی عظمت ٹپکتی ہے اور دکن کے تمدن اور معاشرت میں اسکے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں معلوم نہیں کہ اس مرحوم سلطنت کی شمیم انگیزیاں کب تک اہل دکن کے دل و دماغ کو معطر کریں گی۔ جس زمانے میں اس سلطنت کا سکہ رواں تھا مغربی دکن میں پاکیزہ تمدن اور معاشرت کی نہریں بہتی تھیں۔ علم و فن کے چشمے اُبلتے تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سلطنت ایسی سرزمین میں قائم ہوئی تھی جہاں اہل کرناٹک کے تاریخی خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ کیونکہ دکن میں کرناٹک ہی ایسی سرزمین ہے جس نے سب سے پہلے دکن کی تمدنی خدمت کی اور سیاست کا سبق دیا۔ اسی سرزمین میں سب سے پہلے آندھرا راجگان نے اپنی راجدھانی قائم کی۔ چالوکیہ اور راشٹراکٹ راجگان اسی سرزمین سے اُٹھے اور تمام دکن پر راج کیا۔ ان حکمرانوں کی دھندلی نشانیاں دکن کے چاروں طرف ابتک دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن ابھی اس سرزمین کی تمدنی خدمت باقی تھی جو بہمنوں اور عادل شاہوں نے

اپنا دبدبہ کچھ ایسا قائم کیا تھا کہ اس کا پکا سکّہ بیٹھ گیا۔

اگر عادل شاہی سلطنت کی اصلیت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ حقیقت میں بہمنی سلطنت کا ایک مغربی صوبہ تھا۔ جب سلطنت بہمنی قائم ہوئی تھی تو اس کے دستور سازوں نے جن میں بانی سلطنت علاء الدین حسن اور اس کا بیٹا محمد شاہ اوّل اور ان کا مشہور وزیر سیف الدین غوری ہیں اس سلطنت کی چار صوبوں میں تقسیم کی تھی اور یہ تقسیم بڑی حد تک جغرافی بنائی گئی تھی کرناٹک اس کا مغربی صوبہ تھا۔ اس کا صدر مقام پہلے بلگام تھا جہاں خود محمود گاواں صوبہ داری کرتا تھا لیکن اس کے قتل کے بعد یوسف عادل خان نے جو اپنے کو مرحوم کا بیٹا سمجھتا تھا اس صوبے پر قبضہ کرلیا اور یہیں اپنی خود مختار سلطنت قائم کی لیکن بجائے بلگام کے بیجاپور کو اپنا صدر مقام بنایا اسکے جانشینوں کے زمانے میں ہندوستان کا ایک بہت بڑا شہر بن گیا۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسی کے جنوب میں کچھ فاصلے پر قدیم چالوکیہ سلطنت کا مرکز بھی قایم کیا گیا تھا۔ بہمنی سلطنت کے ابتدائی دور میں یہ صوبہ بہت چھوٹا تھا کیونکہ اسکی فتوحات مغرب میں بہت دور تک نہیں پہنچی تہیں لیکن محمد شاہ لشکری کے عہدِ حکومت میں جو ۸۶۸ھ ۱۴۶۳ع میں تخت نشین ہوا تھا مشرق کی طرح اس مغربی صوبے کی طنابیں بھی سمندر تک کھنچی گئیں۔ ان فتوحات میں جو مغربی کرناٹک کوکن اور گووہ وغیرہ ہیں محمد شاہ لشکری کے وزیر خواجہ محمود گاواں کا بہت حصہ ہے۔ چند سال کی کوششوں کے بعد یہ صوبہ بہت وسیع ہوگیا اس میں نہ صرف تمام کرناٹک بلکہ کوکن کے تمام اقطاع شامل ہوگئے اور اسی وجہ سے خواجہ محمود گاواں نے اس ـــے کے دو حصے کردیئے اور ایک صوبے کے دو صوبہ قرار دیئے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پندرھویں صدی کے آخری عشرے میں جب عادل شاہی سلطنت قائم ہوئی تو اس میں مغرب کے یہ دونوں صوبے یکجا کردئے گئے اور عادل شاہوں کی رہنمائی سے یہ ایک بڑی سلطنت ہوگئی۔

لیکن یہ سلطنت اپنے اصلی حدود میں محدود نہیں رہی۔ اسکی اصلی وسعت گجرات کے جنوبی حدود سے شروع ہو کر دریائے تنگبھدرا تک پھیلی ہوئی تھی اور مغرب میں سمندر تک اسکی حدیں ملتی تہیں لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہر زمانے میں اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ ۹۷۲ھ ۱۵۶۵ع میں جبکہ تالی کوٹ والی فیصلہ کن لڑائی ہوئی جس میں دکن کی تمام قوت مصروف تھی عادل شاہی سلطنت کو بہت فائدہ پہنچا۔ یعنی جنوب میں دریائے تنگبھدرا کے نیچے

انجام دی۔ عادل شاہ بہمنی بادشاہوں کے خوشہ چیں تھے۔ بہمنی سلاطین نے تعمیر دکن کے جو اصول قرار دیے تھے عادل شاہوں نے کرناٹک میں ان کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ بہمنوں کے سامنے دکن نا تمام طول و عرض تھا۔ جس طرح وہ تلنگانے میں اپنا تمدنی اثر پھیلاتے تھے اسی طرح کرناٹک میں بھی ان کا اثر پھیلتا تھا۔ اور ہر خطہ ان کے سرمایہ سے فیض پاتا تھا لیکن عادل شاہوں نے صرف کرناٹک کو اپنا گھر بنایا اور اسی کی آبیاری میں اپنی قوتیں صرف کیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کام چالوکیہ اور راشٹراکٹ راجگان نے ادھورا چھوڑ دیا تھا ان کو عادل شاہوں نے پورا کیا۔ چنانچہ گجرات کی جنوبی سرحدوں سے لیکر جہاں سے یہ سلطنت شروع ہوئی تھی تنجور اور جنجی تک آج عادل شاہی تمدن کے تمدنی جواہر بکھرے پڑے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سلاطین نے اس سرزمین کو اپنا جنم بھوم سمجھا اور اس کی دل سے خدمت کی۔ اس ملک کی تمدنی تعمیر میں ان کا حصہ ویسا ہی قابل قدر ہے جیسے خود اہل کرناٹک کا ہے اور جیسے چالوکیہ اور راشٹراکٹ راجگان نے کیا۔

دکن کے اس سیاسی انتشار میں اس سلطنت کی بنیاد پڑی تھی جو پندرھویں صدی کے آخری عشرے میں رونما ہوا بہمنی سلطنت کا زوال اس سلطنت کا آغاز ہے کیونکہ جب بہمنی سلطنت کی کمزوری سے اسکی طنابیں ڈھیلی پڑنے لگیں تو اس کے دور دراز صوبہ دار جو طرفدار اور سرلشکر کہلاتے تھے اپنی مربی سلطنت سے روگرداں ہوگئے اور اپنا لوہا منوانے لگے۔ اور اس زوال کا اصلی باعث دکن کی طبقہ واری کشمکش تھی جو گھن کی طرح لگ گئی اور بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ ان طبقوں کے رہنما جو ایک دوسرے کے رقیب تھے اپنی طاقت بڑھانے لگے اور جہاں موقع ملا خود مختار ہوگئے۔ یوسف عادل خان سوائی جو اس عادل شاہی سلطنت کا بانی ہے ایک طبقے کا رہنما تھا۔ یہ طبقہ محمود گاوان کے مرنے کے بعد یوسف کے گرد جمع ہوگیا اور اہل ملک کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ یوسف عادل خان نے جو بعد کو یوسف عادل شاہ کے نام سے موسوم ہوا مرکزی سلطنت سے ہٹ کر بیجاپور میں ۸۹۵ھ ۱۴۹۰ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ایک بہت بڑی عادل شاہی سلطنت قائم کردی۔ اگرچہ دکن کے ہمت شکن حالات میں اس سلطنت کی افتاد پڑی تھی لیکن آگے چل کر اس سلطنت کے ناخداؤں نے کچھ ایسا خوشگوار نصب العین اختیار کیا کہ لوگ پندرھویں صدی کے بُرے حالات بھول گئے اور اس کے خوش آئند زمانہ کی راگ گانے لگے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ عادل شاہی سلطنت نے مغربی دکن میں

ایک بہت بڑا راستہ کھل گیا ۔ جب تک تنگبھدرا کی وادی میں سلطنت بیجانگر قائم تھی عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے پھیلنے کے کوئی مواقع نہ تھے کیونکہ جنوب کی ہندو سلطنت انکا راستہ روکے ہوئے تھی ۔ جب اس مشہور لڑائی میں اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تو انکی پیشقدمی میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی چنانچہ علی عادل شاہ اول کے عہد سے جبکہ یہ لڑائی ہوئی تھی آئندہ پچاس یا ساٹھ سال کے دوران میں عادل شاہی سلطنت نے کاویری تک تمام جنوبی کرناٹک مسخر کر لیا ۔ آخری دور کے سپہ سالار اندولہ خان اور شاہ جی مشہور لوگ ہیں جنہوں نے جنوب میں بنگلور فتح کیا اور سمندر کے کنارے جنوب، مشہور قلعہ جنجی مسخر کر لیا سری نگر پٹن کی راجدہانی انکی باج گذار ہو گئی تھی، ان جنوبی مقبوضات کے نظم و نسق کے لئے ' سیرا کو صدر مقام قرار دیا گیا تھا جو بنگلور سے ۵۷ میل کے فاصلہ پر شمال میں واقع ہے ۔ سیرا میں عادل شاہی صوبہ داروں کے کئی آثار پائے جاتے ہیں جو اس مرکز سے تمام جنوبی کرناٹک پر نگرانی رکھتے تھے ۔

یہ تو اس سلطنت کا مغربی اور جنوبی پھیلاؤ تھا لیکن سترھویں صدی میں شمالی دکن میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ انکے زور سے عادل شاہی سلطنت شمال اور مشرقی دکن میں بھی پھیل گئی ۔ یہ نئے حالات مغلوں کے حملے سے پیدا ہوئے تھے ۔ اکبر اعظم کے عہد سے مغل حملہ آور دکن میں آنے لگے اور پہلے ہلے میں ان حملہ آوروں نے خاندیس کی چھوٹی سلطنت کو زیر و زبر کر دیا اور اس کے بعد نظام شاہی سلطنت کے شمالی اقطاع جن میں قلعہ احمد نگر بھی شامل تھا مسخر کر لئے ۔ اگر شہنشاہ اکبر یہاں زندہ رہتے تو شاید جنوب میں مغلوں کی اور پیشقدمی ہوتی اور بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتوں پر بھی آنچ آتی لیکن شہنشاہ کے انتقال سے یہ پیشقدمی رک گئی ۔ جہانگیر کے عہد میں بھی فتوحات حاصل نہیں ہو سکیں ۔ لیکن شاہجہاں نے ۱۶۳۳ء ۱۰۴۳ ہجری میں نظام شاہی سلطنت کا بالکل خاتمہ کر دیا اور اس بدقسمت سلطنت کو مغل شہنشاہت میں ضم کر لیا ۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغل حکومت دکن کے اس وسیع علاقے کا انتظام نہیں کر سکتی تھی ۔ یا اگر دکن کے مورخوں کا بیان صحیح سمجھا جائے تو شاہجہاں کو دکن کی فتوحات میں عادل شاہی سلطنت سے بہت مدد ملی تھی اس لئے نظام شاہوں کی مرحوم سلطنت کے دو حصے کر کے مشرقی حصے مغل سلطنت میں ضم کر لئے اور اس کے مغربی علاقے عادل شاہی سلطنت کو دے دیئے ۔

چنانچہ یہ ماہ ذیحجہ ۱۰۴۶ ہجری ۱۶۳۶ء کا معاہدہ ہے جس کی رو سے شاہجہاں دریائے کرشنا کے تمام مغربی علاقے عادل شاہی

سلطنت کے سپرد کردئے ۔ ان میں بہالکی، چنگوپہ اور کوکن کا وہ حصہ داخل ہوا جو نظام شاہی سلطنت کے زیر نگیں تھا یعنی چاکن اور پونا ۔ اس طریقے سے شمال و مشرق میں یہ سلطنت بہت پھیل گئی اور دکن کی بہت بڑی سلطنت بن گئی ۔ اس وسعت میں غالباً بہمنی سلطنت کے بعد اسی کا درجہ تہا ۔ اگرچہ اس شمال و مشرقی پھیلاو سے عادل شاہی سلطنت اور پورے دکن کو کچھہ فائدہ نہیں پہنچا بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اس سے الٹے نقصان ہوا کیونکہ محمد عادل شاہ کا عہد حکومت جبکہ یہ علاقے حاصل ہوئے تھے اس قدر کمزور تھا کہ وہ انکا بندوبست نہیں کرسکتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہی علاقوں میں سے جو مغلوں سے حاصل ہوئے تھے مرہٹوں کی ایک نئی طاقت پیدا ہوگئی جو خود بیجاپور کے لئے مہلک ثابت ہوئی اور اس کے بعد اس سے پورے دکن کو نقصان پہنچا۔

ابراہیم زبیری کے الفاظ میں جو بیجاپور کا مشہور مورخ ہے عادل شاہی سلطنت کی وسعت کا اندازہ ہوسکتا ہے اس کے الفاظ ہیں ۔ زمان قدیمی ایں ملک کنٹری است . . . . ولایتے است فراخ و وسیع "۔ اس کے جنوب میں بدنور مشرق میں حیدرآباد شمال میں گجرات اور مغرب میں سمندر ہیں ۔ اسی مورخ کے بیان کے مطابق اس سلطنت میں اٹھارہ سرکار یعنی ضلعے اور دوسو اکاسی موضع تھے ۔ عالمگیری زمانے کے حساب کے مطابق جبکہ شہنشاہ عالمگیر نے اس پر قبضہ کرلیا اس سلطنت کی جملہ آمدنی سات کروڑ چوراسی لاکھ اکسٹھ ہزار آٹھ سو ستر روپئے ڈیڑھ آنہ تھی اور روپئے کی تغیر پذیر قدر کا لحاظ کرتے ہوئے موجودہ زمانے میں اس کی مقدار چوگنی ہوجائیگی ۔ ان اضلاع اور پرگنوں کے علاوہ اس سلطنت کی متعدد بندرگاہیں بھی تھیں جن سے محاصل کے ذریعے سے خاطرخواہ آمدنی حاصل ہوتی تھی بارہ بندرگاہوں کے نام معلوم ہوتے ہیں ۔ ہندوستانی اور مغربی تاجر یہاں تجارت کرتے تھے ۔ عادل شاہی سلطنت کی اجازت سے پرتگالیوں نے گووہ کو اپنا صدر مقام بنایا تھا یہاں خود عادل شاہوں کے تجارتی جہاز چلتے تھے اور ان بندرگاہوں پر ٹھہرتے تھے۔ بندرگاہوں کے نام مع انکے محاصل کے یہ ہیں ۔ بندر دابول[1] اسکی آمدنی سات ہزار روپئے کے قریب تھی۔ بندر کھل[2] الستی سات ہزار روپئے ۔ بندر جیول[3] پندرہ ہزار ۔ بندر سنگر[4] دس ہزار روپئے ۔ بندر گووہ[5] سینتیس ہزار پانچ سو روپیہ ۔ اسلام[6] بندر عرف راجاپور چوبیس ہزار روپئے ۔ بندر ساہتی دس ہزار روپئے ۔ بندر کھاری پٹن[7]

پانچ ہزار - اور بندر[9] ہرچری پانچ ہزار - بندر[10] ساتولی تین ہزار پانچ سو - بندر[11] محمد آباد عرف پانچہزار و بندر[12] کیرا پانچ ہزار روپیہ - ان سے عادل شاہی سلطنت کی وسعت معلوم ہوتی ہے -

اس سلطنت کے تحت بڑے بڑے زمیندار تھے جو وسیع زمینوں پر کاشت کرتے تھے اور ان کی عملداری تھی اور اپنی سلطنت کو بڑے بڑے محاصل ادا کرتے تھے - چنانچہ ابراہیم انبری نے ایسی بائیس زمینداریاں بتائی ہیں جن سے لاکھوں روپیے کی آمدنی ہوتی تھی ان میں سے بعض زمینداریوں کی حیثیت اجارہ لو کی سی تھی - یعنی زمیندار راجہ تھے اور عادل شاہی حکمرانوں کی ماتحتی میں راج کرتے تھے اور بیجاپور کو خراج ادا کیا کرتے تھے - چنانچہ منجملہ انکے سری رنگ پٹن اور اناگندی کی زمینداریاں قابل ذکر ہیں - گوان کو زمیندار کہتے ہیں لیکن یہ راجہ تھے - اس آمدنی کی جملہ مقدار پانچ کروڑ پانچ لاکھ اکسٹھ ہزار چھ سو انچالیس روپیے بتائی جاتی ہے اور یہ آمدنی اس کے علاوہ تھی جو اضلاع اور پرگنوں سے حاصل ہوتی تھی - وہ زمیندار مع رقم پیشکش جو ان سے حاصل ہوتی تھی یہ ہیں - زمیندار سری رنگ پٹن تین کروڑ آٹھ لاکھ اکاون ہزار تین سو اکسٹھ روپیے بارہ آنے - اسی تعلقے کا دوسرا[2] زمیندار ایک کروڑ دو لاکھ باسٹھ ہزار چھ سو تیئیس روپیے دس آنے - زمیندار[3] سونڈہ سات لاکھ بیس[4] ہزار آٹھ سو اکہتر روپیے - زمیندار[4] چترورگ گیارہ لاکھ پچیس ہزار روپیے - زمیندار[5] چری ملاو ترانوے ہزار سات سو پچاس روپیے - زمیندار[6] کھیر ایک لاکھ بہتر ہزار پانچسو روپیے - زمیندار[7] زن گری نو ہزار سات سو ستاون روپیے - زمیندار[8] سرہتی پچہتر ہزار روپیے - زمیندار[9] پادگر ایک لاکھ تین ہزار سات سو پچاس روپیے - زمیندار[10] مانک پالا پندرہ ہزار - زمیندار[11] چک پالا ایک لاکھ نو ہزار پانچ سو - زمیندار[12] کوری نگر پچہتر ہزار - زمیندار[13] منوری پانچہزار چھ سو چالیس روپیے - زمیندار ہاکل واڑی سینتیس ہزار پانچ سو - زمیندار دیگر ترانوے ہزار - زمیندار[16] ہرپن پلی دس لاکھ انتیس ہزار ساٹھ روپیے - زمیندار[17] اناگندی ایک لاکھ تریسٹھ ہزار پانچسو پچاس روپیے - زمیندار[18] کیکوری دو لاکھ پچیس ہزار - زمیندار[19] کنک گیری نو لاکھ اکانوے ہزار ایک سو پینسٹھ روپیے - زمیندار[20] بلاری چھیاسی ہزار دو سو پچاس روپیے - زمیندار[21] کوری کوٹھ ایک لاکھ ستاسی ہزار پانچ سو - زمیندار[22] سکر کر سینتیس ہزار پانچ سو روپیے -

پروفیسر عبدالمجید صدیقی ام - اے - ال ، ال ، بی

موجودہ مختصر قصّے

ادب ، زندگی کا عکس ہوتا ہے، لیکن زندگی اس قدر وسیع اور پیچیدہ ہے، کہ بعض وقت، کسی زمانے کے ادیبوں کے کارناموں میں، اُس کے مظاہر کی تلاش دشوار ہو جاتی ہے۔ حالی سے پہلے کے انشاء پردازوں اور شاعروں کا یہی حال ہے۔ لیکن محض اس بناء پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُس زمانے کے ادب کو زندگی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اُس زمانے کے صناعوں نے، ایک نہایت رسمی اور استعارے کا طریقہ، اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اختیار کر لیا تھا۔ تاہم، وہ اپنے زمانے کے علمی خیالات اور معاشرتی اثرات سے بے گانہ نہیں تھے۔

جدید افسانوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے بھی، یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اُن کی پیدائش اور اُن کے نشوونما کے پیچھے حالات اور خیالات کا ایک وسیع پس منظر ہے۔ جب تک ہم ان حالات اور خیالات کو ذہن نشین نہ کریں، اس زمانے کے افسانوں کو پورے طور پر سمجھ نہ سکتے۔

لیکن ہم اس وقت، صرف مختصر قصوں کا ذکر کریں گے کیونکہ، افسانے کی اصطلاح عام اور وسیع ہے۔ اس میں داستان، حکایت، ناول، مختصر قصے، غرض ادب کا وہ تمام ذخیرہ شامل ہو جاتا ہے، جس کو قصّے سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق ہو۔ اس زمانے میں داستانیں اور حکایتیں نہیں لکھی جاتیں۔ یہ

مختصر قصوں اور مختصر ڈراموں کا دور ہے۔ ناول کی طرف بھی اب بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔

مختصر قصے کے لئے انگریزی میں "Short story" کی اصطلاح رائج ہے۔ اردو میں عام طور پر اُسے مختصر افسانہ' اور بعض وقت محض افسانہ کہتے ہیں۔ لیکن' جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں' افسانہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس کو انگریزی اصطلاح "Fiction" کے ہم معنی سمجھنا چاہئے۔ افسانے کی ایک خاص شکل کے لئے' عام اصطلاح استعمال کرنا' مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس سے دقتیں پیدا ہو جاتی ہیں اسی سے بچنے کے لئے' ہندی ادیبوں نے اس صنف کے لئے "کہانی" کا نام اختیار کیا ہے۔ کہانی' "story" کا ترجمہ ہے۔ لیکن' مختصر قصہ نہ تو افسانہ ہے اور نہ کہانی۔ اس کا فن' ان سب سے الگ' اور اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ نئی ادبی شکل کا نیا نام ہونا چاہئے۔ اسی لئے' اس کو مختصر قصہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مختصر قصہ' ہماری زبان میں انگریزی کے توسط سے پہنچا۔ ایشائی قوموں کی مخصوص ذکاوت کو' قصہ گوئی سے بہت قدیم' اور فنی تعلق رہا ہے۔ اسی لئے یورپ کی اس ادبی شکل سے' ہم اس قدر جلد مانوس ہوگئے کہ وہ ہمارے ادب کا ایک مقبول جزبن گئی ہے۔

یورپ کی زبانوں میں بھی' مختصر قصہ' فنی حیثیت سے بہت بعد میں پیدا ہوا۔ اس کی ترقی' دراصل موجودہ زمانے کی مصروف اور صنعتی زندگی کے آغاز کے ساتھ ہوئی۔ یورپ کے اہم ملکوں' جیسے انگلستان' فرانس' جرمنی' اطالیہ' روس اور امریکہ میں' صنعتی ترقیوں کے بعد سے' عام زندگی کی کشمکش اس قدر بڑھ گئی کہ' درمیانی اور ادنیٰ طبقوں کو' قدیم زمانے کے لوگوں کی طرح' بڑے بڑے ناول اور ڈرامے پڑھنے کا وقت کم ملتا تھا۔ لیکن' اس کے ساتھ ساتھ ذہنی اور دماغی تفریح کی ضرورت گھٹی نہیں' بلکہ اور بڑھ گئی۔ اسی لئے ایک ایسی ادبی صنف کی ضرورت ہوئی' جو مصروف لوگوں کی فرصت کے چند لمحات کو پُر کرسکے' اور ایک مکمل تفریح ثابت ہو۔

یورپ کی گذشتہ جنگ عظیم تک' اس فن کو' ناول اور ڈرامے کے ساتھ ساتھ ترقی ہوتی رہی۔ پہلے پہل' اکثر ناول نگار' اس کو ایک وقتی تفریح کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تاہم' ان کے سرانجام میں

وہ بڑے قصوں کی طرح محنت کرتے، اور اپنے مقصد کو نمایاں کرنے میں وہ قدیم قصہ گوئی کے سارے لوازم صرف کر دیتے تھے۔ اسی لئے اُن کے مختصر قصے بھی کافی طویل اور قصہ گوئی کے پورے لطف سے پُر ہوتے تھے۔ اُن کے موضوع عموماً ادبی اور خیالی ہوتے تھے۔

لیکن جنگ کے بعد سے جو اہم تبدیلیاں یورپ کی سیاسی اور معاشی، سماجی اور علمی زندگی میں رونما ہوئیں، اُن کی وجہ سے یورپی ادب میں بہت بڑا انقلاب ہو گیا ہے۔ ان اثرات سے ہندوستان بھی نہ بچ سکا۔ اُردو کے مختصر قصوں میں بھی، ہم وہ تمام ظاہری اور معنوی خصوصیات دیکھ سکتے ہیں، جو یورپی قصوں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ ہمارے قصوں کا بہت بڑا ذخیرہ ایسا ہے، جو یورپی زبانوں سے ترجمہ کے ذریعہ منتقل ہوا ہے۔ اس کے علاوہ، کچھ حصّہ ماخوذ ہے اور کچھ اُسی نمونے پر ڈھالا گیا ہے۔ ملکی ذہنیت بھی، اب اُس پر اس قدر قابو پا چکی ہے، کہ اپنی ذکاوت کے مناسب اُس میں تصرف بھی کرنے لگی ہے۔

اس طرح ہمارے مختصر قصوں میں، ایک طرف مابعدِ جنگ اثرات موجود ہیں تو دوسری طرف ان پر، یورپ کے خاص خاص ملکوں، جیسے انگلستان، فرانس، جرمنی، اور خاص طور پر روس کے باکمال قصہ نگاروں کے، مخصوص قومی اور شخصی رجحانات گہرے اثرات بھی کام کر رہے ہیں۔ یہ یورپی قصہ نگار زیادہ تر ایسے ہیں جو جنگ سے پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ گویا ہمارے قصے، جنگ سے پہلے کے ادبی تخیلات، اور اُس کے بعد کے اثرات کا مجموعہ ہیں۔

روسی قصہ نگاروں میں تورگنیف، ڈوستو وسکی، چیخوف، میکسم گورکی، اور خاص طور پر ٹالسٹائی کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ کئی رسالے اور کتابیں ان کے قصوں اور ان کی صناعی کو سمجھانے کے لئے اُردو میں شایع کی گئی ہیں۔ نوجوان انشا پردازوں کی ایک خاص تعداد ایسی ہے جس کا مقصد روسی ادب اور خیالات کی اشاعت ہے۔ ان میں سعادت حسن منٹو، کامریڈ فیروز الدین منصور، شاہد لطیف وغیرہ بہت پیش پیش ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب اور اختر حسین رائے پوری کے افسانے بھی روسی اثرات ہی کے مظہر ہیں۔

تورگنیف اور ڈوستووسکی، روسی ادب میں، درحقیقت اُس افسانہ نگار گروہ کے پیرو تھے جس کا نشو و نما گوگول اور فرانسیسی مختصر قصہ نگار ژورژ ساں (George sand) کے اثرات کے تحت ہوا۔ اس دبستان کی خصوصیات، ہم عصر روسی زندگی کے صحیح نقشے پیش کرنا، سماجی مسئلوں سے دلچسپی اور اُن پر تنقید، اور عجائبات اور رومانیت کی افراط و تفریط سے کنارہ کشی ہے۔ یہ لوگ ایسے اسلوب بیان پر زور دیتے تھے، جو سادہ اور واضح ہو اور چیزوں کی سچی تصویر پیش کرے۔ تورگنیف، اُس اسکول کی غیر فانی یادگار ہے۔ اس کے قصے سماجی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اور کرداروں میں اُس کے مرد عموماً کمزور اور عورتیں طاقتور ہوتی ہیں۔ اُس کا اسلوب، حقیقت پر مبنی ہونے کے باوجود تہذیب سے نہیں گرتا اور جوش کے بغیر شاعرانہ ہے۔

ڈوستووسکی، غریب اور دیہاتی طبقوں کی زندگی پیش کرتا ہے۔ "غریب منشی" اُس کے مشہور کردار بن گئے ہیں۔

ٹالسٹائے، اُردو میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اُس کی عظمت کی بنیاد، اُس کے قصوں کا انسانی عنصر ہے۔ وہ بنی نوع انسان کی اخلاقی بہتری چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اُس نے ایک نئی اخلاقی عیسائیت کا پرچار کیا۔ سب سے بڑھ کر اُس کا بے مثل اور سادہ انداز بیان ہے، جس میں لفاظی اور علمی نمایش کو بالکل دخل نہیں ہے۔

چیخوف کے کارنامے، اُس پستی کے مظہر ہیں جو ۱۸۸۰ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان روسی ادب طاری رہی۔ اُس کے بہترین افسانے، اُس کے زمانے کے ذہین لوگوں کی فریب خوردگی اور بیکاری کے مرقعے ہیں۔

کارل مارکس Karl marx کے عقائد کی نشر و اشاعت سے، روس میں جو نئی روح پیدا ہوئی۔ اس کی یادگار میکسم گورکی ہے۔ وہ نہایت غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا اور اُس کی ابتدائی زندگی کا ایک بڑا حصہ بے کاری اور آوارہ گردی میں بسر ہوا تھا۔ اُس نے اپنے قصوں میں آوارہ گردوں کی جو نفیس تصویریں کھینچی ہیں، وہ حقیقی ہونے کے باوجود رومانیت سے پُر ہیں۔ یہی دو خصوصیات ہیں جن کی

بدولت، اُس کے قصے ساری دنیا میں مقبول ہیں۔

جنگ عظیم کا اثر، روس میں، بولشویک انقلاب کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس عہد میں مملکتی سیاست کی جو پابندیاں ادیبوں پر عائد ہوگئی ہیں، اُن کے اثر سے ادب میں یکسانیت، میکانیت اور پروپگنڈے کی خصوصیت بڑھ گئی ہے۔ اسی لئے موجودہ زمانے میں عالمی شہرت کا کوئی قصہ نگار پیدا نہ ہوسکا۔

فرانس کے باکمال قصہ نگاروں میں، یوں تو بلزاک سے لے کر رومین رولان تک، سب کے اچھے قصے اُردو میں ترجمہ ہوچکے ہیں، لیکن ماپساں کی سی مقبولیت کسی کو حاصل نہ ہوسکی۔ ماپساں، فرانسیسی ادب میں حقیقت نگار گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس نے اپنے زمانے کے عیش پسند فرانس کی سچی اور حسن کارانہ تصویریں پیش کی ہیں۔ اُس کے اکثر قصے صنفی تعلقات کے وسیع پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔ اُس کا اسلوب بیان حقیقت اور صناعی کی آمیزش کا دلنواز مجموعہ ہے۔ اُردو کے بعض قصہ نگار، جن میں جلیل قدوائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اسی سے متاثر ہیں۔ اُس کے بہترین قصوں کا اُردو میں ترجمہ ہوچکا ہے۔

جنگ عظیم سے فرانس کے نوجوان ادیبوں کی مصروفیتوں میں رخنہ پڑگیا۔ ان میں سے بعض تو جنگ میں کام آئے، جو بچ رہے اُن میں جوش اظہار قابل دید ہے۔ اُس زمانے کے کارنامے جذبات کی صداقت، وطنی جوش اور قومی شجاعت کے ولولوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جنگ کا خطرہ دور ہوجانے پر، وہ جوش تو کم ہوگیا، لیکن نوجوان ادیبوں نے اس طرح کام شروع کیا، گویا انھیں اچھے ادیبوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ انہوں نے ایک نئی دنیا بسانے کی کوشش کی، لیکن انھیں جلد محسوس ہوگیا کہ وہ اچھے لوگوں کے اثر سے نہیں بچ سکتے۔ موجودہ قصہ نگاروں کے رجحانات، قابلیتوں کے اختلافات، اور اُن کے مقصد اتنے ہی وسیع ہیں، جتنے موجودہ اُردو قصہ نگاروں کے نظر آتے ہیں۔ اُن کی فکر میں اتحاد کم ہے، اور ہر شخص اپنے طبعی میلان کی پیروی کرتا ہے۔ اسی لئے اُن کی گروہ بندی کی کوشش دشوار نظر آتی ہے۔ تاہم ایک چیز جو اُن میں مشترک ہے وہ نفسیاتی تجسس ہے۔ یہ چیز بعض موجودہ اُردو قصوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

اطالوی قصہ نگاروں کا اثر یورپی ادب پر کافی پڑا ہے۔ اُردو میں بھی جستہ جستہ قصوں کے ترجمے ہو چکے ہیں، جن میں بوکاچیو سے لے کر میکاویلی، باندیلو، کارلوگوزی اور گریزیا ڈیلیڈا جیسے حال کے قصہ نگاروں کے قصے تک شامل ہیں۔ لیکن ان قصوں کا کوئی خاص اثر، اُردو لکھنے والوں پر نہیں پڑا۔ یہی حال جرمن قصوں کا بھی ہے۔ گرِم، پال ہائز، شانزلر وغیرہ کے کچھ قصے اُردو میں ترجمے ہوئے ہیں لیکن اُن میں کوئی نمونہ نہیں بن سکا۔ جرمنی کے صاحب فکر ادیبوں جیسے گوئیٹے، شِلر، ہیگل، کانٹ اور شوپنہار کے اثرات فرانس، انگلستان، روس اور دنیا کی دوسری زبانوں کے ادیبوں پر وقتاً فوقتاً پڑتے رہے، لیکن، اُردو میں اُن کا کوئی راست اثر سوائے اقبال کے کلام کے، کسی اور جگہ کم نظر آتا ہے۔ گوئیٹے کے شاہکار "فاوسٹ" کا جو ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین نے کیا ہے، اُس کا بھی کوئی معین اثر اُردو میں ظاہر نہیں ہوا، حالانکہ یہ کارنامہ نہایت معرکتہ الآرا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یورپی قصوں کے اثرات اُردو میں، زیادہ تر، انگریزی زبان کے توسط سے پہنچے لیکن یہ بات خاص طور پر دیکھنے کی ہے کہ انگریزی قصہ نگاروں، مثلاً کپلنگ، ساقی، چسٹرٹن، اچ، جی ولز اور گالزوردی کا اثر بھی ہمارے قصہ نگاروں پر بہت زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ کپلنگ، اچ، جی ولز اور گالزوردی کے کچھ قصے اُردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ انگریزی قصوں کے زیادہ مقبول نہ ہونے کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ انگریزوں کی مخصوص ذکاوت، مزاح، اور لطف گفتار کا ہم پورا حظ نہ اُٹھا سکتے ہوں۔ اس کے برخلاف، فرانسیسی اور روسی قصے، جو انگریزی کے توسط سے ہم تک پہنچتے ہیں، ترجمے میں اپنی بہت سی انفرادی خصوصیات کھو دیتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت امریکی قصے بھی ہیں۔ واشنگٹن ارونگ کے قصے ہمارے پاس، او، ہنری، اڈگر، ایلن پو، مارک ٹوین Mark twain و بریٹ ہارٹ کے قصوں سے زیادہ مقبول ہوئے۔ اور، ان میں زیادہ تر وہ قصے ہیں جو اسلامی اسپین سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُردو میں ترجمہ ہوتے ہوتے، یہ مشرقی لباس اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا اندازہ، نیاز فتحپوری کی "نگارستان" کے قصوں کو پڑھنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

اُردو کے تمام موجودہ قصوں اور قصہ نگاروں پر یہاں تبصرہ کرنا مقصود نہیں نمایاں ذبتانوں کا

ذکر کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلا اور نمایاں دبستان، معاشرتی اور قومی" قصہ نگاروں کا ہے۔ اس کی بنیاد منشی پریم چند نے رکھی تھی۔ سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی، اس طرز کے مشہور پیرو ہیں۔ ان کے قصے ہندوستان کی سادہ دیہاتی زندگی کے مرقعے ہوتے ہیں۔ زبان اور اسلوب میں بھی، یہ بے حد سادگی پسند کرتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار کا موضوع بھی معاشرت ہے۔ لیکن اُن کے قصے زیادہ پیچیدہ اور اُن کا اسلوب نفسیاتی ہوتا ہے۔

دوسرا گروہ، " رومانی اور نفسیاتی" قصہ نگاروں کا ہے، جن کے موضوع عام زندگی سے ہٹے ہوئے، اور شاعرانہ ہوتے ہیں، اسلوب کے لحاظ سے، یہ دبستان یورپ کے پرستارِ تصور دبستان کے مماثل ہے۔ ان کا کمال، تخیل کی مدد سے، غیر محسوس کو محسوس بناتا ہے۔ اس طرز کے مشہور لکھنے والے سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری اور حجاب امتیاز علی ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب اور اختر حسن رائے پوری کے قصے، نفسیاتی تجزیہ کے ساتھ ساتھ، صداقت اور سادگی کی طرف زیادہ مائل ہیں۔

تیسرا مکتب، مزاحیہ قصہ نگاروں کا ہے، جس میں عظیم بیگ چغتائی، سب سے پیش پیش ہیں ان کے قصے، مختصر قصوں کے تمام اجزا پر حاوی بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے مزاحیہ نگار، مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، ایم، اسلم اور ملا رموزی وغیرہ شکل یا صنف کے پابند رہ کر نہیں لکھتے۔ لیکن ان کے مضامین کبھی کبھی، مختصر قصے کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

چوتھا اور آخری گروہ، وہ ہے جس میں زیادہ تر مترجمین شامل ہیں۔ یہ جلیل قدوائی، منصور احمد مرحوم عابد علی خان، سعادت حسن منٹو اور اُن کے ساتھیوں پر مشتمل ہے۔ منصور احمد نے دنیا کی مشہور زبانوں کے بعض قصوں کا ترجمہ، " دنیا کے بہترین افسانے " کے نام سے شایع کیا تھا۔ جلیل قدوائی نے موپساں کے کئی قصوں کا ترجمہ کیا اور سعادت حسن منٹو اور اُن کے شریک کار، روسی ادب اور مختصر قصوں کو اُردو سے روشناس کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

جنگ سے پہلے کے قصوں کا ہمارے پاس بہت زیادہ ذخیرہ نہیں ہے، لیکن جو کچھ موجود ہے یا پھر یورپ کے اگلے اساتذۂ فن سے حاصل ہوا ہے، اُس کا مقابلہ، موجودہ زمانے کے قصوں سے کرنے پر یہ ظاہر ہوگا کہ قدیم قصہ نگاروں کا بڑا کمال، ذوقِ قصہ گوئی میں ظاہر ہوتا تھا۔ لیکن بعد کے قصوں میں، یہ چیز اُن کے آرٹ، یعنی صناعی کے مقابلہ میں کم نمایاں ہے۔ موجودہ قصہ نگار نہایت ایمائی اشاروں سے کام لیتا ہے۔ اُس کا رجحان، ایجاز یعنی اختصار کی طرف بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ ہمارے زمانے میں حیاتیات، نفسیات اور سائنسی علوم کو جو ترقی ہوئی ہے، اُس کا ذخیرہ بھی، موجودہ قصہ نگار کے پیچھے پُشتے کے طور پر موجود ہے۔ جدید قصوں میں، اکثر ایسے ہیں، جن میں نہایت مجمل طور پر نفسیاتی تجزیہ سے کام لیا گیا ہے۔ اس زمانے کے سماجی معیاروں اور صنفی خیالات میں جو بھاری انقلاب ہوگیا ہے، اُس کے اثرات بھی قصوں میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ موجودہ لکھنے والے، اپنے پیش رو اساتذہ کے مقابلے میں بھی، زیادہ غیر رسمی نظر آتے ہیں۔ ان کے موضوع پہلے سے زیادہ وسیع ہو گئے ہیں، اور ان کے لئے کوئی چیز ناگفتنی نہیں رہی ہے۔ وہ ادب کا کمال، صناعی سمجھتے ہیں، موضوع خواہ کچھ بھی ہو۔ یہ وہ عام رجحانات ہیں جو یورپی قصوں کی طرح اُردو قصوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر سروری ام۔ اے۔ ال ال بی

منڈی میر عالم

یہ جناب ناصر علی صاحب ام اے (عثمانیہ) لکچرار معاشیات کا تحقیقی مقالہ ہے جو بزم معاشیات کے ایک جلسہ ۱۳۴۲ھ میں پڑھا گیا تھا۔ ناصر علی صاحب جامعہ عثمانیہ کے ان چند مایۂ ناز سپوتوں میں سے ہیں جو کام کو کام کی خاطر کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اعلیٰ تحقیقاتی مضامین اب تک منظر عام پر نہیں آسکے۔ صاحب موصوف کو معاشی تجزیہ و معاشی تحقیق کا خاص ملکہ ہے جو ان ہی کے حصّہ کی چیز ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے معاشی محققین میں آپ کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔ ہم اس مقالہ کو شکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔

"مدیر"

مختصر تاریخ منڈی میر عالم شہر حیدرآباد کی بہت ہی قدیم منڈی ہے یہاں سبزیات اور ترکاریوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اس منڈی کو سید ابوالقاسم (جن کو میر عالم کا خطاب دیا گیا تھا) وزیر حیدرآباد نے سنہ ۱۲۲۰ھ میں تعمیر کروایا اور اس کا نام "سکندر گنج" رکھا۔ مگر اس نام کو کچھ زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ رفتہ رفتہ یہ گنج "منڈی میر عالم" کے نام سے موسوم ہو گیا چنانچہ آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔[۱]

---

[۱] ماخوذ از "سوانح عمری میر عالم" مولفہ محمد سراج الدین صاحب طالب۔

محل وقوع اور وسعت یہ منڈی نواب فخر الملک بہادر کی گھڑیال کے قریب واقع ہے۔ یہ ایک مستطیل میدان ہے جس کا طول (۲۹۰) اور عرض (۲۲۹) فیٹ ہے۔ میدان کے اطراف دو منزلہ عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ ان عمارات کی پہلی منزل ملگیات پر مشتمل ہے جن کی تعداد (۶۱) ہے۔ منڈی کے اندر ملگیات کے علاوہ ایک ناکہ، ایک مسجد اور ایک چاوڑی بھی ہے۔ منڈی میں جملہ چھ دروازے ہیں جن میں صرف تین دروازوں سے آمد و رفت کا کام لیا جاتا ہے۔ مشرق کے درمیانی دروازے سے بیس بیس فیٹ کی دو سڑکیں شمال مغرب اور جنوب مغربی دروازوں کو جاتی ہیں جن کی وجہ سے منڈی کے مستطیل حصہ میں ایک مثلث نما قطعہ بن گیا ہے۔ اس قطعہ کے تقریباً درمیان میں ایک ہشت پہلو سائبان ہے جس کا نصف قطر (۲۴) فیٹ ہے۔

موجودہ اہمیت سبزیات کی حد تک یہ شہر حیدرآباد کی سب سے بڑی منڈی کہی جا سکتی ہے۔ تمام شہر میں سبزیات اور ترکاریوں کی سربراہی بڑی حد تک اسی منڈی سے ہوتی ہے۔ "سبزی منڈی" (واقع مستعد پورہ) میں بھی بھاجی ترکاریوں کی خرید و فروخت ہوتی ہے لیکن بلحاظ وسعتِ کاروبار اس منڈی کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے۔

۲۳ر آذر ۱۳۴۷ف کے اعداد و شمار کے مطابق یہاں کے کاروباری افراد کی تعداد (۵۵۲۷) رہی ہے[1] اگر راہروؤں کو بھی شامل کر لیا جائے، جن میں سے اکثر منڈی سے گذرتے وقت کچھ نہ کچھ خرید لے جاتے ہیں، تو یہ تعداد (۵۵۲۷) سے بڑھ کر (۸۴۶۵) ہو جاتی ہے۔ منڈی کی کاروباری اہمیت نہ صرف اُن افراد کی تعداد سے ظاہر ہوتی ہے جو یہاں خرید و فروخت کے لئے جمع ہوتے ہیں بلکہ اس کا اندازہ اُس مال سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو یہاں روزانہ درآمد ہوتا ہے۔ ۲۳ر آذر ۴۷ف کو منڈی میں جس قدر بنڈیاں داخل ہوئیں اُن کی تعداد (۱۳۸) تھی۔ ان میں (۱۱۸) ایک بیل کی بنڈیاں تھیں اور (۲۰) دو بیل کی۔ منجملہ (۱۳۸) بنڈیوں کے (۱۲۱) بنڈیاں لدی ہوئی تھیں اور (۱۷) بنڈیاں خالی۔ سبزیات و ترکاریوں کی درآمد نہ صرف بنڈیوں پر ہوتی ہے بلکہ انھیں ٹوکروں میں رکھ کر یا گٹھڑیوں میں باندھ کر سروں پر بھی لایا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تاریخ کو جو ٹوکرے یا گٹھڑیاں سروں پر لائی گئیں اُن کی جملہ تعداد

[1] یہ اعداد و شمار بذات خود جمع کئے گئے ہیں۔

(۶۱۹) تھی۔ ذیل کے جدول میں مذکورہ امور کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ اور بتلایا گیا ہے کہ بارہ سے چار بجے تک ہر دروازے سے جملہ کس قدر بنڈیاں داخل ہوئیں، ایک اور دو بیل کی بنڈیاں کتنی تھیں۔ ان میں لدی ہوئی بنڈیاں کس قدر تھیں اور خالی کتنی۔ اسی طرح ہر دروازے سے داخل ہونے والے ٹوکروں کی تعداد بھی تبلائی گئی ہے۔ مزید برآں ہر دروازے سے منڈی میں داخل ہونے والے افراد کی تعداد بھی دی گئی ہے اور آخر میں یہ بھی تبلایا گیا ہے کہ ہر دروازے سے فی گھنٹہ کس قدر آدمی منڈی میں داخل ہوتے ہیں۔

	منڈی میں داخل ہونے کے مختلف دروازے	بنڈی				ٹوکرے اور گٹھڑیاں جو ہر دروازے سے منڈی میں لائے گئے	تعداد نفوس جو ہر دروازے سے منڈی میں داخل ہوئے	تعداد نفوس جو اوسطاً فی گھنٹہ منڈی میں داخل ہوئے
		ایک بیل		دو بیل				
		بھری	خالی	بھری	خالی			
۱	دروازہ جانب مشرق	۳۰	۴	۶	۰	۲۶۰	۳۳۸۸	۸۴۷
۲	دروازہ جانب شمال مغرب	۵۰	۱۱	۸	۲	۱۸۵	۲۹۴۴	۷۳۶
۳	دروازہ جانب جنوب مغرب	۲۳	۰	۴	۰	۱۷۴	۲۱۳۳	۵۳۳
۳	جملہ	۱۰۳	۱۵	۱۸	۲	۶۱۹	۸۴۶۵	۲۱۱۶

دوکانات منڈی کے دوکانات کو ہم دو طرح پر تقسیم کر سکتے ہیں (۱) دوکاناتِ مقدم (۲) دوکاناتِ تضمینی۔

دوکانات مقدم میں بھاجی ترکاری کی دوکانیں شامل ہیں جن کی وجہ سے روزانہ ہزاروں آدمی منڈی میں جمع ہوتے ہیں۔ تضمینی یا ضمنی دوکانات سے ایسی دوکانیں مراد ہیں جو محض دوکاناتِ مقدم کے باعث قائم ہوئی ہیں مثلاً تخم یا ٹوکروں کی دوکانیں۔ اس منڈی میں یہ دوکانیں محض اس لئے قائم ہوئی ہیں کہ یہاں پر روزانہ کثیر التعداد کسان سبزی اور ترکاری کی فروخت لئے جمع ہوتے ہیں اور انہیں تخم

اور ٹوکروں کی خریدی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ یہی حال پان سپاری' اور لہسن' پیاز نمک اور مرچ (سوکھی) کی دوکانات کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادرک لہسن اور پیاز بھی ایک قسم کی ترکاری ہے لیکن ان کی دوکانات کو تضمینی دوکانات میں اس لئے شامل کیا گیا ہے کہ منڈی میر عالم ان کی فروخت کا مرکزی مقام نہیں۔ ان اشیاء کی فروخت کے مرکزی مقامات مہاراج گنج' عثمان گنج اور بشیر گنج ہیں۔ اسی طرح پان سپاری کی دوکانات کو بھی اس منڈی میں ذیلی حیثیت حاصل ہے۔ بہرطور دوکانات تضمینی دوکانات مقدم کا نتیجہ ہیں نہ کہ باعث[1]۔ منجملہ (۳۱۱) دوکانات کے (جس میں دوکانات متفرق شامل ہیں) دوکانات مقدم کی تعداد (۲۶۶) ہے اور دوکانات تضمینی کی صرف (۴۵)، گویا دوکانات مقدم (۷۸) فی صد ہیں تو دوکانات تضمینی (۲۲) فی صد[2]۔ ذیل کی جدول میں منڈی کے جملہ کاروبار کا مفصل تجزیہ کیا گیا ہے۔

دوکاندار																								
(۱) مقدم												(۲) تضمینی												
بھاجی فروش				ترکاری فروش (تھوک)				ترکاری فروش (چلر)				پان فروش				پیاز نمک مرچ فروش				ادرک لہسن فروش				متفرق دوکاندار
۱۴۰				۴۲				۸۴				۱۶				۱۳				۱۶				۳۰
مرد		عورت		مرد		عورت		مرد		عورت		مرد		عورت		مرد		عورت		مرد		عورت		×
۱۰		۱۳۰		۳۶		۶		۲۴		۶۰		۴		۱۲		۱۱		۲		×		۱۶		×
ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	ہندو	مسلمان	×
۱۰	×	۱۳۰	×	۲۵	۱۱	۲	۴	۲۰	۴	۶۰	×	۴	×	۱۲	×	۷	۴	۲	×	×	×	۱۶	×	×

مندرجہ بالا جدول سے نہ صرف اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ اس منڈی میں مختلف دوکانات کی کیا تعداد ہے بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر ایک کاروبار میں کس قدر مرد اور عورتیں مصروف ہیں اور بلحاظ مذہب کن افراد کا زیادہ حصہ ہے۔ حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ منجملہ (۳۱۱) دوکانداروں کے (اس میں متفرق دوکاندار شامل ہیں) (۲۹۰) دوکاندار ہندو اور (۱۱) گیارہ دوکاندار مسلمان ہیں۔ بہ الفاظ دیگر

[1] دوکانات تضمینی کو چونکہ ذیلی حیثیت حاصل ہے اس لئے اُن کے کاروبار کی تشریح کو بنظر طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔
[2] یہ اعداد و شمار ۲۴ تا ۲۸ آذر ۱۳۴۷ ف کو جمع کئے گئے

تقریباً چار فی صد مسلمان دوکاندار ہیں اور ۹۶ فی صد سے زائد ہندو دوکاندار ہیں۔ اس جدول سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بھاجی ترکاری کی فروخت میں بحیثیت مجموعی مردوں کے مقابل عورتوں کا زیادہ حصّہ ہے۔ کیونکہ دوکاندار عورتیں (۷۲) فی صد ہیں تو دوکاندار مرد صرف (۲۸) فی صد۔

بھاجی ترکاریوں کی درآمد اب ہم یہ معلوم کریں گے کہ حیدرآباد میں عموماً کس قسم کی سبزیات اور ترکاریاں کاشت کی جاتی ہیں۔ یہ سبزیات اور ترکاریاں کن مقامات سے درآمد ہوتی ہیں اور انہیں کیونکر لایا جاتا ہے۔

ہندوستان کے دیگر حصص کی طرح حیدرآباد میں بھی مختلف قسم کی سبزیوں اور ترکاریوں کی کاشت کی جاتی ہے مثلاً چُکا، پالک، سویا، میتھی، ولایتی میتھی، امباڑہ، ماٹ، خرفہ، اموتی، چکورہ، کوتھمیر، پودینہ، سیم، گنوار کی پھلی، بینس، اور مونگ پھلی، ترئی، کدو، آلو، اروی، بھینڈی، شکرکدو، پیٹھا، شلغم، گوبی، چقندر، ٹماٹے، کریلے، ککڑی، بڑے اور کائی کے بیگن وغیرہ اسمیں شک نہیں کہ ان میں سے بعض ترکاریاں موسم سرما اور بعض موسم باراں میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ لیکن موسم گرما میں سبزیات اور ترکاریاں عموماً کم ہوتی ہیں۔ خصوصاً میتھی، چُکا، سویا اور کوتمیر بہت ہی کم ہوتے ہیں۔

بھاجی اور ترکاریاں چونکہ سریع الزوال ہوتی ہیں اس لئے ان کی کاشت حوالی شہر میں ہوتی ہے تاکہ کھیتوں سے منڈی تک مال لانے میں سہولت ہو۔ فروخت پیداوار کے لئے کسانوں کو چونکہ روزانہ یا ہر دوسرے تیسرے دن منڈی آنا پڑتا ہے لہٰذا وہ جس قدر بھی ممکن ہوسکے شہر سے قریب کاشت کرنا چاہتے ہیں۔ بھاجی ترکاریوں کی درآمد عموماً ان مقامات سے ہوتی ہے۔ مشیرآباد، باکارم، چلکل گوڑہ، بارکس بالاپور، کتہ پیٹھ، اموگوڑہ، لال دروازہ، بندلاگوڑہ، عنبرپیٹھ، ملک پیٹھ، کاچی گوڑہ، اپل پیٹھ، رامتاپور، سرورنگر، گڈی انارم، تالاب میرجملہ، یاقوت پورہ، دبیرپورہ، چنچل گوڑہ، پوٹلہ چرو، حمایت ساگر، گنڈی پیٹھ، ساہوکاری کاروان، لنگرحوض، جھام سنگھ دیول، تالاب میرعالم، تاڑبن اور ملکاپور وغیرہ موجودہ زمانہ میں ذرائع حمل و نقل کی سہولت کی وجہ سے بعض دور مقامات، مثلاً وقارآباد وغیرہ

کے کسان یا پیکاری بسوں اور لاریوں پر بھی مال لانے لگے ہیں۔ لیکن سبزیوں اور ترکاریوں کی درآمد زیادہ تر یا تو راست بیل کی بنڈیوں کے ذریعہ ہوتی ہے یا پھر ان کے ٹوکرے اور گٹھڑیاں سروں پر رکھکر لائے جاتے ہیں۔ ۲۴ر آذر ۱۳۴۷ ف کو (۱۲۱) بنڈیوں میں مال لایا گیا۔ ان بنڈیوں میں صرف (۱۸) بنڈیاں دو بیل کی تھیں۔ ترکاریوں کو زیادہ تر ٹوکروں میں رکھکر بنڈیوں میں لایا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تاریخ کو (۱۰۳) ایک بیل کی بنڈیوں میں (۳۴۴) ٹوکرے مال لایا گیا۔ بنڈیاں عموماً کسانوں کی ملک ہوتی ہیں۔

سبزیات بیشتر گٹھڑیوں اور کمتر ٹوکروں میں لائی جاتی ہیں۔ جو افراد سروں پر مال اٹھا کر لاتے ہیں ان میں کثیر تعداد عورتوں کی ہوتی ہے۔ چنانچہ ۲۴ر آذر ۱۳۴۷ ف کو ٹوکرے اور گٹھڑیاں اُٹھا لانے والوں کی تعداد (۶۱۹) تھی۔ اسمیں (۲۳۸) مرد تھے اور (۳۸۱) عورتیں تھیں۔

فروخت کے طریقے بارہ اور ایک بجے کے درمیان جملہ فروخت شدنی مال درآمد ہو چکتا ہے۔ اور ٹھیک ایک یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ بجے سے خرید و فروخت شروع ہو جاتی ہے۔

سبزیات عموماً "پیکاری" فروخت کرتے ہیں[1] پیکاری سے مراد وہ فرد ہے جو کسان کے کھیت یا مکان پر مال خریدتا ہے اور اس کو منڈی لانے کے بعد کچھ منافع سے فروخت کر دیتا ہے۔ سبزیات کے پیکاریوں کی تقریباً ۹۳ فی صد تعداد عورتوں پر مشتمل ہے۔ کیونکہ ۲۴ر آذر ۱۳۴۷ ف کے اعداد و شمار کے مطابق بھاجی فروشوں کی جملہ تعداد (۱۴۰) تھی جس میں صرف (۱۰) مرد تھے اور باقی عورتیں۔ پیکاری، کسانوں کے کھیتوں پر پہنچ کر تیار فصل خریدتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ جملہ فصل ایک مدت معینہ میں کاٹ لی جائیگی۔ فروخت شدہ فصل کی قیمت وصول کرنے کا عام طریقہ یہ ہے کہ بوقت خریدی جملہ قیمت کا نصف روپیہ ادا کیا جاتا ہے۔ جب پیکاری آدھی فصل کاٹ کر منڈی میں فروخت کر چکتے ہیں تو باقی نصف رقم بھی ادا کر دی جاتی ہے۔ اگر کسان اور پیکاری کے مابین اچھے مراسم ہوں تو وصول قیمت میں مختلف مراعات روا رکھی جاتی ہیں۔

"پیکاری" نہایت چست و چالاک ہوتے ہیں۔ علی الصباح مکانات سے اُٹھ کر کھیت چلے جاتے ہیں۔ سبزیات کاٹنے کے بعد انہیں دھو دھلا کر بارہ بجے تک منڈی اُٹھا لاتے ہیں۔ منڈی میں

---

[1] سبزیات کی خرید و فروخت میں پیدا کنندوں اور صارفین کے درمیان عموماً صرف دو اشخاص ہوتے ہیں۔ ایک پیکاری۔ دوسرے چلر فروش دوکاندار جو محلوں میں سبزیات فروخت کرتے ہیں۔

لانے کے بعد سبزیات کے کٹے باندھے جاتے ہیں۔ سوائے امباڑے کے (جو بوقت قلت کٹوں کے حساب سے بکتا ہے) جملہ سبزیات کٹوں کے حساب سے فروخت ہوتی ہیں۔ بیوپاریوں کو منڈی میں سبزیات فروخت کرنے کے لئے روزانہ حسب ذیل مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

نمبر	مدات ادائی	مقدار ادائی		مدات ادائی	مقدار ادائی		مدات ادائی	مقدار ادائی
۱	تہ بازاری	۳ سے ۶ پائی تک	۳	معاوضہ نیاز شریف	ایک پائی	۵	معاوضہ نگرانکار عورت	دو کٹے سبزی
۲	پانی چھڑکنے کی مزدوری	ایک پائی	۴	معاوضہ مہتر	دو کٹے سبزی	۶	״	״

جہاں تک سبزیات کی قیمتوں کا تعلق ہے وہ سراسر طلب کے حالات پر منحصر ہے۔ منڈی میں سبزیات کی جس قدر رسد ہو اگر طلب اس سے بڑھ جائے تو قیمتیں اچھی وصول ہوتی ہیں اور اگر اس کے مقابل طلب کم ہو تو قیمتیں گر جاتی ہیں۔ سبزیات کی قیمتوں کا کوئی تعین نہیں۔ ابھی کچھ ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر سے کچھ۔ ترکاریوں کی بالعموم اور سبزیات کی بالخصوص یہ صفت ہے کہ وہ ابتدائے کاروبار کے وقت گراں بکتی ہیں اور اختتام کے وقت تقریباً فی صدی اس سے زائد ارزاں ہو جاتی ہیں۔ مندرجہ ذیل جدول سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے۔

یوم و تاریخ	قسم سبزی	قیمت بوقت آغاز کاروبار	قیمت بوقت اختتام کاروبار	یوم و تاریخ	قسم سبزی	قیمت بوقت آغاز کاروبار	قیمت بوقت اختتام کاروبار
سہ شنبہ ۲۴ آذر ۴۷ف	چکا	پیسے میں ۸ کٹے	پیسے میں ۱۲ کٹے	شنبہ ۲۵ آذر ۴۷ف	چکا	پیسے میں ۱۰ کٹے	پیسے میں ۱۴ کٹے
	پالک	״ ״ ۱۲ ״	״ ״ ۲۰ ״		پالک	״ ״ ۱۲ ״	״ ״ ۱۸ ״
	سویا	״ ״ ۸ ״	״ ״ ۱۲ ״		سویا	״ ״ ۶ ״	״ ״ ۱۰ ״
	میتھی	״ ״ ۲۰ ״	״ ״ ۲۵ ״		میتھی	״ ״ ۲۰ ״	״ ״ ۳۰ ״

یہاں تک تو ہم نے معلوم کیا کہ سبزیات کی خرید و فروخت کیونکر عمل میں آتی ہے۔ لیکن اب یہ معلوم کریں گے کہ ترکاریوں کی خرید و فروخت کے کیا طریقے ہیں۔ ترکاریوں کو عموماً کسان ہی منڈی لے آتے ہیں[2] لیکن فروخت کرنے کے لئے انہیں مونڈے داروں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ مونڈے داروں سے مراد ایسے افراد ہیں جن کے ذریعہ کسانوں کا مال بیشتر چلر فروش دوکانداروں اور کمتر صارفین کے ہاتھ فروخت ہوتا ہے۔ منڈی میں جملہ ۴۲ مونڈے دار ہیں ان میں ۳۶ مرد اور ۶ عورتیں ہیں۔ اسی طرح ۲۸ ہندو اور ۱۴ مسلمان ہیں۔ مونڈے داروں کو منڈی میں مونڈا قائم کرنے کے لئے دفتر اسٹیٹ نواب سالار جنگ بہادر سے اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ مونڈے کے قیام کے بعد روزانہ فی "ڈنڈی" (ترازو) دو پیسے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ مونڈے داروں کا پہلا کام یہ ہے کہ جب کسان مال منڈی لے آئے تو اسکو بنڈی سے اُتار کر دوکان تک اٹھوالائیں اور جہاں تک ہوسکے عمدہ قیمت پر فروخت کرنے کی کوشش کریں تاکہ بے اعتمادی کی وجہ سے آسامی مال اُتارنا ترک نہ کردے۔ ان کا دوسرا کام یہ ہے کہ اروی، آلو، ترئی، اور اسی قسم کی دوسری چیزیں، اگر کسی وجہ سے فروخت نہ ہوسکیں یا قیمت بہت گری ہوئی ہونے کی وجہ سے کسان مال کو دوسرے دن فروخت کروانا چاہے تو اس کو بلا معاوضہ اپنی ملگی میں محفوظ رکھیں۔ ان فرائض کی بناء پر کسان مونڈے دار کو عام حالات کے تحت، فی روپیہ چار پیسے یا ۶¼ فی صد کی شرح سے معاوضہ دیتے ہیں۔ اس محنتانے کو "اڑتی" کہا جاتا ہے اور مونڈے دار اڑتیے یا اڑتی دار کہلاتے ہیں۔ اڑتی کے علاوہ کسان کو، فروخت پیداوار کے سلسلے میں حسب ذیل مدات پر بھی صرف کرنا پڑتا ہے۔

---

[1] سبزیات سے مراد مختلف قسم کی بھاجیاں ـــ چکا، پالک، سویا وغیرہ ـــ ہیں اور ترکاریوں میں آلو، اروی، بھنڈی اور کدو جیسی چیزیں شامل ہیں۔

[2] ترکاریوں کی خرید و فروخت میں بھی پیدا کنندوں اور صارفین کے درمیان عموماً دو افراد ہوتے ہیں۔ ایک مونڈے دار دوسرے چلر فروش دوکاندار جو محلوں میں فروخت کرتے ہیں۔

مدات مصارف فروخت							
(الف) لازمی				(ب) اختیاری			
نمبر		نمبر		نمبر	جو روزانہ صرف ہوتے ہیں	نمبر	جو ہر دوسرے تیسرے دن صرف ہوتے ہیں
۱	چٹھی راہ داری	۴	لٹکرا اتارنے کی مزدوری				
۲	تہ بازاری	۵	پانی چھڑکنے کا معاوضہ	۱	خیرات	۳	معاوضہ مہتر
۳	بوریہ بچھانے کی مزدوری	۶	گنجایش زائد تول اورادائی ٹھرم	۲	چٹا یا چلم کا معاوضہ	۴	معاوضہ فراش
						۵	معاوضہ نیاز شریف

(۱) (الف) مصارف لازمی

(۱) چٹھی راہ داری :- محکمہ سرکار کی جانب سے زرعی بنڈیوں کو حصول نمبر کی قید سے آزاد کیا گیا ہے ۔ جب کسان منڈی میں مال لے آتے ہیں تو بوقت واپسی انہیں " راہ داری" کی چٹھی دی جاتی ہے، تاکہ شناخت ہوسکے کہ ان کی بنڈیاں منڈی کی واپس شدہ ہیں ۔ اس چٹھی کے عوض اسٹیٹ نواب سالار جنگ بہادر کی جانب سے ایک بیل کی بنڈی سے ۶ پائی اور دو بیل کی بنڈی سے ایک آنہ لیا جاتا ہے ۔ اسی چٹھی کو راہ داری کی چٹھی کہا جاتا ہے ۔

(۲) تہ بازاری :- کسان چونکہ منڈی میں مال فروخت کرتے ہیں اس لئے ان سے تہ بازاری وصول کی جاتی ہے ۔ اگر ایک اور دو بیل کی بنڈی میں بھر کر مال لایا جائے تو دو آنہ اور ۴ ردپئے پڑتے ہیں ۔ برعکس اس کے سروں پر اٹھا کر لٹکروں اور گٹھڑیوں میں لایا جاے تو فی لٹکرا یا گٹھڑی دو پیسے سے آٹھ پیسے تک تہ بازاری ادا کرنی پڑتی ہے ۔

(۳) بوریہ بچھانے کی مزدوری :- مونڈے داروں کی طرف سے چند مزدور مقرر ہوتے ہیں جنکا کام یہ ہے کہ آغاز کاروبار سے قبل مقام فروخت پر بورئے بچھائیں اور اختتام کاروبار پر انھیں اٹھا کر رکھیں ۔ اس خدمت کے عوض کسان کو روزانہ تھوڑی ترکاری دینی پڑتی ہے جسکی قیمت کم سے کم ڈو پیسے یا زیادہ سے زیادہ تین پیسے ہوتی ہے ۔

(۴) ٹوکرا اتارنے کی مزدوری :- مونڈے داروں کے ہاں چند ایسے بھی مزدور ہوتے ہیں جنکا کام یہ ہے کہ جب کسان مال کو منڈی لے آئیں تو اسکو بنڈی سے اتار کر مقامِ فروخت تک اٹھالائیں۔ اس کام کے لئے بھی کسان کو تھوڑی بہت ترکاری دینی پڑتی ہے۔ جس کی قیمت دو یا تین پیسے ہوتی ہے۔

(۵) پانی چھڑکنے کا معاوضہ :- منڈی میں تین چار بہشتی ہیں جو ہر طرف چکر لگا کر سبزی یا ترکاری پر پانی چھڑکتے ہیں۔ اس کام کے لئے دو پائی کی ترکاری دی جاتی ہے۔

(۶) گنجایش زائد تول اور ادائی "سڑم" :- آسامیوں کا بیان ہے کہ عام طور پر فی پسری[1] آدھ سیر ترکاری زائد تولی جاتی ہے۔ تول ختم ہو جانے کے بعد فی پسری (کم وبیش) پاؤ سیر ترکاری بطور "سڑم" یا "کوسر" ڈالی جاتی ہے۔

(ب) مصارف اختیاری

(۱) خیرات :- اس مد کے تحت بھی کسان کو کم از کم دو پیسے کی ترکاری صرف کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ دو کانات پر فقیروں کا تار لگا رہتا ہے۔ خیرات کی ترکاری جمع کر کے فروخت کرلی جاتی ہے۔

(۲) چلم یا چپٹہ پلانے کا معاوضہ :- منڈی میں دو اشخاص ہیں جن میں سے ایک آسامیوں اور مونڈے داروں کو (جو کاروبار میں بہت مصروف ہوتے ہیں) چلم پلاتا ہے اور دوسرا بیڑی اور سگریٹ بیڑی عموماً آسامی کو دی جاتی ہے اور سگریٹ مونڈے دار کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ اس ضیافت کے معاوضے میں کسان کو تھوڑی بہت ترکاری ادا کرنی پڑتی ہے جسکی قیمت کم از کم ایک پائی ہوتی ہے۔ اس طرح مذکورہ ہر دو اشخاص کو ترکاری کی فروخت سے روزآنہ چار ایک آنے کی خالص آمدنی ہو جاتی ہے۔

(۳) معاوضہ مہتر :- منڈی کا مہتر بھی روزانہ تھوڑی بہت ترکاری ہر "مونڈے" سے مانگ لیتا ہے۔ یہ مہتر نہ صرف ترکاری وصول کرتا ہے بلکہ بھاجی والیوں سے بھی فی دوکان روزانہ دو کٹے بھاجی وصول کرتا ہے۔ اس طرح بحیثیت مجموعی اسکو روزآنہ پانچ آنے کی سبزی اور ترکاری مل جاتی ہے۔ جسکو وہ فروخت کرلیتا ہے۔

(۴) معاوضہ فراش :- منڈی کی جھاڑو دینے والیاں بھی ہر "مونڈے" سے کچھ ترکاری

[1] ایک پسری چھ سیر کی ہوتی ہے۔

مانگ لیتی ہیں ۔ فی " مونڈا " ایک یا دو پائی کی ترکاری کے حساب سے انھیں بھی ہر روز چار ایک آنے کی ترکاری مل جاتی ہے ۔

(۵) نیاز شریف کا معاوضہ :- مذکورہ مدات کے علاوہ کسانوں کو نیاز شریف کے نام سے بھی دو ایک مٹھی ترکاری دینی پڑتی ہے ۔ نیاز شریف کی مد میں ہر روز ادا کرنا نہیں پڑتا بلکہ ہر کسان باری باری ادا کرتا ہے ۔ اگر ایک مونڈے کے چھ آسامی ہوں تو جس آسامی نے سب سے پہلے اس مد کے تحت ادا کیا ہو تو اس کو دوبارہ چھ دن کے بعد دینا ہوگا ۔ درمیان میں باقی پانچ آدمی ادا کرتے رہیں گے ۔ نیاز شریف کے لئے نہ صرف ترکاری والوں سے وصول کیا جاتا ہے بلکہ خود مونڈے داروں کو بھی روزانہ ایک پیسہ دینا پڑتا ہے ۔ مزید براں چلر فروش ترکاری والوں اور بھاجی والوں سے بھی روزانہ ایک پائی اس مد کے تحت وصول کی جاتی ہے ۔

مختصر یہ کہ نہ صرف مذکورہ بالا مدات کی ادائی میں آسامیوں کو زیر بار ہونا پڑتا ہے بلکہ اکثر و بیشتر صورتوں میں مونڈے داروں کے تولنے کا طریقہ بھی کسانوں کے مفاد پر مبنی نہیں ہوتا ۔ مونڈے دار ترازو کو ٹھیک ٹھیک اٹھاتے نہیں بلکہ اس کی ڈنڈی کو ہتیلی کے آخری حصہ پر رکھ دیتے ہیں ۔ آسامیوں کا بیان ہے کہ مونڈے دار فی پسیری (ایک پسیری چھ سیر کی ہوتی ہے ۔ ٹھوک فروشی کا تول اسی حساب سے ہوتا ہے) آدھ سیر ترکاری زیادہ تول لیتے ہیں ۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ تولنے کے بعد فی پسیری پاؤ سیر ترکاری سڑم یا " کوسر " کے نام سے مفت دی جاتی ہے ۔ اکثر خریدار " سڑم " لینے کے بعد بھی اپنے ہاتھ سے تھوڑی بہت ترکاری اُٹھا لیتے ہیں ۔ آسامی اور مونڈے دار ہائیں ہائیں ہی کرتے رہتے ہیں اور وہ ٹوکرا لیکر ہوا ہو جاتے ہیں ۔ یہ خبر بھی نہایت وثوق کے ساتھ سُنی گئی ہے کہ بعض مونڈے دار خریداروں سے قبل از قبل کچھ وصول کر لیتے ہیں ۔ یہ خریدار سودا لینے کے لئے جب دوکان پر آتے ہیں تو زیادہ مال تول دیا جاتا ہے ۔ اسطرح خریدار کو نہ صرف وہ پیسے وصول ہو جاتے ہیں جو اُس نے مونڈے دار کو قبل از قبل دئے تھے بلکہ مونڈے دار کی مہربانی سے قابل لحاظ مال زائد مل جاتا ہے ۔

جن اوزان سے ترکاری تولی جاتی ہے وہ بھی ناقص معلوم ہوتے ہیں ۔ اس لئے کہ (۲۴م)

مونڈے داروں میں سے ایک بھی مونڈے دار کے ہاں سرکاری اوزان نہیں ہیں ۔ ان کے اوزان کیا ہیں ؟ غیری پتھر کے مستطیل ٹکڑے ۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ مقررہ سرکاری اوزان قیمتی ہونیکی وجہ سے چرالئے جاتے ہیں اس لئے ان کا استعمال نہیں کیا جاتا اور مستعملہ اوزان پتھر کے ہوتے ہیں اس لئے ان کے چرائے جانے کا اندیشہ نہیں ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اوزان سرکاری اوزان کے مساوی ہوتے ہیں ۔ یہ بات محقق کے بس کی نہیں کہ نہ مونڈے داروں کے بٹوں کو تول کر جانچے ورنہ ضرور تبلایا جاتا کہ مستعملہ بٹوں میں کتنے صحیح ہیں اور کتنے غلط ہیں ۔

الغرض اس منڈی میں ناقص طریقہ ہائے فروخت کی وجہ سے آسامیوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے ۔ اس نقصان کا اندازہ لگانے کے لئے ہم یہ فرض کرلیں گے کہ ایک آسامی (۱۶) پسیری یا (۹۶) سیر اروی فروخت کرنے کے لئے ایک بیل کی بنڈی میں رکھ کرلاتا ہے ۔ آج کل (۲۴ آذر سنہ) اروی کا عام نرخ یارہ گنڈے (۸ر) پسیری ہے ۔ اس حساب سے (۱۶) پسیری کی قیمت (للعہ) روپیہ ہوتی ہے ۔ لیکن حسب ذیل مصارف فروخت منہا ہونے کے بعد کسان کو (۱۲ر۴ر) ملتے ہیں ۔

نمبر	مدات مصارف	صرفہ بشکل ترکاری	قیمت ترکاری	نمبر	مدات مصارف	صرفہ بشکل ترکاری	قیمت ترکاری
۱	چٹھی راہ داری	×	۶ر	۵	پانی چھڑکنے کا معاوضہ	ایک مٹھی ترکاری	ایک پیسہ
۲	تہ بازاری	×	ار	۶	بوریہ بچھانے کی مزدوری	دو مٹھی ترکاری	دو پیسہ
۳	۱۶ پسیری کا ناپ تول	(۸ سیر بحسابی پسیری آدھ سیر	۱۰ر۸ر	۷	ٹوکرے اتارنیکی مزدوری	" "	" "
۴	" سٹرم " بر ۱۶ پسیری	(۴ سیر بحسابی پسیری پاؤ سیر	۵ر۴ر	۸	خیرات	" "	

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہو رہا ہے کہ (۱۶) پسیری اروی کی فروخت کے لئے کسان کو عصہ ۲ر۸ر صرف کرنے پڑتے ہیں ۔ (للعہ) روپیہ میں سے عصہ ۲ر۸ر منہا کردینے کے بعد جو بچ رہے (لے ۱۲ر۴ر) اُس پر ۸ر پائی فی روپیہ کے حساب سے ۴ر۶ر اڑتی وصول کی جاتی ہے ۔ اسطرح ہم دیکھ رہے ہیں کہ

کوئی آسامی (۱۰ سے) روپیہ کا مال لائے تو جملہ مصارف فروخت منہا ہونے کے بعد اسکو کم وبیش (۸ سے ۸ ۱۱ آنہ) ملتے ہیں۔ یعنی یہ کہ (۱۰ سے) کا مال فروخت کرنے کے لئے بحیثیت مجموعی ۱۰۸ ، ۲ آنہ صرف ہوتے ہیں جو جملہ رقم کا تقریباً ۲۴ فی صد ہیں۔ فروخت پیداوار کے یہ مصارف کسی طرح قابل قبول نہیں۔ اگران مصارف میں نیاز شریف، فراش، مہتر اور چپٹہ پلانے کا معاوضہ بھی شامل کرلیا جاے تو ۸ پائی کا اور اضافہ ہوجاتا ہے۔ حمل ونقل کے مصارف (بنڈی چونکہ آسامیوں کی ذاتی ہوتی ہے اس لئے براہ راست حمل ونقل کے کوئی مصارف نہیں ہوتے) کو بھی شریک کرلیا جائے تو مصارفِ فروخت میں اور زیادتی ہوجاتی ہے۔

مالی امداد کے طریقے آسامیوں کو اگر ایک طرف ناقص طریقہ ہائے فروخت کی وجہ سے بیجا مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں تو دوسری طرف ناقص طریقہ ہاے لین دین کی وجہ سے بھی انھیں کافی زیربار ہونا پڑتا ہے یہاں جس قدر آسامی فروخت کے لئے ترکاریاں لے آتے ہیں اُن میں سے اکثر آئے دن مونڈے داروں سے مختلف ضروریات (مثلاً خریدی تخم یا بیل، ادائی لگان یا ادائیگی رسومات) کے لئے قرض لیتے رہتے ہیں۔ جب وہ مونڈے دار سے قرضہ حاصل کرتے ہیں تو قدیم روایات کے تحت عموماً اس کے پابند ہوجاتے ہیں کہ اپنا مال اُسی مونڈے دار کے توسط سے فروخت کروائیں۔ البتہ قرضہ کی ادائیگی کے بعد انہیں اس کا اختیار ہے کہ جس مونڈے دار کے توسط سے چاہیں اپنا مال فروخت کروائیں۔

بہت کم مونڈے دار بذات خود سرمایہ دار ہوتے ہیں بلکہ ان میں سے اکثر وبیشتر شہری ساہوکاروں سے قرضہ حاصل کرکے اُسی رقم کو کسانوں کو قرض دیتے ہیں۔ دریافت سے معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ عموماً ایک روپیہ کی شرح سے قرض حاصل کرکے کسانوں کی ساکھ اور اعتبار کا لحاظ کرتے ہوئے بعض مرتبہ اُسی شرح پر اور اکثر مرتبہ نسبتاً گراں شرح پر قرضہ دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ صرف انہی آسامیوں کو ایک روپیہ فی صد کی شرح سے قرض دیا جاتا ہے جن کی ساکھ بہت اچھی رہے اور جو شاذونادر قرض حاصل کرتے ہیں۔ ایسے آسامیوں کو

نوٹ :۔ مندرجہ بالا مصارف میں مہتر، فراش اور نیاز شریف کے لئے جو ترکاری کردی جاتی ہے اس کا حساب اس لئے نہیں لگایا گیا کہ ان مدات کے تحت ہر کسان کو روزانہ نہیں ادا کرنا پڑتا۔ بلکہ انکی ادائی باری باری سے ہوتی ہے۔

ہم درجہ اول کے آسامیوں میں شامل کرسکتے ہیں۔ درجہ دوم کے آسامیوں سے ایک اور دو روپیہ کے درمیان فی صدی سود ماہانہ وصول کیا جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر درجہ اول کے آسامیوں کو بارہ اور درجہ دوم کے آسامیوں کو (۲۴) فی صد سالانہ کی شرح سے قرضہ دیا جاتا ہے۔ درجہ اول اور دوم کے آسامی تعداد میں بہت قلیل ہوتے ہیں۔ آسامیوں کی زیادہ تعداد ایسے افراد پر مشتمل ہے جو آئے دن مختلف ضروریات کے تحت قرضہ لیتے رہتے ہیں۔ ایک قرضہ جو آج سے چھ ماہ قبل حاصل کیا گیا تھا ابھی ادا ہونے نہیں پاتا کہ مزید رقم بطور قرض حاصل کی جاتی ہے۔ اس قسم کے آسامیوں کو قرض دینے میں مونڈے دار پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ اگر سو روپیہ کا مطالبہ کیا جائے تو صرف چالیس یا زیادہ سے زیادہ پچاس روپیہ دئے جاتے ہیں۔ ان افراد کی ساکھ چونکہ زیادہ اطمینان بخش نہیں ہوتی لہذا شرح سود بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ ان آسامیوں سے ایک یا دو فی صد سود لینے کی بجاے "پچیس گنڈے مٹھی" کے حساب سے رقم قرض دی جاتی ہے۔

"پچیس گنڈے مٹھی" کا طریقہ یہ ہے کہ اگر ایک کسان سو روپیہ قرض لے اور جوں جوں کھیت میں مال تیار ہوتا جائے فروخت کے لئے مونڈے دار کے ہاں لے آئے تو مونڈے دار علاوہ اڑتی کے فی دھڑی (یعنی فی تول) ایک مٹھی ترکاری جو پاؤ سیر سے کم نہیں ہوتی[۱] نکال لیتا ہے۔ جب مال فروخت ہو چکتا ہے تو آسامی سے چند روپیہ اصل کی ادائی میں وصول کئے جاتے ہیں۔ فرض کیجئے دس روپیہ کا مال فروخت کیا جائے تو اصل کی ادائی میں پانچ روپیہ لئے جاتے ہیں۔ ان پانچ روپیوں پہ پانچ گنڈے سود لیا جاتا ہے اگر آسامی پانچ روپیہ ادا کرنیکی بجائے صرف ایک روپیہ ادا کرے تو اُس سے چوبیس گنڈوں کی بجائے پچیس گنڈے لئے جائیں گے۔ یعنی ایک روپیہ ادائی میں اور چار پیسے بطور سود۔ یہی طریقہ "پچیس گنڈے مٹھی" کا ہے۔ مذکورہ توضیح سے واضح ہو رہا ہے کہ اس طریق کے تحت سود کی وصولی دو طرح پر ہوتی ہے۔ ایک بہ شکل زر دوسرے بشکل ترکاری۔ بشکل زر جو سود دیا جاتا ہے اسکی شرح فی روپیہ چار پیسے یا ۴ ۱/۲ فی صد ہوتی ہے۔ ترکاری کی شکل میں جو سود لیا جاتا ہے اُس کا اندازہ لگانے کے لئے ہم یہ فرض کریں گے کہ دیندار آسامی (۲۰) پسیری مرچ فروخت کرنیکے لئے لاتا ہے۔ اگر مونڈے دار اس مرچ کو (۴۸) مختلف[۱] دھڑیوں میں فروخت کرتا ہے ایسی صورت میں فی دھڑی پاؤ سیر مرچ کے حساب سے بحیثیت مجموعی ۴۸ پاؤ سیر یا دو پسیری مرچ بطور سود ملیگی جس کی قیمت

[۱] مونڈے دار کو پسیری دھڑی بہت کم تولنا پڑتا ہے۔ چلر فروش دوکاندار عموماً نصف دھڑی یا پاؤ دھڑی خریدتے ہیں۔ لہذا ہم فرض کرینگے کہ مونڈے دار (۲۰) پسیری میں ایک پسیری کی پانچ دھڑیاں آدھی پسیری کی ۱۰ دھڑیاں اور پاؤ پسیری کی ۳ دھڑیاں فروخت کرتا ہے۔ (بہ حیثیت مجموعی ۴۸ دھڑیاں)

موجودہ نرخ کے حساب سے عصہ روپیہ ہوتی ہے ۔ اگر آسامی پانچ روپیہ اصل کی ادائی میں دے تو اسکو پانچ روپیہ بمد اصل اور پانچ گنڈے یعنی ۳ ر ۴ ہ بمد سود ادا کرنا ہوگا ۔ اسطرح مونڈے دار اپنے دیندار کا دس روپیہ کا مال فروخت کرکے پانچ روپیہ اصل میں اور عصہ ۳ ر ۴ ہ سود میں منہا کرلیتا ہے ۔ جب کہ پانچ روپیہ کی ادائی میں کم و بیش عصہ ۳ ر ۴ ہ سود ادا کرنا پڑتا ہے تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سو روپیہ ادا ہونے تک کس قدر زائد سود دینا پڑے گا ۔ بعض مونڈے دار اپنے آسامیوں سے فی دھڑی (تول) صرف ایک مٹھی ترکاری بطور سود وصول کرتے ہیں اور ایک روپیہ پر چار پیسے سود نہیں لیتے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آسامی تقریباً ہر روز مال لاتے رہتے ہیں اور مونڈے داروں کو فی دھڑی ایک مٹھی کے حساب سے کافی ترکاری بطور سود مل جاتی ہے ۔ جو آسامی روزانہ مال نہیں لاتے ان سے نہ صرف ایک روپیہ پر چار پیسے لئے جاتے ہیں بلکہ فی دھڑی ایک مٹھی ترکاری بھی وصول کی جاتی ہے ۔ اگر کوئی آسامی دو مہینے مال لاکر چار مہینے تک کچھ نہ لائے تو جس زمانہ میں وہ فروخت کے لئے مال لاتا ہے اُس وقت فی روپیہ چار پیسے اور فی دھڑی ایک مٹھی ترکاری لی جاتی ہے ۔ جس وقت وہ منڈی نہیں آتا بلکہ کھیت ہی پر رہتا ہے تو ادا شدنی رقم پر ماہانہ دو روپیہ فی صد کے حساب سے سود وصول کیا جاتا ہے ۔ بعض مونڈے دار اپنے آسامیوں سے اُس مدت کا کوئی سود نہیں لیتے جب کہ وہ منڈی کو کچھ مال نہیں لاتے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس زمانے میں وہ مال لاتے ہیں تو اُس وقت اس قدر زائد سود وصول کرلیا جاتا ہے کہ جس سے اُس مدت کے سود کی تلافی ہوجاتی ہے جب کہ کسان منڈی نہیں آتے ۔

منڈی میں سودی لین دین کا کاروبار مونڈے داروں کے علاوہ چند دیگر افراد بھی کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کو مقامی زبان میں " روز لوٹ " کہا جاتا ہے ۔ ان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ لوگ اقساط سے قرض دیتے ہیں اور قسط کی وصولی ہر روز ہوا کرتی ہے ۔ چونکہ یہ لوگ ہر روز قسط وصول کرتے ہیں لہذا انہیں " روز لوٹ " (یعنی روز وصول کرنے والے) کہا جاتا ہے ۔ اُس قسط کو جو روزانہ وصول کی جاتی ہے " روزا " کہتے ہیں اور لین دین کا یہ طریقہ " روزان " کا طریق کہلاتا ہے ۔

منڈی میں " روز لوٹوں " کی جملہ تعداد چھ ہے ۔ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ لوگ صرف

Mr. Mohammed Nasir Ali M.A., (Osman), the Mackenzie prize holder, and the Ex President of the University Economics Association, had been one of the most brilliant students of the University who was appointed last year as a Lecturer in the Economics Department.
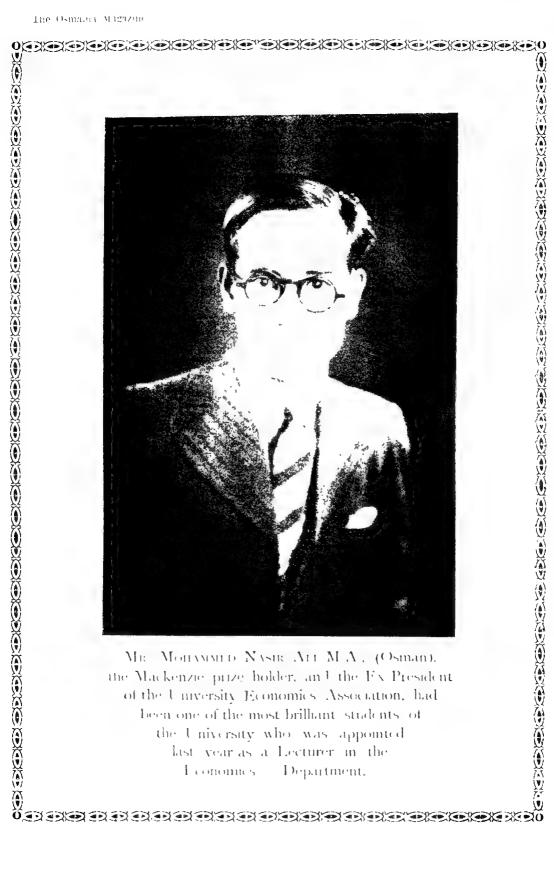
بھاجی ترکاری کے بیوپاریوں کو قرض دیتے ہیں۔ بعض مونڈے دار ان کے ہاں سے اپنی ضمانت پر قرض حاصل کرکے کسانوں کو قرضہ دیتے ہیں "روزان" کے طریقے میں زیادہ سے زیادہ ۲۵ روپیہ قرضہ محض شخصی ضمانت پر دیا جاتا ہے۔ وصولی قسط کا طریقہ یہ ہے کہ جو شخص جس قدر روپیہ قرض لے اتنے ہی گنڈے روزانہ ادائی میں دینے ہوں گے۔ فرض کیجے ایک بیوپاری چوبیس روپیہ قرضہ حاصل کرتا ہے تو اس کو روزانہ چوبیس گنڈے یا ایک روپیہ اصل کی ادائی میں دینا ہوگا۔ ایک روپیہ کی چوبیس اقساط میں جب جملہ اصل ادا ہو جائے تو ایک ایک روپئے کے دو "روزے" (یعنی دو اقساط) بطور سود دینے ہونگے۔ اگر کوئی بیوپاری ایک روپیہ قرض لے تو اس کو روزانہ ایک گنڈا یا چار پیسے کے حساب سے چوبیس قسط اصل کی ادائی میں دینا پڑے گا اور بعد ازاں دو قسط سود کی ادائی میں۔ "روزلوٹ" ہر روز دو تا پانچ بجے کے درمیان دینداروں سے "روزے" وصول کرتے پھرتے ہیں۔ اس کی زیادہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ جملہ "روزے" (اقساط) ایک مہینے تک یا اُس کے اندر وصول ہو جائیں۔ اس تشریح سے ظاہر ہو رہا ہے کہ "روزلوٹ" فی روپیہ آٹھ پیسے یا ماہانہ ۳ء ۸ فی صد شرح سود حاصل کرتے ہیں۔

حالات حاضرہ کا لحاظ کرتے ہوئے دو قسم کی اصلاح ضروری ہے۔ پہلا یہ کہ فروخت پیداوار سے متعلقہ نقائص کو دور کیا جائے دوسرے یہ کہ مالی امداد کے بہتر طریقے فراہم کئے جائیں تاکہ مناسب شرح پر قرض مل سکے۔

محمد ناصر علی ام۔ اے (عثمانیہ)
لکچرار معاشیات

اندر سبھا سے پہلے

ہندوستانی ڈرامہ قدیم الایام سے نہایت مدون اور ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے ہندوستان میں فن ڈرامہ کی ابتدا چوتھی صدی قبل مسیح سے ہوتی ہے، مرچھ کٹک (مٹی کی رتھ) قدیم ترین ہندی ڈرامہ ہے جسکی تصنیف دوسو سال قبل مسیح بتلائی جاتی ہے، بکرماجیت کے زمانہ میں کالی داس نے اعلیٰ پیمانہ کے ڈرامے لکھے، کالی داس کے ڈراموں میں شکنتلا اور وکرم اروسی مشہور ڈرامے ہیں جو اپنی شاعرانہ اور نفسیاتی نزاکتوں اور رفعت خیال کی وجہ سے عدیم المثال ہیں۔

بعد میں سری ہرش دیو، بھوبھوتی وکنی، رام ، ہنومان، بھٹ کنچن اچاریہ، مراتی ، کرشن جیسے اعلیٰ ڈرامہ نگار پیدا ہوئے۔

ہندوؤں نے اور فنون لطیفہ کی طرح ڈرامہ کو بھی دیوتاؤں سے منسوب کرکے اسے مذہبی رنگ دیا ہے چنانچہ بھرت نامی ایک رشی اس فن کے باوا آدم بتائے جاتے ہیں، جنہوں نے بھرت نٹ کے نام سے فن ڈرامہ پر ایک کتاب لکھی۔

ہندوؤں نے شاعری (موسیقی) کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک درسیا سنگتا Visible music دوسرے

سردیا سنگتا (Audible Music) درسیا سنگتا کا تعلق اجازت اور سماعت دونوں سے ہے، جسمیں ابھی نایا (ادلکاری) کے ذریعہ اعلیٰ اور اسفل کردار موزوں ہیں میں اسٹیج پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اسکی دو قسمیں ہیں ایک روپک دوسرے اُپ روپک پھر روپک کی دس اور اُپ روپک کی اٹھارہ قسمیں کی گئی ہیں۔

ہندو واضعان قوانین ڈرامہ نے نہ صرف پلاٹ، قصہ، کردار، موضوع اور جذبات کی یک رنگی کی مناسبت سے اس فن کو تقسیم کیا بلکہ اداکارانہ پہلو کو بھی علم کا مرتبہ بخشا۔ زندگی کے مختلف واقعات کے تحت انسانی جذبات کے تغیرات اور انکے اداکارانہ اظہار کو بالکل نفیاتی طور پر مجوز کردیا تاکہ جذبات اور حرکات میں نفسیاتی یگانگت اور واقعیت پیدا ہو۔ اور تماشائیوں پر ڈرامہ کا وہی اثر ہو جس کا اظہار مدنظر ہے نظریہ رسا (جذبہ) کے تحت بھاؤ اور انا بھاؤ کی تقسیم کی گئی۔ بھاؤ سے مراد قلبی کیفیت ہے اور انا بھاؤ اس کا اظہار ہے، یعنی وہ ظاہری علامات جو بھاؤ سے پیدا ہوتے ہیں غرض ہندوؤں نے ناٹک، ابھی نایا، روپ، سنگت سال، یا رنگ بھومی (اسٹیج) کے ہر جزوی اور فروعی متعلقات کو بھی قواعد و ضوابط کے احاطہ میں لاکر نہایت اعلیٰ قسم کی مدون اور منظم صورت میں پیش کیا۔ اور ہندو راجاؤں نے اس فن کو اپنی سرپرستی میں لے کر ترقی کے انتہائی اعلیٰ مرتبوں پر پہنچایا۔

ہندو ڈرامہ کی خصوصیات کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ ڈرامہ میں مذہب کے بنیادی معتقدات کو پیش کیا جاتا تھا، اکثر ڈراموں میں کرما (اعمال) اور آواگون (تناسخ) کے نظریہ کی تبلیغ ہے۔

۲۔ بہ شکل ڈرامہ موسیقی اور شاعری کا امتزاج کیا جاتا تھا۔

۳۔ کردار کا تنوع ۔ ڈرامہ کے کردار سماج کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کے مرد اور عورتوں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ناٹک (ہیرو) اور نائکہ (ہیروئن) کا صورت سیرت اور سماجی مرتبہ کے لحاظ سے اعلیٰ اور بلند ہونا ضروری تھا کیونکہ وہ تماشائیوں کے لئے نمونہ بناکر پیش کئے جاتے تھے، بادشاہوں

امیروں اور وزیروں کے علاوہ ادنیٰ طبقہ کے لوگ نوکر چاکر بھی ڈرامہ کے عناصر ہوتے تھے۔ ہندو ڈرامہ کی یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اِسے یونانی ڈرامہ سے ممیز کرتی ہے۔

۴۔ ہندو دیو مالا کے کردار اور اُن کے مافوق الفطرت اعمال، خوارق عادات بھی ہندو ڈرامہ کے جزو تھے۔

۵۔ کردار کے سماجی مرتبہ کے لحاظ سے اُسکی زبان بھی ویسی ہی ہوتی تھی، تاکہ واقعیت پیدا ہو، شاہزادے اور برہمن سنسکرت اور عورتیں عموماً پراکرت بولتی تھیں۔ دوسرے اسفل کردار اپنے اپنے مفروضہ صوبوں کی بولی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

دوسری یا تیسری صدی قبل مسیح سے بارہویں صدی عیسوی تک ہندو ڈرامہ نے راجاؤں کی سرپرستی میں برہمنوں کے ہاتھوں خوب ترقی کی۔ گو جین اور بدھ مت کے آغاز نے ہندو ڈرامہ کو نقصان پہنچایا مگر ان مذاہب کے پیشواؤں نے ڈرامہ کی اہمیت اور افادیت کو بہت جلد ہی پہچان لیا اور اس کو تبلیغ کا آلہ بنایا۔ بدھ مت کے عروج کے ساتھ ساتھ ڈرامہ نے بھی ترقی کی جسکا ثبوت اجنٹا کی مصوری سے بھی ملتا ہے، مگر جب بدھ مت کو زوال ہوا اور برہمنوں کا ستارہ پھر چمکا تو اُنہوں نے بدھ ڈراموں کو ہٹا کر رام اور کرشن کی زندگیوں کو پیش کر کے اپنے ڈرامہ کو زندہ کیا۔ ابھی برہمنوں اور بدھ مت والوں کی کشمکش سے ہندو ڈرامہ سنبھلنے ہی نہ پایا تھا کہ بارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوؤں کو مسلمان حملہ آوروں کا سامنا کرنا پڑا مسلمانوں کے حملوں کے سیلاب نے ہندوؤں کے تمدن اور معاشرت میں وہ پراگندگی پیدا کر دی کہ ہندوؤں کی پوری توجہ اپنے سیاسی تحفظ اور دفاع پر مرتکز ہو گئی اسی زمانہ میں ہندو ڈرامہ نے بھی اپنی رفعت کھوئی۔ اور بلندی سے گر کر اس نے بھان، اور ہراہسن کی شکل اختیار کر لی۔ یہی وہ دور ہے جب ہندو ڈرامہ پنڈتوں اور برہمنوں کے پنجہ سے چھٹکارا پا کر عوام میں داخل ہوا۔ اور ہندو کلاسکل ڈرامہ کی شائستگی، نزاکت آفرینی، شاعرانہ صنعت گری رفعت موضوع، دلنواز تغزل۔ پلاٹ کی چستی، اور بے عیب سیرت کشی غائب ہو گئی۔

جب مسلمانوں کے قدم ہندوستان میں جم گئے، ملک گیری اور جنگ و جدال سے انہیں فرصت ملی

اور زیادہ قیام کی وجہ سے ایک حد تک غیر شعوری طور پر ہندو تمدن سے انہیں یگانگت پیدا ہونے لگی تو انھوں نے بھی ہندوؤں سے اپنے مفید مزاج اجزاء کو اخذ کیا' اور ایک مشترکہ تمدن کی بنیاد ڈالی جسکی ابتداء اکبر کے زمانہ سے ہو چکی تھی' فیضی کی گیتا داراشکوہ کے اپنشد اور ابراہیم عادل شاہ کی نورس اس امر کی شہادتیں ہیں کہ مسلمانوں نے ہندو مذہب' فلسفہ اور فنون لطیفہ کی طرف توجہ کی۔ ہندو رقص' موسیقی اور شاعری کے علاوہ جب ہندو رانیاں مسلمانوں کے حرم میں داخل ہوئیں تو شاہی روایتوں کے اثر کے تحت شادی و غم کی تمام ہندو رسمیں بھی مسلمانوں کی معاشرت کا جزو بن گئیں۔ جس کے اثرات باوجود ملاؤں کی چیخ پکار کے اب تک موجود ہیں۔ کچھ سال پہلے تک ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی عیدوں اور تہواروں میں بڑے خلوص سے حصہ لیتے تھے' مسلمان دیوالی اور بسنت مناتے ہولی کھیلتے راماین کی کتھا سنتے' رام لیلا اور کرشن لیلا میں شامل ہوتے' اور ہندو عیدین میں شریک رہتے اور محرم میں حصہ لیتے' تمدنی اتحاد اور اتفاق کے ایسے مناظر اب بھی حیدرآباد دکن میں دیکھنے میں آجاتے ہیں۔

جب دلی اُجڑی اور لکھنو آباد ہوا تو دلی کا پورا سرمایہ لکھنو میں منتقل ہوا' گذشتہ دور میں دلی کے بعد لکھنو ہی وہ مقام تھا جو ہندو اسلامی تمدن کا مرکز بن گیا تاجداران اودھ کی علم نوازی نے شاعری اور نثر نگاری کو خوب ترقی دی انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں جب اودھ کا دربار عیش و طرب کا گہوارہ بن گیا تو لکھنو نے واجد علیشاہ جیسے رنگین مزاج نوجوان تاجدار کو پیدا کیا جسکی زندگی مجسم عیش اور جس کا دربار راجہ اندر کے افسانوی اکھاڑے کی جیتی جاگتی تصویر تھا گانا بجانا وظیفہ حیات اور ناچ رنگ جس کا اوڑھنا بچھونا تھا' اختر پیا خود اچھے ماہر مغنی اور رقاص تھے اور اپنے محل میں انھوں نے اچھی گانے اور ناچنے والی نوخیز پری جمالوں کو چن چن کر جمع کیا تھا اس زمانہ میں وہاں عوام میں رس بہت مقبول تھے' واجد علی شاہ کو یہ چیز بہت پسند آئی رادھا کرشن کی داستان حسن وعشق سے یہ جدت پسند تاجدار اتنا متاثر ہوا کہ اس نے خود رس لکھے جو قیصر باغ میں کھیلے جاتے تھے' جسمیں وہ کبھی کنھیاجی بنتے یا عشق کے ستائے ہوئے جوگی بن کے دھونی رماتے اور بہت سی عورتیں پریاں اور عاشق مزاج گوپیاں بن کے انہیں ڈھونڈتی پھرتیں۔ واجد علیشاہ کے طباع اور حسن پسند مزاج نے ہندوستان کے عوامی ڈرامہ یعنی رس کو اپنے رنگ میں اس خوبصورتی

سے ڈھالا اور اُسمیں شعر و موسیقی اور نسوانی حُسن و شباب کا ایسا رنگ بھرا کہ اختری رَہس مستقل مصدر نشاط بن گئی۔ جس سے متاثر ہو کر اسی عہد کے ایک کہنہ مشق شاعر امانت نے اندر سبھا لکھی جو اردو کا پہلا ڈرامہ ہے۔

ہندو کلاسکل ڈرامہ کے زوال کے بعد جیسا کہ بیان کیا گیا بھان اور پراہسن نے عوام کے دلوں پر اپنا سکہ جمایا۔ بھان اور پراہسن ہندو ڈرامہ کی اسفل قسموں میں سے دو قسمیں ہیں بھان اُس شکل ڈرامہ کا نام ہے جس میں ایک ہی شخص محبت، جنگ اور دوسرے واقعات کو ساز اور نرت کے ذریعہ بیان کرتا ہے، اسکی حیثیت عرب کے راوی اور ایران کے روضہ خوان کی سی ہے' رَہس یورپ کے فارس کے مماثل ہے جسمیں سماج اور زندگی کے واقعات پر ہجو کے انداز میں تنقید ہوتی ہے اس کا مقصد صرف ہنسا ہنسانا ہے' یہ خدمت عموماً بدوشک (مسخرا) انجام دیتا ہے۔

محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں بھانڈ اور بہروپیوں کے نام سے جن گروہوں نے فروغ پایا وہ اسی بھان سے مشتق ہیں۔ بھانڈ اس وقت معاشرہ کا اہم جزو تھے' اِنکے بغیر دربار سونے اور خوشی کی تقریبیں بے رونق رہتی تھیں' یہ گروہ ناچ گانے کے ساتھ نقل بھی کیا کرتے تھے' انکی نسبت مشہور ہے کہ یہ جس کے ہاں جاکے ناچتے اسکی نقل ضرور اتارتے اور ممکن نہ تھا کہ اس پر چوٹ نہ کریں امراء اور رؤسا کو انکی لغزشوں پر متنبہ کرنے میں بھانڈوں کا بہت حصہ تھا بھانڈوں اور بہروپیوں کو نقالی میں ایسا کمال حاصل تھا کہ جس کی نقل اتارتے اس کا ایسا مکمل بہروپ بھرتے کہ سچا اور واقعی کیرکٹر پیش نظر ہو جاتا۔

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بہ ظاہر مختلف قسم کے تماشے ہوتے ہیں جن کا تعلق عوامی ڈرامہ سے ہے جو ہر جگہ ایک دوسرے ہی نام سے مشہور ہیں اور تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ آپسمیں بہت کچھ مشابہت اور یگانگت رکھتے ہیں۔ انھیں پورانی ڈرامہ بھی کہا جاتا ہے جو رامائن' مہابھارت' اور سری کرشن کی زندگی کے واقعات پر مشتمل ہیں۔

مشرقی ہند میں جاترا' جنوبی ہند میں بھاگوت' مہاراشٹرا میں دسا اوتار اور شمالی ہند میں رسا دھاری اور رام لیلا کے نام سے گاؤں اور شہروں میں تماشے ہوتے ہیں جن میں رامائن مہابھارت

کے قصوں اور سری کرشن اور دس اوتار کی زندگیوں کو ناچ گانے اور دیہی شاعری کی آمیزش کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

رسادھاری سری کرشن کی شخصیت قدیم الایام سے ہندو زندگی کی مہتم بالشان اور ذی اثر شخصیت ہے، ان کی رومان آفریں زندگی انکا فلسفہ انکی رزم اور بزم آرائیوں کی داستانیں ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر ہیں، انکی رنگین اور شاعرانہ زندگی کے مقابلہ میں رام جی کا کردار بہت پھیکا اور سیدھا سادھا معلوم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہندی زندگی میں کرشن نے جتنا اثر اور مقبولیت پیدا کی وہ کسی اور قومی ہیرو کو نصیب نہ ہوئی رسادھاری اسی مقبولیت کا نتیجہ ہے جس سے متاثر ہو کر نظیر اکبرآبادی نے کرشن نامہ لکھا رسادھاری ڈرامہ کی اُس بگڑی ہوئی شکل کا نام ہے، جسمیں عوام کی ذہنی سطح کی مناسبت سے کرشن کی داستان طفلی اور حسن و عشق کو تمثیل کیا جاتا ہے،

ان تماشوں میں دو لو عمر بچے رادھا اور کرشن کا بھیس بھرتے ہیں باقی گوالے اور گولنیں بنتے ہیں کرشن کے سر پر تاج ہوتا ہے جسے مور کے پروں سے آراستہ کیا جاتا ہے، رادھا اور بنسی والے کرشن کو حلقہ میں لے کر گولنیں اور گوالے گاتے ہوئے ناچتے ہیں، تماشہ بینوں پر ان تماشوں کا بہت اثر ہوتا ہے اس ارضی رقص و سرود میں ایسا کچھ تقدس پیدا ہو جاتا ہے کہ بعض لوگ حقیقی کرشن سمجھ کر نو عمر بچے کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ متھرا اور بندرابن ان تماشوں کے بڑے مرکز ہیں۔ جہاں برہمن ٹولیاں بنا کر ہندوستان کے کونے کونے میں گشت لگا کر تماشے کرتے ہیں اور پیسے کماتے ہیں (دکن میں محرم کے زمانہ میں گولن کا ناچ اسی کرشن لیلا کی ٹوٹی ہوئی کڑی ہے۔)

ان تماشوں کی اثر نوازی کا یہ عالم ہے کہ جہاں جہاں یہ ٹولیاں جاتی ہیں وہاں کے مقامی عوام اپنے حوصلہ کے مطابق ان تماشوں کی نقل کرتے اور جلسے ترتیب دیتے ہیں جسمیں گانوں، ناچ رنگ کے ساتھ ساتھ سری کرشن کی زندگی کے مختلف حصوں کو روپ کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو رہس کہلاتے ہیں، جسکی زبان صوبوں کی مناسبت سے مختلف پراکرتوں پر مشتمل ہے۔

گاؤں کے چند جوشیلے نوجوان شاعرانہ لطافتوں اور فنی نزاکتوں سے بے نیاز ہو کر خود ہی گانے

اور مکالمے بنا لیتے ہیں، اور راتوں میں شعلوں کی روشنی میں تماشے کرتے ہیں، گاؤں کے دھوبی سے مستعار لئے ہوئے کپڑے ناٹک کے لباس کا اور سیندور، تیل، چکسا، اور ہلدی سے، روپ سازی اور چہرے کی آرایش کا کام لیا جاتا ہے، ملا غنیمت گنجادی نے اپنی مشہور مثنوی نیرنگ عشق میں جو شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں لکھی گئی اُن تماشوں کی کیفیت کو بیان کیا ہے اور اس گروہ کو منقل، پیشہ اور بھگت باز کے نام سے موسوم کیا ہے۔ امانت اندر سبھا کی شرح میں ان تماشوں کا اس طرح ذکر کرتا ہے "الحمدللہ کہ بھگت کا کوئی نام نہیں لیتا ہے، زمانہ اندر سبھا پر جان دیتا ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اندر سبھا سے پہلے بھگت کے نام سے شمال میں تماشے ہوا کرتے تھے۔

جب یہ رہس اپنی مقبولیت کی بنا پر عوام سے گذر کر لکھنؤ کے شاہی محلوں میں داخل ہوئے تو اس کے شوقیانہ اجزا دور ہو کر اُمیں بہت شائستگی اور زیادہ شاعرانہ پن پیدا ہو گیا۔ قیصر باغ کے دروازے عوام النّاس کے لئے کھل گئے اور شہر کے شوقینوں میں ڈراما (رہس) کا فن خود بخود ترقی کرنے لگا چند ہی دن میں اس شوق کو اس قدر فروغ ہوا کہ بڑے بڑے شعراء نے بھی توجہ کی چنانچہ میاں امانت نے سنہ ۱۲۶۸ھ میں اندر سبھا لکھی۔ یہ ایسی مقبول ہوئی کہ اور لوگوں نے بھی امانت کے زیر اثر بہت سی اندر سبھائیں لکھیں جنمیں مداری لال کی اندر سبھا، مچھندر سبھا، جشن پرستان، بزم سلیمان بہت مشہور ہیں۔ اردو مثنویوں کو بھی ڈرامہ کا جامہ پہنایا گیا مرزا شوق کی مثنوی "زہر عشق" جسکی ایک اچھی مثال ہے بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت مثنوی زہر عشق اسٹیج کی گئی تو بعض بعض موقعوں پر مجمع میں کہرام مچ گیا تھا۔ واجد علیشاہ نے مثنوی کی شکل میں جو رہس لکھے ہیں وہ ناپید ہیں اس لئے اس کی ادبی قدر و قیمت پر تبصرہ نہیں کیا جا سکتا مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اندر سبھا کے پیدا کرنے والے یہی رہس تھے۔

مخدوم محی الدین ایم۔ اے
ریسرچ اسکالر

دیہات کی ایک رات

وہ کیا شب تھی جب زندگی ہنس رہی تھی
تمنّاؤں کی ابتدار میں سے لے کی تھی

پہاڑی کے دامن میں اک نہرِ سیمین
تھکی ماندی دن بھر کی سوئی ہوئی تھی

کنول بیچ میں نہر کے کھل رہا تھا
کہ موجوں میں جیسے کوئی جل پری تھی

کنارے پہ وہ جنگلی پھولوں کی بیلیں
کہ جن میں ہوا بھیرویں چھیڑتی تھی

وہ کھیتوں کی رقاص شادابیوں پر
وہ سیال چاندی تھی یا چاندنی تھی

ہوا چاندنی دونوں گھل مل گئے تھے
فسوں کاریٔ فتنۂ سامری تھی

گل و لالہ و نسترن ہنس رہے تھے
ہواؤں میں کچھ ہلکی ہلکی نمی تھی

ہوا کیف زا ۔ چاندنی روح پرور
غرض ذرّہ ذرّہ میں اک دلبری تھی

مگر دل کو محسوس یہ ہو رہا تھا
کہ جیسے فضا میں کسی کی کمی تھی
نگاہیں جو اُٹھیں تو کیا دیکھتا ہوں مرے سامنے میری دیوی کھڑی تھی
وہ فطرت کے معصوم خوابوں کی دنیا
زسرتا قدم صنعتِ آذری تھی
ہواؤں کی موسیقیاں جھوم جائیں اگر دل ہی دل میں وہ کچھ گنگنائیں
فضاؤں کی رعنائیاں منھ چھپائیں ذرا اک جو وہ زیرِ لب مسکرائیں
جو اُٹھ جائیں پلکیں سوئے بزمِ انجم ستاروں کی ضو پاشیاں تھرتھرائیں
محبت، جمال، اور قیامت، جوانی تبسم، نگاھیں، ترنم، ادائیں
شفق کے دہلائے ہوئے عارض و لب نگاھیں نہ جن حُسن کی تاب لائیں
وہ نرگس سی آنکھیں، زرِ گل سی رنگین وہ، زلفیں جو بکھریں تو جادو جگائیں
وہ رخشندہ شفاف، نازک سی باہیں جو صندل کی شاخوں کو نیچا دکھائیں
وہ، میری شکایت پہ یہ اُنکا کہنا
تجھے اور اے ساز، ہم بھول جائیں

(۳)

فضاؤں پہ اک کیف سا چھا رہا تھا
ستاروں پہ بادل بہا جا رہا تھا

مہِ نیم شب محفلِ مشتری کو
بصد ناز و انداز گرما رہا تھا

کوئی، بانسری کے رسیلے سروں میں
کہیں دور کہسار پر گا رہا تھا

محبت، جوانی، شراب، اور مستی
فضاؤں پہ رہ رہ کے برسا رہا تھا

میں زلفوں کو اُن کی سجا کر گلوں سے
گھٹاؤں میں تاروں کو شرما رہا تھا

فضاؤں پہ وہ چھائے جاتے تھے اور میں
پرستش نگاہوں کو سکھلا رہا تھا

مسرت کا اک غیر فانی نشہ سا
مری عقل و ادراک پر چھا رہا تھا

وہ نمناک پلکیں جھکائے ہوئے تھے
میں اپنی وفا کا صلہ پا رہا تھا

سید عبد الصمد رضوی سازؔ
بی۔ اے۔ ال ال بی
(عثمانیہ)

ایک دوست

وہ میرا روم فیلو تھا۔ چار سال تک میرے ساتھ رہا، پہلے ایک اجنبی کی طرح پھر ایک دوست کی طرح ایک مدت تک وہ مجھ سے کھل نہ سکا، بند بند سا رہتا۔ میں کوشش کرتا کہ ان حجابات کے پردوں کو اٹھا کر اس کے اصلی خط و خال میں اسے دیکھوں مگر وہ گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ میں تعاقب کرتا تو وہ اپنی خاموشی سے میرے پیر جکڑ دیتا۔ اجنبی کی حیثیت سے اس میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ وہ ہر نئی چیز سے ایک طرح کی بے تعلقی اور بیزارگی کا اظہار کرتا۔ پہلے پہل جب وہ میرے کمرے میں آیا تو دنوں اس نے مجھ سے بات نہیں کی۔ اس کا یہ طرز مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ میرا اندازہ تو یہ تھا کہ ہر اجنبی میرا دوست تھا۔ اجنبیوں کو دوست بنانے میں مجھے لطف آتا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ مجھے اس میں ملکہ بھی ہے۔ اب مجھے اپنے متعلق کچھ شبہ ہو چلا تھا۔ مجھے دوستوں کے ہجوم میں زندگی جھومتی نظر آتی اور اسے تنہائی کے سوا کچھ نہ بھاتا۔ میرے کمرے پر دوستوں کا تانتا بندھا رہتا، میں قہقہوں میں سونے اور جاگنے کا عادی تھا، مگر وہ اس کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ میں نے اس کی اس کمزوری کو بھانپ لیا۔ دوستوں کی آمد و رفت بڑھتی گئی اور میرا اجنبی ساتھی، سکڑتا، ہچکچاتا میری طرف بڑھتا گیا۔ اب وہ میرا سہارا ڈھونڈھ رہا تھا اور اس میں سپردگی کے

انداز پیدا ہو چلے تھے۔ ابھی تک وہ میرے لئے ایک خاموش مخاطب کے سوا کچھ نہ تھا مگر اب اس میں بھٹنے کی جرات بھی آتی جا رہی تھی۔ زندگی سے متعلق اس کے خیالات سن کر میں دنگ رہ گیا وہ یکسر حزن تھا اور سراپا درد۔ ہر چیز اسے سوگوار اور شکستہ نظر آتی۔ وہ کہتا" ہماری تعمیر کا سارا حاصل جب شکست ہی ہو تو پھر یہ جدوجہد کس لئے؟" وہ کسی تیز آواز کو سن نہ سکتا تھا۔ بھاری قدموں کی چاپ پر اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ میں نے اس سے قریب ہو کر ایسا محسوس کیا جیسے وہ ایک ٹوٹا ہوا ساز ہے، ایک شکست خوردہ انسان اندر ہی اندر کوئی غم اسے جھلسائے دے رہا ہے۔ میں جانتا تھا کہ میں ذرا بھی چھیڑوں تو پھوٹ بہے گا۔ میں منتظر رہا کہ وہ خود ہی اپنے آپ کو ظاہر کر دے کہ اتنے میں چھٹیاں آئیں۔ وہ گھر چلا گیا۔

اب کی جب وہ آیا ہے تو میں اس کی تبدیلی پر حیران رہ گیا۔ اس کی پرسکون زندگی میں طوفان آ گیا تھا۔ وہ کسی چیز کے ٹکرائے جانے اور ٹوٹے جانے میں ایک طرح کی تسکین پاتا۔ اب وہ زندگی کو ایک نئی طرح سے دیکھنے لگا تھا۔ چیخ پکار میں اس کی آواز سب سے زیادہ تیز اور قہقہوں میں، اسی کا قہقہہ سب سے بلند ہوتا۔ اس کے دوست احباب بڑھتے گئے، اس کی دلچسپیاں بڑھتی گئیں، اور وہ خود اپنے گرد ایک طوفان سمیٹے بڑھتا گیا۔ وہ ذہین تھا اور رشک کئے جانے کی حد تک ذہین، پہلے اس نے اپنی ذہانت پر پردہ سا ڈال رکھا تھا، اب وہ پردہ ہٹ چکا تھا اور اس کی ذہانت بے لگام ہو کر زندگی کی وسعتوں میں بھٹک رہی تھی۔ وہ رات رات بھر جاگ کر، صبح کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کی اس دوڑ میں میرا شمار ایک کمزور ساتھی کا سا تھا۔ وہ اتنا تیز قدم ہو گیا تھا کہ میں اس کا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔ وہ بڑی رات گئے کمرے پر آتا، میزیں ادھر سے ادھر کھینچتا، ایک کرخت آواز پیدا ہوتی، میں جاگ اٹھتا تو وہ کہتا" معاف کرو، مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اب اتنی جلد سونے لگے ہو" کمرے کے اصول اور ضوابط کا جو میرے بنائے ہوئے تھے اب اسے کچھ خیال نہ تھا۔ اب وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا۔ بحیثیت سینیر ہونے کے میں اپنے اختیارات کا استعمال کرتا تو اس کی سرتابی کا جذبہ اور بڑھ جاتا اور وہ مجھ سے ٹکرانے کی کوشش کرتا، میں ٹال جاتا تو وہ اپنے جوش میں دور تک نکل جاتا۔ ایک رات وہ گنگنانے اور گانے پر تل گیا، میری پروا کئے بغیر وہ گاتا، مجھ پر ہنستا اور سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا۔ بڑی دیر تک مجھے نیند نہ آسکی،

صبح جب اُٹھا ہوں تو سارا کمرہ سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھرا پڑا تھا اور میرا دوست زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔

اس کی بے راہروی دن بدن بڑھتی گئی، وہ اخلاق وآداب کے سارے اصول توڑتا گیا۔ وہ رات رات بھر شہر میں گھوم کر صبح ہوتے ہوتے کمرے پر آتا۔ کالج میں اس کی نشست اکثر خالی پڑی رہتی اور کمرے میں، میں اکثر اس کے خالی پلنگ کو گھورتا رہتا۔ اُس کی اس بے راہروی پر میں اسے ٹوکتا تو وہ کہتا "میں جب پستی کا اور کمزوری کا سہارا لے کر جی رہا تھا تو تم مجھ میں قوت وتوانائی پیدا کرنے کے منصوبے سوچتے رہتے اور اب، جب میں خطرات میں جی کر اور شعلوں سے لپٹ کر آگے بڑھ رہا ہوں تو تم چیخ اُٹھتے ہو تعمیرِ حیات کی ایک نئی راہ پر میں اپنی پوری تیزی سے دوڑ رہا ہوں تو تم اسے تخریب کہتے ہو" اس پر میں کہتا "تم تاریکی کی گہرائیوں میں گرے جا رہے ہو اور کہتے ہو کہ یہ تعمیرِ حیات کی ایک نئی راہ ہے، یہ تمہاری ذہانت کی توہین ہے۔ جذبات کے طوفان میں بہہ کر تم اپنی شکست کا اعتراف کر رہے ہو" تو وہ کہتا "شکست کا اعتراف!" پھر ہنس دیتا اس طرح جیسے کوئی کسی کی نارسائی پر ہنستا ہو اور پھر کمرے سے باہر نکل جاتا۔ اب تو وہ دو دو دن غائب رہنے لگا اور جب آتا تو تھکا ماندہ آکر خاموش لیٹ رہتا۔ ایک رات نیند میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے، میں چونک پڑا، دیکھا تو میرا دوست سسکیاں بھر رہا تھا۔ میں اُٹھا اس تک گیا وہ روئے جا رہا تھا، مجھے دیکھ کر مجھ سے لپٹ پڑا، اس نے اپنا سر میرے بازو پر رکھ دیا اور پھر رونے لگا۔ میں اسے سمجھاتا اور مناتا رہا، اس طرح جیسے کوئی ننھے بچے کو سمجھاتا ہو۔ بڑی دیر میں جا کر اس کے آنسو تھمے۔ میں نے اسے سلا دیا۔ صبح جب اُٹھا ہوں تو ایسا محسوس ہوا کہ ابر گھر کر آیا، خوب زور سے برسا اور اب مطلع صاف ہو چکا تھا۔

"تم جاننا چاہتے ہو تو سنو" وہ ایک روز کہنے لگا، اب اس کے اندازِ گفتگو میں ایک طرح کا اضمحلال تھا "مدتوں میں، اس آگ میں بھنتا رہا ہوں مگر اب میرا دم گھٹا جا رہا ہے" اس نے ایک سگریٹ جلایا اور اپنی داستان اس طرح شروع کی "میں نے گاؤں میں آنکھ کھولی، چند چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کے بیچ میں ایک پختہ مکان میرا گھر تھا۔ جس سے زمینداری کی خوش حالی اور فراغت کا اظہار ہوتا تھا گھر میں

میرا ہم عمر ساتھی کوئی نہ تھا۔ بوڑھا ملازم مجھے باہر لئے لئے پھرتا۔ گاؤں کے بچے مجھے اس طرح گھورتے جیسے میں ان سے الگ کوئی چیز ہوں، میں چاہتا کہ ان میں گھل مل جاؤں مگر وہ کترا جاتے۔ مجھے ایک ٹھیس سی لگتی، میں بوڑھے ملازم سے چمٹ جاتا، اور وہ ایک بچے کی طرح میرے ساتھ کھیلنے کی کوشش کرتا۔ مگر میرا دل نہ لگتا اور بار بار اسی طرف مڑ کر دیکھتا جہاں سارے بچے کھیلتے ہوتے۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ یہ بوڑھا میرے ساتھ کیوں لگا رہتا ہے۔ ایک مدت تک میرا بچپن اس کے بڑھاپے کے ساتھ کھیلتا رہا جب میں ذرا بڑا ہو گیا تو بھاگ کر اس سے دور نکل جاتا اور ان بچوں کے ساتھ کھیلنے لگتا۔ ان میں، میں نے ایک دو دوست بھی پیدا کر لئے، اب مجھ میں وہ کوئی غیریت نہ پاتے اور کھیل میں مجھے برابر کا شریک سمجھتے۔ میں ان کے گھروں میں گھس جاتا، ان کی مائیں میری بڑی عزت کرتیں۔ مگر وہ بیچارے میرے گھر میں اس آزادی سے دخل نہ پا سکتے تھے۔ اور کسی بہانے آتے بھی تو کھلے بندوں مجھ سے مل نہ سکتے۔ اشارے اشاروں میں وہ مجھے بلاتے اور میں باہر نکل آتا۔ میرے ساتھ ان کا بچپن بھی بڑھتا گیا باہر سے اُستاد بلائے گئے اور میری پڑھائی شروع ہوئی میری اور ان کی تقدیریں بدلتی گئیں دس دس سال کی عمروں میں وہ کام پر لگا دیئے اور زندگی کی جد وجہد میں مصروف کر دیئے گئے۔ پڑھائی کے سوا میرا وقت بیکار گذرنے لگا۔ میں پڑوسیوں کے گھروں میں گھس جاتا، اکثر گھروں کو قفل لگے ہوتے، دن میں عورتیں اور بچے سب کھیتوں میں کام کاج میں مشغول ہوتے اور رات میں یہی سنسان جھونپڑے ٹمٹماتے چراغوں اور عورتوں اور بچوں کے شور وغل سے آباد ہو جاتے۔ مگر میں رات میں باہر نکل نہیں سکتا تھا۔ آخر مجھے ایک ساتھی مل ہی گیا۔ پڑوس کی ایک لڑکی گھر میں کام کاج کے لئے آتی تھی، میں نے اس سے دوستی بڑھائی، موقع پا کر میں اسے گھر سے باہر لیجاتا اور ہم وہاں گھنٹوں کھیلتے رہتے۔ مگر وہ اس آزادی میں کس طرح جی سکتی تھی۔ ایک دو دن کے بعد ہی اس پر خوب لے دے ہوئی۔ پٹائی تک نوبت آرہی تھی کہ میں بیچ میں آگیا مگر وہ بیچاری کام پر سے ہٹا دی گئی۔ وہ سسکیاں لیتی ہوئی گھر چلی گئی کہتی تھی "ماں مجھے اب گھر نہیں آنے دیگی" میں کوفت کھا کر رہ گیا۔

مجھے اس سے ایک طرح کی ہمدردی سی ہو گئی، میں اس کے گھر جاتا رہا اور ہم کھیلتے رہے۔ یہ دن بھی جلد گذر گئے۔ اور وہ پھر مصروف کر دیگئی۔ وہ روز کھیت پر جاتی اور شام ہوتے گھر لوٹتی۔ مجھے اس سے

بغیر کچھ پھیکی سی ہونے لگی۔ ایک دن میں بھی اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ کام پر لگی رہی' میں مدد کرنا چاہتا تو وہ روک
روک دیتی۔ اس کا باپ ہل جوتتا دور چلا جاتا تو وہ مجھ سے باتیں کرنے لگتی۔ وہ کنوئیں پر گئی' میں بھی اس کے
ساتھ ہی گیا۔ وہ پانی کھینچ رہی تھی' میرا دل چاہا کہ میں بھی کھینچوں' میں پانی کھینچ رہا تھا اور وہ ہنس رہی تھی میری
اس کوشش پر ہنس رہی تھی' ایک ہی بار پانی کھینچنے میں' میں ھانپ گیا اور وہ روز یہی کام کرتی تھی۔ میرے
ہاتھوں میں درد ہونے لگا تھا' میں نے اس کے ہاتھ دیکھے' وہ کھردرے اور سخت تھے۔ دوسرے دن
میرے اس طرح کھیت جانے کی خبر گھر میں ہوئی اور مجھ پر پابندیاں عائد کردی گئیں۔ مجھے اس سے لگاؤ
ہوگیا تھا میں کسی نہ کسی طرح روز شام میں اس سے مل آتا۔ اتنے میں مجھے معلوم ہوا کہ میری گھر پر کی تعلیم ختم
کردی گئی اور مجھے پڑھنے شہر جانا ہے۔ میں چلا آیا' بغیر اس سے ملے۔ شہر آکر کچھ دن تو مجھے وہ یاد آتی رہی
مگر پھر میں اُسے بھول گیا۔ ہمارا گھر کا گھر شہر میں اُٹھ آیا۔ صرف والد گاؤں آتے جاتے رہے۔ چار پانچ
سال کے طویل عرصہ کے بعد جب میں گاؤں گیا تو گھر پہنچ کر پچھلی مصروفیات کا خیال آیا۔ میں اس کے
گھر گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔ وہ مجھے پہچان نہ سکی۔ مجھ میں بڑی تبدیلی ہوچکی تھی' وہ بھاگنا ہی چاہتی
تھی کہ میں نے اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا۔ وہ کھل گئی شگفتہ پھول کی طرح' اب اس نے مجھے پہچان
لیا تھا۔ اس نے اپنی نگاہیں مجھ پر گاڑ دیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔ میں بیٹھ گیا' وہ بھی میرے ساتھ
ہی بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ اب وہ کیا سے کیا ہوگئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور میرا دل دھڑک رہا
تھا۔ میں جب وہاں سے اُٹھ کر چلا ہوں تو میرے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ اب میرے لئے وہ بچپن کی
ساتھی نہیں رہی تھی۔ اور بچپن کا وہ تعلق بڑھ کر اب کچھ اور ہوگیا تھا۔ گھر پر آکر میں گم سم پڑا رہا۔ رات میں
بڑی دیر تک نیند نہیں آئی دوسرے روز میں پھر اس کے یہاں گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی بڑی بڑی آنکھیں
چمک اُٹھیں۔ اس کی ماں مرچکی تھی' گھر کا سارا کام وہی کرتی' مگر اس میں اب ویسی تیزی نہیں رہی تھی
وہ جوانی کے بوجھ سے جھکی جارہی تھی۔ وہ مجھ تک آ نہیں سکتی تھی' اور میں روز اس کے یہاں جاسکتا تھا
میں جاتا رہا۔ دل و دماغ کی ساری شگفتگی کے ساتھ' اور وہ مجھ سے قریب ہوتی گئی اپنی سادگی اور معصومیت
کو لئے۔ میری بلندی اور اپنی نارسائی پر وہ مجھ سے دور ہٹ جاتی تو میں اسے دلاسا دیتا' مگر میرا اسلوب

اس کے لئے کتنا اجنبی تھا۔ میرے اور اس کے اس طرح ملنے جلنے کا حال سارے گاؤں کو معلوم ہو گیا اس پر انگلیاں اُٹھنے لگیں، وہ کنویں پر جاتی عورتیں اسے طعنے دیتیں۔ وہ میرے لئے سب کچھ برداشت کرتی رہی مگر میں اسے برداشت نہ کر سکتا تھا۔ میں نے دن میں جانا چھوڑ دیا، سارا دن تڑپتے گزرتا، رات گئے اس کے یہاں جاتا۔ اب وہ رونے لگی تھی، میرے بھی آنسو اُمنڈ آتے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر گھر میں پہونچی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اپنے اور اس کے درمیان کی اس سماجی خلیج کو میں پاٹ دوں گا۔ غم اور غصہ کا ایک طوفان میرے خلاف اُٹھا مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔ یک بیک والد صاحب نے ایک ضروری کام سے مجھے شہر بھیج دیا۔ ایک ہفتہ کے بعد جب میں واپس آیا ہوں تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ زبردستی دوسرے گاؤں میں بیاہ دی گئی۔ میرے عقل و ہوش پر جیسے ایک بجلی سی گری۔ اس کے بعد میں ایک طویل بیماری میں گھلتا رہا۔ جب میں اچھا ہوا ہوں تو مجھے کچھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ مجھے چپ سی لگ گئی۔ اس حالت کو تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ پچھلی مرتبہ جب میں گاؤں گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ یہیں تھی اور میرے پہنچنے سے ایک دن پہلے وہ اپنے شوہر کے یہاں بھیج دی گئی لوگ کہتے کہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ یہ ہے میرے ٹوٹ جانے کی داستان میں سماج کی مضبوط دیوار سے ٹکرا کر اسے گرا دوں گا یا خود گر جاؤں گا۔ یہی میرا انتقام ہے۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور باہر چلا گیا اور میں سوچ رہا تھا کہ حالات کے طوفان میں انسانی زندگی کس طرح ہچکولے کھاتی رہتی ہے اور شکست و ناکامی کا جذبہ کس طرح انتقام کے دھارے کو بہا کر اس کی تخریب بھی کرتا ہے اور تعمیر بھی

سیّد اشفاق حسین ام۔ اے
ریسرچ اسکالر

انگلستان میں قانون سازی

انگلستان کے دارالعوام کے کاروبار کی تین نوعتیں ہیں ۔ وضع قوانین، نظم ونسق مالی، اور فرائض تنقیدی ۔ دارالعوام شاہ اور دارالامراء کی اتفاق رائے سے قوانین وضع کرکے اپنے فرائض قانون سازی کو انجام دیتا ہے ۔ مقاصد عامہ کے لئے رقومات کی منظوری، ان رقومات کے صرف مدات کا تعین، محاصل کا عائد کرنا اور قرضہ جات کی اجازت عطا کرنا یہ امور نظم ونسق مالی کے فرائض میں داخل ہیں ۔ سوالات اور مباحثوں کے ذریعہ دارالعوام بادشاہ کے وزرار اور اس جماعت عاملہ کے اعمال پر جس کی صدارت ان کے تفویض ہے تنقید کرتا اور ان پر قابو رکھتا ہے ۔ اور اس طرح اپنے فرائض تنقیدی بجالاتا ہے ۔

اس مضمون میں ہم دارالعوام کے صرف ایک فریضہ یعنی وضع قوانین پر روشنی ڈالنے کی سعی کریں گے ۔ واضح رہے کہ انگلستان کے قانون کو عموماً دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔ کامن لا یعنی قانون غیر موضوعہ اور اسٹاچیوٹ لا یعنی قانون موضوعہ ۔ سردست ہمارے اغراض کے لئے کامن لا کی تعریف ان الفاظ میں کیجا سکتی ہے ۔

"کامن لا قانون ملک کا وہ جزو ہے جو رسم اور علمدرآمد یا ججوں کی تعبیر و توضیح پر مبنی ہے "

اور قانون موضوعہ

"وہ قانون ہے جسے مقننہ نے وضع کیا ہے اور جو قوانین پارلیمنٹ کے ذخیرہ میں مندرج ہے۔ انہیں کو "قوانین مملکت" Statute of the Realm کہتے ہیں"

قانون کے ان دو اہم اجزاء کے مابین اور بہت ساری نزاکتیں اور امتیازات ہیں مگر ان میں اُلجھنے کی ہمیں چنداں ضرورت نہیں۔ کیونکہ جس قانون سازی کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس کا تعلق صرف قانون موضوعہ سے ہے۔

قوانین موضوعہ کس طرح وضع کیے جاتے ہیں؟ یہی وہ سوال ہے جس کا جواب ہم دینا چاہتے ہیں۔ اس سوال کا تسکین بخش جواب دینے کے لیے ہمیں مختصراً بتانا پڑے گا کہ وہ کونسے مدارج ہیں جن سے کسی مسودۂ قانون کو گزرنا پڑتا ہے تاآنکہ وہ شاہ کی منظوری حاصل کر کے قانون پارلیمنٹ کی حیثیت اختیار کرنے کے بعد نافذ العمل اور واجب التعمیل ہونے کی قوت حاصل کرلے۔ سر دست ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ مایسا مسودۂ قانون مسودۂ قانون عامہ ہے یعنی اس کا مقصد ملک کے عام قوانین میں تبدیلی کرنا ہے نہ کہ مسودۂ قانون خصوصی۔ جس کی نوعیت پر مضمون کے آخری حصہ میں روشنی ڈالی جائے گی۔ مزید بر اں ہم یہاں یہ بات بھی فرض کئے لیتے ہیں کہ ایسے مسودۂ قانون کی ابتداء جس کے مختلف مراحل ہم بیان کرنے والے ہیں دارالعوام ہی سے ہوئی دارالامراء سے نہیں۔

ایوان کا کوئی رکن کوئی سا مسودہ قانون پیش کر سکتا ہے۔ یا کسی مسودۂ قانون کے پیش کرنے کی اجازت طلب کر سکتا ہے۔ حصول اجازت کی یہ تحریک جو شاذ و نادر صورتوں ہی میں نامنظور کی جاتی تھی ابھی حال حال تک کسی مسودۂ قانون کے پیش کرنے کی ابتدائی منزل تصور کی جاتی تھی۔ بلکہ اب بھی حکومت کے پیش کردہ اہم مسودات قانونی کے موقعہ پر بالعموم اور کبھی کبھی غیر سرکاری اراکین کی جانب سے پیش کردہ مسودات قانونی کی صورت میں مسودۂ قانون کے پیش کرنے سے قبل اجازت طلب کی جاتی ہے۔ لیکن ۱۹۰۲ء کی ترمیم کے لحاظ سے اب کوئی رکنِ ایوان کوئی سا مسودۂ قانون پیش کر سکتا ہے بشرطیکہ اس نے اپنی اس

خواہش کی رسمی اطلاع دیدی ہو۔ جب وہ ضروری اجازت حاصل کر چکتا ہے یا ضروری اطلاع دے چکتا ہے تو اسپیکر وقتِ مقررہ پر اس کا نام پکارتا ہے اور اس طرح اُسے اپنے سودۂ قانون کو پیش کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور وہ رکن ایوان کی میز پر اُس مقام پر جہاں ایوان کے کلرکوں کی نشست ہوتی ہے ایک دستاویز رکھ دیتا ہے۔ جس کے متعلق یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ اس رکن کا مجوزہ سودۂ قانون ہے۔ لیکن فی الاصل وہ ایک "ڈمی" ہوتی ہے۔ یعنی وہ ایک ایسا قطعہ کاغذ ہوتا ہے جو اسے ایوان کے دفترِ مسوداتِ عامہ سے فراہم کر دیا جاتا ہے۔ اور جس پر مسودۂ قانون کا نام، اس رکن کا اور چند اور اراکین کے نام ہوتے ہیں جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ یا تو اس رکن کے مؤید ہیں یا مسودۂ قانون کے پیش کرنے میں اس کے شریک۔ اب ایوان کا کلرک مسودہ کا نام پڑھ دیتا ہے۔ اس پر خیال کر لیا جاتا ہے کہ مسودہ کی پہلی خواندگی ختم ہو گئی۔ مسودہ قانون کی طباعت کے رسمی احکام دیدئے جاتے ہیں اور اسکی دوسری خواندگی کا وقت مقرر کر دیا جاتا ہے۔ کسی زمانہ میں یہ خواندگیاں امر واقعہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس زمانہ میں اسپیکر ایک مختصر سی یادداشت کے ذریعہ جو اسے فراہم کر دی جاتی تھی ایوان کو مسودہ کے خاکے اور اہم عنوانات سے واقف کراتا تھا اور خود مسودہ کو بعد کی منزل پر ایوان کا کلرک سنا دیا کرتا تھا۔ لیکن فی زمانناً "خواندگیوں" سے محض مختلف منازل کی نشاندہی کرنا مقصود ہوتا ہے جن سے کوئی مسودہ قانون ایوان میں گزرتا ہے۔ مسودہ کی پہلی خواندگی محض نمائیشی رسم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور جب دوسری خواندگی کا وقت آتا ہے تو مسودہ قانون کے عام اصولوں پر بحث کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ تفصیلات میں پڑنے کا یہ موقعہ نہیں ہوتا۔ اگر ایوان مسودہ کے عام اصولوں پر اظہار رضامندی کر دے تو سمجھا جاتا ہے کہ مسودہ کی دوسری خواندگی ہو گئی۔ اب اس منزل کی باری آتی ہے جو پارلیمانی اصطلاح میں "کمیٹی اسٹیج" کہلاتی ہے۔ قوانین نافذ الوقت کی رو سے جب کسی مسودہ کی دوسری خواندگی ہو چکتی ہے تو اسے مجالس قائمہ میں سے ایک مجلس قائمہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اِلّا یہ کہ ایسا مسودہ قانون استثنائی صورت کے تحت آجائے یا یہ کہ ایوان کسی اور کمیٹی کو اس پر غور و خوض کرنے کا حکم دے۔

دارالعوام کی مجالس قائمہ کی تعداد (۴) ہے۔

(۱) ایک تو وہ مجلس قائمہ ہے جو ان قوانین عامہ پر غور کرتی ہے جو کلیتہً اسکاٹلینڈ سے متعلق ہوتے ہیں اور اسمیں اسکاٹلینڈ کے جملہ نمایندہ ارکان شامل رہتے ہیں۔

بقیہ تین مجالس قائمہ کی تشکیل وہ مجلسِ انتخاب کرتی ہے جو ایوان کی ہر میقات کیلئے مقرر ہوتی ہے۔ اور یہی مجلس انتخاب اسکاٹلینڈ سے متعلقہ مسودات قانونی کی مجلس قائمہ میں حسب ضرورت چند اور ارکین کا اضافہ بھی کرسکتی ہے۔

ہر مجلس قائمہ کی اقل ترین تعداد (۶۰) اور نصابِ کاروبار (۲۰) ہوتا ہے۔

اور اگر کوئی مسودہ "قانون کسی مجلس قائمہ کے سپرد نہوا تو وہ "مجلسِ کل ایوان" Committee of the whole House کے روبرو پیش ہوتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت یہ "مجلس کل ایوان" ایوانِ عام ہی ہوتی ہے لیکن اس حیثیت میں وہ دارالعوام کی شان سے کسی قدر کمتر حیثیت سے کاروبار انجام دیتی ہے۔ یعنی یہ کہ اسپیکر کی کرسی خالی ہوتی ہے اور اس کی صدارت ایک صدر کرتا ہے جو ایوان کی میز کی اس کرسی پر نشست کرتا ہے جہاں اسپیکر کی موجودگی میں ایوان کا کلرک نشست کرتا ہے۔ ان مجالس کل ایوان کی ابتدا ارجو ریاستہائے متحدہ امریکہ کی Committees of the whole کے مترادف ہوتی ہیں سترھویں صدی میں ہوئی۔ ان کی ابتدا یوں ہوئی کہ اس زمانے میں اہم تر مسودات قانونی بڑی کمیٹیوں کے سپرد کئے جاتے تھے اور چونکہ ان کمیٹیوں میں جملہ ارکین کی شرکت و موجودگی دشوار رہوا کرتی تھی اس لئے اکثر اوقات احکام جاری کردئے جایا کرتے تھے کہ جو ارکین چاہیں شریک ہوں۔ احکام جاری کرنے کا یہ طریقہ عام ہوتا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ایوان کو اپنے اسپیکر پر زیادہ اعتماد نہ ہوتا تھا۔ جس کو وہ بادشاہ کا نامزد کردہ باور کرتے تھے اور اس لئے اپنے اہم مباحث کو اس کی غیر حاضری میں انجام دے لینا مناسب سمجھتے تھے۔ اس طور پر مجلس کل ایوان کی بنیاد پڑی جو درحقیقت ایوانِ عام کے ارکین ہی پر مشتمل ہوتی ہے اور اسی مقام پر اجلاس کرتی ہے۔ فرق صرف بعض رسوم، روایات اور طریق کارروائی کا ہوتا ہے۔

قواعد میں ایک حالیہ تبدیلی سے قبل دوسری خواندگی کے بعد جملہ مسودات قانونی "ایک مجلس کل ایوان" کے روبرو پیش ہوتے تھے۔ اِلّا یہ کہ ایوان نے اس کے برعکس حکم دیا ہو۔ آج کل مفروضہ اس کے برخلاف ہے۔

یعنی جملہ مسودات قانون سوائے ایک قسمِ خاص کے مجالس قائمہ کے سپرد ہو جاتے ہیں بشرطیکہ ایوان نے اس کے برعکس حکم نہ دیا ہو۔ لیکن آج بھی مسوداتِ مالی اور دیگر مسوداتِ رقمی کا "مجلس کل ایوان" کے روبرو پیش ہونا ضروری ہے اور جب کبھی کسی اہم یا مابہ النزاع مسودہ قانون کو کسی مجلس قائمہ کے سپرد کرنے کی تجویز کی جاتی ہے تو اس کی سخت مخالفت ہوتی ہے کیونکہ باوجود حالیہ تبدیلیوں کے اکثر اراکین کی رائے میں ہر رکن ایوان کو مسودۂ قانون کے تفصیلی ابواب پر بحث کرنے کا موقع حاصل ہونا چاہیے۔

جب کوئی مسودہ قانون کسی مجلس قائمہ یا "مجلس کل ایوان" کے روبرو پیش ہو جاتا ہے تو ایسی مجلس پورے قانون پر دفعہ بہ دفعہ تفصیلی طور پر غور کرتی ہے۔ جو ترمیمات پیش ہوتی ہیں ان پر بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ اگر مزید دفعات کا اضافہ مقصود ہوتا ہے تو اس پر بھی غور و خوض ہوتا ہے۔ اہم اور مابہ النزاع مسودات قانونی کی صورت میں یہ بحث مباحثے کئی روز بلکہ کئی ہفتے جاری رہتے ہیں اور مجوزہ ترمیمات سے پارلیمنٹری اطلاعناموں کے کئی اوراق پُر ہو جاتے ہیں۔ جب بحث مباحثہ ختم ہو جاتا ہے تو مجلس کا صدر اسپیکر کو ایک سادہ اطلاع دیتا ہے کہ آیا مسودہ قانون میں کوئی ترمیم ہوئی یا نہیں؟

بعض مسودات قانونی کی صورت میں مسودہ قانون بجائے کسی مجلس قائمہ کے روبرو پیش ہونے کے کسی سلیکٹ کمیٹی یا ہر دو ایوانوں کی متحدہ کمیٹی کے روبرو پیش ہوتا ہے۔ ایسی صورتیں شاذ ہی ہوتی ہیں اور اس طریق کار کو اختیار کرنے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس صورت میں گواہوں کو طلب کر کے شہادتیں قلمبند کیجاتی ہیں۔ اور اس امر کا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ مسودۂ قانون مبنی بر مصلحت ہے یا نہیں۔ یا یہ کہ اس کے مختلف دفعات کے کیا اثرات مترتب ہوں گے۔ اس نوع کی کمیٹیاں بالعموم اپنی روداد میں علحدہ پیش کرتی ہیں جس میں اپنی رائے اور وجوہات پیش کرتی ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ جن مسودات قانونی پر ایسی کمیٹیاں غور کرتی ہیں بعد میں ایک مجلسِ کل ایوان میں ان پر دوبارہ غور کیا جاتا ہے۔

اس نوبت پر مسودۂ قانون کا "کمیٹی اسٹیج" ختم ہوتا ہے اور "رپورٹ اسٹیج" شروع ہوتا ہے۔ اسپیکر کی صدارت میں ایوان کا باضابطہ اجلاس ہوتا ہے اور کمیٹیوں کی رپورٹ کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسودہ قانون پر بحث مباحثہ ہوتا ہے اور اس امر کا تصفیہ ہوتا ہے کہ آیا اس مسودہ میں مزید تبدیلیوں کی ضرورت

ہے یا نہیں ؟

دارالعوام میں مسودہ قانون کی آخری منزل مسودہ کی "تیسری خواندگی" ہوتی ہے۔ اس نوبت پر صرف رسمی یا لفظی تبدیلیوں کی اجازت ہوتی ہے۔ ایوان مسودۂ قانون پر من حیث الکل غور کرتا اور تصفیہ کرتا ہے کہ آیا اس کی رائے میں اس مسودہ کو قانون کی شکل دی جانی چاہیئے یا نہیں ؟

جب کوئی مسودہ قانون دارالعوام کی جملہ منازل طے کرلیتا ہے تو ایک رسمی پیام کے ساتھ اس کو دارالامراء میں روانہ کردیا جاتا ہے۔ جہاں چند جزئی اختلافات کے ساتھ مسودۂ قانون کو انہیں تمام منازل سے گزرنا پڑتا ہے جن سے کہ وہ دارالعوام میں گزرچکا ہے۔ دارالامراء چاہے مسودۂ قانون کو مسترد کرسکتا ہے چاہے اسمیں ترمیم۔ لیکن جیسا کہ ہم ابھی بتائیں گے کہ دارالامراء کو کسی مسودۂ مالی یا رقمی میں ترمیم کرنے کا اختیار نہیں ہے اور نہ وہ دیگر مسودات قانونی کو مسترد ہی کرسکتا ہے بلکہ ان کی منظوری کو دو سال تک ملتوی کرسکتا ہے۔

اگر دارالامراء مسودۂ قانون میں ترمیم کرے تو ایک پیام کے ساتھ کہ دارالعوام بھی ان کی اس ترمیم سے اتفاق کرے مسودہ قانون کو دوبارہ دارالعوام میں روانہ کردیا جاتا ہے۔ دونوں ایوانوں میں اختلاف رائے کی صورت میں مسودۂ قانون کے حامیوں اور مخالفین کے مابین غیر رسمی گفت و شنید شروع ہوتی ہے ترمیمات اور جوابی ترمیمات کا سلسلہ ہر دو ایوانوں کے مابین شروع ہوتا ہے تاآنکہ کسی فیصلہ پر پہنچ جائیں۔ اور اگر دارالامراء اپنے استدلال پر مصر ہی رہے تو دو سال کے بعد وہ مسودہ خود بخود قانون بن جاتا ہے یعنی اسے شاہی منظوری کیلئے پیش کردیا جاتا ہے۔

جب کوئی مسودہ قانون ہر دو ایوانوں کی جملہ منازل کو طے کرچکتا ہے تو اسکی آخری منزل شاہی منظوری ہوتی ہے۔ یہ شاہی منظوری مسودات قانون کے مجموعوں کو جوں جوں وہ منظور ہوتے ہیں باری باری دیجاتی ہے۔ یہ سب سے بڑا مجموعہ شاہی منظوری کے لئے میقات کے اخیر میں پیش ہوتا ہے۔

شاہی منظوری کی یہ رسم شاہان جارو بیہ کے زمانہ کی یادگار ہے۔ اور دارالامراء میں ادا کیجاتی ہے۔ شاہ کی نمایندگی لارڈ کمشنر کرتے ہیں جو تخت کے بالمقابل دستہ وار کرسیوں پر ایک صف میں بیٹھے

رہتے ہیں۔ یہ لوگ سرخ لبادوں اور چھوٹی Cocked hats میں ملبوس ہوتے ہیں۔ بعض اوقات چند امرا معمولی بنچوں پر معمولی لباس میں نظر آتے ہیں اور کبھی نہیں۔ ایوان کے Bar کے قریب دارالعوام کا اسپیکر ایستادہ رہتا ہے جسے اس ایوان سے اس موقع پر طلب کیا جاتا ہے۔ اسپیکر کے عقب میں وہ اراکین دارالعوام کھڑے رہتے ہیں جو اس کے ہمراہ ایوان عام کے پیش دالانوں سے آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ دارالامراء کا ایک کلرک گرجدار آواز میں وہ حکم شاہی سناتا ہے جس کی رو سے شاہی منظوری عطا کیے جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ میز کی ایک جانب سے شاہی کلرک ہر مسودۂ قانون کا نام پڑھتا ہے اور پارلیمنٹ کا کلرک میز کی دوسری جانب سے وہ نارمن فرانسیسی فارمولا بہ آواز بلند کہتا ہے جو شاہی منظوری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

ملکۂ این کے عہد حکومت کے بعد سے اب تک کسی شاہ یا ملکہ نے مسودۂ قانون کو منظوری عطا کرنے سے انکار نہیں کیا۔ کیونکہ جدید العصر دستوری حکومت کے تحت بادشاہ کو اس قسم کے معاملات میں اپنے وزراء کے مشورہ پر کاربند ہونا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ وزراء جس مسودہ قانون کے قانون بننے کو پسند نہیں کرتے اسے وہ اس منزل پر جہاں کہ شاہی منظوری عطا ہوتی ہے آنے سے بہت پہلے ہی کسی نوبت پر ختم کر سکتے ہیں۔

ملحوظ رہے کہ کوئی مسودۂ قانون کوئی اور شخص بجز کسی رکن پارلیمنٹ کے نہیں پیش کر سکتا۔ اسی لئے جب کوئی وزیر کوئی مسودہ قانون پیش کرتا ہے تو بہ حیثیت وزیر کے نہیں کرتا بلکہ اس ایوان کے رکن کی حیثیت سے پیش کرتا ہے جس سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ کسی سرکاری مسودۂ قانون یعنی اس مسودۂ قانون میں جو کوئی رکن حکومت پیش کرتا ہے اور غیر سرکاری مسودہ قانون یعنی اس مسودہ قانون میں جو کوئی اور رکن پارلیمنٹ پیش کرتا ہے بہ لحاظ ہیکل ظاہری کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن یہاں یہ جتا دینا ضروری ہے کہ باوجود اس مشابہت ہیکل ظاہری کے دونوں اقسام کے مسودات قانونی کے رتبۂ قانون پانے کے امکانات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایسے مسودہ قانونی کی کامیابی کسی قدر دشوار ہی ہوتی ہے جو کوئی رکن غیر سرکاری پیش کرتا ہے بجز اس کے کہ موضوع مسودہ قانون کوئی امر غیر نزاعی یا غیر اہم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی رکن کسی موضوع پر قانون سازی کا منصوبہ کرتا ہے تو اسے کئی طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مسودہ قانون کی تیاری میں اسے ماہرانہ امداد حاصل کرنے میں دقتیں پیش آتی ہیں۔ پارلیمنٹ میں

اپنے مسودۂ قانون پر مباحثے کے لئے وقت حاصل کرنے میں اسے مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے بہذا وقت اگر مباحثہ کیلئے وقت مل بھی جائے تو پارلیمنٹری اختلافات پر قابو پانے کے لئے کافی عوامل کے حاصل کرنے اور ان پر قابو رکھنے کی دشواریاں اسے ہراساں کرتی رہتی ہیں۔ ان تمام صورتوں میں بمقابل ایک غیر سرکاری رکن کے حکومت کو غیر معمولی آسانیاں حاصل رہتی ہیں۔ حکومت کے پاس ماہروں کی ایسی جماعت موجود رہتی ہے جس سے مسودۂ قانون کی تیاری اور موضوع قانون پر مفصل مواد فراہم کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے۔ پارلیمنٹ میں مباحثہ کے لئے وقت کا حاصل کرنا بھی حکومت کے لئے ایک معمولی بات ہے۔ ہر میقات کے اوائل میں غیر سرکاری اراکین کے مسودات قانون پر مباحثوں کے لئے جمعہ کے ایام مختص کردئے جاتے ہیں اور ان جمعوں کو غیر سرکاری اراکین تقدیم حاصل کرنے کی خاطر قرعہ نکالتے ہیں۔ اگر کسی رکن غیر سرکاری کا مسودۂ قانون اتنا عام فہم اور غیر نزاعی ہو کہ ایوان کے کسی گوشہ سے اس کی مخالفت کا احتمال نہ ہو اور اس طرح وہ سب کی رضامندی کے ساتھ اپنا رستہ طے کرسکتا ہو تو اسکی دوسری خواندگی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ کسی جمعہ کو اوّلِ وقت مباحثہ کے لئے پیش ہو جائے۔ نیز یہ کہ ایسا جمعہ اوائل میقات ہی میں واقع ہو۔ ورنہ ایسے مسودہ قانون کے آگے بڑھنے کی توقعات بہت کم رہتی ہیں۔

اس کے برخلاف حکومت کو پارلیمنٹری مباحثوں کے اوقات کا کثیر جزو حاصل رہتا ہے۔ اور حکومت اپنے مسودہ قانون کو آگے بڑھانے میں جملہ جماعت داری تنظیم کو استعمال کرسکتی ہے۔ لہذا ہمیں یہ معلوم کرکے متحیر نہ ہونا چاہیے کہ اگرچہ غیر سرکاری مسودات قانون ہمیشہ تعداد میں سرکاری مسودات سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں لیکن ان کے جس جزو کو قانون بننے کی سعادت نصیب ہوتی ہے وہ بہ لحاظ تناسب بہت قلیل ہوتا ہے۔ بنابریں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پارلیمنٹری قانون سازی کی اہم ترین ذمہ داری حکومت پر عائد رہتی ہے۔ کیونکہ حکومت ہی ان تمام اہم مسودات قانونی کو مرتب کرتی، انہیں پارلیمنٹ میں پیش کرتی اور پارلیمنٹ میں انکی منظوری کا اہتمام کرتی ہے جو بہ حیثیت قانون Statute books میں جگہ پاتے ہیں۔ بقول ایک موقر امریکی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بہ حالات موجودہ حکومت ہی ماہرین کے صلاح و مشورہ سے قانون سازی کرتی ہے اور اسی لئے تو بعض اوقات غیر سرکاری اراکین اس بات کے شاکی نظر آتے ہیں کہ

قانون سازی کے میدان میں ان کے حصہ کی نامناسب طور پر قطع و برید کیگئی ہے۔ البتہ اس خیال سے یک گونہ
تسکین ہو جاسکتی ہے کہ عصر جدید میں خواہ کسی قدر جداگانہ طریق کار ہی سے کیوں نہ ہو قانون سازی کے پرانے
اصول ہی پر عمل ہو رہا ہے۔ قدیم اصول یہ تھا کہ بادشاہ پارلیمنٹ کے مشورہ سے وضع قانون کرتا ہے۔
جدید العصر طریق عمل کی رو سے ہر اہم تر قانون کے نفاذ میں پہل کرنے والے اور اس کو مرتب کرنے والے وزراء
ہی ہوتے ہیں۔ مگر ہمیں یہ بات کبھی نہ بھلانی چاہیئے کہ وزارت وقت بہ الفاظ دیگر برسر اقتدار جماعت عاملہ
اس امر کا فیصلہ نہیں کر سکتی کہ کسی مسودہ قانون کو پیش ہونا یا پیش نہیں ہونا چاہیئے یا اسے منظور ہونا یا نامنظور ہونا
چاہیئے۔ لیکن دار العوام کی کاروباری تنظیم پر جو قابو کہ جماعت عاملہ کو حاصل رہتا ہے اس کے مدنظر اس قدر
ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی مسودۂ قانون کے قانون بن جانے کے امکانات کے متعلق بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔
مزید برآں اگرچہ کہ جماعت عاملہ کسی مسودہ قانون کی آخری شکل کے متعین کرنے کا مقتدرانہ اختیار نہیں رکھتی
تاہم تجاویز یا ترغیبات کے ذریعہ کسی مسودہ کو اپنی پسندیدہ شکل میں منظور کراسکنے کے بہت سارے موثر ذرائع
اسے حاصل ہیں۔

پارلیمنٹری قانون سازی کی مزید تشریح کیلئے ہم ایک ایسے مسودۂ قانون کی مثال لیتے ہیں جسکو جماعت
عاملہ کے کسی رکن نے پیش کیا ہو۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ ایسے مسودہ قانون کو آغاز سے اختتام تک کن کن منازل
سے گزرنا پڑتا ہے۔ فرض کیجیئے کہ کابینہ اپنے کسی نومبری جلسہ میں قانون مفلسین میں ہمہ گیر اصلاح کی تجویز
منظور کرتی ہے اور سال آئندہ اپنی قانون سازی کے پروگرام میں اسے ایک نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔
اس بارہ میں پہلا قدم یہ ہوگا کہ سرکاری مسودہ سازوں کو ایک مسودہ قانون کی تیاری کی ہدایات دی جائیں گی
ایسے مسودہ سازوں کی تعداد دو ہوتی ہے جو بہ لحاظ عہدہ Counsel کہلاتے ہیں ان کا تعلق محکمہ
خزانہ Treasury سے ہوتا ہے جسے ایک مرکزی محکمہ سرکار کی حیثیت حاصل ہے اور جملہ ہدایات
انھیں ٹریژری ہی کے توسط سے وصول ہوتی ہیں۔ ایسی ہدایات بالعموم بہت عام اور ہمہ گیر ہوتی ہیں۔
شخصی تبادلۂ خیالات و بحث تمحیص کے بعد کہیں فی الحقیقت کوئی مسودہ قانون مرتب ہوتا ہے بعض اوقات
کارروائی کابینہ کی ایک کمیٹی کے سپرد کی جاتی ہے جو وزیر متعلقہ کو مسودۂ قانون کے عام اصولوں کے بارہ میں

مشورہ دیتی رہتی ہے۔ ابتدائی مرتب شدہ مسودہ کی رفتہ رفتہ ترمیم و اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ مسودہ ساز وزیر متعلقہ یا محکمہ متعلقہ کے صدر دوامی یا دونوں سے روزانہ تبادلہ خیالات کرتا رہتا ہے۔ مسودہ قانون کے موضوع کی جملہ شاخوں کے ماہرین سے ملاقاتیں یا مراسلت ہوتی ہے۔ نیلی کتابوں کے ایک ضخیم ذخیرہ کی چھان بین ہوتی ہے اس موضوع پر گذشتہ نافذ شدہ قانون یا پیش کردہ مسودہ قانون کی تاریخ پر اور مسودہ قانون میں مندرجہ متعدد تجاویز کے اسباب و نتائج کی وضاحت کرتے ہوئے بہت سی یادداشتیں تحریر کرنی پڑتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر تنقید و تشریح کا قابل لحاظ مواد فراہم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طور پر پارلیمنٹ میں پیش ہونے سے قبل ہی کافی مدت مسودہ قانون پر بیت چکتی ہے۔

پارلیمنٹ میں پیش ہونے سے قبل ہی مسودۂ قانون کے مختلف نکات کے متعلق مختلف اسمات سے معلومات و آراء فراہم ہو جاتی ہونگی۔ مسودۂ قانون کئی صورتیں بدلتا ہوگا۔ متعدد مجوزہ صورتوں پر باہم دگر انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ غور کیا جاتا ہوگا اور باہم مقابلہ کیا جاتا ہوگا۔ ان تمام احتیاطوں کے باوجود جب مسودہ قانون طبع اور گشت کرایا جاتا ہے تو ترمیمات کی ایک گھٹا اُمنڈ آتی ہے۔ وزیر متعلقہ کا کام یہ ہوتا ہے کہ اپنے دوامی عملہ اور مسودہ ساز کی امداد سے ان ترمیمات کی جانچ پڑتال کرے تاکہ ان کے قبول کئے جانے یا نہ کئے جانے کے وجوہات بتائے جاسکیں۔ اور ان جملہ اعتراضات یا ترمیمات کے جوابات تیار کرے جو مسودۂ قانون کے پیش ہونے کے بعد سے مختلف نکات پر اُٹھائے گئے ہیں۔ اخباروں میں مراسلے اور مضامین شائع ہوتے ہیں ملک کے گوشہ گوشہ سے خطوط کی بھرمار شروع ہوتی ہے۔ اراکین صحافت فصیح و بلیغ اداریے تحریر کرتے ہیں اور اراکین پارلیمنٹ ان اثرات کے متعلق جو اس مسودۂ قانون کی وجہ سے ملک کی خوشحالی یا ادارات ملک کی بربادی کی صورت میں نمودار ہوں گے گرجدار تقریریں کرتے ہیں۔ مختلف مقامات و جماعتوں سے وزیر متعلقہ کے پاس وفد آنے شروع ہوتے ہیں۔

مسودہ قانون کی دوسری خواندگی اور کمیٹی اسٹیج کا درمیانی وقفہ بلکہ دوران کمیٹی میں بھی سارا وقت اسی قسم کے مسائل کی نذر ہو جاتا ہے۔ ایوان کے اندر وزیر متعلقہ کو ان تمام ترمیمات کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے جن میں سے چند تو مخالفین کی جانب سے اس مقصد سے پیش کی جاتی ہیں کہ مسودۂ قانون ناقابل کار ہو جائے اور

چیندنادان دوستوں کی جانب سے پیش کردہ ہوتی ہیں۔ ان ترمیمات کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اس قدر عجلت میں لکھی جاتی ہیں کہ ان میں قواعد کی غلطیوں، منطقی مغالطوں حتیٰ کہ دانائی اور ہوشمندی تک کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ ہر دفعہ یا جملے کے آغاز ہی پر ایسی ترمیمات کی ایک کثیر تعداد پیش ہوجاتی ہے تاکہ مباحثہ کے لئے انہیں کو اوّل موقعہ ملے۔ واضح رہے کہ قانون کی زبان کو واضح، درست اور نکتہ رس ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ایک جوشیلی مجلس میں اس قسم کی نزاکتوں کا کیونکر خیال رکھا جاسکتا ہے؟ اکثر اوقات برمحل فیصلہ کرنا ہوتا ہے اور اس امکان کا ہر وقت خیال رکھنا ہوتا ہے کہ شاید ارشماری کا حکم دیا جاسے۔ الغرض ایک وقت آتا ہے کہ ساری ترمیمات ختم ہوجاتی ہیں اور مسودہ قانون اپنی نئی دفعات کے ساتھ اس کشتی کے مشابہ ہوجاتا ہے جیسے موجوں کے تھپیڑوں نے خوب ہچکولے دئے ہوں۔ جس کے بادبانوں کے پرزے پرزے ہوگئے ہوں۔ جس کے عرشہ پر تباہ شدہ سامان کا ایک بے ترتیب انبار کثیر پڑا ہوا اور جس کی تہ میں بہت سے سوراخ ہوگئے ہوں۔ مسودہ قانون کی موجوں کی ستائی ہوئی یہ کشتی بالآخر ایک عارضی بندرگاہ میں داخل ہوجاتی ہے۔ ترمیم و اصلاح کے ایک مختصر سے وقفہ کے بعد رپورٹ اسٹیج کے موقعہ پر جنگ آزمائی کا دوبارہ آغاز ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات مسودہ قانون کی زبان کو معتد بہ حد تک واضح بنانے کا موقعہ ملتا ہے اور جب اس کا موقعہ نہیں ملتا تو اس کام کو دارالامراء کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ہم نے انگریزی پارلیمنٹ میں طریق قانون سازی کا جو سراپا اپنے قارئین کے سامنے کھینچا ہے اسمیں ہماری طرف سے کسی طرح کی زیادتی کو دخل نہیں ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ بلا کم و کاست تصویر پیش کرنے کی کوشش میں ہم نے کہیں کہیں بعضے طریقوں اور نتائج پر تنقید کرنے کی جرائت بھی کی ہے لیکن واضح رہے کہ ان تنقیدوں کے ساتھ ساتھ بعض اور امور کا لحاظ بھی ضروری ہے۔

یہہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ عام پسند قانون سازی میں محاسن کے ساتھ معائب بھی ہیں۔ اور عام پسند قانون سازی کا جو تخیل انگریزوں کے ہاں ہے اسمیں اس کے محاسن ہی کا پلہ بھاری معلوم پڑتا ہے اسمیں کوئی کلام نہیں کہ پارلیمنٹ میں پیش شدہ کسی مسودہ قانون کے مجوزات کو عام فہم، واضح اور باترتیب ہونا چاہئے اور یہ بھی درست ہے کہ کمیٹی میں ترمیمات کے باعث ان کی عام فہمی داغدار اور ان کا اصل اصول متزلزل ہوجاتا ہے،

لیکن ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ مسودہ قانون میں ان ترمیمات کی وجہ سے قابل قدر اصلاح ہو جاتی ہے اس کے مقابلہ میں زبان و بیان کے اس نقصان کی کافی سے زیادہ تلافی ہو جاتی ہے۔ پارلیمنٹ میں کسی مسودہ قانون کو منظوری کے دوران میں جن سخت امتحانی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے ان کے دوران میں اکثر ایسے نقائص اور سہو نظریاں پیش نظر ہو جاتی ہیں جن کے بارہ میں کسی بڑے سے بڑے مسودہ ساز کو بھی معذور سمجھا جاسکتا ہے اور جن کے متعلق قابل سے قابل عہدہ دار بھی پیش بینی نہیں کر سکتا۔

یہ حقیقت بھی ہمیں فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ موجودہ ضابطے اور طریق کار کے تحت ان ترمیمات سے جو کافی غور و خوض کے ساتھ پیش نہیں کیجاتیں یا جن کو بے احتیاطی میں مرتب کیا جاتا ہے کسی مسودہ قانون کو محفوظ رکھنے کے جو مواقع حاصل ہیں اونہیں وہ لوگ بہ آسانی سمجھ ہی نہیں سکتے اور نہ انکی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں جو پارلیمنٹری طریق کار اور عمل درآمد سے مانوس نہیں ہیں۔

کسی پیچیدہ مسودہ قانون کا (٦٧٠) افراد کی ایک متنوع مجلس کے روبرو تنقید و مباحثہ کے لئے پیش کیا جانا بادی النظر میں حد درجہ بعید از دانائی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر رکن متعلقہ ایسا وزیر ہو جس کی پشت پناہ حامیوں کی ایک کثیر جماعت ہو اور جسمیں وہ اوصاف ہوں جن کی وجہ سے ایسے ایوان کا اعتماد و توقیر حاصل ہوتی ہے تو یقین مانئے وہ کسی نہ کسی طرح ان تمام صبر آزما مرحلوں کے دوران میں اپنے مسودہ قانون کی حیثیت ظاہری اور روح باطنی دونوں کو اپنے تابع رکھے گا۔

یہ درست ہے کہ ایک پیچیدہ اور مابہ النزاع مسودہ قانون کو کامیابی کے ساتھ پارلیمنٹ کی طلاطم خیز بحث سے باہر نکال لانے کی صلاحیت یقیناً اعلیٰ درجہ کی قابلیت ہے۔ ان اوصاف میں تدبر، مستعدی، تبحر، استقلال اور سب سے بڑھ کر صبر اور خوش مزاجی شامل ہوتے ہیں۔ ذراسی خودسری اور تحکمانہ انداز کا اظہار یا ذراسی بدمزاجی پورے ایوان کے ایوان میں آگ بھڑکانے کے لئے کافی ہوتی ہے لیکن اگر رکن متعلقہ صلح جو ہو، ایسی صلح جوئی کہ خود اس کی شخصیت پس منظر میں نہ جا پڑے تو وہ ان ترمیمات میں جو اس کی اسکیم کے لئے مضرت رساں ہیں اور ان ترمیمات میں جو بے ضرر ہیں امتیاز کر سکتا ہے، پریشان کن بحث مباحثہ کے اثناء میں وہ ایک برمحل تجویز پیش کر کے ایوان کو اطمینان کی سانس لینے کا موقع دے سکتا ہے۔ تقسیم ارار کے مطالبہ کے

بغیر وہ اپنے ناقدین کو اپنی ترمیمات واپس لینے، یا ان میں ترمیم کرنے یا ان کو ملتوی کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے اور جب ان تمام تدبیروں میں سے کوئی تدبیر کارگر نہ ہو تو ترمیمات کو قبول کر لیتا ہے مگر آئندہ کسی نوبت پر ان ترمیمات پر غور و خوض کا حق محفوظ کروالیتا ہے۔

بر اینہم یہ صفات انگریزی اہل سیاست میں نادر الوجود نہیں ہیں۔ یہ صفات ایسی ہیں جو ان میں پارلیمنٹری تربیت کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہیں۔ جن لوگوں نے کسی مسودہ قانون پر "مجلس کل ایوان" یا کسی "مجلس قائمہ" کے روبرو بحث مباحثہ ہوتے دیکھا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ مندرجہ بالا تمام اوصاف برطانوی سیاست دانوں میں کتنی وافر ہوتی ہیں۔ مزید براں وہ اس بات کی بھی تصدیق کریں گے کہ انگریز سیاست دان کس طرح ہمیشہ سمجھوتہ پر آمادہ نظر آتے ہیں اور بحث مباحثہ کے پرجوش ترین لمحات میں بھی وہ کس درجہ سلامت روی اور خوش طبعی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

"کمیٹی اسٹیج" میں جو خرابیاں مسودہ قانون میں رہ جاتی ہیں یا داخل ہو جاتی ہیں "رپورٹ اسٹیج" میں ان کی اصلاح ہو جاتی ہے اور جو کچھ سقم اس کے باوجود رہ جاتا ہے اس کی اصلاح دار الامراء میں آکر ہو جاتی ہے۔ جو اس اعتبار سے کسی مسودہ قانون پر نظر ثانی کے اعلیٰ فرائض انجام دیتا ہے۔

ہم نے اپنے مضمون کی ابتداء میں بیان کیا تھا کہ مسودات قانونی کی دو قسمیں ہوتی ہیں مسودات قانون عامہ (پبلک بلز) اور مسودات قانونی خصوصی (پرائیویٹ بلز)۔ مسودات قانون عامہ کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ ان کا مقصد ملک کے عام قانون میں ترمیم یا اضافہ مقصود ہوتا ہے۔

ہم نے اب تک جس قانون سازی کا حال بتایا وہ مسودات قانون عامہ کے متعلق تھا۔ مسودہ قانون خصوصی کی منظوری کے قواعد کچھ اور ہوتے ہیں اور ان کیلئے ضابطہ بھی مختلف ہوتا ہے۔

مسودہ قانون خصوصی کا مقصد ملک کے عام قانون میں تغیر نہیں ہوتا بلکہ کسی خاص رقبے کے قانون میں تبدیلی یا اضافہ منظور ہوتا ہے، یا کسی خاص فرد یا جماعت افراد کو چند خاص حقوق عطا کرنا یا چند خاص ذمہ داریوں سے برائت عطا کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ جب مسودات خصوصی منظور ہو جاتے ہیں تو ان کو رقبہ جاتی اور خصوصی قوانین کے

زمرہ میں شامل کردیا جاتا ہے اور رقبہ جاتی اور خصوصی قوانین کا جو جدول "سالانہ رجسٹر قوانین منظورہ" Annual Statute Register میں درج ہوتا ہے اس سے ہر ایسے قانون کے موضوع کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کی طور پر ایسے خصوصی قوانین کے ذریعہ مقامی حکومتوں کو مزید اختیارات عطا کئے جاتے ہیں یا مقامی مجالس کے دستور میں ترمیم کی جاتی ہے یا ریلوے کمپنیوں' فراہمی قوت برقی اور فراہمی آب کی تجارتی کمپنیوں کے اختیارات میں توسیع و ترمیم کی جاتی ہے۔

ایک معمولی ریلوے کے مسودہ قانون کے لیجیے۔ یہ مسودہ قانون خصوصی کی اچھی نظیر ہے۔ اس نوع کے خصوصی قانون کے مسودہ کے پیش کرنے سے قبل چند خاص قسم کے اعلانات کا شائع کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ ان لوگوں کو مسودہ قانون کے پیش ہونے کی قبل از وقت اطلاع ملجائے جن کے مفادات مجوزہ مسودہ قانون سے متاثر ہونے والے ہوتے ہیں۔ مثلاً ان لوگوں کو آگاہی ہوجائے جن کی اراضی کاروبار زیر بحث سے متاثر ہونیوالی ہو۔ اکثر صورتوں میں اس قسم کے کاروبار کی نوعیت کا ایک خاکہ اور مصارف مجوزہ کا تخمینہ بھی اُن معینہ تواریخ کے قبل از قبل معینہ مقامات میں داخل کرنا ہوتا ہے جن کا تعین ہر دو ایوانوں کے نافذ کردہ احکام سے ہوتا ہے۔ ان تمام امور کے متعلق شرائط و قواعد کا تعین نافذ العمل احکام سے ہوتا ہے۔ اور مخصوص عہدہ دار اس امر کی نگرانی کرتے رہتے ہیں کہ آیا کسی ایوان میں اس نوع کے مسودہ قانون کے پیش ہونے سے قبل ان شرائط کی تکمیل ہوچکی ہے یا نہیں۔ اگر ان تمام قواعد کی پابندی ہوچکی ہے تو مسودہ قانون کو ایوان کے روبرو پیش کرکے اسکی پہلی خواندگی کرائی جاسکتی ہے۔ اس کی دوسری خواندگی کا انحصار عام مسودہ قانون عامہ کے مثل ایوان کی مرضی پر ہوتا ہے۔ بالعموم خصوصی مسودۂ قانون کی دوسری خواندگی کی اجازت دینے سے انکار نہیں کیا جاتا۔ بجز اس کے کہ کسی ایسے اصول کا اختلاف آپڑے کہ مسودہ قانون کے آگے بڑھنے سے قبل اس کا طے پاجانا ناگزیر ہو جب مسودہ قانون کی دوسری خواندگی ہوچکتی ہے تو اس کو ایک مختصر سی کمیٹی کے سپرد کردیا جاتا ہے جو بالعموم چار ارکین پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر مسودۂ قانون خصوصی کے ساتھ ایک دیباچہ Preamble ہوتا ہے جسمیں وہ اسباب بتائے جاتے ہیں جن کے باعث اس قسم کے قانون کی ضرورت داعی ہوئی۔ مذکورہ بالا کمیٹی کا پہلا کام یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ آیا اس کی رائے میں دیباچہ ثابت ہے؟ یعنی آیا اس قسم کے

قانون کے وضع کرنے کی کافی وجہ موجود ہے۔ اگر کمیٹی کی رائے میں معقول وجہ موجود ہو تو پھر کمیٹی مسودہ قانون پر دفعہ وار غور کرتی ہے۔ ان میں اپنی رائے کے مطابق ترمیمات کرتی اور بالآخر ایوان میں مسودہ قانون کی رویداد روانہ کردیتی ہے۔ اس کمیٹی کے کام کی نوعیت عدالتی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ہر دفعہ پر اور ہر مجوزہ ترمیم پر وکلا کی بحث سماعت کرتی گواہوں کی شہادت قلمبند کرتی اور سرکاری محکموں کی رپورٹوں پر غور کرتی ہے۔ غرضکہ اس کا کام بظاہر قانون سازی سے تعلق رکھتا ہے لیکن دیگر ممالک میں انتظامی نوعیت کا سمجھا جاسکتا ہے۔ اور انتظامی اصولوں ہی پر حکومت عاملہ کے کسی سررشتہ کے تفویض کردیا جاسکتا ہے۔

جب مسودہ قانون خصوصی کی بابت کمیٹی ایوان میں رپورٹ پیش کردیتی ہے تو ایوان میں اس رویداد پر غور کیا جاتا ہے۔ اسکی تیسری خواندگی ہوتی ہے اور ایک مسودہ قانون عامہ کے مثل منظوری کے مابقی مدارج طے ہوتے ہیں لیکن یہاں بھی اختلافات کا موقع کم ہوتا ہے بجز اس کے کہ کسی عام اصول پر اختلاف رائے پیدا ہو ہر دو ایوانوں کا عمل درآمد اور مروجہ دستور یہ ہے کہ مسودہ قانون خصوصی کے متعلقہ مسائل مختصر سی کمیٹی میں بطریق احسن طے ہوسکتے ہیں بمقابلہ ایک وسیع اور کثیر التعداد مجلس کے۔

مسودات قانون خصوصی کے ذریعہ قانون سازی بیش خرچ کام ہے۔ ہر ایوان کے احکام نافذہ کی روسے اداشدنی فیس اعلیٰ ہوتی ہے۔ پارلیمنٹری وکلاء اور پارلیمنٹری ایجنٹوں کے معاوضے اس سے زیادہ اعلیٰ ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس نوع کی قانون سازی کی تعداد اور اہمیت میں نسبتاً تخفیف کا رجحان پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ قوانین عامہ مثلاً قانون صحت عامہ ۱۸۷۵ء اور اس کے مابعد کے قوانین نے اکثر ایسے مسائل کو اپنے اندر ضم کرلیا ہے جن کے متعلق پہلے قوانین خصوصی نافذ ہوا کرتے تھے اور پہلے بہت سارے ایسے مسائل جن کیلئے جداگانہ قوانین کی ضرورت ہوا کرتی تھی اب ان کے لئے محض ایک مشروط حکم کفایت کرتا ہے۔ یہ مشروط حکم کسی محکمہ سرکاری مثل لوکل گورنمنٹ بورڈ یا بورڈ آف ٹریڈ کی جانب سے جاری کیا جاتا ہے اور مقامی اعلانات کی اشاعت اور مقامی طور پر تنقیح کے بعد نافذ ہوتا ہے۔ اور جسمیں وہ تمام امور درج ہوتے ہیں جو کسی مسودہ قانون خصوصی میں ہوا کرتے ہیں۔ جب محکمہ سرکار سے یہ حکم نافذ ہوتا ہے تو پارلیمنٹ سے اسکی توثیق درکار ہوتی ہے۔ اور اس توثیق کے حاصل کرنے کی غرض سے وزیر متعلقہ ایک مسودہ قانون پیش کرتا ہے کہ حکم مذکور کی توثیق

کی جائے ۔ اور یہ مسودہ قانون اپنی منظوری کے وہ جملہ مراحل طے کرتا ہے جو کسی معمولی خصوصی قانون کو کرنے پڑتے ہیں ۔ ہوسکتا ہے کہ اسکی مخالفت ہو اور جب یہ مخالفت کمیٹی اسٹیج میں ہوتی ہے تو کافی اخراجات لاحق ہوتے ہیں لیکن عموماً اعتراضات کی تسلی بخش جوابدہی کیلئے ابتدائی تنقیح ہی کفایت کرجاتی ہے اور احکام مشروط کی توثیق کے مسودات قانون میں سے اکثر پارلیمنٹ میں بلا اختلاف منظور ہوجاتے ہیں ۔

واضح رہے کہ مسودۂ قانون خصوصی اور مسودۂ قانون عامہ کے درمیان ایک قطعی حد فاصل قائم کرنا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا اور نہ یہ طے کرنا ہمیشہ سہل ہوتا ہے کہ کہاں تک کسی قانون عامہ میں مقامی ضروریات کے لئے کسی قانون خصوصی کے ذریعہ ترمیم کی اجازت دینی مصلحت آمیز ہے ۔ اور یہ ایک باریک بات ہے کہ اس نوعیت کی قانون سازی بڑی باریک بینی کی متقضی ہوتی ہے ۔ آج کل دارالعوام اپنی ہر سیشن کے اوائل میں ایک خصوصی کمیٹی موسومہ

Local Legislation Committee

مقرر کرتا ہے اور بلدی و دیگر مقامی مجالس انتظامی کی جانب سے پیش کردہ ایسے مسودات خصوصی اسی کمیٹی کے پاس بہ غرض غور پیش کئے جاتے ہیں جن کے ذریعہ پولس یا صفائی کے اختیارات دئے جانے مقصود ہوتے ہیں یا قانون عامہ کے حدود سے زیادہ یا اس سے مختلف یا متضاد قوانین خصوصی کی منظوری طلب کی جاتی ہے فقط

(آخری)

شیخ محبوب علی بی اے متعلم ال ال بی

دل یہ کبھی تو کعبہ ہے اور کبھی سومنات ہے

اشک بہا کے کیوں کہوں
جو ہے سو بے ثبات ہے

ذوقِ تغیرات میں
تازگیٔ حیات ہے

جامۂ زندگی کا رنگ
تازہ بتازہ نو بنو

حسنِ رخِ حیات ہے
عظمتِ کائنات ہے

لمحہ بہ لمحہ شانِ نو
ملتی ہے سب کو جانِ نو

نہ یہ فنا کی دستبرد
نہ یہ اجل کی گھات ہے

شمس و قمر ہیں جامہ زیب اختر چرخ دلفریب
کارگہِ جمال ہے
جلوہ گہِ صفات ہے

نقطۂ تیز سیر سے بن گئے دائرے یہاں
لاکھ طرح ہوئی بیاں
اصل میں ایک بات ہے

ہوگئیں کیا منظر فروز کثرت غم کی ظلمتیں
اُتنی ہے تابش نجوم
جتنی اندھیری رات ہے

شغل مرا صنم گری اور کبھی حرم گری
دل یہ کبھی تو کعبہ ہے
اور کبھی سومنات ہے

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
استاذ فلسفہ

سنسکرت شاعری میں محبت کا عنصر

سنسکرت ادب کی آج تک تھاہ نہیں ملی۔ ایک ساگر ہے جتنا ڈوبو اتنا ہی گہرا معلوم ہوتا ہے۔ اسکی ادبی فضا میں جب ہم پہلا قدم رکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسکی بنیاد ہی "محبت" پر قائم ہے اور بالخصوص نظموں میں "محبت کا عنصر"۔ اپنے انتہائی کمال کو پہنچ چکا ہے۔ پتنجلی کی مہا بھاشا جو کہ دوسری صدی عیسوی کے دور کی بتائی جاتی ہے اس میں بہت سے قصوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مثلاً یاوکریت۔ پری یانگور۔ ییاتی۔ وسودت۔ سمنتار۔ اور بھیمردہ وغیرہ۔ ہم کو ان قصوں کے مفصل حالات سے کوئی سروکار نہیں۔ البتہ وسودت کا پورا قصہ عشق و محبت کی چاشنی لئے ہوئے ہے۔ اس میں اکثر جگہ پتنجلی نے بہترین ترنم آمیز اشعار بھی درج کئے ہیں۔ ایک موقع پر صبح کا سماں یوں کھینچا ہے۔

"اے صبح کی خوبصورت دیوی! تاریکی سے نکل۔ اپنے محبوب کی گردن سے باہیں
ڈھیلی کر دیکھ مرغ بانگ دینے لگے اور صبح کے ستاروں کے دیئے ٹمٹمانے لگے۔"

اکثر سنسکرت مصنفوں سے یہ روایت ہے کہ دورِ قدیم میں پنی نی نامی ایک شاعر گذرا ہے جس کی دو نظمیں پتال وجے اور جامبودتی شہرت دوام رکھتی ہیں۔ ایک نظم میں اس نے شام کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

"ملکۂ شب ضیا باری کرتی ہوئی شام کی سرحد میں داخل ہو چکی ہے اور نیلگوں آسماں پر اپنی حسین ہمجولیوں (ستاروں) کی منتظر ہے جو اپنے رخ سے صبح کی نقاب اُلٹ کر آنے ہی کو ہیں اُس کو محویت انتظار میں اس کی بھی خبر نہیں کہ اس کے ساتھ جو شمع تاریک افروز تھی اُس نے سمتِ مشرق کو بالکل تاریک کر دیا ہے اور اس (ملکہ) کی اس بیباکانہ حرکت سے شہِ شرق کا چہرہ مارے غصہ کے لال ہو گیا ہے۔"

اسوگھوسا جو سنسکرت کے دورِ اوّلین سے تعلق رکھتا ہے اسکی دو مشہور تصنیفین سنٹرل ایشیا میں پائی گئیں۔ ایک تو ڈراما ہے اور دوسری ایک نظم ہے جس میں محبت کے فلسفہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نند اور سندری کی حسن و عشق سے بھری ہوئی مثنویاں بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں لیکن اسوگھوسا کی نظم مسلسل کا پیرایۂ بیان حد درجہ دلچسپ ہے۔ یہ سنسکرت کا مشہور مصنف بھی وہی پرانی داستان دہراتا ہے اور عورت کو دنیا کی تمام برائیوں کا مرکز بتاتا ہے۔

"تند مزاج اور پرجوش عورت خطرہ کا سبب بنتی ہے اور ایسی عورت جس میں جذبہ ہی نہ ہو وہ بھی بالعموم خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ پس جبکہ ہر دو صورتوں میں "عورت" موجب اضطرار و پریشانی ہے تو لوگ کیوں اس سے گریز نہیں کرتے۔"

"عورت کے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ نہایت شیریں معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے دل میں زہر بھرا ہوا ہوتا ہے۔"

اوائل سنہ عیسوی کے اکثر سنسکرت کے منظوم کتبے جو ہمیں ملے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنسکرت کے شعراء شاہی درباروں میں باریاب تھے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سنسکرت کی پرورش شرفاء اور عالی طبقہ کے لوگوں میں ہوئی ہے اور سنسکرت کی ابتدائی نظموں "کو ہم دیکھتے ہیں کہ شروع ہی سے اس میں دلفریبی و دلکشی پیدا ہو گئی تھی جو پڑھنے والے کو اپنا گرویدہ کر لیتی تھیں۔

اس سے پہلے جو بیان کیا گیا اس سے یہ مراد نہ لینا چاہئے کہ چونکہ سنسکرت کے شعراء دربارِ شاہی میں باریاب تھے۔ اس لئے اس کو بہت جلد ترقی ہوئی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی تصنیفات جن میں محبت کی کافی

چاشنی تھی۔ مقبول عام ہوئیں اور بہت جلد لوگوں کے دلوں پر اپنا قبضہ جما لیا۔ عام طور پر سوائے "میگھ دوت" "گیتا گووند" اور چند تصنیفات کے سنسکرت کی تمام عشقیہ نظموں میں کسی قسم کا تسلسل نہیں پایا جاتا اور نہ ان میں ردیف و قافیہ کی کہیں پابندی نظر آتی ہے۔ بلکہ ہر جملہ اپنے مطلب کا آپ حامل ہوتا ہے۔ ہم کو سنسکرت کے ابتدائی دور کا پہلا دلچسپ ذخیرہ جو حاصل ہوتا ہے وہ سات سو شعروں پر مشتمل ہے اور ان کو مشہور شاعر ہالا ستا ہوا سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ ان تمام اشعار کا مفصل تذکرہ کیا جاسکے البتہ ہم بعض دلچسپ اشعار کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ جدائی کی تکالیف کو کن پُر درد الفاظ میں بیان کیا ہے :-

"وہ غریب لڑکی اس قدر روئی جتنا کہ وہ رو سکتی تھی اس نے اپنے جسم کو اس قدر نحیف و زار کر لیا جتنا کہ وہ کر سکتی تھی اور اس وقت تک سرد آہیں بھرتی رہی جب تک کہ اسکی سانس چلتی رہی۔"

"اس دنیائے فانی میں "محبت" دھوکے اور مکاری کا نام ہے اس لئے کہ جس نے محبت کی وہ ہمیشہ مصائب و آلام میں مبتلا رہا اور جب تک زندہ رہا انتظار کی کٹھن گھڑیاں کاٹتا رہا"

"آج صرف ایک دن کے لئے میرے محبوب! مجھ کو روتا چھوڑ کر نہ جا اور کل جب تو جائے گا تو میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ ایک آنسو بھی نہ بہاؤنگی اگر میں زندہ رہی"

"وہ عورتیں کسقدر خوش نصیب ہیں جن کو خواب میں اپنے پریتم کا دیدار نصیب ہوتا ہے اس لئے کہ جدائی کے بے پایاں صدموں سے جب نیند ہی نہیں آتی تو خواب کا کیا ذکر۔"

فرقت کے کٹھن لمحوں میں ایک خیالی عاشق اپنے دل کو یوں تسکین دیتا ہے :-

"اس کا خوبصورت جاذب نظر چہرہ ابتک میری آنکھوں میں پھر رہا ہے اور میرا جسم اس کو محسوس کرتا ہے۔ اس کی شیریں آواز ابتک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اور ابتک میرا دل اس کے دل سے وابستہ ہے۔ پھر میں یہ کیونکر کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے جدا ہوگئی۔"

جب محبوب اپنی محبوبہ سے جدا ہوتے وقت اس بات کی التجا کرتا ہے کہ وہ اسے فراموش نہ کردے تو

وہ یوں جواب دیتی ہے ۔

"یاد تو اس شخص کو کیا جاتا ہے جو بھلا دیا گیا ہو ۔ محبت حقیقی معنوں میں محبت نہیں ہے اگر
وہ اس بات کی محتاج ہو کہ اسے یاد کیا جائے ۔"

محبت میں عہد کے پورے ہونے پر جو مسرت حقیقی حاصل ہوتی ہے اس کو کس نزاکت سے بیان کیا گیا ہے ۔

"ہر آنیوالی گھڑی اُسے خوش آیند معلوم ہوتی ہے ۔ جب وہ دیکھتا ہے تو اس کی آنکھیں بادۂ عشق
سے چھلکتی نظر آتی ہیں ۔ جب وہ بات کرتا ہے تو اس کی گفتگو سے گلہائے مسرت کی بو آتی
ہے اور جب وہ سوچتا ہے تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اس نے دنیا کو فتح کرلیا ہے ۔"

برخلاف اس کے وعدہ کے ایفا نہ ہونے پر محبوب یوں اپنے دل کو تسکین دیتا ہے ؎

"اس کے حسین دلکش حسن کو تنہا رہنے دو ۔ مجھ کو اس کی ضرورت نہیں صرف اس جگہ کو
جہاں وہ رہتی ہے دیکھ لینے سے مجھے دیدار کا لطف حاصل ہو جاتا ہے ۔"

امارو نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے ۔

"میں نہیں چاہتا کہ اس سے لطفِ ملاقات حاصل کروں ۔ بلکہ جب میں اس کے کوچے میں
پھر پھر کر کھڑکیوں سے اسے دیکھنے کی لاحاصل کوشش کرتا ہوں تو میں بے حد محظوظ ہوتا ہوں ۔"

یہاں یہ خیال اس دلچسپ واقعہ کی یاد دلاتا ہے جب مادھو اپنی محبوبہ مالتی کے کوچے میں گشت لگایا کرتا
تھا ۔ عورت کے انتہائے حسن کو کس قدر بہتر الفاظ میں بیان کیا ہے ۔

"اس کے حسین جسم کے جس حصّہ پر نظر پڑی وہیں جم کر رہ گئی آج تک کسی نے اُس سراپا
حسن کو مکمل طور پر نہیں دیکھا ۔"

ایک دوشیزہ جو اپنے رازِ محبت کو کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی ۔ اُس سے اُسکی ایک سہیلی یوں ہمکلام ہوتی ہے ۔

"اگر تم اُس سے محبت نہیں کرتیں تو پھر اس کا نام لینے سے تمہارا چہرہ کیوں شگفتہ ہو جاتا ہے
مانند اس کنول کے جو سورج کی شعاعوں کے پڑتے ہی کھل جاتا ہے ۔"

ایک دوسری نو گرفتارِ محبت اپنی سہیلی پر اعتماد کرتی ہے ۔

"جب میرا محبوب آتا ہے تو میں دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہوں گویا کہ میں اسے
دیکھنا نہیں چاہتی لیکن پیاری سہیلی! میرے جسم میں انتہائے مسرت سے ارتعاش کی سی
کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کو میں چھپا نہیں سکتی۔"

محبوبہ اپنے محبوب سے بدگمان ہو کر اس کو اس طرح جھڑکتی ہے۔

"وہ الفاظ اور ہوتے ہیں جو دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں اور اثر رکھتے ہیں جاؤ۔ چلے جاؤ۔
ان جھوٹے پیالوں سے کیا فائدہ جو صرف لبوں تک ہی محدود رہتے ہیں۔"

"ہاں تم نے ٹھیک کہا۔ اُس عورت کے پاس حسن بھی ہے روپیہ بھی ہے۔ اور میں بدصورت
ہوں اور غریب بھی ہوں لیکن کہو کیا محبت کا یہی شیوہ ہے کہ ایک سے محبت کر کے اسے
برباد کر دیا جائے۔ صرف اس لئے کہ خدا نے اسے حسین نہیں بنایا اور اس کو دولت نہیں دی۔"

کس قدر نازک اور لطیف خیالات ہیں۔

"جب وہ نہا کر کھڑی ہوتی ہے اور اپنے دراز سیاہ بالوں کو شانوں پر منتشر کر دیتی ہے تو
ان بالوں کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس خوف سے کہ اب اُنھیں کس کر باندھ دیا جائیگا۔"

"صحرا کی حسین دوشیزہ جب کسی پیاسے تھکے ماندہ مسافر کے پیاسے چلو میں اپنے گاگر سے
پانی ڈالتی ہے تو پردیسی مسافر اس کے حسن سے مسحور ہو کر اس کے حسین چہرہ پر اپنی نظریں
جما دیتا ہے اور اسے اُسکی خبر بھی نہیں ہوتی کہ پانی اس کی انگلیوں میں سے ہوتا ہوا زمین پر
گر رہا ہے"

"پھول بیچنے والی حسینہ کے حسن کو دیکھ کر منچلی طبیعت کا نوجوان آہستہ آہستہ اُس کے قریب
پہونچتا ہے اور اس سے پھولوں کی قیمت پوچھتا ہے اگرچہ کہ وہ ان کو خریدنا نہیں چاہتا"

"کھیت کی رکھوالی کرنیوالی کسان کی خوبصورت لڑکی دم بھر کے لئے بھی اطمینان سے لیٹنے
نہیں پاتی اس لئے کہ ہر راہ گیر اُس سے راستہ پوچھنے کے لئے کچھ دیر ٹھہر جاتا ہے حالانکہ
ہر ایک راستہ سے واقف رہتا ہے۔"

"عورت محبت کے دیوتا کے سامنے قسم کھاتی ہے کہ وہ اپنے محبوب سے نہ صرف اس دنیا
میں بلکہ دوسری دنیا میں بھی محبت کرے گی۔ صرف اس شرط پر کہ جس تیر سے اُسکے محبوب نے
اُس کے دل کو زخمی کردیا ہے اسی تیر سے وہ بھی اس کے دل کو گھائل کردے۔"

محبوب اپنی روٹھی ہوئی محبوبہ کے گھر جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ چولھے کے پاس بیٹھی ہے اور اپنے غصّہ کو چھپانے کی خاطر بجھی ہوئی آگ کو پھونکنے لگتی ہے۔ تو محبوب اس کو پشیمان کرنے کے لئے کہتا ہے:۔

"آگ کبھی تمھارے پھونکنے سے روشن نہ ہوگی بلکہ دھواں ہی رہے گا اس لئے کہ آگ تمھارے
منہ کی روح پرور ہوا سے اپنے داغ کو تازہ کرتی ہوگی اور یہ سوچتی ہوگی کہ اگر میں روشن
ہوگئی تو یہ عطر بیز ہوا کے جھونکے بند ہوجائیں گے۔"

مسافر جو ہمیشہ دوران سفر میں کسی مکان یا آرام کا متلاشی رہتا ہے اکثر دیہات کی کنواریاں اسے اپنا مخاطب بناتی ہیں۔

"دوپہر کے وقت آفتاب سر پر ہوتا ہے اور سایہ تک گرمی کے خوف سے جسم کو چھوڑ کر کہیں
جانا پسند نہیں کرتا۔ اس وقت اے مسافر تو میرے مکان میں کیوں پناہ نہیں لیتا۔"
"رات تاریک ہے۔ گھر خالی ہے۔ مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اے مسافر کاش اس وقت
تو آجاتا اور آج کی رات میرا مہمان ہوتا۔"

امارو نے بھی عشقیہ نظموں میں شہرت دوام حاصل کی ہے۔ آنند وردھن نے اس کے خیالات کی بہت تعریف کی ہے۔ سنسکرت کی خیالی شاعری کا بانی اسی کو خیال کیا جاتا ہے جس نے سنسکرت کی شاعری میں ایک انقلاب پیدا کردیا اپنی ایک نظم میں وہ محبت کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ محبت میں تمام خداؤں سے زیادہ طاقت ہے۔ خوبصورت مگدھہ کے داستان کی تصویر بہتیرے سنسکرت کے شعراء نے کھینچی ہے لیکن امارو نے جس حسن و خوبی سے واقعات قلمبند کئے ہیں وہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں۔

"جب اس کی سہیلیوں نے مگدھہ کو یہ سکھانا چاہا کہ وہ ابھی بہت بھولی ہے اس اپنے پریمی
پر کافی اثر رکھنا چاہئے اور ہمیشہ اس سے ایسا سلوک کرنا چاہئے کہ وہ خوشامد کرنے پر

مجبور ہو جائے ۔ یہ سن کر اُس مجسم ناز نے معصومانہ انداز سے جواب دیا ۔ "پیاری سہلیو

ذرا آہستہ گفتگو کرو ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے دل کا مالک جو ہمیشہ دل ہی میں رہتا ہے ان

باتوں کو سُن لے ۔"

عروس نو کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے ۔

"جب اس کا شوہر اس کے لباس کو ہاتھ لگاتا ہے تو وہ شرم سے گردن جھکا لیتی ہے اور

جب وہ آغوش میں لینے کے لئے اپنے ہاتھ دراز کرتا ہے تو وہ نہایت سنجیدگی سے اس کے

ہاتھوں کو اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ہٹا دیتی ہے ۔"

" صبح جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ دیکھتی ہے کہ اسکی تمام ہمجولیاں اس کو دیکھ دیکھ کر ہنس

رہی ہیں ۔ تب وہ بات کرنا چاہتی ہے لیکن اس کی زبان نہیں کھلتی ۔"

اسی قسم کے ہزاروں لطیف اور دلچسپ اشعار امارو نے تصنیف کئے ہیں ۔ جن میں سے

چند اور مثالیں درج کیجاتی ہیں ۔

"نوجوان میاں اور بیوی کے راز و نیاز کی باتیں جو روزانہ رات کے وقت ہوتی تھیں گھر کے

پالتو طوطے نے سیکھ لیں اور صبح کو وہ انہیں الفاظ کو تمام گھر والوں کے سامنے دہرانے لگا

نوجوان بیوی شرم سے گھبرا جاتی ہے اور طوطے کی چونچ میں اپنے کان کا خوشنما ہیروں کا

بُندہ دبا دیتی ہے تاکہ طوطا اُس سے کھیلنے لگے ۔"

محبوب کی موجودگی میں عورت کے غصہ کا اظہار کس خوبی سے کیا گیا ہے ۔

"میں یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں اس سے برہم ہوں اپنی جبیں پر مصنوعی بل ڈال لیتی ہوں لیکن

میری آنکھیں یہی کہتی ہیں کہ میں اس کو گھورتی رہوں ۔ میں قصداً کوئی بات نہیں کرتی لیکن

میرے لبوں پر تبسم کی ہلکی لہر دوڑ جاتی ہے ۔ میں اپنے دل کو سخت اور سر دبنا لیتی ہوں لیکن

میرے جسم میں رعشہ سا پڑ جاتا ہے ۔ میں نہیں جانتی کہ اس کی موجودگی میں میں کب تک

اپنے غصہ کو قائم رکھ سکتی ہوں ۔"

" میں اپنی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے سے پھیر لیتی ہوں جو میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا بغور معائنہ کرتی رہتی ہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ اُس کے الفاظ کو نہ سنوں۔ لیکن محسوس کرتی ہوں کہ میری پیشانی اور گال پسینہ سے تر ہو گئے ہیں۔"

میاں بیوی کے آئے دن کی رنجشوں کو کس پُرلطف پیرایہ میں ڈھالا ہے۔

" ایک ہی بستر پر لیٹی ہوئی عروس جب اپنے شوہر کے منہ سے کسی دوسری عورت کے حُسن کی تعریف سُنتی ہے تو آتشِ رشک وحسد سے جل جاتی ہے اور انتہائی نفرت کے ساتھ اپنا رُخ اُس کی طرف سے پھیر لیتی ہے اور اس کی خوشامدوں کا کوئی لحاظ نہیں کرتی۔ اور جب شوہر مایوس ہو کر خاموش ہو جاتا ہے تو عروس چپکے چپکے اپنا رخ اس کی طرف کرتی ہے۔ اس خوف سے کہ کہیں وہ سو نہ گیا ہو۔"

" محبوب سے جب کوئی گستاخی ہو گئی تو محبوبہ کی جبیں پر بل آ گئے۔ پھر جب اُس نے بات کرنی چاہی تو اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ دھر لیا۔ اور جب اُس نے اپنی مشتاق باہیں اس کے سامنے پھیلا دیں تو وہ دور ہٹ گئی۔ پھر جب اس کے کپڑوں کو چھو لیا تو غصہ سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور جب مایوس محبوب نے خود کو اپنی مغرور محبوبہ کے قدموں گرا دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ رونے لگی۔"

" ضبطِ غم سے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اس کی محبت مجھ کو گھلا گھلا کر لاغر کر دے لیکن اب میں اس بے وفا محبوب سے کبھی نہ ملوں گی۔ اپنے محبوب کی ٹھکرائی ہوئی ناکام محبت دوشیزہ کے منہ سے یہ الفاظ انتہائی غصہ کی حالت میں نکلتے ہیں۔ لیکن پھر اُس کی مشتاق نظریں اس راہ پر جم جاتی ہیں جس طرف سے اس کا پریمی آنے والا ہوتا ہے۔"

طویل سفر سے شوہر کی واپسی پر بیوی کی حالت

"بیچاری بیوی جو کہ ہجر کے پیہم صدموں سے زرد پڑ گئی ہے۔ سارا دن بڑی بیقراری سے کاٹتی ہے۔ لیکن رات میں اس کے شوہر کے دوست اُس کو دیر تک باتوں میں لگا لیتے ہیں

اور کمرے میں شوہر کی منتظر بیوی یہ کہتے ہوئے کہ آج باتیں ختم نہ ہوں گی اپنی ریشمی ساری کا آنچل سنبھالتے ہوئے اٹھتی ہے اور روشنی کو مدھم کردیتی ہے ۔ پھر بستر پر دراز ہوکر متوحش خیالات میں گم ہوجاتی ہے ۔"

اسی قسم کے بیشمار محبت سے بھرے ہوئے اشعار امارو کے تصانیف میں ملیں گے ۔

"تیرے اعضا اس قدر کمزور کیوں ہیں؟ اور تیرے بدن میں یہ کپکپی کس لئے ہے؟ اور اے پیاری تیرے گال اس قدر زرد کیوں پڑ گئے ہیں؟ جب اس کے محبوب نے اس سے یہ سوال کیا تو اس نے کہا " میری زندگی کے مالک یہ میری فطرت ہے " اور وہاں سے ہٹ گئی اس خیال سے کہ آنسو جو اس کی آنکھوں میں بھر آئے تھے کہیں جاری نہ ہوجائیں ۔"

اب مشہور شاعر سری نگار کی سحر نگاری دیکھئے ۔

سہیلی ' عورت کے محبوب سے اس کی جدائی کا حال یوں بیان کرتی ہے :-

"جب سے وہ تم سے جدا ہوئی ہے وہ کبھی چاند کو نہیں دیکھتی اس لئے کہ اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی صورت کو بھی آئینہ میں دیکھنا پسند نہیں کرتی ۔ جب کوئل کی کوک سنتی ہے تو وہ بےچین ہوجاتی ۔ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ خود اپنی آواز سُننا پسند نہیں کرتی وہ محبت کے دیوتا کے بنائے ہوئے حسین پھول سے بھی نفرت کرتی ہے لیکن یہ بات تعجب خیز ہے کہ وہ تم سے بے حد محبت کرتی ہے جو اس کی نظروں میں "محبت کے دیوتا " سے کم نہیں ۔"

کچھ اور نازک خیالیاں ملاحظہ ہوں ۔

"میری ساس میری طرف دیکھتی ہی نہیں اور جب کبھی دیکھتی بھی ہے تو اس کے چہرے سے غصہ کے آثار نمایاں رہتے ہیں ۔ میری نند مجھ کو ہمیشہ بُرا بھلا کہتی رہتی ہے ۔ اے پیاری سہیلی تو نے جانا میری خطا کیا ہے؟ میرا یہی قصور ہے کہ " وہ " مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں!"

حسن سادہ کی تصویر کس قدر حسین کھینچی ہے۔

"تیرے سینہ کا بوجھ خود تیرے لئے ناقابل برداشت ہے پھر تو یہ مالا پہنکر اپنے بوجھ میں اضافہ کیوں کرلیتی ہے۔ تیرے پاؤں خود کمزور ہیں اور ان کے لئے تیرا جسم ہی بہت بار ہے۔ پھر تو اس میں پازیب پہنکر بوجھ کو ناقابل برداشت کیوں بنالیتی ہے۔ جب خدا نے تجھ کو خود مجسمہ حسن بنایا ہے تو اس حسن سادہ کو زیورات اور جواہرات پہن کر غیر نظری کیوں بنالیتی ہے"۔

"کلائی میں چوڑیاں نہیں۔ پاؤں میں پازیب نہیں۔ گلے میں مالا نہیں۔ باوجود اس کے جب اس کی چوڑی پیشانی پر بکھرے ہوئے بال آ آکر گستاخی کرنے لگتے ہیں تو دیکھنے والوں پر ایک عجیب کیف طاری ہو جاتا ہے۔ اُف رے حسن کی سادگی!!"

عورت غصہ کا اظہار کرنا چاہتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔

"نہ تو تم میرے پاس آتی ہو۔ نہ مجھ سے آنکھیں ملاتی ہو اور نہ مجھ سے بات ہی کرتی ہو۔ گویا کہ تم مجھ سے ناراض ہو لیکن میں اسکا کیسے یقین کرلوں۔ جب تمھارے گلابی لبوں پر ہلکا سا تبسم تمھارے دل کا راز عیاں کئے دیتا ہے"۔

عروس نو کی حیا اور شوخی میں کشمکش۔

"اگر وہ سو جاتی ہے تو اپنے شوہر کے حسین چہرہ کو دیکھ نہیں سکتی اور اگر وہ نہیں سوتی تو اس کا شوہر اُسے چھیڑتا ہے ان خیالات کی کشمکش میں نہ تو عروس نو سونے ہی پاتی ہے اور نہ جاگنے"۔

سنسکرت کے تمام شعرا میں بھاؤ بھوتی ہی صرف ایک ایسا شاعر ہے۔ جو عورت کے ظاہری حسن سے متاثر نہیں ہوتا اور گہرائی میں چلا جاتا ہے یعنی روح کی خوبصورتی سے بحث کرتا ہے لیکن ابھی ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ مرولا اور راندولیکھا کے ناموں کو بھی ہم اپنے مضمون سے حذف نہیں کرسکتے۔ یہ دونوں اپنے دور کی نامور شاعرہ تھیں، جنھوں نے اپنی بیش بہا اور نادر تصانیف سے یہ ثابت کردکھایا کہ صرف مرد ہی نہیں بلکہ صنف نازک بھی نازک اور لطیف خیالات پیدا کرسکتی ہیں۔ لیکن

افسوس ہے کہ انکا نمونۂ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

اب ہم کالی داس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

یہ سنسکرت کا وہ مشہور کوی ہے جس نے حسن و عشق کو اپنی فکر کی جولانگاہ بنایا اور شاعری کے آکاش پر ایسا آفتاب بن کر چمکا جس کی تیز کرنوں نے مشرق کیا مغرب کو بھی جگمگا دیا۔ اور سب سے زیادہ تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ اس مشہور شاعر کی بے نظیر تصنیفات نے بہ نسبت اہل ہند کے اہل یورپ سے زیادہ خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ چنانچہ الگزینڈر ہمبوٹ کہتا ہے" اپنی تصانیف میں کالیداس نے نہایت ہی اعلیٰ خوبی سے اس تاثر کو بیان کیا ہے جو کہ فطرت عاشقوں کے دلوں میں پیدا کرتی ہے"۔ کالیداس کی شاعری چند لفظوں میں "لطیف جذبات" اور مرصع خیالات کی شاعری ہے۔ استعارے اور تشبیہات عام، جذبات سچے مگر سادہ۔ حق تو یہ ہے کہ شکسپیر ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کے ساتھ اس مہا کوی کا موازنہ کیا جا سکتا ہے دونوں ڈراما نویس، دونوں فطرت انسانی کے مبصر۔ جس نگاہ سے شکسپیر کسی شے کو دیکھتا ہے اُسی نگاہ سے کالیداس بھی اسے دیکھتا ہے۔ شکسپیر کے کیریکٹروں میکبتھ، اُتھلو، رومیو، جولیٹ کی تصویروں کا کالیداس کے دشینیت، شکنتلا، پریم بدا اور اروسی کی تصویروں کے مقابلے میں رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں شاعروں نے صحیفۂ فطرتِ انسانی کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ کالیداس ازل سے "مصور کی نظر" "شاعر کا دماغ" اور "نقاش کا ہاتھ" لیکر آیا تھا، اس کا طرز اس کی پیاری گنگا کے مشابہ ہے جس کا نتھرا نتھرا پانی کچھ اور ہی شان سے گنگناتا، لہراتا اور دھیرے دھیرے بہتا چلا جاتا ہے۔ کالیداس کی تصنیفیں سات ہیں اور ان ساتوں میں سے کوئی ایک کتاب بھی اُس کے بقائے دوام کے لئے کافی ہے۔ حسین عورت اس کی امیدوں کی ابتدا، اُس کی آرزوں کی انتہا اور اُسکی دلفریبیوں کا مرکز ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی تمام شاعری محبت کے ضو سے منور، محبت کی نکہت سے معطر اور محبت کی "آشاؤں" سے معمور ہے۔

یوں تو کالیداس کی ہر تصنیف عشق و محبت کی شراب میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن "سری نگر تنک" اپنی مشہور تصنیف میں اس نے عشق کی ابتداء اور اس کا انجام نہایت ہی دلکش الفاظ میں بیان کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کالیداس کو تمام شعرائے سنسکرت پر اس لئے ترجیح ہے کہ جہاں کہیں اُس کو موقع ملا ہے اُس نے

حسن وجمال کی بہترین تصویر کھینچی ہے مشہور عام تصانیف "میگھ ودت" و کرم آروسی شکنتلا اور کمار سنبھو کے چند دلچسپ نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

"میگھ ودت" میں کالیداس نے ایک نیا قاصد بنایا وہ میگھ یعنی ابر کو اپنی حدیثِ غم سناتا ہے۔ اس افسانے کا ہیرو یکش جو کسی خطا پر جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ ابر کو اپنا قاصد بناتا ہے اور اپنی بیوی کے گھر کا پتہ بتا کر سندیسہ بھیجتا ہے راستہ کی دلفریب تصویر کتنی رنگین کھینچی ہے۔"

"اے ابر جب تو ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اُس طرف سے گزرے گا تو وہاں کے پردیسیوں کی خوبصورت عورتیں اپنے کھلے بال منہ سے ہٹا ہٹا کر تجھے الفت بھری نگاہوں سے دیکھیں گی۔ اور رات میں جب چاروں طرف تیری سیاہی چھا جائے گی تو وہاں کی رہنے والی جوانی میں مست اور محبت میں اندھی عورتیں یہ دعائیں مانگیں گی کہ اپنے محبوب کے گھر پہونچنے تک یا برنہ برسے اور نازک صاف دل عورتیں اپنے دل میں خوف کھائیں گی کہ تیرے برسنے کی وجہ سے وہ اپنے شوہروں کے پاس نہ جا سکیں گی۔ اس لئے ابر میں تجھے سمجھائے دیتا ہوں کہ تو کم سے کم دو گھڑی رات گئے تک نہ برسنا ورنہ وہ تجھے پانی پی پی کر کوسیں گی۔"

"جب کچھ رات گئے تک تو نہ برسے گا تو جوانی میں چور اور محبت میں مخمور عورتیں ڈرتے ڈرتے اپنے محبوب کے پاس جاتی ملیں گی اور تیرے سر پر چھا رہے۔ جس کی وجہ سے تاریکی اس قدر رہے گی کہ ایک ہاتھ کو دوسرا ہاتھ سوجھائی نہ دے گا۔ اس اندھیرے میں انکو راستہ تلاش کرنے میں بڑی دقت ہوگی اس لئے تو اپنی بجلی کو چمکا چمکا کر راہ دکھا دینا۔ مگر خیال رہے۔ پانی نہ برسانے لگنا۔ ورنہ وہ بیچاریاں گھبرا جائیں گی۔ تجھ کو دیکھ کر عیش کی بھوکی اور جوانی میں چور نازک بدن عورتیں کیتکی اور کنول کے پھولوں کے خوبصورت ہار گوندھ کر اپنے بالوں اور کانوں کو سجائیں گی۔ اور جب تیری خوفناک گرج ان کے کانوں میں پہونچیگی تو وہ الڑھڑپن سے بالوں کو سمیٹ کر جوڑے باندھ لیں گی اور سب کو چھوڑ کر اپنے شوہروں کی خوابگاہ کو سدھاریں گی اور جب پانی سے تر ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے دل میں سرایت کرنیوالی خوشگوار سردی پیدا ہوگی تو وہ اپنے اُبھرے ہوئے سینوں کو

رنگین کپڑوں سے چھپالیں گی اور ہوا بار بار انھیں چھیڑنے کے لئے ان کا آنچل دوش سے گرادیگی۔
جسکی وجہ سے ان کے گلے کی سنہری اور روپہلی زنجیریں چمک چمک کر عجیب بہار دیں گی اور
ایسا معلوم ہوگا کہ چاند اور سورج کے درمیان بجلی کوند رہی ہے۔"

کالیداس کی دوسری تصنیف "وکرم اروسی" ہے۔ اس کے تین ترجمے انگریزی زبان میں ہیں اور ایک ترجمہ جرمن زبان میں۔ انگریزی میں سب سے پہلا ترجمہ ولسن کا ہے جو نظم میں ہے۔ اس ڈرامے میں مہاکوی کالیداس نے زور بیان کی وہ کیفیت دکھلائی ہے کہ خیالات بادلوں کی طرح اُمڈے پڑتے ہیں اور تشبیہات کی بجلی دفعتاً ایک عجیب بے تکلفی سے چمک کر پڑھنے والے کے دل و دماغ کو روشن کردیتی ہے۔

مثلاً ایک تشبیہہ ملاحظہ ہو۔ اس ڈرامہ کا ہیرو پرورآوس اپنی محبوبہ اروسی سے کہتا ہے۔

"دیبی تمھارا آنا مبارک ہو لیکن معاف کرو تمھاری سکھی کو تمھارے ہمراہ نہ دیکھ کر اتنی خوشی نہ ہوئی جو تم دونوں کے دیکھنے سے ہوتی۔ کیونکہ گنگا جمنا کا سنگم دیکھنے کے بعد تنہا جمنا کا نظارہ اتنا بھلا نہیں معلوم ہوتا۔"

ایک موقع پر پرورآوس اروسی کی یوں تعریف کرتا ہے۔

"اس کا جسم زیوروں کا زیور اور سنگھاروں کا سنگھار ہے بادی النظر میں جو چیزیں حسن کا معیار سمجھی جاتی ہیں اگر اسکی رعنائی سے اُلٹا اکی زیبائی کا اندازہ کیا جائے تو بجا ہے۔"

اروسی اپنے دل کے جذبات کو پرورآوس کے خط میں کس عمدہ پیرایہ میں بیان کرتی ہے۔

"میرے محبوب اگر میں جس کے دل کا حال آپ سے پوشیدہ ہے، حقیقت میں آپ کے تعلق خاطر کی کیفیت معلوم ہونے کے بعد آپ کی طرف سے ویسی ہی سردمہر ہوں جیسا کہ آپ کا خیال ہے تو پھر کیا بات ہے کہ جب میں نندن بن میں ہارسنگھار کے پھولوں کی سیج پر لیٹتی ہوں تو نسیم بہار سے بھی میرے دل کو آرام نہیں ملتا اور جو پھول میرے جسم سے چھو جاتا ہے مرجھا کر فنا ہو جاتا ہے۔"

پرورآوس جب اپنی محبوبہ اروسی سے ملتا ہے تو اپنی حالتِ دل کا اظہار یوں کرتا ہے۔

"حیرت سی حیرت ہے کہ مراد کے حاصل ہو جانے سے حالت بالکل بدل جاتی ہے چاند کی وہی کرنیں اب

میرے جسم کو تازگی بخش معلوم ہوتی ہیں اور عشق کے وہی شرارے روح پرور ہیں۔"

پروُرَاوس اُروسی کی تلاش میں جنگل میں نکل آتا ہے اور وہاں کسی کو اپنا رہبر نہ پاکر راج ہنس ہی سے اپنی محبوبہ کا پتہ دریافت کرتا ہے۔

"سیاہی مائل نیلی گردن اور سفید کودن کی آنکھوں والے پرند! تونے اس جنگل میں کہیں میری دلربا صراحی دار گردن اور غزالی آنکھوں والی نازنین کو دیکھا ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت میں دیکھنے کے قابل ہے۔ اچھا اور راج ہنس یہ بتا کہ اگر تونے میری کمان ابرو سندری کو تالاب کے کنارے ٹہلتے نہیں دیکھا تو پھر اوٹو اکو تونے اس کی مستانہ چال کیسے اُڑائی۔ پس جب تونے میرے دلنواز کی چال اُڑائی ہے تو اسے بھی پیدا کر۔ کیونکہ تیرے پاس سے جب مال مسروقہ کا ایک حصہ برآمد ہوا ہے تو تو ہی باقی کا ذمہ دار ہے۔"

کالیداس کی شکنتلا کو جو مقبولیت حاصل ہوئی شاذ ہی اتنی مقبولیت کسی شاعر کی کسی تصنیف کو حاصل ہوئی ہو۔ رومیش چندر دت مصنفِ ایسٹ انڈیا (EAST INDIA) کا خیال ہے۔

"جس کسی نے شکنتلا کو پڑھا وہ یہ ضرور محسوس کریگا کہ ابتک کسی انسان کے دل میں اتنی خوبصورت اور نازک مخلوق کا خیال نہیں آیا جتنی کہ شکنتلا میں بیان کیگئی ہے۔"

شکنتلا کا کیریکٹر ملاحظہ ہو ــــــ شکنتلا عورت ہے شعر کی، درد کی۔ اس میں سیتا کی روحانیت نہیں، ساوتری کا استقلال نہیں۔ وہ ایک کمزور ہستی ہے تناور درخت نہیں۔ وہ ایک شاخ ہے جو ہواؤں سے ہلتی ہے اور ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ پھول کیطرح کومل اور پتی کی طرح نرمل ہے۔ یہی اس کا جوہر ہے ـــــ اسی نے اسے دلکش بنادیا ہے۔ شکنتلا کی سادگی دشینت کی نظر میں کتنی دلفریب ہے

"کلائی میں چوڑیاں نہیں، پاؤں میں پازیب نہیں، گلے میں مالا نہیں۔ باوجود اس کے جب اُسکی چوڑی پیشانی پر بکھرے ہوئے بال اٹکھیلیاں گستاخی کرنے لگتے ہیں تو ہر ذرہ پر ایک عجیب کیف چھا جاتا ہے۔
اُف رے حسن کی سادگی"!!

اسی کو پڑھ کر گوئٹے (GOETHE) پر وجد کا عالم طاری ہوگیا تھا اور اُس نے کہا تھا۔

" جو کچھ زمین و آسمان میں ہے وہ سب کالیداس نے ایک نام میں جمع کر دیا ہے شکنتلا کا نام زبان پر آیا اور وہ سب نعمتیں گویا مل گئیں۔"

شکنتلا کے حسن کی تعریف دشینت کی زبان سے سنئے

" اُس کے لب رنگین گلِ نو دمیدہ کی سرخی لئے ہوئے ہیں۔ اُس کے شفاف و بلوریں بازو نرم اور لچکدار ڈالیوں کے مانند ہیں اور اُس کے عضو عضو سے جوشِ شباب گل نوشگفتہ کی لطافتوں کے ساتھ نمایاں ہے۔"

کمار سمبھو مشہورِ عام مثنوی میں کالیداس نے دیبی پاربتی کے حسن کی تصویر یوں کھینچی ہے:-

" اُٹھتی ہوئی جوانی اس کے اعضا کی متناسب بالیدگی کا سبب بنی جسکی وجہ سے وہ مجسمۂ حسن بن گئی اسطرح جیسے کہ کسی تصویر میں رنگ بھر کر اُس میں جان ڈالدی گئی ہو۔"

" دمِ خرام پاؤں کے اُٹھے ہوئے انگوٹھے اور ناخونوں سے سرخی ٹپکنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا گل لالہ چن رہی ہیں۔"

" حسن کی دیوی جب چاند کیطرف دیکھتی ہے تو کنول کے دلفریب نظارے سے محروم ہو جاتی ہے اور جب وہ کنول پر توجہ کرتی ہے تو چاند کے نور سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب وہ پاربتی کے حسین چہرہ پر نظر کرتی ہے تو اُس کو کنول اور چاند دونوں کا نظارہ نصیب ہوتا ہے"

" اُس کا بے عیب حسن ایک غنچۂ ناشگفتہ ہے یا ایک نرم شاخ ہے جو ابھی خراشِ ناخن سے ناآشنا ہے یا ایک دُرِ ناسفتہ ہے۔"

کس قدر لطیف تشبیہات ہیں:-

" موتی کسی شفاف مونگے میں جاگزیں ہو یا کوئی نو دمیدہ پھول کونپل میں چھپا رہے تو اُسکے دلربا تبسم سے جس کا حسن لبِ شیریں کی سرخی نے اور بھی دوبالا کر دیا تھا تعبیر دیجا سکتی۔"

" فسون آمیز نظر کو اُس نیلے کنول سے تشبیہ دیجا سکتی ہے جو تند ہوا کے جھونکوں سے تھپیڑے کھا رہا ہو۔"

ان چند مثالوں سے جو درج کیگئی ہیں کہیں یہ نہ خیال کیا جائے کہ سنسکرت زبان کے بے بہا اشعار کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے بلکہ اس صنف کی ہر نظم اپنے اندر ایک نیا لطف اور ایک اچھوتا کیف رکھتی ہے۔ تمام نظموں میں خصوصاً " محبت " کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ نظریہ محبت اُس کے احساسات و تاثرات، بیقراری، اُمید، رشک، غصہ، ناامیدی، یاس، تمنائے ملاقات حقیقی جذبات ——— بہر حال ہر پہلو پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور اسکا حقیقی لطف تو اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ان تصنیفات کا بذات خود مطالعہ کیا جائے۔

علی احمد بی۔ اے (آخری)

جدید ترکی اور اسلام

اگر ہم انگریزی اور جرمن نظامِ حکومت کو اچھی طرح سے سمجھنے کی کوشش کریں تو ان دونوں قوموں کی تاریخ کا مطالعہ لابدی ہے کیونکہ دورِ حاضرہ کا پیچیدہ نظامِ حکومت مرورِ زمانہ کے ارتقاء کا نتیجہ ہے یہی وجہ ہے کہ موجودہ صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے جب تک ہم تاریخی پس منظر سے واقف نہ ہوجائیں اس وقت تک موجودہ تمدن و معاشرت کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ ہر نظامِ حکومت دراصل کسی قوم کی سیاسی، تمدنی اور مذہبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک مرقع ہوتا ہے اور یہ مختلف پہلو ایک دوسرے سے اتنا قریب کا تعلق رکھتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

اس چیز کا بہترین نمونہ ہم کو ترکی میں ملتا ہے جہاں مذہب اور سلطنت ایک واحد شخصیت یعنی سلطان کے اندر مرکوز ہوگئے تھے۔ اسلام میں دینوی اور مذہبی منصب ایک واحد ادارہ ہے اسلام مذہب عیسوی کے برخلاف نہ صرف اپنے پیروؤں کی مذہبی زندگی کو سنوارتا ہے بلکہ ان کی روزمرہ کی خانگی زندگی میں بھی اسی کا اثر جاری وساری ہے۔

ہر شخص اس بات کو جانتا ہے کہ جب ترکی کے اندر یکایک انقلاب ہوا تو تمام اسلامی دنیا

انگشت بدنداں ہوکر رہ گئی ترکوں کی زندگی میں یہ کتنا بڑا انقلاب تھا کہ انہوں نے اپنے ماضی کے اصولوں کو توڑ ڈالا اور قدیم روایات کو یکے بعد دیگرے چھوڑتے چلے گئے۔ ان تمام واقعات اور انقلابات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اور گذشتہ چند سالوں میں ترکی کی ترقی کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے یہ بہت مناسب ہوگا کہ ترکی کی قبل اور بعد از جنگ عظیم کی حالت کا ایک خاکہ پیش کر دیا جائے۔

قبل اس کے کہ ترکی میں مذہب کی حیثیت کو واضح کیا جائے یہ بہتر ہوگا کہ گذشتہ صدی کے دوران میں مذہب کی جو حالت دوسرے اسلامی ممالک میں پائی جاتی تھی اس پر ایک نظر ڈالی جائے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ترکوں نے اسلام کی اصلاحی تحریکات میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیا اور نہ انھوں نے بذات خود کسی تحریک کی بنا ڈالی۔ جتنی بھی اصلاحی تحریکات تھیں وہ دوسرے ممالک میں شروع ہوئیں۔

انیسویں صدی کے وسط میں ہم علامہ جمال الدین افغانی کو ایک تحریک کی رہبری کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ علامہ مرحوم پان اسلامزم کے مبلغ تھے ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ قدیم روایات کو ترک کیا جائے اور انکی بجائے لبرل ادارے قائم کئے جائیں تاکہ اس کے ذریعہ اسلام اور اسلامی ممالک کو حیات نو میسر ہوسکے۔ ہندوستان میں جو تحریک شروع ہوئی اس میں پیش پیش ہستی سر سید احمد خان مرحوم کی تھی ان کا اور ان کے احباب کا یہ خیال تھا کہ حقیقی اسلام موجودہ تمدن اور معاشرت کا دشمن نہیں ہے ان کا عقیدہ 'اجتہاد' میں تھا نہ کہ تمدن ماضیہ کی اندھی تقلید میں۔ مصر میں اصلاحی تحریک کا تعلق محمد عبدہٗ سے تھا جو ۱۸۹۹ء سے وہاں کے مفتی اعلیٰ تھے مذہبی نقطۂ نگاہ سے انھوں نے اور ان کے پیرؤوں نے 'تقلید' کی حد درجہ مخالفت کی اور بالآخر وہ مصر میں اجتہاد کو جو قرآن کریم اور سنت کی تعلیم پر مبنی تھا پھر سے داخل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان کا رسالہ 'المنار' اب تک مصری تخیلات پر کافی اثر ڈال رہا ہے۔

یہ واقعہ کہ ترکوں نے اصلاحی تحریکات میں نسبتاً بہت دیر میں حصہ لینا شروع کیا اس وجہ سے اور بھی تعجب خیز ہو جاتا جب ہم دیکھتے ہیں کہ صدیوں سے ترک اسلامی ممالک میں اپنی غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے اور باوجود اس کے وہ لاپرواہ بنے رہے۔ اس کی ایک وجہ اس واقعہ میں مضمر ہے کہ فطرتاً ترکی نسل بہ نسبت نظری ہونیکے زیادہ عملیت پسند واقع ہوئی ہے اور ان کو فلسفیانہ تصورات اور

منطقی ذہنیت کی وہ نعمت میسر نہیں جو صرف عربوں کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کی مذہبی ترقی میں بھی ترکوں کا کچھ حصہ نہیں کیونکہ جب انھوں نے اسلام قبول کیا اس وقت تک وہ ایک مکمل مذہبی نظام کی حیثیت سے ترقی پا چکا تھا۔ اس کے بالکل برعکس ترکوں نے یورپی تمدن اور مادی ترقیات میں ضم ہونیکی کوشش کی۔ مغربیت کی تحریک ان کے ہاں عسکری نقطۂ نگاہ کی وجہ سے پیدا ہوئی کیونکہ ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ مغرب کی عسکری برتری کے سامنے نیچا نہ دیکھیں۔ مغربی ملاپ Impact of the west کو ٹائن بی (Toynbee) نے اپنی کتاب ' ترکی ' میں بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جیسے جیسے ترک یورپ کے اثر میں آتے گئے ویسے ویسے نوجوان ترکوں اور اسلام کے درمیان خلیج وسیع ہوتی گئی یہی وہ چیز تھی جو بیسویں صدی کی ابتدا میں صحیح معنوں میں ظہور پذیر ہوئی۔ اسی کو ترک " مغربیت " (Occidentalism) کہتے ہیں یہ صرف یورپ کی اندھی تقلید تھی جس میں روحانیت کا پتہ نہ تھا نوجوان ترک جو یورپ میں اور خاص طور سے پیرس میں تعلیم پا رہے تھے انکی یہ خواہش تھی کہ ترکی کو یورپ کے سانچے میں ڈھال دیا جائے اور قدیم روایات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔

ترکوں کی اس فوری مغرب پرستی کی بہترین مثال ہم کو جنگ عظیم سے قبل کے مشہور ترکی انشا پرداز احمد حکمت کی کتاب " میرا بھتیجا " میں ملتی ہے اس کتاب میں ایک نوجوان ترک کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو پیرس سے اپنی تعلیم ختم کر کے وطن واپس ہوا ہے نوجوان ترک کو مشرقی ماحول بالکل غیر مانوس معلوم ہوتا ہے اور وہ اس میں ایک بے چینی محسوس کرتا ہے۔ احمد حکمت بہت پرلطف پیرایہ میں بیان کرتے ہیں کہ کس طرح سے نوجوان اپنے پورے گھرانے کو مغربی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا ہے ابتداًء وہ ملازمین کو وردی پہناتا ہے اور باورچی کو فرانسیسی کھانے پکانے کا حکم دیتا ہے۔ حرم کے طریقہ کو ترک کر کے اپنی بھولی بھالی چچی کو مغربی راستہ پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے مختصراً یہ کہ پورے گھر کے اندر ایک طوفان عظیم برپا ہو جاتا ہے جب اس کے بوڑھے چچا کے لئے یہ سب کچھ تبدیلیاں ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں تو وہ بھتیجے کو ایک نصیحت آمیز لکچر دیتا ہے اور مشرقی اور مغربی میں بنیادی فرق سمجھاتا ہے۔ سزا کے طور پر نوجوان کو ایشائے کوچک کے شمال مغربی حصہ کے ایک مقام سنگلداک کو کوئلے کی کان میں کام کرنیکے لئے

بھیج دیتا ہے ۔ پانچ سال کے بعد جب نوجوان سنگلداک کے ماحول سے متاثر ہوکر وطن واپس ہوتا ہے تو سارا مغربیت کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے ۔

دوسری وجہ جسکی بدولت ترکی تیز رفتاری کے ساتھ مغربیت کی طرف بڑھا وہ سلطان عبدالحمید کے چونتیس سالہ دور حکومت کی سخت گیر اور دہشتناک پالیسی تھی ۔ سلطان انتہا سے زیادہ تنگ نظر اور پرانے خیال کے حامی تھے اور اسی بنا پر نوجوان ترکوں' اور کٹر ملاؤں کے درمیان کسی قسم کا بحث مباحثہ ممکن نہ تھا بنائے علیہ مصالحت کے جتنے امکانات تھے وہ ختم ہو گئے اور اس کا نتیجہ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے ۱۹۰۸ء کے انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا ۔ سلطان نے ملک کو ایک نیا دستور دینے کا اعلان کیا لیکن چونکہ اپنا وعدہ ٹھیک طرح پر ایفا نہ کرسکے اس لئے ان کو ۱۹۰۹ء میں تخت سے معزول کردیا۔ اس زمانے سے پھر ان تمام مذہبی مسائل پر جو سلطان عبدالحمید کے زمانے میں دبا دئے گئے تھے بحث و مباحثہ ہونے لگا ۔ جنگ عظیم کے شروع ہوجانیکی وجہ سے یہ مسائل کسی قسم کا مزید نشو و نما نہ پاسکے کیونکہ جنگ نے ترکوں کو مجبور کردیا کہ وہ اپنے آپ کو زمانے کی رفتار کے ساتھ چلائیں ۔

ترکی میں تین نمایاں جماعتیں پائی جاتی تھیں ۔ ایک قدامت پسندوں کی جماعت تھی جو قدیم روایات میں اصلاح یا ترمیم و تخفیف کی مخالفت کے لئے ہر طرح سے آمادہ تھی ۔ ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ ہر قربانی پر اسلام کی اسی پرانی شان و شوکت کو برقرار رکھا جائے جو اب تک ترکی کے اندر پائی جاتی تھی اس جماعت کے اثرات سلطان عبدالحمید کے بعد سے زائل ہونے لگے تھے یہاں تک کہ انقلاب ۱۹۰۸ء کے بعد وہ معدوم ہوگئی ۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ دو بڑی طاقتور جماعتیں ترکی میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں تھیں ۔ ایک قومی جماعت اور دوسری اصلاحی جماعت، قومی جماعت کے رہنما مشہور فلسفی شاعر ضیا، گوک آلپ تھے اور دوسری جماعت کے محمد عاقف اور وزیر اعظم سعید حلیم ان میں کی پہلی جماعت سیاسی تھی اور دوسری مذہبی ۔ جہاں تک مذہبی مسائل کا تعلق ہے یہ بہت دلچسپ بات تھی کہ یہ دونوں جماعتیں ایک عرصہ دراز تک ایک دوسرے کے دوش بدوش

چلتی رہیں۔ انھوں نے فی زمانہ اسلام کی حالت کو قبول نہیں کیا کیونکہ وہ اتفاقی ترقیوں کا نتیجہ تھا انکی یہ آرزو تھی کہ وہ ترکی کے اندر پھر پیغمبر صلعم کے زمانے کا اسلام دیکھیں اس مقصد کو حاصل کرنیکی غرض سے انھوں نے اس زمانہ کی شریعت اور اسلامی قانون کو بالکل رد کردیا اور یہ کوشش کی کہ اجتہاد پھر سے زندگی کا ایک جزو لاینفک بنجائے دونوں گروہ وسیع معنوں میں زمانہ کا ساتھ دینے کے مدعی تھے اور ان کا مسلک بھی ایک ہی " اسلام لاشمک " یعنی اسلام پسندی تھا۔ لیکن دونوں گروہ نے اس لفظ کے معنی کی تعبیر اور سیاسی اہمیت مختلف نقاط نگاہ سے کی اور یہی ان دونوں جماعتوں کے اندر تفریق کا باعث ہوا۔

قومی جماعت کا پروگرام تین مقاصد پر مشتمل تھا یعنی " ترک نوازی " اسلام پسندی اور رفتار زمانہ کا ساتھ اسلام پسندی سے قوم پرست ترکوں کا مطلب اس اسلام کی پیروی تھی جو اپنی ابتدائی حالت میں عرب میں پایا جاتا تھا اور جو بعد کی تبدیلیوں سے پاک تھا انکے نزدیک ہر مذہبی چیز کی بنیاد قرآن کریم تھا۔ لیکن انکے پروگرام کا اہم حصہ سیاسی اور معاشری تھا انکی نظر میں سلطنت کا تخیل دوسرے تمام تخیلات پر حاوی تھا۔ قومی تخیل دراصل انکے خیالات کا مرجع تھا۔ اسلام صرف مذہبی زندگی کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ تھا قوم پرست ترکوں نے مذہب کو ایک محدود دائرے میں مقید کردیا تھا یعنی یہ کہ مذہب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قوم کی دنیوی اور سیاسی زندگی پر بھی اپنا اثر ڈالے۔ انھوں نے مذہب اور سلطنت میں کلیتہً تفریق پیدا کرنیکی کوشش کی ان کا نصب العین یہ تھا کہ حکومت مکمل طور پر دنیوی ہونی چاہئے نہ کہ مذہبی۔

اس کے برعکس اصلاحی جماعت کا مطمح نظر صرف " اسلام لاشمک " تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ابتدائی زمانے میں جو اسلام کی حالت تھی اس پر عمل کیا جائے اور ان تمام خیالات کو اسلام سے خارج کردیا جائے جو مرور زمانہ سے اس کے اندر داخل ہوگئے تھے اور جنھوں نے اسلام کی سادگی اور نفاست کو برباد کردیا تھا اس چیز نے انھیں مجبور کیا کہ وہ فقہا کی کج بحثی کو ترک کرکے اجتہاد پر عمل کریں اور ہر مسئلہ کا تصفیہ ' اجماع ' کی روشنی میں اپنے ماحول کے لحاظ سے کریں ' اسلام لاشمک ' کو اپنے پروگرام کی بنیاد بنا کر انھوں نے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی کہ اسلام میں دنیوی اور مذہبی دائرے علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں ان کے لئے زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ظہور کا لازمی ذریعہ اور منبع صرف اسلام تھا۔

جنگ عظیم کے اثرات سے ترکی بھی نہ بچ سکا اور اس کو جنگ میں شریک ہونا پڑا لیکن جنگ میں ترکی کا بہت نقصان ہوا اور وہ بالکل بے دست و پا متحدین کے رحم و کرم پر پڑا ہوا تھا ترکی مختلف مصائب سے گذرتا رہا یہاں تک کہ صلحنامہ لوزان ۱۹۲۳ء کی بدولت اس کے چھینے ہوئے حقوق پھر واپس مل گئے اور وہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پھر دنیا کے سامنے نمودار ہوا۔

صلحنامہ لوزان پر دستخط کر کے ترکی اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا اپنی پوری تاریخ میں ترکی پہلی مرتبہ ترکی بنا اور اسکی پوری قومی زندگی میں یک نئی لہر دوڑ گئی اب اس کو اپنی تنظیم کرنی تھی اور اپنے کو اس قابل بنانا تھا کہ ایک ترقی یافتہ قوم کی حیثیت سے ہر خارجی طاقت کا مقابلہ کرے۔

یہ چیز ایک مرتبہ پھر ہمیں ترکی جدید میں مذہب کی نوعیت کی طرف واپس لاتی ہے اس سے تو آپ واقف ہوگئے ہیں کہ زمانہ سابق میں ترکی ایک مذہبی سلطنت تھی سلطان ترکی بہ حیثیت بادشاہ کے ۲ کروڑ ترکی باشندوں کا حکمران اور اپنے مذہبی منصب کے اعتبار سے ۳۰ کروڑ مسلمانوں کا خلیفہ تھا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ کس طرح سے قومی جمعیت انگورہ کے ایک قانون کی رو سے یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو سلطان کے منصب کو ختم کردیا گیا نئے منتخب شدہ خلیفہ عبدالمجید آفندی صرف مذہبی سردار تھے انھیں سیاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

قسطنطنیہ پر سے خارجی افواج ہٹا لئے جانے کے بعد ۲۹ر اکتوبر کو ترکی جمہوریہ کا اعلان ہوا اور قومی مجلس اعلیٰ کی ایک قرارداد کی رو سے مصطفےٰ کمال پاشاہ کو بہ غلبۂ آرا جمہوریہ کا صدر منتخب کیا گیا۔ مارچ ۱۹۲۴ء کے ایک اعلان کی رو سے نام نہاد منصب خلافت کا بھی خاتمہ کردیا گیا۔ مذہب اور سلطنت کے درمیان تفریق پیدا کردینا قوم پرست ترکوں کی ہمت اور جوانمردی کی ایک بین دلیل ہے اس جرات کا اندازہ ٹھیک طور پر وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو یہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ کس طرح صدیوں سے ترکی سلطنت اور اسلام ایک دوسرے میں ضم ہوگئے تھے اور یکایک ان میں علیحدگی پیدا ہوگئی۔ اس حیرت انگیز واقعے کی وجہ سے عام طور سے یہ پیشنگوئی کیجاتی تھی کہ ترکوں کو اسلامی دنیا کی رہبری کا جو شرف حاصل تھا وہ اب باقی نہیں رہیگا لیکن یہ غلط ثابت ہوا۔ پہلی مرتبہ ہم ترکی کے اندر ایک ایسی حکومت پاتے ہیں جو کلیتہً قومیت پر مبنی ہے

مذہب اب بھی موجود ہے لیکن وہ صرف ذاتی عقائد کی حد تک ہے حکومت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اب ہم جدید ترکی میں اسلام کی حالت پر بحث کریں گے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ترکی کے اس فوری انقلاب سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والا کوئی واقعہ ابتک اسلامی اور عیسوی دنیا کے سامنے پیش نہیں آیا تھا۔ ترکی جمہوریہ بن گیا، خلافت ختم ہوگئی، سلطنت اور مذہب میں تفریق پیدا ہوگئی، مدارس میں سے مذہبی عناصہ کو کلیتہً نکال دیا گیا، درویشوں کے گروہ کو فنا کردیا گیا یورپی لباس اور لاطینی رسم الخط داخل کیا گیا، جمعہ کے بجائے اتوار کو تعطیل ہونے لگی عورتوں کو بالکل آزادی دیدی گئی غرض ہر شعبہ زندگی میں ایک تغیر رونما ہوا۔ ان تمام تبدیلیوں کو ایک زندہ قوت کے طور پر موجودہ ترکی جاکر دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ ہم کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ ترکی رہنماؤں نے جو کچھ کیا وہ سیاسی ضروریات کے تحت کیا ۱۹۲۳ء کے چند سالوں بعد تک تو حالت بہت غیر اطمینان بخش تھی۔ تمام تبدیلیاں جو ترکی میں ہوئیں ان کا صرف ایک واحد مقصد یہ تھا کہ جہاں تک ہوسکے کم سے کم عرصہ میں قوم پرست جماعت کے لائحہ عمل پر عمل پیرا ہوکر ترکی کو ایک ترقی یافتہ اور موجودہ تخیل کے لحاظ سے مہذب سلطنت بنادیا جائے۔ ترکی کے متعلق اس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہاں غیر مذہبی حکومت ہوگی۔ اگر ہم اسلام کے وہی معنی سمجھتے ہیں جو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد سے ایک عجیب صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا رہا تو یقیناً ترکی کے غیر مذہبی ہونے میں کسی شبہ کی گنجایش باقی نہیں رہتی لیکن اگر ہم ترکی کو ان احکام کی روشنی میں دیکھیں جو قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ علما راسلام کا فتویٰ ترکی کے متعلق غلط تھا تمام اصلاحات جو ترکی میں داخل کی گئیں انکا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے اندر جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں انکو دور کرکے حقیقی اسلام کی حفاظت کیجائے شومئی قسمت سے کٹر مسلمان ابتدائی اسلام اور بعد کے اسلام میں امتیاز نہ کرسکے اور اسی وجہ سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ترکوں نے ہر اسلامی حکم کی خلاف ورزی کی لیکن دراصل ترک اسلام ترکوں کا کبھی مقصد نہ تھا اب بھی ترکوں کا مذہب اسلام ہے لیکن اصلاحات کے ذریعہ انھوں نے صرف اتنا کیا ہے کہ بعد کے اسلام کے اندر سے خرابیاں دور کرکے اسلام کو اسی حالت پر لے آئے ہیں جسکی تعلیم پیمبر صلعم دی تھی ترکی کے دستور کے دفعہ (۳) میں صاف لکھا ہوا ہے کہ " ترکی سلطنت کا مذہب اسلام ہے، سرکاری زبان

جنگ عظیم کے اثرات سے ترکی بھی نہ بچ سکا اور اس کو جنگ میں شریک ہونا پڑا لیکن جنگ میں ترکی کا بہت نقصان ہوا اور وہ بالکل بے دست و پا متحدین کے رحم و کرم پر پڑا ہوا تھا ترکی مختلف مصائب سے گذرتا رہا یہاں تک کہ صلحنامہ لوزان ۱۹۲۳ء کی بدولت اس کے چھینے ہوئے حقوق پھر واپس مل گئے اور وہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پھر دنیا کے سامنے نمودار ہوا۔

صلحنامہ لوزان پر دستخط کرکے ترکی اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا اپنی پوری تاریخ میں ترکی پہلی مرتبہ ترکی بنا اور اسکی پوری قومی زندگی میں یک نئی لہر دوڑ گئی اب اس کو اپنی تنظیم کرنی تھی اور اپنے کو اس قابل بنانا تھا کہ ایک ترقی یافتہ قوم کی حیثیت سے ہر خارجی طاقت کا مقابلہ کرے۔

یہ چیز ایک مرتبہ پھر ہمیں ترکی جدید میں مذہب کی نوعیت کی طرف واپس لاتی ہے اس سے تو آپ واقف ہوگئے ہیں کہ زمانہ سابق میں ترکی ایک مذہبی سلطنت تھی سلطان ترکی بہ حیثیت بادشاہ کے ۲ کروڑ ترکی باشندوں کا حکمران اور اپنے مذہبی منصب کے اعتبار سے ۳۰ کروڑ مسلمانوں کا خلیفہ تھا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ کس طرح سے قومی جمعیت انگورہ کے ایک قانون کی رو سے یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو سلطان کے منصب کو ختم کردیا گیا نئے منتخب شدہ خلیفہ عبدالمجید آفندی صرف مذہبی سردار تھے انھیں سیاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

قسطنطنیہ پر سے خارجی قبضہ ہٹائے جانے کے بعد ۲۹ اکتوبر کو ترکی جمہوریہ کا اعلان ہوا اور قومی مجلس اعلیٰ کی ایک قرارداد کی رو سے مصطفیٰ کمال پاشاہ کو بہ غلبہ آراء جمہوریہ کا صدر منتخب کیا گیا۔ مارچ ۲۴ء کے ایک اعلان کی رو سے نام نہاد منصب خلافت کا بھی خاتمہ کردیا گیا۔ مذہب اور سلطنت کے درمیان تفریق پیدا کردینا قوم پرست ترکوں کی ہمت اور جوانمردی کی ایک بین دلیل ہے اس جراءت کا اندازہ ٹھیک طور پر وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو یہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ کس طرح صدیوں سے ترکی سلطنت اور اسلام ایک دوسرے میں ضم ہوگئے تھے اور یکایک ان میں علیحدگی پیدا ہوگئی۔ اس حیرت انگیز واقعے کی وجہ سے عام طور سے یہ پیشنگوئی کیجاتی تھی کہ ترکوں کو اسلامی دنیا کی رہبری کا جو شرف حاصل تھا وہ اب باقی نہیں رہیگا لیکن یہ غلط ثابت ہوا۔ پہلی مرتبہ ہم ترکی کے اندر ایک ایسی حکومت پاتے ہیں جو کلیتہً قومیت پر مبنی ہے

مذہب اب بھی موجود ہے لیکن وہ صرف ذاتی عقائد کی حد تک ہے حکومت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اب ہم جدید ترکی میں اسلام کی حالت پر بحث کریں گے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ترکی کے اس فوری انقلاب سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والا کوئی واقعہ ابتک اسلامی اور عیسوی دنیا کے سامنے پیش نہیں آیا تھا۔ ترکی جمہوریہ بن گیا، خلافت ختم ہوگئی سلطنت اور مذہب میں تفریق پیدا ہوگئی، مدارس میں سے مذہبی عناصر کو کلیۃً نکال دیا گیا، درویشوں کے گروہ کو فنا کردیا گیا یورپی لباس اور لاطینی رسم الخط داخل کیا گیا، جمعہ کے بجائے اتوار کو تعطیل ہونے لگی عورتوں کو بالکل آزادی دیدی گئی غرض ہر شعبہ زندگی میں ایک تغیر رونما ہوا۔ ان تمام تبدیلیوں کو ایک زندہ قوت کے طور پر موجودہ ترکی جاکر دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ ہم کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ ترکی رہنماؤں نے جو کچھ کیا وہ سیاسی ضروریات کے تحت کیا ۱۹۲۳ء کے چند سالوں بعد تک تو حالت بہت غیر اطمینان بخش تھی۔ تمام تبدیلیاں جو ترکی میں ہوئیں ان کا صرف ایک واحد مقصد یہ تھا کہ جہاں تک ہوسکے کم سے کم عرصہ میں قوم پرست جماعت کے لائحہ عمل پر عمل پیرا ہوکر ترکی کو ایک ترقی یافتہ اور موجودہ تخیل کے لحاظ سے مہذب سلطنت بنادیا جائے۔ ترکی کے متعلق اس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہاں غیر مذہبی حکومت ہوگی۔ اگر ہم اسلام کے وہی معنیٰ سمجھتے ہیں جو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد سے ایک عجیب صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا رہا تو یقیناً ترکی کے غیر مذہبی ہونے میں کسی شبہ کی گنجایش باقی نہیں رہتی لیکن اگر ہم ترکی کو ان احکام کی روشنی میں دیکھیں جو قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ علماء اسلام کا فتویٰ ترکی کے متعلق غلط تھا تمام اصلاحات جو ترکی میں داخل کی گئیں انکا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے اندر جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں انکو دور کرکے حقیقی اسلام کی حفاظت کیجائے شومئی قسمت سے کٹر مسلمان ابتدائی اسلام اور بعد کے اسلام میں امتیاز نہ کرسکے اور اسی وجہ سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ترکوں نے ہر اسلامی حکم کی خلاف ورزی کی لیکن دراصل ترک اسلام ترکوں کا کبھی مقصد نہ تھا اب بھی ترکوں کا مذہب اسلام ہے لیکن اصلاحات کے ذریعہ انھوں نے صرف اتنا کیا ہے کہ بعد کے اسلام کے اندر سے خرابیاں دور کرکے اسلام کو اسی حالت پر لے آئے ہیں جسکی تعلیم پیمبر صلعم دی تھی ترکی کے دستور کے دفعہ (۲) میں صاف لکھا ہوا ہے کہ "ترکی سلطنت کا مذہب اسلام ہے، سرکاری زبان

ترکی ہے اور حکومت کا دارالسلطنت انگورہ ہے" اب اس سے بڑھکر ترکی کے اسلامی سلطنت ہونے کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ تمام اصلاحات فوری اور مصنوعی طور پر کی گئیں اسلیئے نہ تو ان میں اعلیٰ صفات ہونگی اور نہ ان میں استقلال ہوگا۔ اس کا جواب صرف یہی ہے کہ اب تک تو کوئی خرابی پیدا ہوئی نہیں ہے۔ یہ اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے کہ ترکی کے اس نفسیاتی اور مذہبی انقلاب کی بنیادیں زمانہ دراز سے کھڑی کی جارہی تھیں۔ ترکی کے مغربی ممالک سے گہرے تعلقات پیدا ہوچکے تھے اور بیسویں صدی کی ابتدا سے ہر شعبہ زندگی میں یورپی اثرات کارفرما تھے۔ جنگ عظیم نے صرف ان کو تکمیل کو پہونچادیا۔ نئی تبدیلیوں سے ملک کا ہر باشندہ یہاں تک کہ اناطولیہ کے دور دراز کے قصبات بھی متاثر ہوچکے ہیں عوام ان تبدیلیوں سے نہ صرف مطمئن نظر آتے ہیں بلکہ زندگی کے متعلق ان کے نظریات بھی بدل گئے ہیں تمام ملک معاشری اور تمدنی ترقیوں کے زینے طے کرتا چلا جارہا ہے۔ مدارس کی حالت بالکل بدل چکی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ترکی حکومت سمجھتی ہے کہ نوجوان قوم کی امیدوں کا مرکز ہیں لہذا انکی تعلیم و تربیت ایسی ہونی چاہیئے جو ان کو صحیح معنوں میں اپنی قوم کا ہمدرد اور پاسباں بنادے عورتوں کی وہی حالت ہوگئی ہے جو یورپین عورتوں کی ہوتی ہے اور اب وہ ان قیود اور پابندیوں سے آزاد ہوچکی ہیں جو جمہوریہ سے قبل ان پر عائد کی گئی تھیں۔

جس چیز پر ہم خاص طور سے زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ترکی کے اندر تمام تغیرات ارتقار کا نتیجہ ہیں۔ دوسرا جزو بھی کافی اہم ہے۔ حقیقی انقلاب وہی ہوتا ہے جس کا نتیجہ نہ صرف حکومت اور سیاسیات کا تغیر ہوتا ہے بلکہ سماجی اور تمدنی خیالات بھی بدل جاتے ہیں۔ ترکی کے انقلاب کی حقیقی خوبی اسی چیز میں مضمر ہے۔ انقلاب ترکی اتنا زبردست واقعہ ہے جو اب تک دنیائے اسلام میں وقوع پذیر نہیں ہوا۔ عوام ان تمام پرانی دقیانوسی چیزوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے جو ان کے مصائب کا سبب بنی ہوئی تھیں۔ ترکوں کا یہی عقیدہ انکی تبدیلی کا باعث ہوا ترک مصطفیٰ کمال مرحوم کو اپنا سردار' باپ اور نجات دہندہ سمجھتے تھے اس سے ترکوں کی ضبط و نظم کی قابلیت ظاہر ہوتی ہے جو ان کی نسل کی سب سے اعلیٰ صفت ہے۔

اگر ہم حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترکوں کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ بہت بڑی

ناانصافی ہوگی اگر ہم ان کو اسلام کا مخالف کہیں جو کچھ انھوں نے کیا وہ صرف اتنا تھا کہ پرانی چیزوں میں نئی روح پھونکدی اور پان اسلامزم کا بالکل خاتمہ کردیا ۔ ہم کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ اسلام کے اندر بے انتہا پنہاں قوتیں مضمر ہیں جن کا اظہار کوشش عمل سے ممکن ہے اسلام کی عظمت کی تاریخ اسلامی نادرالوجود ادب اور سادگی ہی ایسی چیزیں ہیں جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن پھر اسلام بنی نوع انسان کی نجات کا باعث ہوگا ۔ اگر ہم اس کے اندر عقیدہ اور ایمان راسخ رکھیں تو آج ہم بھی ویسے ہی ہو سکتے ہیں جیسے کہ ترک ۔

(مترجمہ از اسلامک ریویو)

سید حسین رضوی متعلم ال ال بی (ابتدائی)

آتشکدہ

کیا کہوں کن دلبرانِ خاص کی محفل میں ہوں
کیا بتاؤں کن نگاہوں میں ہوں کیسے دل میں ہوں

واجب و امکان کی کس حد میں ہوں میں کیا کہوں
کیسی کیسی تجلیوں کی زد میں ہوں میں کیا کہوں

کتنے لب، کتنی جبینیں، کتنے جلوے، کتنے طور
کتنی صبحوں کا اُجالا، کتنے نغموں کا سرور

کتنی نو آغاز کلیاں، کتنے خوشبودار پھول
میری ٹھنڈی سانس پر ہوتے ہیں رنجور و ملول

کتنے سنگین دل ہیں جو میرے نشہ میں چور ہیں
کتنی راتیں ہیں جو میرے نام سے مشہور ہیں

کیا کہوں کن مہوشوں کن دلبروں کا ساتھ ہے
کیا کہوں کن عارضوں کن کاکلوں کا ساتھ ہے

کیسے کیسے آتشیں پیغمبروں کا ساتھ ہے

مخدوم محی الدین ام اے
ریسرچ اسکالر

پودوں کی جماعت بندی

کرۂ ارض پر پودوں کی تعداد ان گنت ہے۔ ایسی صورت میں ایک شخص کے لئے جو ان کا مطالعہ کرنا چاہتا ہو یہ ناممکن ہے کہ وہ انھیں ایک ایک کرکے یاد رکھے۔ اس لئے ان سے واقفیت کا صحیح اور واحد طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ ان کی ایسی جماعت بندی کی جائے جس سے اُن کے آپس کے نسلی تعلقات اور ارتقائی رجحانات کا پتہ لگایا جاسکے اور بآسانی یاد بھی رکھے جاسکیں۔

تاریخ نباتات میں سب سے پہلے جس شخص نے پودوں کی جماعت بندی کی کوشش کی وہ تھیوفراسٹس تھا۔ جو یونان میں ۳۷۲ ق۔م میں پیدا ہوا۔ یہ یونان کے مشہور عالم اور حکیم ارسطو کا شاگرد تھا۔ تھیوفراسٹس نے تقریباً ۴۸۰ پودوں کو بیان کیا ہے ان کی تقسیم بوٹیوں، جھاڑیوں اور درختوں میں کی ہے۔ اس کے بعد سنہ عیسوی کی ابتدا میں اور حکماء نے بھی پودوں کی تقسیم کی کوششیں کیں، لیکن ان حکماء قدیم نے جو اہم کام شروع کیا تھا وہ اُن کے بعد عہدِ جہالت کی تاریکی میں غائب ہوگیا۔ چنانچہ سولھویں صدی کے آغاز تک پھر کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ سولھویں صدی کا ابتدائی زمانہ تاریخ نباتات میں عطاروں (Herbals) کا عہد کہلاتا ہے۔

اس دور میں جڑی بوٹیوں کا استعمال دواؤں اور جادو ٹونوں میں کثرت سے کیا جانا لگا۔ اس دور میں جرمنی، فرانس اور ہالینڈ میں اس مضمون سے بہت دلچسپی لی جانے لگی۔ چنانچہ Fuchs (۱۵۰۱ء تا ۱۵۶۶ء)، Bock (۱۴۹۸ء تا ۱۵۵۴ء) اور Brunfels (۱۵۰۰ء تا ۱۵۳۴ء) وغیرہ نے اپنے اپنے ملک کے پودوں کو جمع کیا اور اُن کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے نہ صرف اپنے قرب وجوار کے درختوں کو بیان کرنیکی کوشش کی بلکہ اُن پودوں کا بھی ذکر کیا جو اُن کے ملک کے دور دراز مقامات سے سیاحوں اور مسافروں کے ذریعہ حاصل ہوئے۔ ان لوگوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جسقدر ہوسکے درخت جمع کریں کیونکہ اس زمانے میں کسی ماہرِ نباتات کا اعزاز اُس کے جمع شدہ درختوں کی تعداد پر منحصر تھا۔ درخت کثیر تعداد میں جمع ہونے کے باعث ان کو گروہوں میں تقسیم کرنے کے لئے ایک ابتدائی درجہ بندی کی ضرورت ہوئی۔ پودوں کو پتوں، تنے اور شاخوں کی مشابہت کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان حکیموں نے اس میں بہت سی ترمیمات پیش کی تھیں لیکن نفس مضمون پر ان لوگوں کا اس سے زیادہ احسان نہیں ہے کہ انہوں نے علم نباتات کی اہمیت کو عوام سے روشناس کرادیا۔

ایک نہایت تفصیلی درجہ بندی جان گے رارڈ نے کی ہے۔ اس نے اپنی ترتیب کو تین کتابوں میں شایع کیا۔ پہلی کتاب میں گھاس اور جذع والے پودوں کا ذکر ہے۔ دوسری جماعت جس کا بیان دوسری کتاب میں ہے اُس میں وہ تمام پودے شریک ہیں جو بطور دوا، خوشبو اور ترکاری استعمال ہوتے ہیں۔ تیسری کتاب میں پھل والے پودے ماس اور فطر شریک ہیں۔ بظاہر یہ ایک ابتدائی اور غیر منظم ترتیب تھی لیکن اس ترتیب کو ہمیں اُس زمانے کے حالات کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔

Cesalpini (۱۵۱۹ء تا ۱۶۰۳ء) اطالیہ کا ایک قابل ذکر فلسفی اور سائنس داں گذرا ہے۔ اس نے سب سے پہلے بیج اور پھل کی اہمیت کو محسوس کیا۔ گو اس کی تحقیقات بھی ارسطوئی مکتب کے اثرات سے بچ نہ سکی۔ چنانچہ وہ بھی پودوں کو بوٹیوں، جھاڑیوں اور درخت کے اعتبار سے تقسیم کرنے کا حامی ہے۔ اس کے بعد سوئٹزرلینڈ کا ایک ماہر نباتیات Kaspar Bauhin ہے۔ جس کی ترتیب ۱۶۲۰ء میں شائع ہوئی۔ اور نظامی نباتیات میں دو نامی طریق کی ابتداء ہوئی۔ لیکن اس کی ترتیب بھی غیر علمی

اور ابتدائی ہے ۔ اس نے جنین اور بیج کو خاص اہمیت نہیں دی۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا تمام حکماء کی جماعت بندیوں کا انحصار شکلیاتی خصوصیات پر ہے اسی لئے انھیں "مصنوعی" کہا جاتا ہے ۔ برخلاف اس کے اگر پودوں کی، ان کے پھول اور زہراوی حصوں مثلاً پنکھڑیاں، پھول پتیاں، زردریشے، بیض خانے کی اشکال، ساخت، ان کی ترتیب و تعداد، ان کے آپس کے نسلی تعلقات اور شکلیاتی خصوصیات کے لحاظ سے تقسیم کی جائے تو ایسی جماعت بندی زیادہ تر قابل بھروسہ ہوگی اس کو ہم "فطری تقسیم" کہہ سکیں گے ۔

John Ray کا رسالہ Historia Plantarum سنہ ۱۶۸۲ء میں شائع ہوا ۔ اس کی درجہ بندی کے ساتھ ہی موجودہ نظامی نباتات کی داغ بیل پڑگئی ۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے جنین میں ایک بیج اور دو بیج پتوں کے درمیان تمیز کی ۔ اسی بناء پر اس نے ایک بیج پتیا پودے اور دو بیج پتیا پودے کا نام دیا ۔ لیکن یہ قدیم درجہ بندی کے اثرات سے بچ نہ سکا ۔ یعنی اُس نے انہیں وہی قدیم عنوانات Herbae اور Arbores میں تقسیم کرنے کی کوشش کی گو اُن کو پھر Dicotyledons اور Monocotyledons کی ذیلی تقسیموں میں بانٹ دیا گیا ۔

Camerarius پہلا جرمن سائنسداں تھا جس نے پھولوں میں جنسیت کے وجود کا پتہ چلایا ۔ اس نے ثابت کیا کہ باروری کے لئے زیرے کی ضرورت لازمی ہے ۔

Linnaeus کی جماعت بندی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے یہ سنہ ۱۷۰۷ء میں سویڈن میں پیدا ہوا ۔ بچپن ہی سے Linnaeus کو نباتات سے دلچسپی تھی ۔ چنانچہ اس نے اساتذہ قدیم کی تصنیفات کا ازسرنو مطالعہ کیا اور کئی غلط خیالات کی تردید کی اس کے علاوہ اُس نے دُہرے لاطینی ناموں کا استعمال کثرت سے شروع کیا ۔ اور دنیا کے تمام حصوں کے کئی پودے بیان کئے جن میں بیشتر حصہ شمالی امریکہ کے نباتیہ کا تھا ۔

اپنے فن کا ماہر ہونے پر بھی Linnaeus کوئی ایسا نظام پیش نہ کرسکا جس کی بنیادیں پودوں کے نسلی تعلقات پر مبنی ہوں ۔ گو اس سے انکار نہیں کیا جاتا کہ اسی نے اول ایسے نظام کی ضرورت

محسوس کی جونسلی تعلقات کا اظہار کرسکے۔ اس کا نظام تقسیم زرریشوں اور بیض خانوں کی تعداد پر منحصر تھا۔ چنانچہ اس نے زرریشوں کی تعداد کے لحاظ سے (۲۴) کلاس اور بیض خانوں کی تعداد کے مطابق (٦٧) آرڈر بنائے۔ یہ جماعت بندی بڑی تیزی سے یورپ میں مقبول ہوگئی کیونکہ اس تقسیم میں پہلے کی بہ نسبت بہت سی سہولتیں موجود تھیں۔ زرریشوں کی تعداد اور ساخت کے اعتبار سے مندرجہ ذیل ۲۴ کلاس بنائے گئے مثلاً

کلاس نمبر (۱) Monondria جس میں زرریشہ ایک
" " (۲) Diandri " " دو
" " (۳) Triandria " " تین

اسی طرح Tetrandria میں چار، Pentandria میں پانچ علیٰ ہذا۔ Polyandria میں کثیر زرریشے۔ ساخت کے اعتبار کرتے Monodelphia، Didelphia Polydelphia میں بالترتیب یک برادری، دو برادری اور کثیر برادری زرریشے نیز نمبر (۱۹) Syngenesia نمبر (۲۰) Gynandrla سے مراد مل زردان اور مادگیں سے ملے ہوئے زرریشے والے پھول ہیں۔ نمبر (۲۱) Monoecia نمبر (۲۲) Dioecia نمبر (۲۳) Polygamia ایک صنفی، دو صنفی اور کثیر جوگی پھول تھے سب کے آخر میں ان پودوں کو بھی شامل کرلیا گیا جن کے تناسلی اعضاء نظروں سے پوشیدہ ہوں یعنی نمبر (۲۴) Cryptogamia۔ ان چوبیں جماعتوں کو مادہ کوٹ کے لحاظ سے (٦٧) آرڈروں میں بیان کیا گیا مثلاً دوسری کلاس Diandria کے تحت اس نے حسب ذیل آرڈر قائم کئے۔

۱) Monogyna میں ایک بیض خانہ والے پھولدار پودے
۲) Digyna میں دو "
۳) Trigyna " تین "
۴) Tetragyna " چار "

Linnaens کی ترتیب ایک مصنوعی نظامی ترتیب کی اچھی مثال ہے۔ اس میں خامیاں بھی ہیں مثلاً بیسویں جماعت جو Gynandria پر مشتمل ہے ایک بیج پتیا اور دو بیج پتیا پودے ایک جگہ رکھ دئے گئے ہیں۔ اسی طرح اکیسویں اور بیسویں جماعتیں بھی اس قسم کے گروہ بناتی ہیں۔

Linnaens کے جماعت بندی کے ہم ممنون احسان اس لئے بھی ہیں کہ اس نے Binary system of nomenclature کی بنیادیں مضبوط کیں۔ ہر پودے کو دو ناموں سے بیان کرنا شروع کیا۔ نام کا پہلا جز جنس اور دوسرا نوع کا نام ہوتا تھا۔ اس کی درجہ بندی کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس نے جماعت بندی تولیدی اعضار کے اعتبار سے کی۔

اس سلسلہ میں مزید تحقیق دو فرانسیسی ماہرین نے کی۔ ایک فرانسیسی ماہر نباتیات Dernard de Jussien کچھ زمانے تک تحقیقات کرتا رہا۔ لیکن وہ اپنی تحقیقات سے مطمئن نہیں تھا اور اسی لئے اس نے انہیں شائع کرنے سے احتراز کیا۔ اُس کے بھتیجے A. L. Dejussien نے اس کی تحقیقات میں حذف و اضافہ کے بعد اُس کو اپنی ذاتی تجاویز کے ساتھ ۱۷۸۹ء میں شائع کیا۔ یہ سب سے پہلی سائنٹیفک درجہ بندی ہے جس کو فطری درجہ بندی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سائنسداں کو جدید نظامی فطری تقسیم کا پیش کنندہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے نوع' جنس' اور آرڈروں میں صحیح امتیاز قائم کیا۔ عائلے جو تقریباً سو ہیں۔ تین ذیلی تقسیموں اور پندرہ جماعتوں میں تقسیم کئے گئے ہیں یعنی نمبر (۱) Actyledons جس میں Thallophyta ' Bryophyta اور Pteridophyta اور بہت سے مشتبہ نسلیاتی تعلقات رکھنے والے عائلے اور آبی پودوں کو جمع کیا گیا ہے۔

نمبر (۲) Monocotyledon جس کی تین جماعتیں کی گئی ہیں۔

نمبر (۳) Dicotyledons جس کی گیارہ جماعتیں کی گئی ہیں۔ اس کو پھر Apetalae' Monopetalae' Polypetalae اور Diclines irregulares میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن اس میں یہ خامی ہے کہ Monocotyled Dicotyledons کو Cryptogams (یا Acotyledons) کے مقابل مساوی درجہ دیا گیا ہے۔ ذیلی جماعتوں کو زیادہ تر زر ریشوں اور بعض خانوں کی تعداد پر مرتب کیا گیا ہے حالانکہ بعض

خواص ایک مقام پر تو نظامی حیثیت رکھتے ہیں' اور دوسری جگہ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ سب سے بیکار ترتیب Apetalae Diclines irregulares میں ظاہر کی گئی ہے لیکن آخر الذکر کے پانچ عائلے سب سے زیادہ غیر فطری ترتیب میں ہیں۔ Coniferae کو دو بیج پتیا پودوں کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے اور یک بیج پتیا پودوں کو دو بیج پتیا کے بیشتر بیان کیا گیا ہے۔

Angustin Candolle دوسرا ماہر نباتات ہے' جس کی تحقیقات سے موجودہ نظامی نباتیات پر گہرا اثر پڑا۔ یہ ترتیب بڑی حد تک Jussieu کی ترتیب سے مشابہ ہے لیکن اس میں کئی ترمیمیں ہوئی ہیں۔ Condolle کا یہ خیال تھا کہ فعلیات کو شکلیات کی بہ نسبت زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ اپنے تحقیقات کے دوران میں یہ خود اپنے اس اصول سے انحراف کرتا ہے مثلاً وہ اپنے ذیلی گروہوں کی تقسیم کرتے وقت وعاء کی موجودگی یا غیر موجودگی کو وجہ تقسیم قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک فعلیاتی فرق ہے۔ ایک طرف تو وہ خلوی اور وعائی پودوں کے درمیان تعلق بتلاتا ہے تو دوسری طرف وہ درختوں میں بیجے پتوں کی موجودگی اور غیر موجودگی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح اس کی ترتیب میں وعائی Cryptcgams یک بیجے پتیا پودوں میں شامل ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ Jussieu نے ان کو یک بیج پتیا پودوں اور دو بیج پتیا پودوں سے علحدہ رکھا۔ کنڈول کے نظام کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

I Vascular plans or plants with cotyledons.

II Cellular plants or plants without Cotyledons.

ان تمام جماعت بندیوں میں ایک خاص نقص یہ تھا کہ کھل بیجے بعد بیجوں کے گروہ میں شامل کردیے گئے تھے۔ سب سے پہلے جس شخص نے کھل بیجوں اور زہراوی پودوں میں تمیز کی وہ رابرٹ براون نامی ایک انگریز تھا۔ اس نے بتایا کہ کھل بیجے دراصل برہنہ بیض خانے والے پودے ہیں۔ ان کو دو بیج پتہ پودوں سے بالکل علحدہ رکھنا چاہئے۔ نیز اس نے بیضدان کی مختلف ساختیٰ اور تشریحی تبدیلیوں کی نسبت تحقیقات کی۔ ان تحقیقات سے یک بیج پتیا اور دو بیج پتیا پودوں کی ذیلی تقسیموں میں مدد ملی۔

ایک دوسرے انگریز Lindley کی پیش کردہ جماعت بندی اسی لئے قابل ذکر ہے کہ اس کا اثر انگلستان اور دیگر ممالک پر بہت پڑا گو اس کا نظام تقسیم براعظم یورپ خصوصاً جرمنی میں زیادہ تنقید کا شکار رہا۔ ۱۸۳۰ء میں جان لنڈلے نے اپنی درجہ بندی شائع کی یہ جماعت بندی کنڈول کی نظامی ترتیب میں کچھ ترمیم اور اضافہ کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔ پھولدار اور غیر پھولدار پودوں کے بڑے عنوانوں کو قائم رکھا گیا۔ لیکن اول الذکر کے ذیلی تقسیموں میں کھل بیجوں اور بند بیجوں کے اصول کو جس کو براؤن نے معلوم کیا تھا قائم رکھا گیا۔ لنڈلے بجائے اس کے کہ کنڈول کی طرح اُن پانچوں ذیلی جماعتوں میں کوئی ہم ترکیبی یا ہم فعلیت معلوم کرتا وہ پودوں کی عام توافقی حالت کو اہمیت دیتا ہے یعنی اس نے طفیلی یا نیم طفیلی عادتوں کو جو ظاہری طور پر ایک ہی ہیں لیکن در اصل مختلف پودوں میں ایک ہی قسم کے حالات کے تحت پیدا ہو جاتی ہیں اہمیت دی۔ اس قسم کا تبصرہ اُن چند یک بیج پتیا پودوں کے عائلوں پر بھی کیا جاتا ہے جس کو لنڈلے نے محض اس لئے یک بیج پتیا پودوں سے علٰحدہ کیا کہ ان میں جالدار رگیت پائی جاتی ہے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں Stephan Endlicher نے ایک ایسی جماعت بندی پیش کی جو ایک عرصہ تک یورپ میں مقبول رہی۔ اس کی تصنیف کئی اہم ترین تجویزوں اور مشوروں سے پُر ہے۔

اس کے بعد ۱۸۴۳ء میں ایک فرانسیسی سائنسدان Adolphe Brongniat نے اپنا ایک نظام تقسیم پیش کیا۔ یہ بھی لنڈلے کی طرح پودوں کی دو تقسیمیں کرتا ہے ـــــ Cryptgams اور Phanerogams ۔ اسی طرح یک بیج پتیا پودوں کو بیضین کی موجودگی یا غیر موجودگی کے اعتبار سے دو درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دو بیج پتیوں کی دو ذیلی تقسیمیں Gomopetalae اور Dialypetalae کی گئیں ہیں Adolphe Bungniart کے ترتیب کی ایک اہم خصوصیت یہہ ہے کہ اس میں سے بے پنکھڑی پودوں کو خارج کر دیا گیا۔ Apetalae عموماً Dialpetalae کا ایک نامکمل گروہ نظر آتا ہے جس کے اندر Apetalae کو منتشر کر دیا گیا ہے۔

۱۸۵۰ء تک جتنی بھی تقسیمیں پیش ہوئیں اُن سب کی غیر سائنٹیفک خصوصیت یہ تھی کہ ان سب میں Cryptogams کو غیر تولیدی پودوں کے طور پر تقسیم کیا گیا تھا۔ خوردبین کے ایجاد کے ساتھ ہی اُن کی سوانح حیات معلوم ہوگئی۔ یہ Hofmeister کی زبردست تحقیقات کا نتیجہ تھا کہ ان کی جنسیات کے مطالعہ کے بعد اُن کے متعلق کوئی معین تخیل پیش کیا گیا۔ تبادلۂ نسل کا نظریہ نہ صرف فرن اور اس کے متعلقہ پودوں کے ضمن میں بیان کیا جا سکتا ہے بلکہ کھلے بیجوں اور بند بیجوں کے متعلق بھی۔ نباتی عالم کے ذیلی تقسیموں میں Hofmeister کی تحقیقات کی قیمت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ Thallophytes، Bryophytes، Pteridophytes، کھلے بیج والے پودے، بند بیج والے پودے کی تقسیموں کی بنا اس ہی نے قائم کی۔ لیکن ہم صرف پھول والے پودوں کی تقسیم کو اہمیت دیں گے۔

گذشتہ صدی کے نصف حصّہ میں سب سے زیادہ اہم جو جماعت بندی پیش ہوئی وہ بنتھام اور ہوکر کی بیان کردہ ہے۔ جارج بنتھام اور سر جوزف ہوکر دو انگریز ماہرین نباتیات نے کیو کے رائل بوٹانک گارڈن کے زبردست مواد Herbarium سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا۔ بنتھام اور ہوکر نے اپنی جماعت بندی جس میں (۲۰۲) فصیلے شامل ہیں ایک ضخیم کتاب Genera Plantarum میں پیش کی جو ۱۸۶۲ء تا ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔

بنتھام اور ہوکر کی جماعت بندی میں گو کنڈول اور Jussieu کی اکثر خصوصیات شامل ہیں لیکن پھر بھی وہ ان تمام تقسیموں سے جو اب تک پیش ہوئے تھے بہتر اور سہل تھی بنتھام کی تقسیم گو انکل پنکھڑیوں سے شروع ہوتی ہے (جو حقیقتاً بے پنکھڑیوں سے ابتدائی ہیں) لیکن اس میں کھلے بیجوں کا مقام بے محل ہے یعنی وہ بے پنکھڑیوں کے بعد اور ایک بیج پتیا پودوں کے پہلے رکھے گئے ہیں۔ حالانکہ ان کو ابتداء سے علٰحدہ رکھنا چاہئے تھا یعنی دو بیج پتوں سے پہلے۔ کیونکہ کھلے بیجوں کو زہراوی پودوں سے تعلق بعید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جماعت بندی سخت تنقید کا شکار ہوتی رہی۔ چنانچہ Hutchinson لکھتے ہیں کہ

"بنتھام اور ہوکر کی جماعت بندی مکمل نسلی تعلقات کے واضح کرنے کے لئے کبھی بھی پیش نہیں ہوئی

بلکہ وہ Jussieu کے کام کا کم و بیش ایک ترمیم شدہ تفصیلی بیان ہے جس میں کنڈول کی پیروی کی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ماہرین نباتیات ابھی قدیم نظریہ مخصوص تخلیق کا ساتھ دے رہے تھے ۔ . . . . .

. . . . بنتھام اور ہوکر تقسیم صرف پودوں کی شناخت میں آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے پیش کی گئی"۔

انھوں نے ل پتیا اور اکل پتیا خصوصیتوں پر زیادہ زور دیا۔ تقسیم اکل پنکھڑیوں سے شروع ہوتی ہے اور پہلا Cohort اکل پھلا بیض خانے اور ادنیٰ پھول والے زہراوی پودوں کی وجہ سے Ranales رکھا گیا۔ جس میں فصیلہ Ranunculaceae شامل ہے۔ ان کی تقسیم میں دو امور ایسے ہیں جن پر کثرت سے تنقید کی گئی اوّل تو یک قبادار کو اکل پنکھڑیوں سے علٰحدہ رکھا گیا دوسرے کھل بیجوں کا مقام بے محل ہے۔

بنتھام اور ہوکر نے دو بیج پتیا پودوں کو تین ذیلی گروہوں میں تقسیم کیا۔ پہلا Polypetalae دوسرا Gamopetalae تیسرا Monochlamydeae

Polypetalae میں کنڈول کی دو جماعتیں Thalamiflorue Calyciflorae شامل ہیں۔ لیکن اور بہت سے عائلوں جن کا نسلیاتی تعلق مبہم ہے ایک درمیانی گروہ Disciflorae میں رکھا گیا ہے۔ کیونکہ کم و بیش ان میں ایک زرریشی قرص پایا جاتا ہے ۔ Gamopetalae اور Monochlamydeae ، کنڈول کے تیسرے اور چوتھے گروہ ہیں .Gamopetalae کو پھر تین سلسلوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلا آرڈر جس میں بیض خانہ ادنیٰ ہے۔ تیسرا آرڈر جس میں بیض خانہ اعلیٰ دو پھل پتہ دار ہے۔ اور درمیانی جس میں اعلیٰ بیض خانہ اور پھل پتوں کی تعداد دو سے زیادہ ہے ۔ Polypetalae اور Gamopetalae کو کئی Chorts میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن Monochlamydeae کو آٹھ مختلف النوع سلسلوں میں بانٹ دیا گیا مثلاً Curvembryeae ایک فطری گروپ ہے۔ لیکن Unisexuals میں ایسے عائلے رکھ دئے گئے ہیں جن کے درمیان دور کا بھی نسلیاتی تعلق نہیں ہے۔

Monocotyledons کو سات سلسلوں میں تقسیم کیا ہے جن میں نہایت پیچیدہ بر مادگیں دار عائلے مثلاً Crchideae اور Scitamineae ـــــ زیر مادگیں دار عائلے مثلاً Lilioceae وغیرہ

میں بٹ گئے ہیں لیکن ایسے عائلے جن میں گرد گل پنکھڑی نما نہیں ہے مثلاً Juncaceae اور Palmae ان کو علٰحدہ کیا گیا ہے اسی طرح Iroids اور Pandaceae ۔ یہاں پر گرد گل غائب ہے ۔ Apocarpeae میں پھل پتے آزاد ہیں ۔ Glumaceae میں پھول نہایت سادہ ہیں ۔

اس جماعت کا ایک اور نقص یہ بھی ہے کہ Monochlamydeae کے تحت ایسے عائلے رکھ دئے گئے ہیں جن کا نسلیاتی تعلق دو گھیرے دار (یعنی ایسے عائلے جن میں کمامہ اور اکلیلچہ پایا جاتا ہے) عائلوں سے ملتا ہے مثلاً Salicineae اور Cupuliferae کی پھولوں کی سادگی ایسے عائلوں کے ابتدائی پرکھوں سے ملتی ہوگی جو اب غائب ہوگئے ہیں ۔ اس لئے یہ عائلے موجودہ کسی گروہ کے قریب نہ ہوں گے ۔ پھر بھی ان کو ایسے دو گھیرے دار عائلوں کے قریب رکھنا چاہئے جن کے آبا و اجداد ان سادہ پھول والے عائلوں کے آبا و اجداد سے حاصل ہوئے ہیں مثلاً Chenopodiaceae اور Caryophyllaceae کے قریب رکھنا چاہئے کیونکہ خمیدہ جنین دونوں کی مشترک خاصیت ہے ۔

یقیناً یہ کہنا مشکل ہے کہ ایک گھیرے والے پھولوں کے عائلے دو گھیرے والے پھولوں کے عائلوں سے تنزل یافتہ ہیں یا ان سے ابتدائی ۔ لیکن کسی ایک مبدا سے دونوں کے ارتقا کو اگر ڈھونڈ نکالا جائے تو کسی نظامی ترتیب میں اس سے مدد لی جاسکے گی ۔ بنتھام اور ہوکر کے بموجب ایک مشترک مبدا سے Polypetalae پھر ان سے Gamopetalae حاصل ہوئے ۔

ایک بیج پتیا پودوں کی ذیلی تقسیموں میں بیضخانہ کے نسبتی مقام یا گردِ گل کی نوعیت پر زیادہ زور دیا گیا ۔ اور اسی کو نسلیاتی تعلق کی کسوٹی سمجھا گیا ہے حالانکہ تمام عائلوں کا تنقیدی مطالعہ ہونا چاہئے تھا مثلاً Irideae اور Amaryllideae یقیناً Liliaceae سے Scitamineae یا Bromeliaceae کے بہ نسبت زیادہ قریب ہیں ۔ حالانکہ دونوں میں Epigynons خصوصیت مشترک ہے اس لئے ان کو Scitamineae اور Bromeliaceae کے ساتھ رکھا گیا ہے ۔ نیز Juncaceae ، Liliaceae سے قریب ہونا چاہئے لیکن اس کو Palmac کے قریب

رکھا گیا ہے جس سے وہ کوئی قریبی نسلیاتی تعلق نہیں رکھتا۔

ایک فرانسیسی ماہر نباتیات Van Tieghem نے ۱۸۹۹ء میں ایک اور ترتیب شائع کی۔ اس نے ابتدائی دو ذیلی تقسیموں کو قائم رکھا مثلاً Astigmateae (Gymonosperms) اور Strgmateae (Angiosperms) لیکن بندبیجوں کی ذیلی تقسیموں میں اُس نے جڑ کے نقطۂ نمو پر زیادہ زور دیا۔ اس طرح سب سے اہم خاصیت تو بیضدان ہے اس کے بعد پنکھڑیوں کی موجودگی یا غیر موجودگی، اُن کا ملاپ اور بیضخانہ کا مقام بھی رکھا گیا ہے۔ اس غیر لچکدار نظام سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ اگر ایک مقام پر کوئی شکلیاتی خصوصیت اہم ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہی دوسری مقام پر بھی اہم ہو۔

ان سب ترتیبوں میں بہتر درجہ بندی Engler کی ہے۔ Engler ۱۸۴۴ء میں بمقام برلن پیدا ہوا۔ اس کی تقسیم پہلی مرتبہ ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ تقریباً تیس سال جامعہ برلن کا پروفیسر نباتیات رہا۔ ساتھ ہی ساتھ اس شہر کا بوٹانک گارڈن اور میوزیم اس کی نگرانی میں رہا۔ پہلی تقسیم بہت جلد مقبول ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں اس کو زیادہ تفصیل سے "Die Naturlichen Pflanzen familien' کے عنوان سے دوبارہ جاری کرنا پڑا۔ اس کے بعد مختلف طویل ضمیموں کے ذریعہ اس میں اضافہ ہوتا رہا چنانچہ اب یہ جماعت بندی بیس ۲۰ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

بنتھام و ہوکر اور Engler کی تقسیموں میں اہم فرق یہ ہے کہ Jussieu کے گرو Polypetalae اور Monochlamydae کو یہاں ایک عنوان Archichlamydac کے تحت بیان کیا گیا ہے نیز یہ کہ اس میں ایک بیج پتے سب سے پیشتر رکھے گئے ہیں۔

اس درجہ بندی میں عائلہ کے گروہوں کو ایسے سلسلوں میں ترتیب دیا گیا ہے جن میں پھولوں کی ساخت کی پیچیدگی بڑھتی جاتی ہے۔ ابتدائی گروہوں میں پھول برہنہ ہیں یا ایک قبا ہیں۔ اعلیٰ گروہ Dichlamydy ہیں۔ اس سے زیادہ ارتقائی عائلوں میں ان گھیروں کا ملاپ ہو گیا ہے ان کو Sympetalae کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ ارتقائی ایک ذیلی گروہ ہے جس کو Archichlamydeae سے تمیز کیا جاتا ہے۔

انگلر کا طریق، بنتھام اور ہوکر کے طریق سے علیحدہ یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ اس میں

chlanydae کا کوئی علٰحدہ مخصوص گروہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کو بن پنکھڑیوں میں منتشر کردیا گیا ہے۔ مزید براں انگلر کے نظام میں نہ صرف عائلوں کے نسلیاتی تعلق کو تبلایا گیا ہے بلکہ ان کے پھولوں کی ساخت سے عائلوں کا ارتقائی رجحان بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً Sympetalae کی نسبت انگلر کا خیال تھا کہ وہ ان الگ پنکھڑیوں سے نہیں حاصل ہوئے ہیں بلکہ وہ ان کے مورثین سے بہت ابتدائی حالت میں ہی مل پنکھڑیا خصوصیت کے حامل ہوگئے ہیں۔

انگلر کی تقسیم پر حال حال میں بڑی زبردست تنقید کی گئی۔ اس خیال کے تحت اس پر نکتہ چینی کی گئی کہ بند بیج والے پودے Cycodeoideae (یعنی Benettrites) کے پھول سے حاصل ہوئے ہیں۔ جن میں ایک بڑا مخروطا کئی پیچدار زہری غلاف سے گھرا ہوا ہے۔ اس پر نر اور مادہ بذری پتے لگے ہوتے تھے۔ اس خیال کی تائید کرنے والوں کا خیال ہے کہ اس طرح حاصل شدہ ابتدائی پھول کا عائلہ Ranales میں ملے گا۔ جہاں پر ایک مخروطا پر آزاد گردگل، کثیر زر ریشے اور کثیر آزاد پھل پتے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ Magnolia اس خاکہ کی اچھی ترجمانی کرتا ہے۔ لہٰذا اس خیال کے تحت تمام موجودہ بند بیجے Ranalian قسم سے حاصل ہوتے ہیں۔ نیز اس خیال کے تحت Dichlomydeous عائلے، munochla mydeous Achlamydeous عائلوں کی تخفیف یافتہ شکلیں ہیں۔ علاوہ ازیں یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سادہ عائلے Anemophilous ہیں۔

C. Roberston نے بے پنکھڑیوں کے گروہ Amentiferae کی ارتقائی کیفیات پر تحقیقات کی ہیں۔ چنانچہ اس کے نتائج کی نوعیت پر انگلر کی جماعت بندی کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا انحصار ہے۔ وہ یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ ابتدائی زہراوی پودوں کی زیرگی کیڑوں کے ذریعے عمل میں آتی تھی۔ بعد میں ایسے پودے حاصل ہوئے جن کے پھولوں کی زیرگی ہوا کے ذریعہ ہوتی تھی۔ لہٰذا آخرالذکر کسی طرح ابتدائی نہیں ہوسکتے۔ ایک نظریہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ بے پنکھڑے وابتدائی کھل بیجے بھی Anemophilous تھے اس لئے بے پنکھڑے بھی ابتدائی ہوئے یہ بھی ایک غلط نتیجہ ہے کیونکہ ارتقاء کھل بیجوں سے جو Anemophilous تھے پنکھڑیوں کی جانب ہوا اور ابتدائی زہراوی پودے

Entomophilous تھے۔ ان سے بے پنکھڑے حاصل ہوئے جو Anemophilous ۔ اس خیال کو مزید تقویت بعض Gnetales سے ہوتی ہے۔ جن میں زیرگی کیڑوں کے ذریعے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ دوسرا اعتراض جو بے پنکھڑیوں کے ارتقائی ہونے پر کیا جاتا ہے وہ بیضہ خانہ کے سادہ اور اکہر ہونے پر ہے۔ لیکن Amentiferae کے بیضہ خانے نمایاں طور پر ایک سے زیادہ بیضہ خانوں کے ملاپ سے حاصل ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اکل پہلا بیض خانوں سے ترقی یافتہ ہے لہذا بے پنکھڑیوں کے بعد بیان کرنا چاہئے تھا۔ نیز ایک بیج پتیا پودوں کا ذکر دو بیج پتیا پودوں کے بعد ہونا چاہئے تھا لیکن انگلر نے ایک بیج پتیا پودوں کو دو بیج پتیا پودوں سے پہلے رکھا ہے۔ حالیہ رکازی پودے اس ترتیب کا بھی بہت کم ساتھ دیتے ہیں۔

Charles Edwin Bessey پہلا امریکی ہے جس نے اپنا ایک علٰحدہ نظام تقسیم قائم کیا۔ اس کے پہلے ملک میں عام طور پر بنتھام ہوکر اور انگلر کی جماعت بندیاں مروج تھیں۔

۱۸۹۴ء Bessey کا ابتدائی نظام زیادہ تر کنڈول کی جماعت بندی کی ترمیم شدہ صورت تھی۔ بیسے اور بنتھام و ہوکر کے نظامات میں اہم اختلافات یہ ہیں کہ گروہوں کے ناموں کی تبدیلیوں کے علاوہ یک بیج پتیا پودوں کی علٰحدہ تنظیم کی گئی۔ نیز ایک قبادار کو دیگر آرڈروں میں منقسم کر دیا گیا۔ کھل بیجے بالکل علٰحدہ کر دئیے گئے۔ بیسے اپنے پیش کردہ نظام میں مسلسل ترمیمیں کرتا رہا چنانچہ آخری بار (۱۹۰۹ء) کے شائع شدہ نظام میں بہت سی باتیں بنتھام و ہوکر کے موافق تھیں۔ بیسے نے زیادہ تر نسلی تعلقات کو پیش کرنے کی کوشش کی۔

ایک اور قسم کی تقسیم Carl Moz نے ۱۹۱۴ء میں پودوں کے serum diagnosis پر رکھی جو انسانوں کے Soro-diagnosis کے اصول پر کی گئی ہے۔

۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۴ء تک J. Hutchinson جو کیسو کے رائل بوٹانک گارڈن کے نگران کار تھے اپنی ترمیمات کے ساتھ ایک نظام تقسیم دو جلدوں میں پیش کیا ہے جو کئی امور میں بنتھام ہوکر اور انگلر کی جماعت بندیوں کی انقلاب انگیز تبدیلیوں پر منحصر ہے مثلاً سب سے پہلے انہوں نے Archichlamydeae میں اکل پنکھڑی بے پنکھڑے شامل کئے ہیں۔ اس میں اس نے چوبی کو Ranales سے علٰحدہ اور پہلے بیان کیا ہے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اول الذکر کی چوبی حالت اور پھولوں کی چکردار ترتیب بہت ابتدائی ہے Hutchinson نے کوشش کی ہے کہ حتی الامکان اس کا نظام نسلیاتی تعلقات پر مبنی ہو گو انھیں اعتراف ہے کہ

اس کوشش میں وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے لیکن عام طور پر آجکل یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ نظام اگلے نظامات پر فوقیت ضرور رکھتا ہے۔

یہ ترتیب اس مفروضہ کے تحت کی گئی ہے کہ ایسے پودے جن میں گرد گل دو گھیروں میں کمامہ اور کلیلچہ کی صورت میں موجود ہے ان عائلوں سے زیادہ قدیم ہے جن میں کمامہ اور کلیلچہ نہیں ہے۔ یہ خیال اس مفروضہ کی تائید کرتا ہے کہ ایک پھولدار پودے کے مختلف زہری اجزاپتوں کی متبدلہ شکل ہیں۔ یہ اجزاء لازماً ابتدائی ہوئے۔ اگر ان میں ملاپ ہو تو یہ ایک ارتقائی علامت ہے۔ نیز ان کی پیچیدار ترتیب بہ نسبت گھیرے دار ترتیب کے ابتدائی ہے۔ اس کے علاوہ کثیر زر ریشی حالت بہ نسبت چند زر ریشی اور مل زر ریشی حالت کے ابتدائی ہے۔ مزید براں خنثی شکل کیفیت یک جاتی کیفیت کی نسبت ابتدائی ہے۔

اس ترتیب میں گروہ چھوٹے ہیں۔ ان میں ایسے عائلہ رکھے گئے ہیں جن میں نسلیاتی تعلق بہت واضح ہے۔ بنتھام اور ہوکر کی یک قبا کو اصل پنکھڑیوں کے عائلوں میں حالیہ اور ارتقائی سمجھکر بانٹ دیا گیا ہے۔ ایک بیج پتوں کو دو بیج پتوں کے بعد رکھا گیا ہے۔ ان کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہ بہت ابتدائی زمانے میں دو بیج پتیا کے یا دوسرے ایسے ہی گروہوں سے حاصل ہوئے ہیں۔ حالیہ کازی پودوں کی دریافت ان نظریوں کی توثیق کرتی ہے۔

یہ امر اب بھی سہولت بخش ہے کہ دو بیج پتیا پودوں کی جماعت بندی میں Hutchinson کے سفارش کردہ دو گروہ باقی رکھے جائیں:-

1 Archichlamydae (PolyPetalae and Monochlamydeae)

2 Metachlamydae (Gamopetalae and Sympetaleae)

لیکن اگر پنکھڑیوں کے ملاپ کو ایک عام توافق خیال کیا جائے تو پھر ایک ایسی تقسیم کی جا سکتی ہے جو نسلی تعلقات پر ہی مبنی ہو مگر حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی انقلاب انگیز تجاویز پیش کرنا ابھی بہت قبل از وقت ہے کیونکہ اس صورت میں نتائج نہایت ہی عجیب ہونگے مثلاً Anonaceae کو Sapotaceae کے ساتھ اور Caryoplyllaceae Primulaceae اور Gentianaceae کو قریب قریب رکھنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں دیگر فصیلوں کی تقسیم کا عمل اتنا آسان نہیں رہے گا۔

محمد ریاض الحسین قریشی ام - یس - سی (آخری)

آنسو

——— وہ جا رہا تھا ———

غنچے چٹک رہے تھے، پھول بیساختگی میں مسکرا رہے تھے، کالے کالے مست بھونرے کنواری کلیوں کا منہ چوم رہے تھے۔ بے بس کلیوں کا کچھ شرم سے کچھ غصہ سے منہ لال ہو گیا تھا۔ نیچر نور کے کرنوں میں نہا دھو کر بنی ٹھنی کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے دیکھا۔ سب کچھ دیکھا۔ اُس کے قدم رُک رہے تھے مگر وہ ٹھہر نہ سکا۔ ہر شئے دلکش تھی مگر اُس کے لئے جاذبِ نظر نہ ہو سکی۔

موسم کی دلفریبیاں ذرہ ذرہ میں بدمستیاں پیدا کر رہی تھیں لیکن اُس کے پُر رعب چہرہ پر سنجیدگی و متانت کی لہریں رقصاں تھیں اور اُس کے لبوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ۔

——— وہ چلا جا رہا تھا ———

بادل کی کڑک میں اُس نے بجلی کو مسکراتے دیکھا۔ اُس سے رہا نہ گیا ہنس پڑا۔ گھٹائیں شرم سے پانی پانی ہو گئیں۔

تاروں کے جلو میں، مہتاب اٹھلایا ہوا بڑھ رہا تھا۔ اُس کی پر نور شعائیں حسین شفاف چشموں پر

ناچ رہی تھیں۔ اس نے اس منظر کو بیتاب ہو ہو کر دیکھا۔ دل کی دھڑکنیں بڑھ رہی تھیں مگر ۔۔۔ وہ بڑھتا ہی گیا باغ اُجڑ چکا تھا۔ گلستان خارستان تھا۔ نہ پھولوں کی مسکراہٹ تھی نہ بلبل نغمہ ریز، نہ غنچے چٹک رہے تھے نہ بھونروں کا چکر۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ موت آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی گھور رہی تھی۔ وہ بڑھ رہا تھا۔ مگر قدموں میں لغزش تھی۔ یہی عالم تھا کہ دور سے ایک دلخراش آواز آئی "پی کہاں" قدم اُٹھ نہ سکے وہ ٹھہر گیا۔ سنبھل نہ سکا گر پڑا اور اس کی حسرت نصیب آنکھوں میں اشک کا ایک قطرہ رقص کر رہا تھا۔

ادیب نے اُس کو "یاس" شاعر نے "درد" مغنی نے "سوز" سمجھا۔

بادی النظر میں سب کے سب حقیقت نا آشنا تھے فلسفی سوچ رہا تھا۔ اس نے ہر انسانی جذبہ کا تجزیہ کیا۔ اس نے سب کی سُنی مگر عقل اُس گتھی کو سلجھا نہ سکی۔ وہ متحیر تھا اور بحر تفکر میں غرقاب!۔

یکایک مرنے والے کی ایک "آہ" نے فلسفی کو چونکا دیا۔۔ وہ مر رہا تھا!! حقیقت عریاں ہوگئی دل تڑپ اُٹھا آنکھیں پرنم ہوگئیں اب اُس نے سمجھا کہ "آنسو" کی حقیقت کا انکشاف عقل سے ناممکن کیونکہ جس مسئلہ کو وہ حل کر رہا تھا اُس کا تعلق دماغ سے نہ تھا۔ دل کی دھڑکنوں میں اُس نے سُنا۔ بیساختہ بول اُٹھا سبھوں نے جو کچھ سمجھا وہ رازِ حقیقت نہیں بلکہ عقل و نظر کا فریب ہے وہ پکار اُٹھا۔

"تفسیر حیات، معراج زندگی، روحِ انسانیت جو ایک حقیر آنسو میں ہے وہ سطحی نظروں سے پوشیدہ مگر متلاشی نگاہیں اور دھڑکتے ہوئے قلوب اس حقیقت سے آشنا۔ آنسو یاس ہے نہ درد ہے نہ سوز بلکہ انسانیت کا جوہر، روحِ وجود کائنات، جذبۂ محبت کا نچوڑ۔

سیّد احمد محی الدین (عثمانیہ)

ہندوستان کا مستقبل

"یہ مضمون فی البدیہہ اردو تحریری مقابلہ جشن یوم جامعہ میں لکھا گیا تھا اور
اس کو انعام اول کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔"

"ادارہ"

ایشیائی عموماً شاہ پرست ہوتے ہیں وہ بادشاہ کو خدا کا سایہ یا ظل اللہ کہتے ہیں چنانچہ اہل جاپان کی شاہ پرستی کے قصے زبان زدِ خاص و عام ہیں وہاں کے بچہ بچہ میں جذبۂ شاہ پرستی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ہندوستان بھی اس نعمت سے محروم نہیں ہے لیکن تقریباً ایک صدی سے یہاں کے باشندوں کی ذہنیتوں میں ایک خاص تغیر ہوگیا ہے۔ یورپی اقوام کی آمد سے قبل ہندوستانی شاہ پرست تھے۔ ہندوستان میں یورپی اقوام کی آمد سترھویں صدی عیسوی سے شروع ہوی۔ اکبرؔ، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد ہی سے یورپی اقوام نے یہاں اپنا اثر جمایا لیکن یہ اسقدر موہوم سا تھا کہ اُس کے بقا اور نشو و نما کی بہت کم اُمید تھی۔ جس وقت مغلیہ خاندان کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گُل ہوگیا تو اُن کا اثر زیادہ مقبول ہوگیا حتیٰ کہ انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہوگئیں انگریزی مصنوعات کی ہر دلعزیزی بڑھ گئی اور ۱۸۵۷ء کے غدر جسکو "انقلاب" یا "جنگِ آزادی ہند" کا نام دیا گیا ہے، کے بعد سے انگریزوں کے قدم ہندوستان میں مستحکم طور پر جم گئے

اور تاجِ برطانیہ سے براہ راست تعلق پیدا ہو گیا۔ انگریزوں کی اس حکومت سے یہاں کے تمدن، تہذیب، معاشرت زبان اور روزمرہ کی زندگی پر اثرات پڑے۔ یہاں اس امر کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری ہوگا کہ مغربی سیاسیات کا اثر اہل ہندوستان کے دل و دماغ پر پڑا اور ہندوستانیوں کے اطراف ایک ایسا سیاسی ماحول اور اقتصادی حالات پیدا ہو گئے کہ وہ اپنے قدیم جذبہ شاہ پرستی کو بھولنے لگے اور ان میں ایک نیا تخیل پرورش پانے لگا وہ تخیل "جمہوریت" ہے۔ جس وقت ہندوستانیوں کے دل و دماغ جمہوریت سے روشناس ہوئے تو انہوں نے آزادی کا مطالبہ شروع کیا۔ اس خصوص میں یہاں ۱۸۸۵ء میں ایک قومی ادارہ قائم ہوا جس کو "کل ہند قومی کانگریس" کے نام سے یاد کرتے ہیں جس کے بانی ڈیوڈ ہیوم تھے ان کے علاوہ دادا بھائی نارو جی سر فیروز شاہ، بدرالدین طیب جی، تلک، گھوکھلے، سر سیندر ناتھ بنرجی، لالہ لجپت رائے اور سر ولیم وغیرہ بانیان کانگریس کی حیثیت سے تاریخ کانگریس میں ممتاز ہیں اس خصوص میں گاندھی جی بھی قابل ذکر ہیں۔ گاندھی جی ہندوستان کی ایک مایہ ناز شخصیت ہیں جن کا نام نہ صرف ہندوستان کے ہر گوشہ میں سنائی دیتا ہے بلکہ یورپی ممالک میں بھی اُن کے نام اور کارہائے نمایاں سے لوگ واقف ہیں یہ ناانصافی ہوگی اگر ہم ان کے ہم کاروں کے نام بھول جائیں۔ مولانا شوکت علی مرحوم مولانا محمد علی مرحوم مولانا ابوالکلام صاحب آزادؔ۔ پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ مولانا کفایت اللہ صاحب۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور خان عبدالغفار خان صاحب کانگریس کی تاریخ میں ممتاز ہستیاں ہیں جنہوں نے اپنے بے لوث اور بیش بہا خدمات سے یہ ثابت کر دکھایا کہ ہندوستان مستقبل قریب میں وہ منزلیں طے کرے گا جس کے خواہاں اہل ہند ہیں۔ یہاں مختصر طور پر کانگریس کے قیام اُس کے مقاصد اور لائحہ عمل پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

کانگریس ایک قومی ادارہ ہے جس میں ہندو، مسلمان اور دیگر اقوام برابر کے شریک ہیں۔ اس ادارہ میں کسی قسم کے رنگ و نسل اور مذہب و ملت کا امتیاز اور تفریق نہیں ہے۔ یہ ہندوستانیوں کی ایک ٹھیٹ قومی جماعت ہے اُس کا مقصد اور مدعا ہندوستان کی آزادی ہے دو ایک صدی سے اہل ہند کے گلوں میں غلامی کا طوق پڑا ہوا ہے محض اس غلامی کی وجہ سے ہندوستان ترقی کے میدان میں پیچھے ہے ہندوستانی

عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کی تاریخ کو ہم نہیں بھول سکتے کیا ایک وقت نہیں تھا جبکہ ہندوستان کی شان و شوکت ۔ جاہ و جلال عزت و عظمت ۔ شجاعت و شہامت ۔ طریقہ کامرانی و حکمرانی ۔ سیاست و حکومت تجارت و صنعت و حرفت ۔ تہذیب و تمدن ۔ زبان و معاشرت اور اتحاد و اتفاق دوسروں کے لئے سبق آموز نہ تھا ؟ لیکن آج اس غلامانہ زندگی و ذہنیت کی وجہ سے ہم میں ان تمام خصوصیات کا فقدان ہے ۔ کانگریس کے حامیوں نے میدان آزادی میں نہایت استحکام جرات اور ہمت کے ساتھ قدم اُٹھایا ہے ۔ کانگریس اپنے ابتدائی دور میں بہت ہی گمنام رہی اور اُس کے اراکین اور کارکن سرگرم اور ممتاز نہ تھے لیکن ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہئے کہ اُس کا سبق وہی ایک آزادی تھا ۔ یہ قومی ادارہ ابھی پوری طرح سے پھلنے پھولنے نہیں پایا تھا کہ یہاں پھر وہی فرقہ بندی اور فرقہ واریت کا سوال پیدا ہوا ۔ بقول اقبال مرحوم کے

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں ؟

اور یہاں ایک فرقہ واری تفریق پیدا ہو گئی جس کے نتیجہ کے طور پر نواب سلیم اللہ خان کی تحریک پر بمقام ڈھاکہ زیر صدارت نواب وقار الملک ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور دوسرے سال آدم جی پیر بھائی کے زیر صدارت بمبئی میں اس کا اجلاس منعقد ہوا ۔ لیگ میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا شفیع لیگ اور حسین لیگ کا علحدہ علحدہ قیام عمل میں آیا آخر میں وہ متحد ہو گئے ۔ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی مقتدر واحد نمایندہ جماعت ہے اُس کا اصلاحی پروگرام بھی کانگریس کی طرح ہے وہ بھی آزادی کی خواہاں ہے صرف فرق یہ ہے کہ کانگریس ایک قومی جماعت ہے اور لیگ ایک فرقہ واری جماعت جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی اور مدبر ہیں اگر ہندوستان بھر میں کوئی حقیقی معنوں میں مدبر اور سیاست دان ہے تو وہ محمد علی جناح ہی ہیں مسٹر جناح نے مسلم لیگ کی نیم مردہ جماعت میں زندگی کی روح پھونک دی ۔

اب ہندوستان میں دو بڑی سیاسی جماعتیں قائم ہو گئیں دونوں نے متحدہ کوشش کی کہ ہندوستان کو آزادی ملنا چاہئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کا اعلان کیا گیا ۔ ہندوستانیوں کی

بارہا کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ انھیں ان اصلاحات سے مطمئن کرنا چاہا۔ ان اصلاحات کی رو سے انتخابی عنصر کی تعداد بڑھا دی گئی۔ ہندوستانیوں کو کونسل میں شرکت کی اجازت دیگئی اور صوبجاتی حکومت میں بھی کچھ اختیارات عطا کئے گئے۔ ان اصلاحات کے بعد بھی برطانوی حاکم برابر مقتدر رہتے اور ہندوستانی اُن کے ماتحتین کی طرح خدمات انجام دیتے تھے۔ یہ اصلاحات ہندوستانیوں کے لئے ناقابل قبول تھے اُنھوں نے اس کے بعد آزادی کا پر زور مطالبہ شروع کیا برطانیہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء جنگ عظیم میں اُلجھا رہا جنگ کے تباہ کن نتائج نے برطانیہ کو کسی قدر پریشانیوں اور مصائب میں گرفتار رکھا۔ اس وقت بھی اہل ہند کی آواز ایوان شاہی سے ٹکرائی اور انھوں نے ۱۹۱۹ء میں مانٹفرڈ اصلاحات کا اعلان کیا۔ ان اصلاحات کی رو سے امور مملکت کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ایک امور منتقلہ دوسرے امور محفوظہ اور کچھ اختیارات ہندوستانیوں کو مرکز اور صوبوں میں عطا کئے اور صوبوں میں دوعملی قائم کی گئی۔ یہاں ہندوستانیوں نے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا تھا بھلا اُن کے لئے یہ چند اختیارات کس طرح قابل قبول ہوسکتے تھے۔ ان اصلاحات کے بعد بھی ہندوستان میں سیاسی بے چینی اور انتشار پیدا ہوگیا اور ترک موالات کی تحریک کی ابتداء ہوئی اور ہر جگہ انگریزوں کا بائیکاٹ شروع کیا گیا اس سیاسی ہیجان اور ہل چل کو دیکھ کر انگریزوں نے مناسب یہ سمجھا کہ ایک کمیشن مقرر کیا جائے تاکہ ہر جگہ دورہ کر کے غیر جانب دارانہ طور پر اپنی رپورٹ معہ سفارشات کے حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کرے یہ کمیشن ۱۹۲۷ء میں سر جان سائمن کے زیر صدارت مقرر کیا گیا دو سال کی تحقیقات کے بعد کمیشن نے متفقہ طور پر رپورٹ معہ سفارشات کے حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کی۔ ہندوستانیوں نے اس کمیشن پر اعتراض کیا کیونکہ اس میں کوئی ہندوستانی عنصر شریک نہ تھا ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو ہندوستان کے حالات اور ہندوستان کے ماحول سے غیر مانوس اور ناآشنا ہوں کس طرح ہندوستان میں صحیح طور پر تحقیقات کر سکتے ہیں اور کس حد تک اُنکی سفارشات مستند قرار دئے جا سکتے ہیں۔ ہندوستانیوں نے صاف کہدیا کہ وہ اس کمیشن سے مطمئن نہیں ہیں اور اُنکی سفارشات ناقابل قبول ہوں گی اس کے بعد موتی لال نہرو کے زیر صدارت نہرو کمیٹی کا انعقاد عمل میں آیا اور نہرو رپورٹ شائع ہوئی جس میں ذمہ دارانہ حکومت Responsible government اور قلمروی درجہ Dominlon Status کا مطالبہ

کیا گیا۔ اس سے انگریز چونکے اور انھوں نے ٹال مٹول شروع کی جس سے ۱۸۵۰ء کے کینیڈا کی یاد تازہ ہوئی آخر ایک عرصہ دراز کی سیاسی جدوجہد کے بعد انگریزوں نے طے کیا کہ ہندوستانیوں کو ایک ایسا طرز حکومت عطا کریں جو اُن کی معاشرت۔ ماحول، تہذیب اور فرقہ بندی کے اعتبار سے موزوں ہو کیونکہ ہندوستان میں نسلی۔ قومی۔ لسانی۔ تمدنی۔ معاشرتی اور جغرافی اختلافات بے حد ہیں۔ انہوں نے وفاق۔ Federation کو ہندوستان کے حالات اور ماحول کا لحاظ کرتے ہوئے اچھا اور موزوں طریق حکومت قرار دیا چنانچہ ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرس میں جس میں ہندوستان کے نمایندے اور والیان ریاست بھی شریک تھے وفاق کو ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا جس کا خیر مقدم سب سے پہلے مہاراجہ بیکانیر نے کیا۔ اس کے بعد دوسری کانفرس ۱۹۳۱ء اور تیسری کانفرس ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں Communal award کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد کافی غور وخوض کرکے انگریزوں نے ۱۹۳۵ء میں قانون حکومت ہند کا اعلان کیا جس کا نفاذ دو سال کے بعد ۱۹۳۷ء میں ہوا۔

اس قانون کی رو سے حکومت کے تین ادارے قرار دئے گئے ایک امپریل گورنمنٹ دوسرا صوبجاتی حکومت۔ تیسرے ریاستیں اور وفاق کا اعلان کیا گیا ابتک ریاستیں اس میں شریک نہیں ہیں ریاستوں کا مسئلہ کسی قدر پیچیدہ ہے۔ مہاراجہ بیکانیر نے پہلی گول میز کانفرنس میں نہایت فراخ دلی کے ساتھ وفاق کا خیر مقدم کیا لیکن جب یہاں آئے تو غور کرکے دیکھا کہ یہ طریق حکومت ہندوستانیوں کے لئے موزوں نہیں اس لئے ریاستوں کی طرف سے مخالفت شروع ہوئی۔ کانگریس نے ابتداء میں شدومد کے ساتھ مخالفت کی لیکن انگریزوں نے اُنھیں آٹھ صوبوں میں وزارتیں عطا کرکے منہ بند کردیا مسلم لیگ ہنوز مخالفت کر رہی ہے حال میں جو پانچ مطالبات مسلم لیگ کی طرف سے شائع ہوئے تھے اُن میں سب سے پہلا مطالبہ یہ تھا کہ ۱۹۳۵ء کا قانون حکومت ہند اُن کے لئے ناقابل قبول ہے وفاق کی شرکت میں ریاستوں کا بھی سراسر نقصان ہے مالی بار ریاستوں پر بیحد پڑتا ہے علاوہ ازیں جن ریاستوں کے پاس اپنا سکہ اور ٹپہ ہے وہ غائب ہوجائیگا جس سے اُنکی خود مختاری بھی ختم ہوجاتی ہے اس لئے ریاستیں پس وپیش کر رہی ہیں اب ریاستوں کو مزید ۲ سال کی مدت دی گئی ہے کہ وہ غور کریں یہ صوبونکی

حد تک ہندوستانیوں کو اختیارات عطا کئے گئے جس کو صوبجاتی " خود اختیاری حکومت " کہتے ہیں آٹھ صوبوں پر کانگریسی وزرار مقرر ہیں اور تین مسلم وزراتیں ہیں۔ صوبوں میں بھی پوری طرح سے ذمہ دارانہ حکومت قائم نہیں کی گئی ہے۔ گورنر کو وزرار کی نسبت بہت زیادہ اختیارات حاصل ہیں دستوری اختیارات اور ناگہانی اور اتفاقی حالات میں بھی اختیارات حاصل ہیں۔ آزادی کا کم امکان ہے۔

ہندوستان کا مستقبل حیات اجتماعی کا ایک اہم موضوع ہے اُسی وقت مستقبل کا اندازہ کیا جاتا ہے جبکہ ہم ماضی سے واقف رہیں کیونکہ مستقبل ماضی میں پنہاں ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ " We look bookward in order to go forward بیان بالا سے ہمیں واقفیت حاصل ہوگئی کہ ہندوستان کا ماضی کیا تھا اب ہم بآسانی مستقبل کی تلاش کرسکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان ایک براعظم ہے آب و ہوا ور جغرافی اعتبار سے ہندوستان سب سے برتر ہے لیکن فرقہ وارانہ کشمکش اور فرقہ واریت نے ہندوستان کے مستقبل کو تاریک بنا رکھا ہے آج سے چندسال قبل ہمارا خیال تھا اور بالکل صحیح تھا کہ ہندوستان کا مستقبل شاندار اور درخشاں ہوگا لیکن اس فرقہ واریت کی زہریلی فضا نے یہاں کے حالات اور ماحول کو اس طرح مکدر کر رکھا ہے کہ ہمیں مایوس کن اور حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہندوستان ایک براعظم ہے یہاں کئی نسلیں آباد ہیں اور کئی تمدن ہیں ان حالات میں یہاں جمہوری حکومت قائم کرنا مشکل اور دقت طلب امر ہے کانگریس نے جب سے کہ اس کو آٹھ صوبوں میں وزراتیں اور اختیارات ملے ہیں قلمروی رتبہ کا مطالبہ شروع کیا انہوں نے دعوی کیا ہے کہ جس طرح کناڈا نیوزی لینڈ جنوبی افریقہ اور اسٹریلیا کو قلمروی رتبہ حاصل ہے اُسی طرح ہندوستان کو بھی قلمروی درجہ حاصل ہونا چاہئے انگریز بھی اس بات پر رضامند ہیں کہ ہندوستان کو قلمروی رتبہ عطا کیا جائے چنانچہ سرسیمول ہور نے بارہا اپنی تقاریر میں کہا ہے کہ " قلمروی رتبہ کوئی ایسی چیز نہیں جو ہندوستان کو عطا نہ کی جاسکے اور یہ اُس وقت عطا ہوگا جبکہ حالات قلمروی رتبہ لینے کے لئے ہندوستانی پیدا کریں "

اُس وقت قلمروی رتبہ مل سکتا ہے جب کہ ہندوستانی اپنے آپ کو کناڈا۔ نیوزی لینڈ اور دوسرے قلمروں کے لوگوں کی طرح حکومت کرنے کے اہل ثابت کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ آپس کے اختلافات اور کشیدگی کے

باعث ہندوستانیوں میں اس قسم کی اہلیت ظاہر نہیں ہو رہی ہے۔ ہر قدم پہ نئے سیاسی تجربے ہوتے ہیں۔
یہاں کے لوگوں میں کارکردگی اور جفاکشی مفقود ہے۔ انگریزوں کا اعتراض ہے کہ اگر ہندوستانیوں کو قلمروی
رتبہ دیا جائے تو وہ اُنکی تباہی اور مزید فرقہ واریت کا باعث ہوگا اور اختلافات اسقدر رونما ہوں گے
کہ یہاں کے فریق ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے کیونکہ پہلے ہی سے ہندوستانیوں
کی نااتفاقی اور نفاق کا سارے عالم میں ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔

سنہ ۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کے بعد یہاں ایک مسئلہ رونما ہوا وہ اقلیتوں کا مسئلہ ہے
اس قانون سے مسلمان اور دیگر اقلیتیں غیر مطمئن ہیں مسلمانوں کو تین صوبوں میں حکومت یا وزارتیں ملی ہیں۔
اقلیتیں اپنے حقوق اور جائداد کا تحفظ چاہتی ہیں جن کو کانگریسی پائمال کرنے کے درپے ہیں۔ اُن آٹھ
صوبوں میں جہاں کانگریسی وزارتیں قائم ہیں سیاسیات کے پردہ میں اُنہوں نے ہندو تہذیب۔ ہندو
مذہب اور ہندی زبان کا پرچار شروع کیا اور مسلمان اور دیگر اقلیتوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے
شروع کئے۔ اُن کے حقوق اور جائیدادوں پر ہاتھ ڈالا گیا۔ کانگریسی وزارتوں کے اس طرزِ عمل سے
فرقہ واری کشیدگی میں مزید اضافہ ہوا جس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہو جانے پر مسلم لیگ
نے "یوم نجات" منایا۔

ہندوستان کے مستقبل کو شاندار بنانے اور قلمروی رتبہ حاصل کرنے کا صرف ایک ہی حل ہو سکتا
ہے وہ یہ کہ اقلیتوں کو چاہئے کہ وہ اپنی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے کانگریس میں جو یہاں کا بڑا سیاسی
ادارہ ہے شریک ہو جائیں اور کانگریس کو بھی چاہئے کہ اقلیتوں کی وحدت کو تسلیم کرے یعنی مسلم لیگ
کو مسلمانوں کی واحد مستند نمائندہ جماعت تسلیم کر لے بالفاظ دیگر مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی
میدان میں قدم بڑھائیں۔ کارکردگی پیدا کریں اور خود میں اس قدر صلاحیت و ایثار پیدا کریں کہ معمولی
معمولی اختلافات کو نظر انداز کر کے حکومت چلا سکیں۔ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھیں اور ہندوستانیوں
کی طرح سب مل جل کر زندگی بسر کریں فرقہ وارانہ کشیدگی کو دل سے دور کریں، آپس میں مذہبی رواداری
پیدا کریں، اتحاد و اتفاق کا سبق سیکھیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی پرانی عظمت و شوکت، شان و شکوہ

جاہ وجلال، دولت وثروت، سیاست وحکومت اور اتحاد ویکجہتی کو نہیں بھولیں ان سب باتوں کے علاوہ ایک اور امر غور طلب رہ جاتا ہے وہ دفاع کا مسئلہ ہے ہر قوم اور ملک کی مرگ وزیست کا انحصار فوج پر ہے۔ ہندوستانیوں کے پاس نہ فوج ہے اور نہ وہ آڑے وقت اپنی آپ مدد کرسکتے ہیں۔ سب سے پہلے ہندوستانیوں کو چاہئے کہ فوجی کمان اپنے ہاتھ میں لے لیں اور ملک کی مدافعت کا مسئلہ اٹھائیں ورنہ بغیر قوتِ مدافعت کے قلمروی رتبہ حاصل کرنا بے سود ہوگا۔

غرض اگر مذکورہ بالا حالات یہاں پیدا ہوجائیں یعنی جذبہ قوم پرستی اور جذبہ وطن پرستی پیدا ہوجائے تو ہندوستان مستقبل قریب میں اسی عظمت اور شان وشوکت اور جاہ وجلال کو پالے گا جو دو ایک صدی قبل اس کی ملکیت تھی ساتھ ہی ساتھ تجارتی ترقی صنعتی ارتقا اور قوت مدافعت کا کافی انتظام ہو اور سب سے اہم چیز یعنی فرقہ واری کشیدگی اور ناچاقی دور ہوجائے آپس میں اتحاد واتفاق اور یکجہتی پیدا ہوجائے اور ہندوستان ایک سیاسی وحدت بن جائے تو ہم بہ بانگ دہل اعلان کرسکتے ہیں کہ ہندوستان کا مستقبل نہایت شاندار اور درخشاں ہوگا فقط

محمد شفیع الدین احمد بی۔ اے (آخری)

آخری پھول

شاخ نازک پہ تو ہے، ایک گلاب
رخ سے اُلٹے ہوئے ہے، اپنی نقاب

آخری پھول ہے بہار کا تو
اک سنبھالا ہے شاخسار کا تو

نازوالے عدم کی راہ گئے
خوش ادا اور خوش نگاہ گئے

اب وہ صبح و مسائے حسن کہاں
اب وہ رنگین فضائے حسن کہاں!

آہ، کوئی نہیں ترا دمساز
کون سنتا ہے درد کی آواز

لیکن اے پھول اس کا خوف نہ کر
نوحہ خواں ہیں ہوں تیرے بالیں پر

صبحدم تیری آہ و زاری ہے
عمر ساری یونہی گذاری ہے!

عبدالقیوم خاں باقی ام۔ اے
لکچرار ادبیات اردو

ایک خط

سلمیٰ ———— !

ذوق گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینہ سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

اب مضمون نگاری کے مشغلہ سے مجھے اُلجھن سی ہونے لگی ہے۔ جی گھبراتا ہے لکھنے کے نام سے۔ اس لئے میں تم کو خط لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس کو کم کروں گی۔ اب خواہ تم اس کو مضمون سمجھو یا خط۔

یہ دنیا —— یہ غموں اور دکھوں کی بستی —— یہاں تو ایک ننھے سے پھول کی سی زندگی لانی چاہئے یا پروانہ کی حیات اک شب۔ ان دونوں کی مختصر عمر دیکھو تو کتنی قابل رشک ہے۔ ایک صرف تھوڑی دیر کے لئے ہنسنے اور مسکرانے میں اپنی زندگی ختم کر دیتا ہے۔ دوسرا جل کر مرجاتا ہے۔ ایک رات کی حیات ہی کیا۔ شمع پگھلتی تھی کسی زمانہ میں۔ اس نئی روشنی کی شمع نے تو پلک جھپکانے کی بھی قسم کھائی ہے۔ آج کل تو چراغ کے نیچے ہی زیادہ روشنی رہتی ہے۔ مگر خیر۔ پروانہ تو کسی طرح ختم ہو جاتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ نہ معلوم کب سے جی رہے ہیں اور کب تک جیئے جائیں گے ——

سلمٰی ـــــ میرے خطوط میں تم رنگینی و دلچسپی مت ڈھونڈو یہ تو تیر و نشتر ہوتے ہیں سماج کی دکھتی ہوئی رگوں کے لئے۔ جن کا منجمد خون بہتا بہتا نہیں۔

اُف تم نے کتنا بڑھا چڑھا کر مجھے مخاطب کیا ہے۔ تم نے کیا سمجھ لیا ہے مجھے ؟ انسان کے سمجھنے میں لوگ بہت غلطی کرتے ہیں۔ درحقیقت اس کا سمجھنا مشکل ہے ؎

جو نظر آتے ہیں نہیں انساں جو ہے انساں نظر نہیں آتا

تم شاعری کو محض الٹی سیدھی باتیں سمجھ کر اس سے گریز مت کرو۔ شاعر کا ایک ادنیٰ سا تخیل جو شعر کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے بڑے بڑے مضمون میں اسکی سمائی نہیں ہوتی۔ اس کے ہاتھ وہ چیز آئی ہے جو آپ کو صرف دوسری دنیا میں ملے گی۔ ہائے ـــــ تو مجھ جیسی مہمل ہستی کے لئے اپنے اتنے قیمتی الفاظ ضائع مت کر۔ مگر تم نے کہاں سے سیکھی ہے یہ الفاظ کی مصوری ؟ خیالات کی یہ والہانہ بندش نگارش کی یہ انوکھی طرز ؟ بلا مبالغہ تم ایک مصور ہو' جذبات و حسیات کی مصور۔ جن کو صحیح معنوں میں استعمال کرنیکی مجھ میں یقین مانو صلاحیت نہیں ۔ دنیا کی نت نئی نیرنگیوں نے دل کے دیئے کو بجھا دیا ہے۔ میری زندگی کا ساز اب بجتا و جتا نہیں ۔ خاطر جمع رکھو۔

خیال تو کرو ہم لوگ کتنے بے حس ہوتے جاتے ہیں ۔ اپنے ابنائے جنس کا ذرا ہم میں درد نہیں۔ ہم زندگی کے قنوطی پہلو پر بھی مذاق کا رنگ چڑھانے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ دنیا ایک حزنیہ و المیہ افسانہ ہے ۔ بچہ پیدا ہوتے ہی رونے لگتا ہے ۔ ایک غیر ارادی حرکت ہے یہ اس کی ۔ عقل ــ اُف یہ عقل و ہوش کی دنیا ـــــ اس کو ڈراونی سی معلوم ہوتی ہے ۔ گو عقل و ہوش اس سے دور ـــــ بہت دور رہتے ہیں ۔ ہم لوگ وضعداری میں مرے جاتے ہیں ۔ ہر کام میں تصنع بناوٹ ہمارا شعار ہو گیا ہے ۔ ہم مصنوعی چہرے بنا کر باہر نکلتے ہیں ۔ ہمارا ظاہر و باطن بالکل الگ ہے تانگے اور جھٹکے میں بیٹھنے کی بھی سچ پوچھو تو ہماری اوقات نہیں ۔ لیکن قرض کی موٹریں پھرنے میں ہم اپنی شان سمجھتے ہیں۔ یہ ہماری تہذیب ہے !

اپنے غریب عزیزوں سے امراء کی محفلوں میں بات چیت کرتے ہمیں شرم دامنگیر ہوتی ہے

کہیں لوگ تہ یہ سمجھ لیں کہ یہ بھی ہمارے عزیز ہیں ۔ اس سے یہ پتہ چل جائے گا تا کہ کبھی ہم بھی ایسے ہی تھے
— قدرت نے بڑے باپ کی بیٹی بنا دیا ' یا بڑی حیثیت والے کی اتفاق سے بیوی بنجائیں تو خود کو
نہ معلوم کیا سمجھنے لگتے ہیں ۔ غالباً باپ بھائی اور شوہر کو بھی اپنے حلقۂ تعارف میں اپنی اپنی خدمت
اور اپنے اپنے عہدوں پر یہ فخر نہ ہوتا ہوگا جن کو بیویاں ' بیٹیاں یا بہنیں اختیار کرتی ہیں ۔ یعنی دوست
احباب سے سلام علیک میں پیشقدمی کرنا بھی ان کے کسرِ شان ہو جاتا ہے ۔ یہ غالباً وضعداری ہے!
اسی میں ہماری شان ہے!! انکسار میں جو قوت ہے ' خاکساری میں جو کشش و جاذبیت ہے وہ غرور
میں نہیں ۔ غرور تم کو دوسروں کی نگاہوں سے گرا دیتا ہے ۔ انکساری تمھاری عزت بڑھانے کا ایک
زینہ ہے ۔ جس کا دوسرا زینہ خلوص ہے ۔ یہاں سے محبت حقیقی کا سراغ ملجاتا ہے ۔ مجاز ہی تو حقیقت
کی سیڑھی ہے ۔ اگر خدا تک پہنچنا ہے تو ریاکاری کے سجدوں اور دنیا دکھاوے کی نماز سے زیادہ خلق
سے حسنِ خلق کا برتاؤ رکھو ۔ زبان کا صدمہ بھلائے نہیں بھولتا ۔ دل ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتے ہیں
یہ بغیر ہڈی کی زبان چشم زدن میں دل کے آبگینہ کو چور چور کر دیتی ہے ۔ اس کو قابو میں رکھو تو دنیا تمھیں
سر آنکھوں پر لے گی ۔ خالق کی خوشنودی مخلوق کی دلجوئی میں ہے ۔ اور چیزیں ٹوٹ کر کم قیمت ہو جاتی
ہیں مگر دل کا آبگینہ ٹوٹنے کے بعد قیمتی ہو جاتا ہے ۔ دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے ۔ اس ہرجائی کی
محبت میں پڑ کر اپنے جگر گوشوں کے دل کا خون کرنے سے بہتر ہے کہ تم نماز مت پڑھو ۔ جس زبان سے
خدا کی عبادت اور اسکی پرستش کے انمول الفاظ نکلتے ہیں اس کو تو جنت کی کلید بننا چاہئے ۔ مگر تعجب
ہوتا ہے یہ دیکھکر کہ اکثر ایسے ہی لوگ "ہمچو من دیگرے نیست" کے نشہ میں خلق کو اپنی حرکات و سکنات
سے انتہائی دکھ پہنچاتے ہیں ۔

خلق و مروت ایک جادو ہے جس سے انسان ہر دلعزیز بنجاتا ہے ۔ لیکن بعض طبائع اس کی
ہر دلعزیزی پر بھی خار کھاتے ہیں ۔ اس میں نقائص ڈھونڈتے ہیں ۔ اسکی خرابیوں کو اجاگر کرنیکی ناکام
کوششیں ہوتی ہیں ۔

قلب کی بیماریاں — اگرچہ جسمانی امراض سے زیادہ مہلک اور سخت تکلیف دہ ہوتی ہیں ۔

لیکن بہت کم لوگ ہیں جن کو اپنے ان امراض کا خیال ہوتا ہے ۔ وہ تو محسوس بھی نہیں کرتے کہ یہ مرض ہے یا آسمانی رحمت ۔ اپنے عیوب کی تشخیص کا اتنا خیال نہیں رہتا جتنا اپنے امراض جسمانی کی تشخیص کا تمھاری جسمانی بیماری تو صرف تمھیں کو مبتلا رکھتی ہے ۔ تمھاری ہی حد تک اسکی دوڑ دھوپ قائم ہے تمھاری ہی صرف نیند حرام کردیتی ہے ۔ لیکن تمھارے قلبی امراض —— حسد، بغض، کینہ، عداوت، نفرت، غرور، تکبر، شان، میں پن، دوسروں کو ذلیل سمجھنا، دل آزاری، دلشکنی ان سے خیال تو کرو کتنے ایسے ہیں جو نالاں ہیں ۔ اس اپنے چھپتے مرض کی تشخیص کا تم کو کبھی خیال بھی ہوا ؟ اگر ابتک نہیں ہوا تو اب بھی وقت ہے ۔ اس کی چارہ جوئی کرو ۔ سنسار کی بددعا اچھی نہیں ہوتی ۔ خلق کی بے چینی میں خالق کی خلش مضمر ہے ۔

جھٹ خفا ہونا، زود رنج بننا یہ فطری امراض ہیں ۔ ان سے بچنا اپنے بس کا روگ نہیں بعض مواقع ہوتے ہی ایسے ہیں کہ انسان اگر زود رنج نہ ہو تو دل پھٹ کر مر جائے ۔ دنیا میں صرف شادی مرگ ہی کے حادثے نہیں ہوتے ۔ یوں بھی لوگ مر جاتے ہیں ۔ ایک حد تک کوئی ظلم سہہ سکتا ہے ۔ اس سے تجاوز کر جائے تو خودداری کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے ۔ اس لئے جھٹ خفا ہونا اچھا نہیں تو برا بھی نہیں ۔

تم میرے پند و نصائح بھرے خط سے گھبرا تو نہیں جاتیں ؟ مگر تم کو نصیحت اور پھر میرے منہ یا قلم سے کیا اچھی معلوم ہوگی ۔ تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو ۔ تم خود سمجھو ۔ میں کیا سمجھاؤں تمھیں ۔ تمھیں میرے خیالات سے اتفاق ہے کہ نہیں ؟ میں بعض وقت اپنے خیالات کی روانی میں بہت بہہ جاتی ہوں ۔ یہ بڑی کمزوری ہے میری ۔ ان جذبات کی تو الفاظ میں تصویر ہی نہیں کھینچ سکتی جو تمھارے متعلق میرے دل میں موجزن ہیں ۔ بلکہ ساری دنیا آجاتی ہے میری نظروں میں ۔ اس طرح میرا تخیل بوجھل ہو جاتا ہے ۔ لیکن اگر انسان اپنے دلی جذبات کسی وجہ سے مجبور ہو کر ظاہر نہ کرسکے تو اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے دل میں جذبات ہی نہوں گے ۔ جو زیادہ سوچ سکتے ہیں وہ زیادہ بول نہیں سکتے ۔ دماغ کام میں رہے تو زبان عاجز و درماندہ رہ جاتی ہے ۔ اور جو زیادہ بک بک کرتے ہیں

ان کی عقل کو تو لگام نہیں ہوتی ۔ ہاں تو کیا کہہ رہی تھی ـــ ایک پرسکون عظیم الشان سمندر میں چھوٹی چھوٹی موجوں کی مسلسل روانی دیکھ کر کیا یہ اطمینان کیا جا سکتا ہے کہ اسمیں طوفان کبھی نہ آئے گا؟ اور یہی کمزور موجیں کبھی پہاڑ کی طرح سر اُٹھا کر چٹان جیسے ساحل سے نہ ٹکرائیں گی؟ اگر اس قسم کے مشاہدے کا کبھی موقع ملا ہے تو تم اندازہ لگا سکتی ہو اس سے دوسری باتوں کا۔

بس اب اپنی اس والہانہ بکواس کو ختم کرونگی ـــ کہ تمھارے ساتھ دوسرے بھی اس کو سن سن کر اُکتا گئے ہیں۔ قصہ مختصر ؎

ہزاروں حوادث ہیں یا زندگی ہے
یہی زندگی ہے تو کیا زندگی ہے

"تمہاری ناہید"

جہاں بانو بیگم ایم۔ اے (عثمانیہ)

ہماری غذا میں حیاتین کی اہمیت

ابتدائی زمانہ میں کچے پھل، ترکاری اور حیوانوں کے گوشت پر انسان گذر بسر کیا کرتا تھا اور یہی اسکی اصلی وفطری غذا تھی لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا انسان کائنات پر زیادہ سے زیادہ قابو حاصل کرکے عناصر کو اپنے قبضے میں کرتا گیا۔ اب وہ تمدن کے اُس درجہ پر پہنچ گیا تھا جہاں معاشی فرق مراتب پیدا ہوا اور معاش پر زیادہ قابو رکھنے والوں نے عیش پسندی شروع کی یہاں تک کہ حسی لذات میں بھی زیادہ سے زیادہ تنوع پسندی شروع ہوئی۔ اس کا اثر اور دوسری چیزوں کے علاوہ زیادہ تر غذا پر پڑا۔ چنانچہ سادی اور مقررہ غذاؤں کے بجائے مرکب اور مختلف النوع غذائیں وجود میں آئیں۔ ہر چیز میں افراط وتفریط شروع ہوئی۔ فطری غذا کی جگہ مصنوعی غذا نے لے لی۔ مزے کی خاطر انسان نے غذا کی روح یا دوسرے الفاظ میں "جوہر حیات یا حیاتین" کو بہت بڑی حد تک اپنی غذا سے گھٹا دیا۔

لیکن بہت جلد اس کو بعض تلخ تجربات ہوئے۔ چنانچہ مفکروں نے ہر چھوٹے چھوٹے واقعہ پر غور کرنا شروع کیا۔ یہی وہ چیز تھی جس سے وہ فطرت کی بہت ساری چیزوں کے رموز اور اسرار معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ چنانچہ حیاتین بھی ان میں سے ایک تھے جن کا انکشاف واضح طور پر اسی صدی کی ابتداء

میں ہوا۔ اور ان کی تحقیق کا سہرا ایک انگلستانی سائنس دان ھاپ کنز (Hopkins) کے سر ہے
یہاں اُن واقعات کا مختصراً بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا جن کے باعث مفکروں نے حیاتین کی تحقیق کی طرف توجہ کی۔

اٹھارہویں صدی میں جہاز راں جب لمبے سفر کو جاتے تھے تو اپنے ساتھ خورد و نوش کی ایسی اشیاء رکھتے جو زیادہ دن تک خراب نہ ہونے پائیں مثلاً روٹی، چاول، گیہوں، باسی گوشت اور دال وغیرہ۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اکثر وہ ایک خاص قسم کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ جسکی وجہ سے اُنکے مسوڑھے پھول جاتے اور اُن سے خون بہنے لگتا تھا نیز پاؤں متورم ہو جاتے اور ان میں درد ہونے لگتا تھا۔ کوئی دوا اس مرض پر کارگر نہ ہوتی تھی۔ لیکن کپتان کوک سب سے پہلا شخص تھا جس نے تازہ پھل اور ترکاریاں کھلاکر جہاز رانوں کو اس بیماری سے نجات دلائی۔

انقلاب روس کے زمانہ میں جب غذا نایاب ہوگئی تھی ہسپتالوں میں ہڈیوں سے جلالین نکال کر اس کا شوربا مریضوں کو دیا جاتا تھا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اس شوربے کے استعمال سے بدہضمی اور اسی قسم کے بہت سے امراض، جو فتور فعلیت معدہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں تمام مریضوں کو لاحق ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جسم میں حیاتین کی کمی کا نتیجہ تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں بھی اسی قسم کے مشاہدات ہوئے۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد سے سائنس کے اس شعبہ نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اور اب غذا کا سوال ساری دنیا میں ایک دلچسپ، اہم اور مفید مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں تین "نوبل انعام" اُن سائنسدانوں کو دئے گئے جو حیاتین پر تحقیقاتی کام کر رہے تھے۔ تقریباً پچیس سال کی لگاتار دماغی کاوشوں کے بعد حیاتین کی پوری اصلیت معلوم ہوئی ہے، اور اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ مختلف اشیاء سے کئی ایک حیاتین اصلی حالت میں علٰحدہ حاصل کر سکیں۔

جو غذا ہم کھاتے ہیں آنتیں اس میں سے ان اجزا کو جذب کر لیتی ہیں جو ہماری جسمانی عمارت کے بنانے میں ممد و معاون ہونیکے علاوہ نہایت ہی ضروری ہوتی ہیں۔ یہ اجزاء خون کی نالیوں کے ذریعہ

ان اعضا تک پہونچادی جاتی ہیں جن کو ان کی ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن جسم کو بنانے والی اشیا جو پروٹین اور معدنی نمک کہلاتی ہیں تقریباً ویسی ہی بے جان ہوتی ہیں جیسی کہ مکان کی تعمیری اشیاء ۔ وہ خود بخود جسم کے مختلف حصوں میں داخل نہیں ہوسکتیں بلکہ اُن کو معماروں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ جسم کا سب سے بڑا معمار ہماری قوت حیات ہے جس کے کئی مددگار ہیں ۔ ان مددگاروں میں سے بعض مددگار "حیاتین" کہلاتے ہیں ۔ یہ نام ان کی اسی خاصیت کی بناء پر انھیں دیا گیا ہے ۔

حیاتین جسم کے بنانے اور اس کی تعمیر میں تقریباً وہی کام انجام دیتے ہیں جو کسی مکان کے بنانے میں سنگتراش، خشت ساز، اور نجار انجام دیتے ہیں ۔ ان کارکنوں کے ناموں کی طرح حیاتین کے بھی نام ہیں ۔ یہ حیاتین، ا، ب، ج، د، اور ہ سے منسوب کئے جاتے ہیں ۔ جس طرح سنگ تراش پتھر جماتا خشت ساز اینٹ رکھتا اور بڑھئی کھڑکیاں اور دروازے تیار کرتا ہے اور یہ سب ملکر ایک ہی عمارت کی تکمیل کرتے ہیں ۔ اسی طرح یہ مختلف حیاتین بھی ہمارے جسم میں مختلف افعال انجام دیتے ہیں ۔ اور یہ سب کے سب ملکر ہمارے جسم کی بالیدگی اور اس کے وجود کو قائم رکھتے ہیں ۔

یہ تمام حیاتین معہ ان تعمیری اجزاء کے جن سے ہمارا جسم تعمیر ہوا ہے صرف صحیح غذا ہی میں پائے جاتے ہیں ۔ لیکن اگر غذا ناقص ہو تو نہ اس میں ایسے تعمیری اجزا ہوں گے اور نہ حیاتین جو جسم کے نشو و نما اور مناسب تعمیر کے لئے کافی ہوسکیں ۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جسم کے بعض حصے اور اعضاء صحیح طور پہ اور مکمل نشو و نما نہیں پاسکیں گے ۔ اور وہ کام انجام نہیں دے سکیں گے جن کا انجام دینا مطلوب تھا ۔ جس طرح ناقص تعمیری اشیاء یا غیر ماہر معماروں کی وجہ سے کسی مکان کی چھت تڑخ جاتی ہے اور پانی اندر رسنے لگتا ہے ۔ اسی طرح ہڈیاں جن کا کام جسم کو سدھارنا ہے خم ہو جائینگی یا ٹوٹ جائینگی ۔ دانت جن کا کام غذا چبانا ہے ناکارہ ہو جائیں گے یا ٹوٹ جائیں گے ۔ پٹھے ڈھیلے پڑ جانے کی وجہ سے ہاتھ پیر کھیل کود اور دوسرے کاموں کے قابل نہ رہیں گے ۔ پھیپڑے جن کا کام جسم کو آکسیجن بہم پہونچانا ہے کمزور ہو جانیکی وجہ سے اپنا پورا کام انجام نہ دے سکیں گے ۔ معدہ اور آنتیں جن کا کام غذا کا ہضم کرنا، تحلیل کرنا اور فضلے کو جسم سے خارج کرنا ہے، بہت کمزور ہو جائیں گے ۔ اور اپنا کام پورا نہ کرسکیں گے ۔ مختصر یہ کہ ہماری ناقص غذا متعدد مہلک بیماریوں کا

باعث ہوگی ۔

حیاتین ا ۱۸۸۸ء میں سوئٹزرلینڈ کے ایک سائینسدان لیونن (Lunin) نے یہ تبلایا کہ کامل غذا میں ایک نامعلوم کیمیائی شے کی سخت ضرورت ہے ۔ اور لندن میں ۱۹۰۶ء میں ہاپ کنس بھی ذرا تفصیلات سے اسی نتیجہ پر پہونچا ۔ اور اس کے چند سال بعد ۱۹۱۵ء میں امریکہ کے دو سائینسدان مک کالم (Mccallum) اور ڈے وس (Davis) نے تبلایا کہ غذا میں کم از کم دو حیاتینوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن ۱۹۲۸ء میں سویڈن کے ایک سائینسدان ایولر (Euler) نے یہ نتیجہ نکالا کہ کیروٹین (Carotene) ان نامعلوم حیاتینوں کا نعم البدل ہوسکتا ہے ۔ اسی طرح انگلستان میں مور (Moore) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جانور اپنے جسم میں کیروٹین کی مدد سے حیاتین جمع کرتے ہیں ۔ اور بالآخر سوئٹزرلینڈ کے سائینسداں کیرر (Carrer) نے ۱۹۳۱ء میں حیاتین کا کیمیائی ضابطہ معلوم کرلیا ۔

یہ حیاتین پودوں کے سبز پتوں پر دھوپ کے عمل سے تیار ہوتا ہے ۔ اور وہ جانور جو سبز پتے کھاتے ہیں ان کے جسم میں حل شدہ حالت میں چربیوں میں موجود رہتا ہے ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی کلیجی، گردے، اور دوسرے اعضا میں بھی محفوظ رہتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کلیجی حیاتین ا کا سب سے بڑا مخزن ہے ۔

تجربوں سے منکشف ہوا ہے کہ پودوں میں جو زرد رنگ سبزی کے ساتھ ملا ہوا کیروٹین کا ہوتا ہے وہ کیمیائی اعتبار سے حیاتین ا سے متعلق ہے ۔ گاجروں میں زرد رنگ اسی کیروٹیں کا ہوتا ہے جو حیاتین ا کا ایک عمدہ ماخذ ہے چند سال پیشتر دو سائینسدانوں نے یہ حیاتین خالص حالت میں علحدہ کیا ہے ۔ کیروٹین جس سے یہ حیاتین حاصل کیا گیا ہے، بازار میں بہت زیادہ قیمت سے بکتا ہے ۔ یعنی اسکے ایک گرام کی قیمت تقریباً چالیس روپیہ ہے ۔ اور یہ مقدار پندرہ سو سے زیادہ اشخاص کے لئے کافی ہوتی ہے ۔

اس حیاتین کا سب سے پہلا اثر تو ان غشائے مخاطی (Mucaus Membranes) پر ہوتا ہے جو پپوٹے، ناک، نرخرے، معدے، آنتوں اور مثانے کی استرکاری کرتے ہیں ۔ اور اس کی کمی ان کو جلاکر

خشک کر دیتی ہے۔ جس سے جلد صحت مند اور پاک و صاف حالت میں نہیں رہ سکتی۔ نتیجتاً مختلف امراض کے جراثیم مثلاً ملیریا، ٹائی فس وغیرہ بآسانی جسم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ حیاتین جسم کے نشو و نما اور بالیدگی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی ضرورت بڑوں کی بہ نسبت چھوٹے بچوں کو زیادہ ہوتی ہے۔ حیاتین ا حیوانات کے دودھ میں بھی موجود رہتا ہے۔ لیکن ایسی گائیں اور بھینسیں جنھیں سبز چارہ نہیں دیا جاتا یا جنھیں خشک اور جھلسی ہوئی گھاس دی جاتی ہے، انہیں حیاتین ا کافی میسر نہیں آتے اسی لئے خود اُن کی حالت ابتر ہو جاتی ہے۔ اور ان کے دودھ میں بھی حیاتین بہت ہی کم پائے جاتے ہیں۔ ایسا دودھ چھوٹے بچوں کے لئے مفید نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ مائیں سبز ترکاریاں اور حیاتین ا رکھنے والی دوسری غذائیں کھایا کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کے بچے پیدائش کے وقت بہت کمزور رہیں گے، اور شیر خواری کے زمانے میں بھی جبکہ اُن کا انحصار ماں کے دودھ پر ہوتا ہے بیماری کی طرف مائل ہوں گے۔ اور اسی طرح نتیجتاً ان کی موت واقع ہو جائیگی۔ ہندوستان میں شیر خواری کے زمانے میں اتنی کثیر تعداد میں بچوں کے کمزور پیدا ہونے اور کثیر تعداد میں فوت ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کی مائیں ایسی غذائیں نہیں کھاتیں جن سے اُن کو اس حیاتین کی کثیر مقدار میسر آسکے ہماری طرح پرندوں کو بھی اپنی صحت اور اپنے بچوں کے لئے حیاتین ا کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ حیاتین انڈوں کی زردی میں محفوظ کئے جاتے ہیں تاکہ نمو پانے والے چوزے کو اس کی کافی مقدار میسر آسکے اور وہ انڈے سے نکلنے کے بعد قوی اور مضبوط رہ سکے لہذا انسان کے لئے انڈا اس حیاتین کا دوسرا عمدہ ماخذ ہے

حیاتین ا کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ ہمارے جسم کو متعدی امراض سے بچاتا ہے۔ آنکھ، ناک، کان، پھیپھڑے، معدے اور آنتوں کی بیماریوں کے علاوہ "شب کوری" (رات کو نہ دکھائی دینا) کا عارضہ بھی اسی حیاتین کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یورپ کے سائینسدان متعدد تجربات سے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ پچاس فی صد بچوں کا اندھا پیدا ہونا یا بعد میں بینائی کھو دینا اسی حیاتین کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور شب کوری کے علاج میں اس حیاتین کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی کمی سے جو دوسرے امراض پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ آلات تنفس کی خرابی، نزلہ، زکام، اشتہا کی کمی، سنگ مثانہ اور امراض گردہ ہیں۔

متعدد محققین نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ یہ حیاتین نہ صرف متعدی امراض اور مستذکرہ بالا بیماریوں کو روکتی ہے بلکہ ان کا ازالہ کرنے کے علاوہ اگر جسم میں زیادہ مقدار میں موجود ہو تو انسان کی طویل العمری کا بھی ذمہ دار ہے ۔ اسی بنا پر ہماری غذا میں اس حیاتین کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اور صحت و قوت کو اچھی حالت میں رکھنے کے لئے نہ صرف دوران بالیدگی میں اسکی کافی مقدار کی ضرورت ہے بلکہ ہر زمانے میں اس کا لحاظ بہت ضروری ہے ۔

ہندوستان میں عام طور پر سبزیاں پکانے کا جو طریقہ رائج ہے ۔ اُس سے اس حیاتین کا بہت بڑا حصہ ضائع ہوجاتا ہے ۔ لیکن سبزی کو معمولی طور پر پکانے سے یا نیم جوش دینے سے یہ حیاتین ضائع نہیں ہوتا البتہ زیادہ دیر تک پکانے سے اور ہوا میں کھلا چھوڑنے سے یہ ضائع ہوجاتا ہے ۔ چاول میں اس حیاتین کی بہت تھوڑی سی مقدار پائی جاتی ہے ۔ لیکن جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ گرنی میں چھلکا نکلوانے اور پکانے سے پیشتر دھونے سے غائب ہوجاتی ہے ۔ نہ صرف حیاتین ا بلکہ دوسرے حیاتین بھی جو اس میں پائے جاتے ہیں اس طرح پکانے سے ضائع ہوجاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ چاول بیمار کے لئے بہت ہی ناقص قسم کی غذا ہے ۔

حیاتین ا (سبز پتے کھانے والے جانوروں کی) کلیجی ، مچھلی کے تیل (کاڈ لیور آئیل) انڈے ، گوشت ، گردے ، گھی ، مکھن اور دودھ میں پایا جاتا ہے ۔ اور ترکاریوں میں پالک ، آبی سلاد ، سوجی ، گوبھی ، شلجم ، چقندر ، مولی اور بانس کے پتوں میں ۔ گاجر ، کرم کلہ ، ٹماٹے ، اور مکئی وغیرہ میں بکثرت پایا جاتا ہے ۔

حیاتین ب | ۱۸۸۶ء میں جاپانیوں کا ایک جنگی جہاز بہت طویل سفر کررہا تھا ۔ چند دن بعد ملاحوں میں ایک خاص قسم کی بیماری پیدا ہوئی ۔ اور ملاحوں کی ایک معتدبہ تعداد نذر اجل ہوگئی ۔ اس جہاز کے ایک بحری ڈاکٹر ٹکاکی (Takaki) نے اس بیماری کی وجہ کو ناقص غذا پر محمول کیا چنانچہ دوسرے بیمار ملاحوں کو گوشت ، مچھلی ، انڈے وغیرہ بطور غذا کے دئے جانے لگے ، اور بہت جلد اس علاج سے اچھے ہوگئے ۔ یہ نامعلوم مرض بری بری (Beri - beri) تھا جو بدقسمتی سے اب بھی جاپانیوں میں

پایا جاتا ہے۔

۱۸۸۶ء میں آئیکمان (Ejik man) نامی ایک مشہور ڈچ سائینسداں نے جاوا میں مشاہدہ کیا کہ اُسکے تجربہ خانے کی مرغیوں میں ایک خاص قسم کی بیماری پھوٹ پڑی ہے بہت دنوں کی کدو کاوش کے بعد اُس نے یہ معلوم کیا کہ یہ مرض مرغیوں میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ ان کو مشین سے صاف کیے ہوئے یا بغیر بیج کے چاول دئیے جائیں اس مرض کا نام اس نے "پالی نیوریٹز" رکھا۔ پس اس تحقیق سے یہ نتیجہ نکالا گیا تھا کہ چاولوں کے چھلکوں یا بیج میں ایک ایسی "ضروری یا لازمی شئے" موجود ہے جو مرغیوں کے اس مرض کو روکتی ہے۔ بعد میں اس "ضروری شئے" کا نام فنک (Funk) نامی سائینسداں نے حیاتین یا (Vilamin) رکھا۔ اس انکشاف کے تقریباً پندرہ سال بعد ہاپکنس نے متعدد تجربے کئے اور بالآخر ۱۹۰۶ء میں اس نے اس حیاتین کی حقیقت معلوم کر لی۔

حیاتین ب پودوں کے پتوں میں موجود رہتا ہے۔ لیکن ان کے بیجوں اور پھلوں میں خاص طور پر زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہ پودوں سے جانوروں اور انسانوں کی غذا کی شکل میں پیٹ میں داخل ہو کر تحلیل ہو جاتا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ ان اعضاء کو پہونچتا ہے جو دوسرے اعضاء سے کام لینے کا فعل انجام دیتے ہیں۔ اس لئے دماغ، قلب، جگر، گردہ، اور اعضائے ہاضمہ میں اس کی بڑی مقدار موجود رہتی ہے۔ اگر انسان حیوانات کے ان اعضاء کو بطور غذا استعمال کریں تو وہ حیاتین ب کے اچھے ماخذ ہوتے ہیں۔ حیاتین ا کیطرح یہ بھی جانوروں کے دودھ اور پرندوں کے انڈوں میں پایا جاتا ہے کیونکہ ان کے بچوں کی نشو و نما کے لئے یہ ضروری ہے۔ لہٰذا انسان کے لئے دودھ اور انڈے حیاتین ب کے عمدہ ماخذ ہیں۔

یہ حیاتین چربی، تیل، اور سفید شکر میں نہیں پایا جاتا، لیکن سرخ شکر اور شہد میں اس کی تھوڑی سی مقدار موجود ہوتی ہے۔ اس حیاتین کے بڑے بڑے ماخذ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ہر قسم کے اناج:۔ گیہوں، جئی، چولم، اور راگی۔

(۲) دالیں:۔ مٹر، لوبیا، سیم وغیرہ کے بیج اور مختلف دالیں۔

(۳) ہر قسم کے سخت (Nuts)

(۴) سبزیاں :- پالک، شلجم کے پتے، مولی کے پتے، سلاد، آبی سلاد، ٹوماٹو، چقندر، گاجر کرم کلہ، گکرونداا، اور پیاز،

(۵) دودھ، انڈے، کلیجی، اور حیوانات کے دوسرے غدودی اعضاء ۔ خمیر اور اخروٹ ۔

حیاتین ب :- حالیہ تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ "حیاتین ب" ایک پیچیدہ شئے ہے جو چند اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے ۔ یہ اجزاء حیاتین ب۱، ب۲، ب۳، ب۴، ب۵ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں ۔ "حیاتین ب۱" تو وہ جزو ہے جو مرغیوں میں "پالی نیورئیٹز" اور انسانوں میں مرض "بری بری" کو روکتا ہے اور ب۲ وہ جزو ہے جس کا تعلق ناقص تغذیہ کی ایک خاص صورت سے ہے ۔

حیاتین ب۱ کی کمی کی وجہ سے ایک خاص قسم کی عصبی بیماری "بیری بیری" پیدا ہوتی ہے جس سے قوت حرکت صلب ہو جاتی ہے اور ابتداء میں مریض تھکاوٹ، سستی اور ٹانگوں میں درد محسوس کرتا ہے لیکن بعد میں یہ سکتہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ ایک عرصہ سے یہ مرض جاپان، چین، ہندوستان اور جزیرہ نما ملایا میں موجود ہے ۔ اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے یہ بیماری بے ہیچ کے چاول سپیے کی روٹی، چینی، پنیر، خشک پھل، محفوظ گوشت ۔ نقلی گھی، جیسی غذاؤں پر انحصار کرنے سے پیدا ہوتی ہے ۔ اس کے برخلاف تازہ پھل اور ایسی غذائیں جن میں حیاتین ب۱ موجود ہو اس بیماری کو روکتے ہیں۔ اس حیاتین کی اہمیت پر "برٹش میڈکل ریسرچ کونسل" کی رپورٹ میں ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے "یہ بات اب بالکل مسلمہ بن گئی ہے کہ حیاتین ب۱ نہ صرف مرض بری بری کی مدافعت کرتا ہے بلکہ نو عمری میں جسم کی نشو و نما کا بہترین مددگار ہے ۔ اس کا تجربہ ننھے ننھے چوہوں پر کیا گیا ۔ بالغوں میں معمولی وزن اور تندرستی برقرار رکھنے کے لئے اس کی مناسب مقدار نفع بخش تسلیم کر لی گئی ہے"

حیاتین ب۱ جسم کی تعمیر و مرمت کے کام آتا ہے لیکن یہ چند خاص کام بھی انجام دیتا ہے ۔ (۱) دماغ اور اعصاب کو تندرست اور مضبوط رکھتا ہے ۔

(۲) قلب، جگر، ہاضم غدود اور گردوں کو تندرست رکھتا ہے ۔

(۳) جسم کی آنتوں اور عضلات کو تندرست بناتا ہے۔

(۴) اشتہا اور ہاضمی فعل کو برقرار رکھتا ہے۔

اس حیاتین کے استعمال سے ہاضمہ درست ہوتا ہے اور بھوک باقاعدہ ہوتی ہے اور اس کی کمی کی وجہ سے بدہضمی، اسہال اور قبض کی شکایت ہو جاتی ہے۔ عضلات کمزور اور اعصاب زود حس ہو جاتے ہیں۔ جسم کمزور اور لاغر ہو جانیکی وجہ سے متعدی امراض کی مدافعت نہیں کر سکتا۔ اور مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس حیاتین کا زیادہ ذخیرہ عرصہ تک جسم میں رکھا نہیں جا سکتا۔ مثلاً چوہوں اور کبوتروں میں حیاتین ب کی مقداریں چار ہفتوں میں ختم ہو جاتی ہے اس لئے حیاتین کا روزانہ خرچ ہونا اور جسم میں داخل ہوتے رہنا اچھی صحت کی ضمانت ہے۔

ہندوستان میں لاکھوں آدمی۔ چاول پر گذر کرتے ہیں۔ بعض تو اس کو کوٹ کر اس کا چھلکا علیحدہ کر دیتے ہیں، بعض صاف کرنے کے لئے اسے گرمی پہنچا دیتے ہیں لیکن اکثر لوگ صاف کئے ہوئے چاول بازار سے خریدتے ہیں۔ اور تقریباً سب کے سب اس کو خوب دھو کر استعمال کرتے ہیں۔ غرض یہ سب اس طرح چاولوں سے حیاتین کی رہی سہی مقدار ضائع کر دیتے ہیں۔ جتنے بھی اناج ہندوستان میں پائے جاتے ہیں ان میں چاول حیاتین ب کے لئے سب سے زیادہ ناقص ہے۔ یہ حیاتین چاول کے دانوں کے بیرونی پرت میں بہت ہی قلیل مقداروں میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاول کو ٹنے سے، دھونے سے یا جوش دیکر پیچ پھینک دینے سے حیاتین ب ضائع ہو جاتا ہے۔

حیاتین ب مختلف اناجوں اور خاص کر انڈے کی زردی اور چاول کے خول میں پایا جاتا ہے۔

حیاتین ب۲ :- ۱۹۳۶ء میں اس حیاتین کا پتہ چلا۔ دو نامور سائینسدانوں اسمتھ اور ہنڈرک نے تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ " حیاتین ب " میں دوسرا قائم الحرارت جزء موجود ہوتا ہے جو حیوانوں کی بالیدگی اور ان کے تغذیہ کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بعد کی تحقیقات میں گولڈبرگر نے تبلایا کہ اس حیاتین کی کمی سے مرض پلاگرا د   ) وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ ایک غیر متعدی مرض ہے جو اٹلی، رومانیہ، بلقان اور ریاست ہائے امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ اس مرض کا تعلق نظام عصبی، غذائی نالی اور

جلد سے ہے ۔ یہ مرض غریبوں میں زیادہ ہوتا ہے جنکی غذا اناج اور سبزیوں کی حد تک محدود ہوتی ہے اور جن میں حیاتین ب۲ نہیں پایا جاتا ۔ اس حیاتین کی کمی کی وجہ سے خارش اور دوسرے جلدی امراض پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ حیاتین دراصل دو حیاتینوں کا مجموعہ ہے ۔ ایک کا کام بیماری کا انسداد کرنا ہے اور دوسرے کا کام نشو و نما میں مدد دینا ہے ۔ نشو و نما میں مدد دینے والا حیاتین دراصل " لیکٹو فلیون " Lactoflovin ہے جو نارنجی بھورے رنگ کا ہوتا ہے ۔ جسے سب سے پہلے " کون " (Khun) نامی ہیڈل برگ کے سائینسداں اور اُس کے ہمکاروں نے تیار کیا تھا ۔ اور انہیں لوگوں نے سنہ ۱۹۳۶ء میں اس حیاتین کو مصنوعی طور پر تیار کیا ۔

حیاتین ب۲ کا سب سے عمدہ ماخذ خمیر ہے چکنائی کا گوشت ، انڈے کی زردی اور دودھ پلانے والے جانوروں کا جگر ہے ۔ لیکن مختلف مقداروں میں یہ ٹماٹو ، مٹر دودھ اور انڈوں میں پایا جاتا ہے ۔

حیاتین ب۳ ب۴ ب۵ :- یہ حیاتین انڈے کی زردی اور گیہوں میں پائے جاتے ہیں ۔ لیکن ابھی تک ان کی پوری تفصیلات تحقیق کے منزل تک نہیں پہونچی ہیں ۔ فی الوقت صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ حیاتین ب۳ اور ب۵ سے جسم میں توانائی اور وزن قائم رہتا ہے ۔ اور " ب۴ " زیادہ تر چوہوں کی غذا سے بہت تعلق رکھتا ہے ۔ چوہوں کو اپنی پرورش کے لئے حیاتین ب۴ اور ب۵ کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اور اسی طرح غالباً پرندوں کو بھی حیاتین " ب۴ " کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی ۔ لیکن انسان جو تمام انواع حیوانی میں حیات کا سب سے عمدہ اور مکمل مظہر ہے ۔ اُسے ان تمام حیاتینوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔

حیاتین ج :- ابتداء یہ خیال کیا جاتا تھا کہ غذا میں ایک شئے ایسی موجود ہے جو ایک خاص مرض اسکروطیا دارالحضر (Scurvy) کو روکتی ہے ۔ ملاحوں میں یہ مرض ایک وبا کی صورت میں پایا جاتا تھا ۔ اکثر یہ اُن کے طویل سفر کے دوران میں یا غذا میں تازہ ترکاریاں میسر نہ آنے سے پھوٹ پڑتا تھا ۔ واس کوڈی گاما ، پرتگال کا ایک مشہور ملاح ۔ جب ہندوستان کے سفر پر نکلا تو راہ میں اسکے (۱۶۰) ساتھیوں میں سے (۱۰۰) اس مرض اسکروطا کے نذر ہوگئے ۔ اس مرض کے علامات بتدریج نمودار

ہوتے ہیں سُستی زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ مریض کا وزن گھٹنے لگتا ہے۔ اور رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ خون میں کمی اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ جوڑوں میں سخت تکلیف ہوتی ہے اور اکثر دانت بھی گر جاتے ہیں۔ جسم میں سرخ جسیموں کی کمی کیوجہ سے جلد پر سرخ رنگ کے یا بنفشی رنگ کے دھبے پڑ جاتے ہیں۔ اس بیماری کی دوا آج سے تین سو سال پیشتر بھی بعض لوگوں کو معلوم تھی۔ سر رچرڈ ہاکس نے جس نے مغربی افریقہ اور امریکہ میں بردہ فروشی کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس مرض کا علاج لیمو اور سنتروں کے رس سے کیا تھا۔ چنانچہ ایک برطانوی بیڑے کا کپتان لنڈ (Lind) نے بھی کچھ تفصیلات سے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔

جنگ عظیم کے زمانے میں جب ہندوستانی فوجیں عراق میں تھیں یہ بیماری بڑے زور سے پھوٹ پڑی تھی۔ لیکن بہت جلد اس پر قابو پا لیا گیا۔ اس کے بعد سپاہیوں کی غذا میں اس چیز کو ملحوظ رکھا گیا کہ اُس میں سبزی، ترکاری یا پھلوں کا کچھ نہ کچھ جزء ضرور ہوا کرے۔ دال کو پکانے سے پہلے اُسے گرم مرطوب ہوا میں رکھکر اُگا لیا جاتا تھا اور پھر اسے ساگ پات کے ساتھ ملا کر کھانے کے لئے سپاہیوں کو دیا جاتا تھا

حیاتین ج تمام تازہ سبز ترکاریوں، سبز خوردنی پتوں اور اکثر تازے پھلوں اور میووں میں کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ پودوں کے بیجوں اور خشک ترکاریوں میں یہ حیاتین نہیں پایا جاتا۔ جیسے چاول، گیہوں، مکئی، اور چوزے (Nuts) لیکن اگر اناج کو پانی سے تر کیا جائے اور انھیں پھوٹنے کا موقعہ دیا جائے تو ان کے دانوں میں یہ حیاتین پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر سبز ترکاریاں اور میوے کم یاب ہوں تو حیاتین ج حاصل کرنے کا یہ ایک نہایت اچھا طریقہ ہے۔

جب حیوانات ایسی تازہ سبزیاں اور پتے کھاتے ہیں جن میں یہ حیاتین موجود ہوتا ہے تو یہ ان کے جسم میں حل ہو کر خون اور جگر میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ شیر اور چیتے جیسے گوشت خوار درندے اس حیاتین کو اپنے شکار کردہ حیوانات کے خون اور جگر سے حاصل کرتے ہیں۔ یہی حال گوشت خوار قوموں کا بھی ہے جیسے اسکیمو۔ یہ حیاتین جانوروں کے دودھ میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ یہ گائے، بھینس اور بکری وغیرہ کے دودھ میں موجود رہتا ہے بشرطیکہ ان کا چارہ تازی سبز گھاس یا پتوں پر مشتمل ہو۔ لیکن اگر ان جانوروں کو سبز گھاس میسر نہ آئے بلکہ خشک گھاس پر رکھا جائے تو ان کے دودھ میں حیاتین ج بہت ہی قلیل

مقدار میں موجود ہوگا۔ ایسی حالت میں ان کا دودھ شیر خوار بچوں کے لئے مفید نہ ہوگا۔

یہ حیاتین حیوانی اور نباتی چربیوں جیسے گھی، مکھن، مختلف تیلوں، خشک غذاؤں، جیسے شکر، میدہ، آٹا، چاول وغیرہ میں نہیں پایا جاتا۔ یہ حرارت سے بآسانی تباہ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ دودھ یا ترکاریوں کو اُبالنے سے یا زیادہ پکانے سے ان کی بہت بڑی مقدار غائب ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں بچوں کی پرورش اور خصوصاً ان بچوں کی پرورش جن کو ماں کا دودھ میسر نہیں آتا اُبالے ہوئے اور بہت زیادہ جوش دئے ہوئے دودھ سے کیجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیاتین ج کی وجہ سے بچے بیمار پڑ جاتے ہیں۔ اور ہمیشہ لاغر اور نحیف رہتے ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کو پھلوں کا رس جیسے نارنگی، لیمو، ٹماٹو، ار ترکاریوں میں شلجم وغیرہ کا رس دیا جائے۔

جسم کو حیاتین ج کی ضرورت حسب ذیل اغراض کے لئے ہوتی ہے۔

(۱) خون کو صاف اور صحیح ترکیب میں قائم رکھنے اور اسکورگوں سے رسنے سے بچانے کے لئے۔

(۲) عموماً پورے جسم اور خصوصاً ہڈیوں اور دانتوں کی تعمیر میں دوسرے حیاتین کی مدد کے لئے۔

(۳) آنتوں کو صحت مند رکھنے کے لئے۔

(۴) جراثیم کی مدافعت میں جسم کو مدد دینے کے لئے۔

حیاتین ج چونے (کیلسیم) اور فاسفورس کے جسمانی اجزاء کو صحیح تناسب میں رکھتا ہے۔ یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اگر حیاتین ج نہ ہو تو جسم میں کیلسیم اور فاسفورس کی کمی ہونے لگتی ہے۔ جب ہڈیوں میں کیلسیم کی کمی ہو جائے تو اُن میں خم پیدا ہو جاتا ہے۔ حمل کے دنوں میں اور وضع حمل کے بعد ماں کو حیاتین ج کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ایام حمل میں اپنا جسم بنانے کے لئے بچہ ماں کے جسم سے فاسفورس اور کیلسیم کی بہت زیادہ مقدار حاصل کر لیتا ہے۔ اس لئے اس زمانے میں ماں کو ان کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ حیاتین حاملہ کو پوری مقدار میں میسر نہ آئیں تو نہ صرف ماں کی تندرستی برباد ہو جاتی ہے بلکہ بچہ بھی مریض اور لاغر پیدا ہوتا ہے ایسے بچوں میں ک ر ح (Rickets)، لاغری، اور دانتوں کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔

حال ہی میں حیاتین ج پر بہت کچھ تحقیقاتی کام ہوا ہے اور یہ معلوم ہوگیا ہے کہ "ایس کوربک اسیڈ" (Ascorbic Acid) دراصل حیاتین ج کی ایک خالص اور قلمی شکل ہے۔ اس اسیڈ کو حاصل کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ "زینٹ گی اور گی" ہنگری کے ایک سائینسدان نے اس کو مرچ کی ایک خاص قسم سے حاصل کیا ہے اور دوسرے محققین نے اس پر تجربے کرکے اس کا کیمیائی ضابطہ بھی معلوم کرلیا ہے۔ "برمنگھم" میں آر۔ ڈبلیو۔ ہربرٹ (R. W. Herbert) اور اُس کے ساتھیوں نے اس ایسڈ کو یعنی حیاتین ج کو مصنوعی طریقہ پر تیار کرلیا ہے۔ وہ زمانہ دور نہیں جب ہم بہت جلد سبزیوں اور ترکاریوں کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

ذیل میں ایسی ترکاریوں اور سبزیوں کے نام دئے جاتے ہیں جو حیاتین ج میں کامل ہیں۔
تازہ کچا کرم کلہ، پالک، کچے مٹر یا دالیں، شلجم، تازہ لیمو کا رس، نارنگی، سنترے، ٹوماٹو کا رس، تازہ گاجر، سلاد، شلجم کے پتے، شکر قند کا رس، کچے آلو، نارنگی اور سنترے کا پوست، اناس کا رس وغیرہ

حیاتین د ۱۹۱۹ء میں ایک روسی سائینسدان نے یہ دکھلایا کہ ایک بیماری ک ح (Riekets) جس میں ہڈیاں نرم ہوکر ٹیڑھی ہو جاتی ہیں، غذا میں کوئی تبدیلی کئے بغیر سیمابی بخار کے قوسی لیمپ کے شعاعوں سے ہوسکتا ہے۔ اسی زمانے میں ایک انگریز سائینسدان ڈاکٹر ای۔ میلن بی نے اپنے کتوں کا علاج جنکو ک ح کا عارضہ ہوگیا تھا مچھلی کے تیل اور مکھن سے کیا جو کامیاب ثابت ہوا۔ اسی سلسلے میں دو امریکن سائینس دانوں نے بھی تحقیقی کام شروع کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ وہی غذائیں جن سے ک ح پیدا ہوتا ہے اگر ان کو کچھ مدت کے لئے بالائے بنفشی شعاعوں (Ultra violet rays) کے آگے رکھدیا جائے تو اس مرض کے لئے بہترین علاج ثابت ہوسکتی ہیں۔ مختلف تجربات کے بعد پتہ چلا کہ "کولیسٹرال" (Cho lestrol) ایک شئے ایسی غذا میں پائی جاتی ہے جو بالائے بنفشی شعاعوں کے زیر اثر حیاتین د میں تبدیل ہوجاتی ہے اور یہی کولیسٹرال حیوانات کی جلدیں بھی پائی جاتی ہے۔ جب اُن کی جلد پر دھوپ پڑتی ہے تو کولیسٹرال بالائے بنفشی شعاعوں کو جذب کرکے حیاتین د میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح مانع "ک ح" ثابت ہوتی ہے۔

لیکن بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ حیاتین د کی اصل کولیسٹرال نہیں بلکہ ارگاسٹرال (Ergastrol) ہے جو کولیسٹرال کی ایک لوث دار شکل ہے۔ پے درپے تجربات کے بعد آخر سائنس دان اسی ارگاسٹرال سے حیاتین د کو اصلی قلمی حالت میں جدا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس انکشاف کا سہرا دنیا کے تین بڑے ملکوں کے سر ہے۔ جرمنی میں ونڈاؤس نے، لندن میں بوردلان اور اس کے ساتھیوں نے اور ولندیز میں اپی انک اور واٹن وچ نے علیحدہ علیحدہ اس کو حاصل کیا۔ یہ انکشاف ۱۹۳۱ء میں ہوا اور دنیائے سائنس میں بہت قدر کی نظروں سے دیکھا گیا۔ کیونکہ حیاتین د پہلا حیاتین تھا جس کو خالص حالت میں علیحدہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد بھی حیاتین آ اور ج تین ماہ کے اندر اندر خالص حالت میں علیحدہ کرلئے گئے۔ مصنوعی طریقہ سے تیار کیا ہوا حیاتین آ بازار میں کیل سی فرول (Calcifrol) کے نام سے بکتا ہے۔ اس کے ایک گرام کی قیمت تقریباً (۸۰) روپئے ہے۔ اور قوت میں یہ نصف ٹن "کاڈلیور آئیل" کے مساوی ہوتا ہے۔ جو قیمت میں اس سے دس گنا زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی قوت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کے ایک گرام میں تقریباً چار کروڑ خوراکیں ہوسکتی ہیں۔

حیاتین د دودھ، مکھن، گھی، انڈے کی زردی، اور مچھلی کے تیل میں پایا جاتا ہے۔ جسم پر سورج کی شعاعوں سے بھی یہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سے لوگ دھوپ میں کھڑے ہو کر جسم پر تیل کی مالش کرنے کے عادی ہیں جو اس حیاتین کے حصول کا ایک نہایت مفید طریقہ ہے۔ غذا میں جب یہ حیاتین کافی مقدار میں نہیں ہوتا یا جسم اچھی طرح دھوپ نہیں کھاتا تو نوعمر بچوں کی ہڈیاں اچھی طرح بننے نہیں پاتیں اور نرم ہوکر خم ہوجاتی ہیں۔ اور بچے ک ح کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس حیاتین کی کمی سے بڑی عمر والوں کو بھی مرض آسٹو ملے شیا (Ostomalacia) لاحق ہوجاتا ہے۔ ایسے بچے جن کی غذا حیاتین د کے لحاظ سے ناقص ہوتی ہے عصبی المزاج، چڑچڑے، بےچین اور بےخوابی کے شکار ہوجاتے ہیں۔ ان کے جوڑ پٹھے ڈھیلے اور ہڈیاں کمزور اور نرم ہوجاتی ہیں وہ صحت مند بچوں کی بہ نسبت اوائل عمر میں کھڑے ہونا یا چلنا دیر میں سیکھتے ہیں۔ آنتوں کے عضلات

ڈھیلے پڑجانے کے سبب ایسے بچے قبض یا دوسری معدہ کی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں ک ح ایک نہایت عام مرض ہے۔ کیونکہ وہاں ایسی غذائیں جن میں یہ حیاتین کثیر مقدار میں موجود رہتا ہے نہیں پائی جاتیں اور نہ وہاں دھوپ تیز نکلتی ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان میں رہنے والے لوگ خوش نصیب ہیں جہاں اتنی اچھی تیز دھوپ نکلتی ہے اور ایسی غذائیں بآسانی مہیا ہوسکتی ہیں جو حیاتین د میں کامل ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مرض ک ح بہت کم پایا جاتا ہے۔ اور قدرتاً لوگ اس مہلک بیماری سے بچے رہتے ہیں۔

حیاتین ہ اس حیاتین پر بہت سے سائنس دانوں نے کام کیا ہے لیکن ۱۹۲۷ء میں ایونز اور اس کے ساتھیوں نے یہ شہادت بہم پہونچائی کہ حیوانوں کے تناسلی نظام پر اس خاص نامعلوم چیز کا اثر ہوتا ہے اور اس کو کارآمد رکھنے کے لئے ایک ایسی نامعلوم شئے کی ضرورت ہے جو چکنائی میں حل پذیر ہے۔ بعد میں اس نامعلوم شئے کا حیاتین ہ ہونا ثابت ہوا۔ اس حیاتین ہ کی کمی یا نقص کی باعث مردوں میں قوت رجولیت نہیں رہتی اور یہی چیز عورتوں میں بانجھ پن اور دوسرے رحمی امراض پیدا کرتی ہے۔

پہلے پہل چوہوں پر تجربات کئے گئے اور یہ معلوم ہوا کہ ان کے تناسلی نظام کے افعال جاری رہنے کے لئے ان کی غذا میں حیاتین ا اور ہ ناگزیر ہیں۔ اگر نر چوہوں کو ایسی غذا دی جائے جس میں حیاتین ہ موجود نہ ہو تو چند روز میں اُن کی منوی نالیاں (Sewiniferous tubes) کمزور ہوکر بیکار ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح اگر مادہ چوہے کو اس حیاتین سے پاک شدہ غذا دی جائے تو استقرار حمل تک تمام افعال تولید حسب معمول انجام پاتے ہیں اور جنین آٹھ روز تک برابر نمو پاتا ہے۔ لیکن اسکے بعد اُس کے نمو میں فرق پیدا ہوجاتا ہے اور بالآخر اسقاط ہوجاتا ہے اس مشاہدہ سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ حیاتین ہ جنین کے نمو کے لئے ضروری ہے اگر استقرار حمل کے پانچویں روز بھی حیاتین ہ غذا میں دیا جائے تو جنین بچ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر عورتیں اس حیاتین کو استعمال نہ کریں تو انہیں بچے پیدا نہیں ہوسکتے۔ یا اگر ہوتے بھی ہیں تو مرجاتے ہیں یا دوران حمل میں ضائع ہوجاتے ہیں۔

میسن (Mason) نے یہ ثابت کیا کہ حیاتین تہ کی مسلسل کمی کے باعث مردوں میں مردانہ قوت کا جو نقص پیدا ہو جاتا ہے اسے بعد میں اس حیاتین کو زیادہ مقداریں دے کر دور کرنا چاہیں تو وہ نقص دور نہیں ہو سکتا۔ لیکن عورتوں میں یہ دیکھا گیا۔ ہے کہ جب اس حیاتین کی مناسب مقدار دی جانے لگی تو ان کا بانجھ پن دور ہو جاتا ہے۔

حیاتین تہ کا سب سے بڑا ماخذ گیہوں کے جنین کا تیل ہے۔ دوسرے اناج کے جنینوں میں اسکی تھوڑی بہت مقداریں موجود ہوتی ہیں۔ حیوانی بافتوں خاص کر عضلات اور چربیوں میں کم مقدار میں پایا جاتا ہے۔ دودھ، مکھن، کاڈلیور آئیل جو دوسرے حیاتینوں کی کافی مقداریں رکھتے ہیں اس اہم شئے سے عاری ہوتے ہیں۔

اس قدر بیان سے قارئین پر حیاتین کی اہمیت، ان کا وقوع، اور افعال بخوبی واضح ہو گئے ہوں گے۔ ہمارے ملک میں عام صحت کی خرابی، اور بعض امراض کی اشاعت کے ذمہ دار بہت بڑی حد تک وہ غذائیں ہیں جو حیاتین کے لحاظ سے ناقص ہوتی ہیں۔ اکثر بعض ناقص غذاؤں کا استعمال اور انہیں اس طریقہ سے پکانا کہ رہے سہے حیاتین بھی برباد ہو جائیں یہ ایسے امور ہیں جو بہت بڑی حد تک غذا کو حیاتین سے اور ہم کو صحت سے محروم کر دیتے ہیں۔ ہماری غذا کے ضروری اجزاء پروٹین، معدنی نمک، چربی، کاربوہائیڈائیس اور "حیاتین" ہیں۔ ان اجزاء میں سے ہر ایک اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ دوسرا۔ اور ہر ایک اپنا صحیح کام انجام دینے کے لئے دوسرے کا محتاج ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے روزمرہ کے استعمال میں ایسی غذا کا انتخاب کیا کریں جو ان تمام اہم اجزاء کی صحیح قسم اور صحیح مقدار کا ایک اچھا آمیزہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ڈاکٹر اور سائنس دان حضرات "ملوان غذا" (Mixed dict) کی سفارش کرتے ہیں جو ہر لحاظ سے انسانی جسم کے لئے مفید ثابت ہوتی ہیں۔

میر شمشیر علی۔ بی۔ ایس سی۔ (آخری)

امن و جنگ

سو رہی تھی نیند کے آغوش میں دنیا ابھی
رنگ میں ڈوبا ہوا ہر زیست کا افسانہ تھا

تھا ابھی پابندِ موجِ عیش ہستی کا سکوں
اضطرابِ گردشِ ایام سے بیگانہ تھا

جھولتی تھی چین کے جھولوں میں بے پروا نسیم
اس گلستاں میں ابھی رنگِ خزاں آیا نہ تھا

بوئے گل دامن گلوں کا چھوڑ کر رسوا نہ تھی
پہلوِ دریا سے بیگانہ ابھی قطرہ نہ تھا

ہاں نہ تھا اندیشۂ آثارِ بربادی ابھی
شمعِ محفل سے ابھی کچھ دور ہی پروانہ تھا

بیخودی و کیف میں نبضِ تھی ڈوبی ہوئی
ہاں ابھی شیرازۂ رازِ سکوں بکھرا نہ تھا

یک بیک لیکن زمانے کو زوال آنے لگا
یعنی مستقبل کے آئینے میں بال آنے لگا

جنگ و استبداد کی دیوی نے پھر انگڑائی لی
پھر جمودِ دہر حرکت میں بدل جانے کو ہے

آ رہا ہے پھر وہی سیلِ فلاکت الاماں
امن کی کشتی پھر اس طوفاں میں بہہ جانے کو ہے

پھر ہوائے گلشنِ ہستی سموم آمیز ہے
پھر کوئی خونیں کہانی جنگ دہرانے کو ہے

خاک پھر ہو جائیں گے جل کر نشیمن امن کے
پھر زمانہ بجلیاں گردوں سے برسانے کو ہے

پھر زمینِ پر سکوں کھونے کو ہے اپنا سکوں
پھر مصیبت کا رواں در کارواں آنے کو ہے

چپے چپے میں تباہی مسکرانے کو ہی پھر
ذرہ ذرہ پھر سراپا درد بن جانے کو ہے

اب وہ رات آنیکو ہے جسکی سحر ہوتی نہیں
اب وہ دن آئیگا جسکی دوپہر ہوتی نہیں

علی احمد بی۔ اے (آخری)

تبدیلی شکل

(۱)

ہمارے لئے کوئی نئی بات نہ تھی، مگر ڈاکٹر براڈلے کے شاہین صفت دماغ نے پھر پرواز شروع کی
"دیکھا تمنے" اس نے کہا " انسان کتنی متنزلزل نوعیت کا جانور ہے۔ غالباً اس وقت خدا کسی مضحکہ خیزی پر تلا ہوا تھا جب اس نے پہلے انسان کو بنایا۔ کیا تمھیں اس پر ذرا بھی تعجب نہیں کہ اس بڑھیا کو دیوانے کتے نے کاٹ کھایا اور بیچاری بے قصور کتوں کی سی حرکتیں کرتی ہوئی اپنے بنانے والے کے پاس سدھاری؟"

تازہ ترین اخبار میں سے میں نے براڈلے کو یہ خبر سنائی تھی کہ کسی بڑھیا کو کتے نے کاٹا۔ اس نے بروقت علاج نہیں کروایا اور مرگئی۔ کہا جاتا ہے کہ مرنے سے پہلے وہ کتوں کی سی حرکتیں کرتی رہی ۔
اس خبر نے ڈاکٹر براڈلے کو میری دماغ پاشی پر مجبور کردیا۔

"کیوں نہیں لارل!" اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "کوئی انسان کتے کو کاٹ کھائے تو وہ انسانوں کی سی حرکتیں کرتا ہوا مرے۔ کیوں نہ میں تمھیں کاٹوں اور تم ڈاکٹر بن جاؤ۔ کیوں نہ تم مجھے

کاٹ کھاؤ اور میں چوروں کو گرفتار کرنے لگوں ؟"

"خدا کے کھیل خدا ہی جانے" میں نے اکتا کر جواب دیا

"اپنی قوت تجسس کو اس طرح چرچ کے حوالے نہ کرو" اس نے درشت لہجے میں جواب دیا "جب ہم کو مجبور کیا جاتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں تو ہم خدا کو مجبور کریں گے کہ وہ ہمارے اعتراضات کے جوابات جو اس نے بصورتِ کائنات دے رکھے ہیں ہم پر واضح کرے ۔ اور اسی جبر کا دوسرا نام سائینس ہے"

"یہ سب باتیں تمہاری ہیں" میں نے جل کر جواب دیا "مجھے تمہارے مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ تم سائینسدان اور سائینس تمہاری کنیز۔ تم اس کو جو چاہے نام دے لو جو چاہے کام تبلاؤ میں تو زندگی کا مفہوم صرف اتنا سمجھتا ہوں کہ میں پیدا کیا گیا ہوں اور مارا جاؤں گا۔ میرا پیدا کرنے والا اگر مجھ سے کوئی کام لینا چاہے تو کروں گا اور اگر مارنا چاہے تو مروں گا"

"بہتر ہوتا لارل تم پادری ہوتے" براڈلے نے طنزاً کہا "جو اپنی ساری زندگی اس تاریکی میں جھانکتے ہوئے گنواتے ہیں جہاں انکی دماغی بد اعمالیاں انہیں طرح طرح کی بھیانک شکلیں دکھلاتی ہیں وہ کبھی اس تاریکی میں روشنی ڈالنا پسند نہیں کرتے ۔ وہاں انہیں خدا کہیں کسی کنواری کے بطن سے جنم لیتا ہوا نظر آتا ہے اور کہیں سولی پر لٹکا ہوا"

"مذہب کی توہین کرتے ہوئے تمھیں دوزخ کی اس ہولناک آگ کا تصور نہیں آتا ! کیا تم اس سے ڈرتے نہیں جس سے کہ ہر آسمانی کتاب میں ڈرایا گیا ہے ؟" میں نے ڈراونے لہجے میں کہا جس کے جواب میں براڈلے نے جبڑے پھیلا کر ایک قہقہہ لگایا

"دوزخ کی آگ تم جیسے پٹرول صفت لوگوں کے لئے ہے" اس نے کہا "تم ہی کہتے ہو کہ ہمارے خالق کا بیٹا کفارہ ہوا اور تم ہی کہتے ہو کہ دوزخ کی آگ بھی کوئی شئے ہے ۔ بتاؤ میں کس کو سچ جانوں اور کس کو غلط ؟" میں لاجواب ہو گیا مگر اپنی تسکین کے لئے مجھے کہنا پڑا "کفارہ ان کے لئے ہوا جو اس پر بلا چوں وچرا ایمان لے آئے ان کے لئے نہیں جن کے پاس اس پر اعتراضات کے دفتر موجود ہوں"

"کیا تم مجھے کفارے کا مفہوم سمجھا سکتے ہو!" اس نے کہا

" جیسے کسی مجسٹریٹ نے کسی ملزم کو (۵۰) پچاس روپیہ جرمانہ کیا لیکن ازراہ ہمدردی جرمانے کی رقم خود ادا کردی" میں نے جواباً کہا جو کہ اکثر پادری کہا کرتے ہیں۔

اس پر بھی براڈلے کی طرف سے ایک قہقہہ وصول ہوا

" جیسے کسی مجسٹریٹ نے" اس نے کہا " کسی مجرم کو قید کی سزا دی اور ازراہ ہمدردی خود جیل میں چلا گیا۔ جیسے کسی مجسٹریٹ نے کسی مجرم کو قصاص کی سزا دی اور ازراہ ہمدردی اپنی گردن دار پر رکھدی۔

بیوقوف پادری مذہب کو نہ سمجھ سکے اور اپنے ساتھ اوروں کو بھی غلط راستہ پر ڈال دیا خدا ایک فلسفی قسم کی کوئی شئے ہے۔ وہ حد درجہ امن پسند اور معتدل مزاج ہے اور وہ کائنات کی ہر شئے کو اپنے ہی رنگ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ جنہیں اس نے مقید کر رکھا ہے وہ تو اس کی مرضی کے مطابق ہیں اور حضرت انسان کو جو اس نے غلطی سے آزادی دیدی تو ان تمام پند و نصائح کی ضرورت لاحق ہوئی۔ کفارے کا اصل راز میں تمھیں بتلاتا ہوں۔ مسیح ان کے لئے کفارہ ہوئے جو ان پر ایمان لے آئے ان پر ایمان لانے کے معنی یہ ہوئے کہ ان کے بتلائے ہوئے قواعد و قوانین کی پوری طرح پابندی کی۔ جب کسی نے پوری طرح پابندی کی تو وہ ایک انتہائی نیک آدمی ہوا جو یقیناً جنت کا مستحق ہے اور جنہوں نے پابندی نہ کی وہ عیسائی نہیں اس لئے مذہب کے خیال میں دوزخی۔ اس جھگڑے کو مسیح کے صلیب پر لٹکائے جانے سے کوئی دور کا رشتہ بھی نہیں۔ کفارہ دراصل ایک استعارہ ہے۔ رہا جنت دوزخ تو وہ خود آپ کی صحت جسمانی و روحانی اور ذہنی کرب و سکون کا نام ہے"۔

"تھوڑی دیر پیشتر آپ نے مجھے پادری بننے کو کہا تھا" میں نے مسکرا کر قصہ ختم کرنے کے ارادے سے کہا" اب مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ نہایت مناسب ہوگا اگر آپ ہر اتوار کو کلیسا میں چند منٹ لکچر دیں"

"میں ان گم کردہ راہ رہنماؤں سے دور ہی رہنا پسند کرتا ہوں" اس نے جواب دیا "میرے لئے

تو یہی دلچسپ مشغلہ ہے کہ کبھی کسی کا پیٹ چیر کر آنتیں دھو ڈالوں اور کبھی کسی کے پھیپڑوں کے غیر ضروری سوراخ بند کردوں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں کفارہ پر بحث کرتے ہوئے فطرت کی اس مضحکہ خیز حرکت کو فراموش کرسکتا ہوں جس نے ایک انسان کو کتے کی حرکتیں کرنے پر مجبور کردیا“

(۲)

کئی مہینوں تک میں پر وازشدہ سائنسدان روسیو کی لیباٹری کے حادثے کے سبب بیمار پڑا رہا۔ صحت پانے کے بعد مجھے تفریحاً باہر جانا پڑا۔ کافی عرصے تک سوئٹزرلینڈ میں رہنے کے بعد میں واپس ہوا۔ جب میں کام پر رجوع ہوا تو مجھے ایک عجیب خبر ملی۔

ڈاکٹر براڈلے نے اپنے اختیارات کے تحت تین پاگلوں کو پاگل خانے سے یہ کہکر نکلوایا کہ تبدیل آب وہوا کے لئے انہیں سوئٹزرلینڈ لیجانے کی ضرورت ہے۔ پاگل خانے کا ایک چپراسی بھی ساتھ تھا۔ مگر ان کے سوئٹزرلینڈ پہنچنے کی کوئی اطلاع ملی نہ پیرس میں ان کا کوئی پتہ چلا۔

اس عجیب وغریب خبر نے مجھے کئی دنوں تک پریشان کر رکھا۔ دن گذرتے گئے حتیٰ کہ یہ بات عوام کے دلوں سے فراموش ہوگئی۔ میں بھی اسے تقریباً بھول چکا تھا مگر ایک روز اچانک ایک واقعہ نے اس کی یاد تازہ کردی۔ بازار سے گذرتے ہوئے میں نے دوا فروش کی دوکان پر ایک شخص کو دیکھا جس کی داڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں اور وہ ایک قدیم فیشن کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ مجھے اس کی صورت سے واقفیت کا گمان ہوا اور میں پلٹ کر اس کے قریب سے گذرا۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ براڈلے تھا۔ میں نے دور جاکر اس کو دیکھنا شروع کیا۔ دوکان سے ایک تھیلا لیکر وہ ایک طرف کو چلا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے ایک ٹکسی لی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اپنی موٹر سائیکل پر چلتا رہا۔ حتیٰ کہ ہم پیرس کے غیر آباد حصے میں پہنچ گئے۔ یہاں ٹکسی رک گئی۔ براڈلے اترا اور ڈرائیور سے کچھ باتیں کرتا ہوا اپنا تھیلہ سنبھال کر ایک طرف کو ہولیا۔ غالباً اس نے ڈرائیور کو کافی انعام دیا تھا کیونکہ وہ خوش خوش نہایت تیز رفتاری سے واپس ہوتا نظر آیا۔

میں نے موٹر سائیکل کا انجن بند کردیا تھا اور اسے ڈھکیل رہا تھا۔

اس طرف آبادی بہت کم تھی۔ دور دور فاصلے سے کچھ مکانات تھے۔ انہیں میں سے ایک مکان میں ڈاکٹر براڈلے داخل ہوا۔ میں نے بھی تیز تیز چل کر اس کو جا لیا۔ اور قبل اس کے کہ وہ دروازے کو اندر سے بند کرلے اسے آواز دی میری آواز پر وہ چونک پڑا اور اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہوگئے۔ میں نے قریب پہنچ کر موٹر سائیکل اسٹانڈ پر کھڑی کردی اور آگے بڑھا۔

"لارل!" اس نے نہایت تعجب سے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر" میں نے مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا

"تم یہاں کیسے؟" اس نے اسی حیرت سے دریافت کیا

"حیرت تو مجھے ہونی چاہئے کہ تم یہاں کھڑے ہو جبکہ دنیا تمہاری تلاش سے تھک چکی ہے" میں نے جواب دیا

"لیکن تم یہاں کیسے آئے؟ تم نے مجھے پہچان لیا؟" اس نے کہا

"میں اور تمہیں نہ پہچانوں!" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اس نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچا اور پھر مسکرایا

"اب جبکہ تم نے مجھے پالیا ہے" اس نے کہا "تو وعدہ کرو کہ مجھے چھوڑو گے نہیں"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی سے دریافت کیا

"اچھا چلو اندر چلو" اس نے ہنستے ہوئے کہا "دیکھو کہ ہماری پراسرار سکونت کس رنگ میں ہے"

عالم استعجاب میں اس کے پیچھے ہولینے کے سوا مجھے اور کچھ نہ بن پڑا۔ ہم دونوں ایک نیم بوسیدہ ہال میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں میز پر ایک برقی قمقمہ رکھا ہوا تھا اور نہایت بے ترتیبی سے کچھ کاغذات قلم ایک قلمدان اور کچھ تار پڑے ہوئے تھے۔ ایک کرسی پر وہ خود بیٹھ گیا اور دوسری میرے لئے چھوڑ دی۔ تھیلا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا میز پر رکھدیا گیا۔

"آخر یہ ماجرا کیا ہے ڈاکٹر!" میں نے دریافت کیا "تم نے روپوشی کیوں اختیار کرلی۔ وہ پاگل کیا ہوئے۔ تمہاری ہیئت کیوں بدل گئی آخر یہ سب ہے کیا؟"

"تم یہ سب کچھ معلوم کرنا چاہتے ہو؟" اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا "میں سب قصہ سناؤنگا تمھیں یاد ہے کہ مجھے اخبار میں سے ایک خبر تم نے سنائی تھی کہ کسی بڑھیا کو کتے نے کاٹ کھایا اور وہ کتوں کی سی حرکتیں کرتی ہوئی مرگئی۔ میں نے اس پر بہت دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ مجھے یکایک خیال پیدا ہوا کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے ایک انسان کی انسانیت چھین لی۔ سوچ سوچ کر میں نے بہت سے نتیجے اخذ کئے مگر ان کے تجرباتی ثبوت کی ضرورت تھی۔ اس ثبوت کے حاصل کرنیکے لئے مجھے جرم کرنا پڑا مگر میں مجرم نہیں ہوں۔ میرا ضمیر مجھے ملامت نہیں کرتا۔ اگر ایک اہم تحقیقات کے سلسلے میں دو ایک آدمیوں کی جان چلی جائے تو کیا حرج ہے جبکہ موٹروں کی دوڑ اور ہمالیہ کی چڑھائی میں کئی آدمی مرجاتے ہیں۔"

"تو کیا وہ پاگل مرگئے!" میں نے نہایت ہی حیرت سے دریافت کیا۔

دو مرگئے اور دو زندہ ہیں" اس نے جواب دیا

"اور عنقریب وہ بھی آپ کے اس مہمل تجربے کی بھینٹ ہو جائیں گے" میں نے حقارت سے کہا کیونکہ مجھے ان کی اس طرح بلا وجہ موت بری معلوم ہو رہی تھی۔

"میں کوشش تو کروں گا کہ ان کے مرنے سے پہلے میرا تجربہ ختم ہو جائے پھر بھی کچھ کہا نہیں جا سکتا" اس نے جواب دیا" "شرم نہیں آتی تمھیں" میں نے درشت لہجے میں کہا "گویا انسان کی جان تمھارے لئے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔ قتل کرتے ہو اور کہتے ہو ضمیر ملامت نہیں کرتا!!"

"زیادہ گرم نہ ہو جاؤ لارل!" براڈلے نے بھی درشتی سے کہا "میں اپنی ہستی کو اس وقت تک حکومت کے حوالے نہیں کر سکتا جب تک کہ میرا تجربہ ختم نہ ہو جائے اور میرے راستے میں حائل ہو کر کہیں تم بھی میرا شکار نہ بن جاؤ"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں غصہ سے کانپنے لگا اور میری زبان بے قابو ہوگئی "ٹھہرا او انسان نما درندے میں ابھی تجھے گرفتار کروا دیتا ہوں۔ مجھے دھمکی دیتا ہے کہ میں بھی اس بیہودے تجربے کا شکار نہ ہو جاؤں۔ لے اب دیکھ کون شکار ہوتا ہے"!

غصہ میں کانپتا ہوا میں اٹھنے لگا۔ مگر جونہی کہ کرسی کے دستے پر ہاتھ رکھا ایک طاقتور برقی رو

جدید ترکی اور اسلام

اگر ہم انگریزی اور جرمن نظامِ حکومت کو اچھی طرح سے سمجھنے کی کوشش کریں تو ان دونوں قوموں کی تاریخ کا مطالعہ لابدی ہے کیونکہ دور حاضرہ کا پیچیدہ نظام حکومت مرورِ زمانہ کے ارتقاء کا نتیجہ ہے یہی وجہ ہے کہ موجودہ صورت حال معلوم کرنے کے لئے جب تک ہم تاریخی پس منظر سے واقف نہ ہوجائیں اس وقت تک موجودہ تمدن و معاشرت کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ ہر نظامِ حکومت دراصل کسی قوم کی سیاسی، تمدنی اور مذہبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک مرقع ہوتا ہے اور یہ مختلف پہلو ایک دوسرے سے اتنا قریب کا تعلق رکھتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

اس چیز کا بہترین نمونہ ہم کو ترکی میں ملتا ہے جہاں مذہب اور سلطنت ایک واحد شخصیت یعنی سلطان کے اندر مرکوز ہو گئے تھے۔ اسلام میں دینوی اور مذہبی منصب ایک واحد ادارہ ہے اسلام مذہب عیسوی کے برخلاف نہ صرف اپنے پیروؤں کی مذہبی زندگی کو سنوارتا ہے بلکہ ان کی روزمرہ کی خانگی زندگی میں بھی اسی کا اثر جاری وساری ہے۔

ہر شخص اس بات کو جانتا ہے کہ جب ترکی کے اندر یکایک انقلاب ہوا تو تمام اسلامی دنیا

انگشت بدنداں ہو کر رہ گئی ترکوں کی زندگی میں یہ کتنا بڑا انقلاب تھا کہ انہوں نے اپنے ماضی کے اصولوں
کو توڑ ڈالا اور قدیم روایات کو یکے بعد دیگرے چھوڑتے چلے گئے۔ ان تمام واقعات اور انقلابات کو صحیح
طور پر سمجھنے کے لیے اور گذشتہ چند سالوں میں ترکی کی ترقی کے متعلق رائے قائم کرنے کے لیے یہ بہت
مناسب ہوگا کہ ترکی کی قبل اور بعد از جنگ عظیم کی حالت کا ایک خاکہ پیش کر دیا جائے۔

قبل اس کے کہ ترکی میں مذہب کی حیثیت کو واضح کیا جائے یہ بہتر ہوگا کہ گذشتہ صدی کے دوران
میں مذہب کی جو حالت دوسرے اسلامی ممالک میں پائی جاتی تھی اس پر ایک نظر ڈالی جائے۔ جہاں تک
مذہب کا تعلق ہے ترکوں نے اسلام کی اصلاحی تحریکات میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیا اور نہ انھوں نے
بذات خود کسی تحریک کی بنا ڈالی۔ جتنی بھی اصلاحی تحریکات تھیں وہ دوسرے ممالک میں شروع ہوئیں۔

انیسویں صدی کے وسط میں ہم علامہ جمال الدین افغانی کو ایک تحریک کی رہبری کرتے ہوئے پاتے
ہیں۔ علامہ مرحوم پان اسلامزم کے مبلغ تھے ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ قدیم روایات کو ترک کیا جائے اور
ان کی بجائے لبرل ادارے قائم کئے جائیں تاکہ اس کے ذریعہ اسلام اور اسلامی ممالک کو حیات نو میسر
ہو سکے۔ ہندوستان میں جو تحریک شروع ہوئی اس میں پیش پیش ہستی سر سید احمد خان مرحوم کی تھی ان کا
اور ان کے احباب کا یہ خیال تھا کہ حقیقی اسلام موجودہ تمدن اور معاشرت کا دشمن نہیں ہے ان کا عقیدہ
"اجتہاد" میں تھا نہ کہ تمدن ماضیہ کی اندھی تقلید میں۔ مصر میں اصلاحی تحریک کا تعلق محمد عبدہٗ سے تھا
جو ۱۸۹۹ء سے وہاں کے مفتی اعلیٰ تھے مذہبی نقطۂ نگاہ سے انھوں نے اور ان کے پیروؤں نے
"تقلید" کی حد درجہ مخالفت کی اور بالآخر وہ مصر میں اجتہاد کو جو قرآن کریم اور سنت کی تعلیم پر مبنی تھا پھر
سے داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کا رسالہ "المنار" اب تک مصری تخیلات پر کافی اثر ڈال رہا ہے۔

یہ واقعہ کہ ترکوں نے اصلاحی تحریکات میں نسبتاً بہت دیر میں حصہ لینا شروع کیا اس وجہ سے
اور بھی تعجب خیز ہو جاتا جب ہم دیکھتے ہیں کہ صدیوں سے ترک اسلامی ممالک میں اپنی غیر معمولی دلچسپی کا
اظہار کر رہے تھے اور باوجود اس کے وہ لاپروا بنے رہے۔ اس کی ایک وجہ اس واقعہ میں مضمر ہے
کہ فطرتاً ترکی نسل بہ نسبت نظری ہونے کے زیادہ عملیت پسند واقع ہوئی ہے اور ان کو فلسفیانہ تصورات اور

منطقی ذہنیت کی وہ نعمت میسر نہیں جو صرف عربوں کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کی مذہبی ترقی میں بھی ترکوں کا کچھ حصہ نہیں کیونکہ جب انھوں نے اسلام قبول کیا اس وقت تک وہ ایک مکمل مذہبی نظام کی حیثیت سے ترقی پا چکا تھا۔ اس کے بالکل برعکس ترکوں نے یورپی تمدن اور مادی ترقیات میں ضم ہونیکی کوشش کی۔ مغربیت کی تحریک ان کے ہاں عسکری نقطۂ نگاہ کی وجہ سے پیدا ہوئی کیونکہ ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ مغرب کی عسکری برتری کے سامنے نیچا نہ دیکھیں۔ مغربی طاپ Impact of the west کو ٹائن بی (Toynbee) نے اپنی کتاب "ترکی" میں بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جیسے جیسے ترک یورپ کے اثر میں آتے گئے ویسے ویسے نوجوان ترکوں اور اسلام کے درمیان خلیج وسیع ہوتی گئی یہی وہ چیز تھی جو بیسویں صدی کی ابتدا میں صحیح معنوں میں ظہور پذیر ہوئی۔ اسی کو ترک "مغربیت" (Occidentalism) کہتے ہیں یہ صرف یورپ کی اندھی تقلید تھی جس میں روحانیت کا پتہ نہ تھا نوجوان ترک جو یورپ میں اور خاص طور سے پیرس میں تعلیم پا رہے تھے انکی یہ خواہش تھی کہ ترکی کو یورپ کے سانچے میں ڈھال دیا جائے اور قدیم روایات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔

ترکوں کی اس فوری مغرب پرستی کی بہترین مثال ہم کو جنگ عظیم سے قبل کے مشہور ترکی انشاپرداز احمد حکمت کی کتاب "میرا بھتیجا" میں ملتی ہے اس کتاب میں ایک نوجوان ترک کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو پیرس سے اپنی تعلیم ختم کرکے وطن واپس ہوا ہے نوجوان ترک کو مشرقی ماحول بالکل غیر مانوس معلوم ہوتا ہے اور وہ اس میں ایک بے چینی محسوس کرتا ہے۔ احمد حکمت بہت پرلطف پیرایہ میں بیان کرتے ہیں کہ کس طرح سے نوجوان اپنے پورے گھرانے کو مغربی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا ہے ابتداً وہ ملازمین کو وردی پہناتا ہے اور باورچی کو فرانسیسی کھانے پکانے کا حکم دیتا ہے۔ حرم کے طریقہ کو ترک کرکے اپنی بھولی بھالی چچی کو مغربی راستہ پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے مختصراً یہ کہ پورے گھر کے اندر ایک طوفان عظیم برپا ہو جاتا ہے جب اس کے بوڑھے چچا کے لئے یہ سب کچھ تبدیلیاں ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں تو وہ بھتیجے کو ایک نصیحت آمیز لکھ دیتا ہے اور مشرقی اور مغربی میں بنیادی فرق سمجھاتا ہے۔ سزا کے طور پر نوجوان کو ایشائے کوچک کے شمال مغربی حصہ کے ایک مقام سنگلداک کو کوئلے کی کان میں کام کرنیکے لئے

بھیج دیتا ہے ۔ پانچ سال کے بعد جب نوجوان سنگلداک کے ماحول سے متاثر ہو کر وطن واپس ہوتا ہے
تو سارا مغربیت کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے ۔

دوسری وجہ جسکی بدولت ترکی تیز رفتاری کے ساتھ مغربیت کی طرف بڑھا وہ سلطان عبدالحمید کے
چونتیس سالہ دور حکومت کی سخت گیر اور دہشتناک پالیسی تھی ۔ سلطان انتہا سے زیادہ تنگ نظر اور پرانے
خیال کے حامی تھے اور اسی بنا پر نوجوان ترکوں اور کٹر ملاؤں کے درمیان کسی قسم کا بحث مباحثہ
ممکن نہ تھا بنائے علیہ مصالحت کے جتنے امکانات تھے وہ ختم ہو گئے اور اس کا نتیجہ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے
سنہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا ۔ سلطان نے ملک کو ایک نیا دستور دینے کا اعلان کیا لیکن
چونکہ اپنا وعدہ ٹھیک طرح پر ایفاء نہ کر سکے اس لئے ان کو سنہ ۱۹۰۹ء میں تخت سے معزول کر دیا ۔ اس
زمانے سے پھر ان تمام مذہبی مسائل پر جو سلطان عبدالحمید کے زمانے میں دبا دئے گئے تھے بحث و مباحثہ
ہونے لگا ۔ جنگ عظیم کے شروع ہو جانیکی وجہ سے یہ مسائل کسی قسم کا مزید نشو و نما نہ پا سکے کیونکہ جنگ نے
ترکوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو زمانے کی رفتار کے ساتھ چلائیں ۔

ترکی میں تین نمایاں جماعتیں پائی جاتی تھیں ۔ ایک قدامت پسندوں کی جماعت تھی جو قدیم
روایات میں اصلاح یا ترمیم و تخفیف کی مخالفت کے لئے ہر طرح سے آمادہ تھی ۔ ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ
ہر قربانی پر اسلام کی اسی پرانی شان و شوکت کو برقرار رکھا جائے جو اب تک ترکی کے اندر پائی جاتی تھی
اس جماعت کے اثرات سلطان عبدالحمید کے بعد سے زائل ہونے لگے تھے یہاں تک کہ انقلاب سنہ ۱۹۰۸ء
کے بعد وہ معدوم ہو گئی ۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ دو بڑی طاقتور جماعتیں ترکی میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے ایک
دوسرے کے ساتھ دست و گریباں تھیں ۔ ایک قومی جماعت اور دوسری اصلاحی جماعت، قومی جماعت
کے رہنما مشہور فلسفی شاعر ضیا، گوک آلپ تھے اور دوسری جماعت کے محمد عاقف اور وزیر اعظم
سعید حلیم ان میں کی پہلی جماعت سیاسی تھی اور دوسری مذہبی ۔ جہاں تک مذہبی مسائل کا تعلق ہے
یہ بہت دلچسپ بات تھی کہ یہ دونوں جماعتیں ایک عرصہ دراز تک ایک دوسرے کے دوش بدوش

چلتی رہیں۔ انھوں نے فی زمانہ اسلام کی حالت کو قبول نہیں کیا کیونکہ وہ اتفاقی ترقیوں کا نتیجہ تھا انکی یہ آرزو تھی کہ وہ ترکی کے اندر پھر پیغمبر صلعم کے زمانے کا اسلام دیکھیں اس مقصد کو حاصل کرنیکی غرض سے انھوں نے اس زمانہ کی شریعت اور اسلامی قانون کو بالکل رد کردیا اور یہ کوشش کی کہ اجتہاد پھر سے زندگی کا ایک جزو لاینفک بنجائے دونوں گروہ وسیع معنوں میں زمانہ کا ساتھ دینے کے مدعی تھے اور ان کا مسلک بھی ایک ہی "اسلام لاشمک" یعنی اسلام پسندی تھا۔ لیکن دونوں گروہ نے اس لفظ کے معنی کی تعبیر اور سیاسی اہمیت مختلف نقاط نگاہ سے کی اور یہی ان دونوں جماعتوں کے اندر تفریق کا باعث ہوا۔

قومی جماعت کا پروگرام تین مقاصد پر مشتمل تھا یعنی "ترک نوازی" "اسلام پسندی اور رفتار زمانہ کا ساتھ" اسلام پسندی سے قوم پرست ترکوں کا مطلب اس اسلام کی پیروی تھی جو اپنی ابتدائی حالت میں عرب میں پایا جاتا تھا اور جو بعد کی تبدیلیوں سے پاک تھا انکے نزدیک ہر مذہبی چیز کی بنیاد قرآن کریم تھا۔ لیکن انکے پروگرام کا اہم حصہ سیاسی اور معاشری تھا انکی نظر میں سلطنت کا تخیل دوسرے تمام تخیلات پر حاوی تھا۔ قومی تخیل دراصل انکے خیالات کا مرجع تھا۔ اسلام صرف مذہبی زندگی کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ تھا قوم پرست ترکوں نے مذہب کو ایک محدود دائرے میں مقید کردیا تھا یعنی یہ کہ مذہب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قوم کی دنیوی اور سیاسی زندگی پر بھی اپنا اثر ڈالے۔ انھوں نے مذہب اور سلطنت میں کلیتہً تفریق پیدا کرنیکی کوشش کی ان کا نصب العین یہ تھا کہ حکومت مکمل طور پر دنیوی ہونی چاہئے نہ کہ مذہبی۔

اس کے برعکس اصلاحی جماعت کا مطمح نظر صرف "اسلام لاشمک" تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ابتدائی زمانے میں جو اسلام کی حالت تھی اس پر عمل کیا جائے اور ان تمام خیالات کو اسلام سے خارج کردیا جائے جو مرور زمانہ سے اس کے اندر داخل ہوگئے تھے اور جنھوں نے اسلام کی سادگی اور نفاست کو برباد کردیا تھا اس چیز نے انھیں مجبور کیا کہ وہ فقہا کی کج بحثی کو ترک کرکے اجتہاد پر عمل کریں اور ہر مسئلہ کا تصفیہ 'اجماع' کی روشنی میں اپنے ماحول کے لحاظ سے کریں 'اسلام لاشمک' کو اپنے پروگرام کی بنیاد بنا کر انھوں نے یہ ثابت کرنیکی کوشش کی کہ اسلام میں دنیوی اور مذہبی دائرے علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں ان کے لئے زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ظہور کا لازمی ذریعہ اور منبع صرف اسلام تھا۔

جنگ عظیم کے اثرات سے ترکی بھی نہ بچ سکا اور اس کو جنگ میں شریک ہونا پڑا لیکن جنگ میں ترکی کا بہت نقصان ہوا اور وہ بالکل بے دست و پا متحدین کے رحم و کرم پر پڑا ہوا تھا ترکی مختلف مصائب سے گذرتا رہا یہاں تک کہ صلحنامہ لوزان ۱۹۲۳ء کی بدولت اس کے چھینے ہوئے حقوق پھر واپس مل گئے اور وہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پھر دنیا کے سامنے نمودار ہوا۔

صلحنامہ لوزان پر دستخط کرکے ترکی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اپنی پوری تاریخ میں ترکی پہلی مرتبہ ترکی بنا اور اسکی پوری قومی زندگی میں یک نئی لہر دوڑ گئی اب اس کو اپنی تنظیم کرنی تھی اور اپنے کو اس قابل بنانا تھا کہ ایک ترقی یافتہ قوم کی حیثیت سے ہر خارجی طاقت کا مقابلہ کرے۔

یہ چیز ایک مرتبہ پھر ہمیں ترکی جدید میں مذہب کی نوعیت کی طرف واپس لاتی ہے اس سے تو آپ واقف ہو گئے ہیں کہ زمانہ سابق میں ترکی ایک مذہبی سلطنت تھی سلطان ترکی بہ حیثیت بادشاہ کے ۲ کروڑ ترکی باشندوں کا حکمران اور اپنے مذہبی منصب کے اعتبار سے ۳۰ کروڑ مسلمانوں کا خلیفہ تھا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ کس طرح سے قومی جمعیت انگورہ کے ایک قانون کی رو سے یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو سلطان کے منصب کو ختم کر دیا گیا۔ نئے منتخب شدہ خلیفہ عبدالمجید آفندی صرف مذہبی سردار تھے انھیں سیاست اور حکومت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

قسطنطنیہ پر سے خارجی اقتدار ہٹائے جانے کے بعد ۲۹ ر اکتوبر کو ترکی جمہوریہ کا اعلان ہوا اور قومی مجلس اعلیٰ کی ایک قرار داد کی رو سے مصطفےٰ کمال پاشاہ کو بہ غلبۂ آراء جمہوریہ کا صدر منتخب کیا گیا۔ مارچ ۱۹۲۴ء کے ایک اعلان کی رو سے نام نہاد منصب خلافت کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ مذہب اور سلطنت کے درمیان تفریق پیدا کر دینا قوم پرست ترکوں کی ہمت اور جوانمردی کی ایک بین دلیل ہے اس جرات کا اندازہ ٹھیک طور پر وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو یہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ کس طرح صدیوں سے ترکی سلطنت اور اسلام ایک دوسرے میں ضم ہو گئے تھے اور یکایک ان میں علیحدگی پیدا ہو گئی۔ اس حیرت انگیز واقعے کی وجہ سے عام طور سے یہ پیشنگوئی کیجاتی تھی کہ ترکوں کو اسلامی دنیا کی رہبری کا جو شرف حاصل تھا وہ اب باقی نہیں رہیگا لیکن یہ غلط ثابت ہوا۔ پہلی مرتبہ ہم ترکی کے اندر ایک ایسی حکومت پاتے ہیں جو کلیتہً قومیت پر مبنی ہے

مذہب اب بھی موجود ہے لیکن وہ صرف ذاتی عقائد کی حد تک ہے حکومت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے ۔

اب ہم جدید ترکی میں اسلام کی حالت پر بحث کریں گے ۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ترکی کے اس فوری انقلاب سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والا کوئی واقعہ ابتک اسلامی اور عیسوی دنیا کے سامنے پیش نہیں آیا تھا ۔ ترکی جمہوریہ بن گیا، خلافت ختم ہوگئی سلطنت اور مذہب میں تفریق پیدا ہوگئی، مدارس میں سے مذہبی عناصر کو کلیۃً نکال دیا گیا، درویشوں کے گروہ کو فنا کر دیا گیا یورپی لباس اور لاطینی رسم الخط داخل کیا گیا، جمعہ کے بجائے اتوار کو تعطیل ہونے لگی عورتوں کو بالکل آزادی دیدی گئی غرض ہر شعبہ زندگی میں ایک تغیر رونما ہوا۔ ان تمام تبدیلیوں کو ایک زندہ قوت کے طور پر موجودہ ترکی جا کر دیکھا جا سکتا ہے ۔

یہ ہم کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ ترکی رہنماؤں نے جو کچھ کیا وہ سیاسی ضروریات کے تحت کیا ۲۳ء کے چند سالوں بعد تک تو حالت بہت غیر اطمینان بخش تھی ۔ تمام تبدیلیاں جو ترکی میں ہوئیں ان کا صرف ایک واحد مقصد یہ تھا کہ جہاں تک ہوسکے کم سے کم عرصہ میں قوم پرست جماعت کے لائحہ عمل پر عمل پیرا ہوکر ترکی کو ایک ترقی یافتہ اور موجودہ تخیل کے لحاظ سے مہذب سلطنت بنا دیا جائے ۔ ترکی کے متعلق اس وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہاں غیر مذہبی حکومت ہوگی ۔ اگر ہم اسلام کے وہی معنی سمجھتے ہیں جو آنحضرتؐ کی وفات کے بعد سے ایک عجیب صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا رہا تو یقیناً ترکی کے غیر مذہبی ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی لیکن اگر ہم ترکی کو ان احکام کی روشنی میں دیکھیں جو قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ علماء اسلام کا فتویٰ ترکی کے متعلق غلط تھا تمام اصلاحات جو ترکی میں داخل کی گئیں انکا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے اندر جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں انکو دور کرکے حقیقی اسلام کی حفاظت کیجائے شومئی قسمت سے کثر مسلمان ابتدائی اسلام اور بعد کے اسلام میں امتیاز نہ کرسکے اور اسی وجہ سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ترکوں نے ہر اسلامی حکم کی خلاف ورزی کی لیکن دراصل ترک اسلام ترکوں کا کبھی مقصد نہ تھا اب بھی ترکوں کا مذہب اسلام ہے لیکن اصلاحات کے ذریعہ انھوں نے صرف اتنا کیا ہے کہ بعد کے اسلام کے اندر سے خرابیاں دور کرکے اسلام کو اسی حالت پر لے آئے ہیں جسکی تعلیم پیمبر صلعم دی تھی ترکی کے دستور کے دفعہ (۲) میں صاف لکھا ہوا ہے کہ " ترکی سلطنت کا مذہب اسلام ہے، سرکاری زبان

ترکی ہے اور حکومت کا دار السلطنت انگورہ ہے" اب اس سے بڑھکر ترکی کے اسلامی سلطنت ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ تمام اصلاحات فوری اور مصنوعی طور پر کی گئیں اسلیئے نہ تو ان میں اعلیٰ صفات ہونگی اور نہ ان میں استقلال ہوگا۔ اس کا جواب صرف یہی ہے کہ اب تک تو کوئی خرابی پیدا ہوئی نہیں ہے۔ یہ اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے کہ ترکی کے اس نفسیاتی اور مذہبی انقلاب کی بنیادیں زمانہ دراز سے کھڑی کی جارہی تھیں۔ ترکی کے مغربی ممالک سے گہرے تعلقات پیدا ہو چکے تھے اور بیسویں صدی کی ابتدا سے ہر شعبہ زندگی میں یورپی اثرات کارفرما تھے۔ جنگ عظیم نے صرف ان کو تکمیل کو پہونچا دیا۔ نئی تبدیلیوں سے ملک کا ہر باشندہ یہاں تک کہ اناطولیہ کے دور دراز کے قصبات بھی متاثر ہو چکے ہیں عوام ان تبدیلیوں سے نہ صرف مطمئن نظر آتے ہیں بلکہ زندگی کے متعلق ان کے نظریات بھی بدل گئے ہیں تمام ملک معاشری اور تمدنی ترقیوں کے زینے طے کرتا چلا جارہا ہے۔ مدارس کی حالت بالکل بدل چکی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ترکی حکومت سمجھتی ہے کہ نوجوان قوم کی امیدوں کا مرکز ہیں لہذا انکی تعلیم و تربیت ایسی ہونی چاہیئے جو ان کو صحیح معنوں میں اپنی قوم کا ہمدرد اور پاسباں بنادے عورتوں کی وہی حالت ہوگئی ہے جو یورپین عورتوں کی ہوتی ہے اور اب وہ ان قیود اور پابندیوں سے آزاد ہو چکی ہیں جو جمہوریہ سے قبل ان پر عائد کی گئی تھیں۔

جس چیز پر ہم خاص طور سے زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ترکی کے اندر تمام تغیرات ارتقار کا نتیجہ ہیں۔ دوسرا جزو بھی کافی اہم ہے۔ حقیقی انقلاب وہی ہوتا ہے جس کا نتیجہ نہ صرف حکومت اور سیاسیات کا تغیر ہوتا ہے بلکہ سماجی اور تمدنی خیالات بھی بدل جاتے ہیں۔ ترکی کے انقلاب کی حقیقی خوبی اسی چیز میں مضمر ہے۔ انقلاب ترکی اتنا زبردست واقعہ ہے جو اب تک دنیائے اسلام میں وقوع پذیر نہیں ہوا۔ عوام ان تمام پرانی دقیانوسی چیزوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے جو ان کے مصائب کا سبب بنی ہوئی تھیں۔ ترکوں کا یہی عقیدہ انکی تبدیلی کا باعث ہوا ترک مصطفیٰ کمال مرحوم کو اپنا سردار، باپ اور نجات دہندہ سمجھتے تھے اس سے ترکوں کی ضبط و نظم کی قابلیت ظاہر ہوتی ہے جو ان کی نسل کی سب سے اعلیٰ صفت ہے۔

اگر ہم حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترکوں کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ بہت بڑی

ناانصافی ہوگی اگر ہم ان کو اسلام کا مخالف کہیں جو کچھ انھوں نے کیا وہ صرف اتنا تھا کہ پرانی چیزوں میں نئی روح پھونکدی اور پان اسلامزم کا بالکل خاتمہ کردیا۔ ہم کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ اسلام کے اندر بلانتہا پنہاں قوتیں مضمر ہیں جن کا اظہار کوشش عمل سے ممکن ہے اسلام کی عظمت کی تاریخ اسلامی نادرالوجود ادب اور سادگی ہی ایسی چیزیں ہیں جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن پھر اسلام بنی نوع انسان کی نجات کا باعث ہوگا۔ اگر ہم اس کے اندر عقیدہ اور ایمان راسخ رکھیں تو آج ہم بھی ویسے ہی ہو سکتے ہیں جیسے کہ ترک۔

(مترجمہ از اسلامک ریویو)

سیّد حسین رضوی متعلم ال ال بی (ابتدائی)

آتشکدہ

کیا کہوں کن دلبرانِ خاص کی محفل میں ہوں
کیا بتاؤں کن نگاہوں میں ہوں کیسی دل میں ہوں

واجب و امکان کی کس حد میں ہوں میں کیا کہوں
کیسی کیسی تجلیوں کی زد میں ہوں میں کیا کہوں

کتنے لب، کتنی جبینیں، کتنے جلوے، کتنے طُور
کتنی صبحوں کا اُجالا، کتنے نغموں کا سرور

کتنی نوآغاز کلیاں، کتنے خوشبو دار پھول
میری ٹھنڈی سانس پر ہوتے ہیں رنجور و ملول

کتنے سنگیں دل ہیں جو میرے نشہ میں چور ہیں
کتنی راتیں ہیں جو میرے نام سے مشہور ہیں

کیا کہوں کن مہوشوں کن دلبروں کا ساتھ ہے
کیا کہوں کن عارضوں کن کاکلوں کا ساتھ ہے

کیسے کیسے آتشیں پیغمبروں کا ساتھ ہے

مخدوم محی الدین ام اے
ریسرچ اسکالر

پودوں کی جماعت بندی

کرۂ ارض پر پودوں کی تعداد ان گنت ہے۔ ایسی صورت میں ایک شخص کے لئے جو ان کا مطالعہ کرنا چاہتا ہو یہ ناممکن ہے کہ وہ انھیں ایک ایک کرکے یاد رکھے۔ اس لئے ان سے واقفیت کا صحیح اور واحد طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی ایسی جماعت بندی کی جائے جس سے اُن کے آپس کے نسلی تعلقات اور ارتقائی رحجانات کا پتہ لگایا جاسکے اور بآسانی یاد بھی رکھے جاسکیں۔

تاریخ نباتات میں سب سے پہلے جس شخص نے پودوں کی جماعت بندی کی کوشش کی وہ تھیوفراس ٹس تھا۔ جو یونان میں ۳۷۲ ق۔م میں پیدا ہوا۔ یہ یونان کے مشہور عالم اور حکیم ارسطو کا شاگرد تھا۔ تھیوفراسٹس نے تقریباً ۴۵۰ پودوں کو بیان کیا ہے ان کی تقسیم بوٹیوں، جھاڑیوں اور درختوں میں کی ہے۔ اس کے بعد سنہ عیسوی کی ابتداء میں اور حکماء نے بھی پودوں کی تقسیم کی کوششیں کیں، لیکن ان حکماء قدیم نے جو اہم کام شروع کیا تھا وہ اُن کے بعد عہدِ جہالت کی تاریکی میں غائب ہوگیا۔ چنانچہ سولھویں صدی کے آغاز تک پھر کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ سولھویں صدی کا ابتدائی زمانہ تاریخ نباتات میں عطاروں (Herbals) کا عہد کہلاتا ہے۔

اس دور میں جڑی بوٹیوں کا استعمال دواؤں اور جادو ٹونوں میں کثرت سے کیا جانا لگا ۔ اس دور میں جرمنی، فرانس اور ہالینڈ میں اس مضمون سے بہت دلچسپی لی جانے لگی ۔ چنانچہ Fuchs (سنہ ۱۵۰۱ء تا سنہ ۱۵۶۶ء) ، Bock (سنہ ۱۴۹۸ء تا سنہ ۱۵۵۴ء) اور Brunfels (سنہ ۱۵۰۰ء تا سنہ ۱۵۳۴ء) وغیرہ نے اپنے اپنے ملک کے پودوں کو جمع کیا اور اُن کا مطالعہ کیا ۔ انہوں نے نہ صرف اپنے قرب و جوار کے درختوں کو بیان کرنے کی کوشش کی بلکہ اُن پودوں کا بھی ذکر کیا جو اُن کے ملک کے دور دراز مقامات سے سیاحوں اور مسافروں کے ذریعہ حاصل ہوئے ۔ ان لوگوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جس قدر ہوسکے درخت جمع کریں کیونکہ اس زمانے میں کسی ماہر نباتات کا اعزاز اُس کے جمع شدہ درختوں کی تعداد پر منحصر تھا ۔ درخت کثیر تعداد میں جمع ہونے کے باعث ان کو گروہوں میں تقسیم کرنے کے لئے ایک ابتدائی درجہ بندی کی ضرورت ہوئی ۔ پودوں کو پتوں، تنے اور شاخوں کی مشابہت کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا ۔ اس میں شک نہیں کہ ان حکیموں نے اس میں بہت سی ترمیمات پیش کی تھیں لیکن نفس مضمون پر ان لوگوں کا اس سے زیادہ احسان نہیں ہے کہ انہوں نے علم نباتیات کی اہمیت کو عوام سے روشناس کرادیا ۔

ایک نہایت تفصیلی درجہ بندی جان گے رارڈ نے کی ہے ۔ اس نے اپنی ترتیب کو تین کتابوں میں شایع کیا ۔ پہلی کتاب میں گھاس اور جذع والے پودوں کا ذکر ہے ۔ دوسری جماعت جس کا بیان دوسری کتاب میں ہے اُس میں وہ تمام پودے شریک ہیں جو بطور دوا، خوشبو اور ترکاری استعمال ہوتے ہیں ۔ تیسری کتاب میں پھل والے پودے ماس اور فطر شریک ہیں ۔ بظاہر یہ ایک ابتدائی اور غیر منظم ترتیب تھی لیکن اس ترتیب کو ہمیں اُس زمانے کے حالات کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے ۔

Cesalpini (سنہ ۱۵۱۹ء تا سنہ ۱۶۰۳ء) اطالیہ کا ایک قابل ذکر فلسفی اور سائنس داں گذرا ہے ۔ اس نے سب سے پہلے بیج اور پھل کی اہمیت کو محسوس کیا ۔ گو اس کی تحقیقات بھی ارسطوئی مکتب کے اثرات سے بچ نہ سکی ۔ چنانچہ وہ بھی پودوں کو بوٹیوں، جھاڑیوں اور درخت کے اعتبار سے تقسیم کرنے کا حامی ہے ۔ اس کے بعد سوٹزرلینڈ کا ایک ماہر نباتیات Kaspar Bauhin ہے ۔ جس کی ترتیب سنہ ۱۶۲۰ء میں شائع ہوئی ۔ اور نظامی نباتیات میں دو نامی طریق کی ابتداء ہوئی ۔ لیکن اس کی ترتیب بھی غیر علمی

اور ابتدائی ہے ۔ اس نے جنین اور بیج کو خاص اہمیت نہیں دی ۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا تمام حکماء کی جماعت بندیوں کا انحصار شکلیاتی خصوصیات پر ہے اسی لئے انھیں "مصنوعی" کہا جاتا ہے ۔ برخلاف اس کے اگر پودوں کی' ان کے پھول اور زہرادی حصوں مثلاً پنکھڑیاں، پھول پتیاں، زردریشے، بیض خانے کی اشکال، ساخت، ان کی ترتیب وتعداد' ان کے آپس کے نسلی تعلقات اور شکلیاتی خصوصیات کے لحاظ سے تقسیم کی جائے تو ایسی جماعت بندی زیادہ تر قابل بھروسہ ہوگی اس کو ہم "فطری تقسیم" کہہ سکیں گے ۔

John Ray کا رسالہ Historia Plantarum سنہ ۱۷۰۳ء میں شائع ہوا ۔ اس کی درجہ بندی کے ساتھ ہی موجودہ نظامی نباتات کی داغ بیل پڑگئی ۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے جنین میں ایک بیج اور دو بیج پتوں کے درمیان تمیز کی ۔ اسی بنا پر اس نے ایک بیج پتیا پودے اور دو بیج پتیا پودے کا نام دیا ۔ لیکن یہ قدیم درجہ بندی کے اثرات سے بچ نہ سکا ۔ یعنی اُس نے انہیں وہی قدیم عنوانات Herbae اور Arbores میں تقسیم کرنے کی کوشش کی گو اُن کو پھر Dicotyledons اور Monocotyledons کی ذیلی تقسیموں میں بانٹ دیا گیا ۔

Camerarius پہلا جرمن سائینداں تھا جس نے پھولوں میں صنفیت کے وجود کا پتہ چلایا ۔ اس نے ثابت کیا کہ بارروری کے لئے زیرے کی ضرورت لازمی ہے ۔

Linnaeus کی جماعت بندی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے یہ سنہ ۱۷۰۷ء میں سویڈن میں پیدا ہوا ۔ بچپن ہی سے Linnaeus کو نباتات سے دلچسپی تھی ۔ چنانچہ اس نے اساتذہ قدیم کی تصنیفات کا ازسرنو مطالعہ کیا اور کئی غلط خیالات کی تردید کی اس کے علاوہ اُس نے دُہرے لاطینی ناموں کا استعمال کثرت سے شروع کیا ۔ اور دنیا کے تمام حصوں کے کئی پودے بیان کئے جن میں بیشتر حصہ شمالی امریکہ کے نباتیہ کا تھا ۔

اپنے فن کا ماہر ہونے پر بھی Linnaeus کوئی ایسا نظام پیش نہ کرسکا جسکی بنیادیں پودوں کے نسلی تعلقات پر مبنی ہوں ۔ گو اس سے انکار نہیں کیا جاتا کہ اسی نے اول ایسے نظام کی ضرورت

محسوس کی جو نسلی تعلقات کا اظہار کر سکے۔ اس کا نظام تقسیم زر ریشوں اور بیض خانوں کی تعداد پر منحصر تھا۔ چنانچہ اس نے زر ریشوں کی تعداد کے لحاظ سے (۲۴) کلاس اور بیض خانوں کی تعداد کے مطابق (۶۷) آرڈر بنائے۔ یہ جماعت بندی بڑی تیزی سے یورپ میں مقبول ہو گئی کیونکہ اس تقسیم میں پہلے کی بہ نسبت بہت سی سہولتیں موجود تھیں۔ زر ریشوں کی تعداد اور ساخت کے اعتبار سے مندرجہ ذیل ۲۴ کلاس بنائے گئے مثلاً

کلاس نمبر (۱) Monondria جس میں زر ریشہ ایک
" " (۲) Diandri " " دو ۲
" " (۳) Triandria " " تین ۳

اسی طرح Tetrandria میں چار، Pentandria میں پانچ علیٰ ہذا۔ Polyandria میں کثیر زر ریشے۔ ساخت کے اعتبار کرتے Monodelphia، Didelphia Polydelphia میں بالترتیب یک برادری، دو برادری اور کثیر برادری زر ریشے نیز نمبر (۱۹) Syngenesia نمبر (۲۰) Gynandrla سے مراد مل زردان اور ماؤگیں سے ملے ہوئے زر ریشے والے پھول ہیں۔ نمبر (۲۱) Monoecia نمبر (۲۲) Dioecia نمبر (۲۳) Polygamia ایک صنفی، دو صنفی اور کثیر جوگی پھول تھے سب کے آخر میں ان پودوں کو بھی شامل کر لیا گیا جن کے تناسلی اعضا نظروں سے پوشیدہ ہوں یعنی نمبر (۲۴) Cryptogamia۔ ان چوبیس جماعتوں کو مادہ کوٹ کے لحاظ سے (۶۷) آرڈروں میں بیان کیا گیا مثلاً دوسری کلاس Diandria کے تحت اس نے حسب ذیل آرڈر قائم کئے۔

۱) Monogyna میں ایک بیض خانہ والے پھولدار پودے
۲) Digyna میں دو "
۳) Trigyna " تین "
۴) Tetragyna " چار "

Linnaens کی ترتیب ایک مصنوعی نظامی ترتیب کی اچھی مثال ہے۔ اس میں خامیاں بھی ہیں مثلاً بیسویں جماعت جو Gynandria پر مشتمل ہے ایک بیج پتیا اور دو بیج پتیا پودے ایک جگہ رکھ دئے گئے ہیں۔ اسی طرح اکیسویں اور بیسویں جماعتیں بھی اس قسم کے گروہ بناتی ہیں۔

Linnaens کے جماعت بندی کے ہم ممنون احسان اس لئے بھی ہیں کہ اس نے Binary system of nomenclature کی بنیادیں مضبوط کیں۔ ہر پودے کو دو ناموں سے بیان کرنا شروع کیا۔ نام کا پہلا جز جنس اور دوسرا نوع کا نام ہوتا تھا۔ اس کی درجہ بندی کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس نے جماعت بندی تولیدی اعضا کے اعتبار سے کی۔

اس سلسلہ میں مزید تحقیق دو فرانسیسی ماہرین نے کی۔ ایک فرانسیسی ماہر نباتیات Dernard de Jussien کچھ زمانے تک تحقیقات کرتا رہا۔ لیکن وہ اپنی تحقیقات سے مطمئن نہیں تھا اور اسی لئے اس نے انہیں شائع کرنے سے احتراز کیا۔ اُس کے بھتیجے A. L. Dejussien نے اس کی تحقیقات میں حذف و اضافہ کے بعد اُس کو اپنی ذاتی تجاویز کے ساتھ ۱۷۸۹ء میں شائع کیا۔ یہ سب سے پہلی سائنٹیفک درجہ بندی ہے جس کو فطری درجہ بندی کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سائنسداں کو جدید نظامی فطری تقسیم کا پیش کنندہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نے نوع، جنس، اور آرڈروں میں صحیح امتیاز قائم کیا۔ عائلے جو تقریباً سو ہیں۔ تین ذیلی تقسیموں اور پندرہ جماعتوں میں تقسیم کئے گئے ہیں یعنی نمبر (۱) Actyledons جس میں Thallophyta، Bryophyta اور Pteridophyta اور بہت سے مشتبہ نسلیاتی تعلقات رکھنے والے عائلے اور آبی پودوں کو جمع کیا گیا ہے۔

نمبر (۲) Monocotyledon جس کی تین جماعتیں کی گئی ہیں۔

نمبر (۳) Dicotyledons جس کی گیارہ جماعتیں کی گئی ہیں۔ اس کو پھر Apetalae، Monopetalae، Polypetalae اور Diclines irregulares میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن اس میں یہ خامی ہے کہ Monocoty، Dicotyledons کو Cryptogams (یا Acotyledons) کے مقابل مساوی درجہ دیا گیا ہے۔ ذیلی جماعتوں کو زیادہ تر زر ریشوں اور بعض خانوں کی تعداد پر مرتب کیا گیا ہے حالانکہ بعض

خواص ایک مقام پر تو نظامی حیثیت رکھتے ہیں، اور دوسری جگہ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ سب سے بیکار ترتیب Apetalae ا Diclines irregulares میں ظاہر کی گئی ہے لیکن آخر الذکر کے پانچ عائلے سب سے زیادہ غیر فطری ترتیب میں ہیں۔ Coniferae کو دو بیج پتیا پودوں کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے اور یک بیج پتیا پودوں کو دو بیج پتیا کے بیشتر بیان کیا گیا ہے۔

Angustin Candolle دوسرا ماہر نباتیات ہے، جس کی تحقیقات سے موجودہ نظامی نباتیات پر گہرا اثر پڑا۔ یہ ترتیب بڑی حد تک Jussieu کی ترتیب سے مشابہ ہے لیکن اس میں کئی ترمیمیں ہوئی ہیں۔ Condolle کا یہ خیال تھا کہ فعلیات کو شکلیات کی بہ نسبت زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ اپنے تحقیقات کے دوران میں یہ خود اپنے اس اصول سے انحراف کرتا ہے مثلاً وہ اپنے ذیلی گروہوں کی تقسیم کرتے وقت وعاء کی موجودگی یا غیر موجودگی کو وجہ تقسیم قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک فعلیاتی فرق ہے۔ ایک طرف تو وہ خلوی اور وعائی پودوں کے درمیان تعلق بتلاتا ہے تو دوسری طرف وہ درختوں میں بیجے پتوں کی موجودگی اور غیر موجودگی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح اس کی ترتیب میں وعائی Cryptcgams یک بیجے پتیا پودوں میں شامل ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ Jussieu نے ان کو یک بیج پتیا پودوں اور دو بیج پتیا پودوں سے علحدہ رکھا۔ کنڈول کے نظام کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

I Vascular plans or plants with cotyledons.

II Cellular plants or plants without Cotyledons.

ان تمام جماعت بندیوں میں ایک خاص نقص یہ تھا کہ کھل بیجے بعد بیجوں کے گروہ میں شامل کردیئے گئے تھے۔ سب سے پہلے جس شخص نے کھل بیجوں اور زہراوی پودوں میں تمیز کی وہ رابرٹ براون نامی ایک انگریز تھا۔ اس نے بتایا کہ کھل بیجے دراصل برہنہ بیض خانے والے پودے ہیں۔ ان کو دو بیج پتہ پودوں سے بالکل علحدہ رکھنا چاہئے۔ نیز اُس نے بعیدان کی مختلف ساختی اور تشریحی تبدیلیوں کی نسبت تحقیقات کی۔ ان تحقیقات سے یک بیج پتیا اور دو بیج پتیا پودوں کی ذیلی تقسیموں میں مدد ملی۔

ایک دوسرے انگریز Lindley کی پیش کردہ جماعت بندی اسی لئے قابل ذکر ہے کہ اس کا اثر انگلستان اور دیگر ممالک پر بہت پڑا گو اس کا نظام تقسیم براعظم یورپ خصوصاً جرمنی میں زیادہ تنقید کا شکار رہا۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں جان لنڈلے نے اپنی درجہ بندی شائع کی یہ جماعت بندی کنڈول کی نظامی ترتیب میں کچھ ترمیم اور اضافہ کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔ پھولدار اور غیر پھولدار پودوں کے بڑے عنوانوں کو قائم رکھا گیا۔ لیکن اول الذکر کے ذیلی تقسیموں میں کھل بیجوں اور بند بیجوں کے اصول کو جس کو براؤن نے معلوم کیا تھا قائم رکھا گیا۔ لنڈلے بجائے اس کے کہ کنڈول کی طرح اُن پانچوں ذیلی جماعتوں میں کوئی ہم ترکیبی یا ہم فعلیت معلوم کرتا وہ پودوں کی عام توافقی حالت کو اہمیت دیتا ہے یعنی اس نے طفیلی یا نیم طفیلی عادتوں کو جو ظاہری طور پر ایک ہی ہیں لیکن در اصل مختلف پودوں میں ایک ہی قسم کے حالات کے تحت پیدا ہو جاتی ہیں اہمیت دی۔ اس قسم کا تبصرہ اُن چند یک بیج پتیا پودوں کے عائلوں پر بھی کیا جاتا ہے جس کو لنڈلے نے محض اس لئے یک بیج پتیا پودوں سے علٰحدہ کیا کہ ان میں جالدار رگیت پائی جاتی ہے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں Stephan Endlicher نے ایک ایسی جماعت بندی پیش کی جو ایک عرصہ تک یورپ میں مقبول رہی۔ اس کی تصنیف کئی اہم ترین تجویزوں اور مشوروں سے پُر ہے۔

اس کے بعد سنہ ۱۸۴۳ء میں ایک فرانسیسی سائنسدان Adolphe Brongniat نے اپنا ایک نظام تقسیم پیش کیا۔ یہ بھی لنڈلے کی طرح پودوں کی دو تقسیمیں کرتا ہے ـــــ Cryptgams اور Phanerogams ۔ اسی طرح یک بیج پتیا پودوں کو بیضین کی موجودگی یا غیر موجودگی کے اعتبار سے دو درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دو بیج پتیوں کی دو ذیلی تقسیمیں Gomopetalae اور Dialypetalae کی گئیں ہیں Adolphe Bungniart کے ترتیب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سے بے پنکھڑی پودوں کو خارج کر دیا گیا۔ Apetalae عموماً Dialpetalae کا ایک نامکمل گروہ نظر آتا ہے جس کے اندر Apetalae کو منتشر کر دیا گیا ہے۔

سنہ ۱۸۵۰ء تک جتنی بھی تقسیمیں پیش ہوئیں اُن سب کی غیر سائنٹیفک خصوصیت یہ تھی کہ ان سب میں Cryptogams کو غیر تولیدی پودوں کے طور پر تقسیم کیا گیا تھا ۔ خوردبین کے ایجاد کے ساتھ ہی اُن کی سوانح حیات معلوم ہوگئی ۔ یہ Hofmeister کی زبردست تحقیقات کا نتیجہ تھا کہ ان کی جنینیات کے مطالعہ کے بعد اُن کے متعلق کوئی معین تخیل پیش کیا گیا ۔ تبادلہ نسل کا نظریہ نہ صرف فرن اور اس کے متعلقہ پودوں کے ضمن میں بیان کیا جا سکتا ہے بلکہ کھلے بیجوں اور بند بیجوں کے متعلق بھی ۔ نباتی عالم کے ذیلی تقسیموں میں Hofmeister کی تحقیقات کی قیمت معلوم ہوتی ہے ۔ کیونکہ Thallophytes، Bryophytes، Pteridophytes، کھلے بیج والے پودے، بند بیج والے پودے کی تقسیموں کی بنا اس ہی نے قائم کی ۔ لیکن ہم صرف پھول والے پودوں کی تقسیم کو اہمیت دیں گے ۔

گذشتہ صدی کے نصف حصہ میں سب سے زیادہ اہم جو جماعت بندی پیش ہوئی وہ بنتھام اور ہوکر کی بیان کردہ ہے ۔ جارج بنتھام اور سر جوزف ہوکر دو انگریزی ماہرین نباتیات نے کیو کے رائل بوٹانک گارڈن کے زبردست مواد ـــ Herbarium ـــ سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ۔ بنتھام اور ہوکر نے اپنی جماعت بندی جس میں (۲۰۲) فصیلے شامل ہیں ایک ضخیم کتاب Genera Plantarum میں پیش کی جو سنہ ۱۸۶۲ء تا سنہ ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی ۔

بنتھام اور ہوکر کی جماعت بندی میں گو کنڈول اور Jussieu کی اکثر خصوصیات شامل ہیں لیکن پھر بھی وہ ان تمام تقسیموں سے جو اب تک پیش ہوئے تھے بہتر اور سہل تھی بنتھام کی تقسیم گو الگ پنکھڑیوں سے شروع ہوتی ہے (جو حقیقتاً بے پنکھڑیوں سے ابتدائی ہیں) لیکن اس میں کھلے بیجوں کا مقام بے محل ہے یعنی وہ بے پنکھڑیوں کے بعد اور ایک بیج پتیا پودوں کے پہلے رکھے گئے ہیں ۔ حالانکہ ان کو ابتداء سے علیحدہ رکھنا چاہئے تھا یعنی دو بیج پتوں سے پہلے ۔ کیونکہ کھلے بیجوں کو زہرادی پودوں سے تعلق بعید ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جماعت بندی سخت تنقید کا شکار ہوتی رہی ۔ چنانچہ Hutchinson لکھتے ہیں کہ

"بنتھام اور ہوکر کی جماعت بندی مکمل نسلی تعلقات کے واضح کرنے کے لئے کبھی بھی پیش نہیں ہوئی

بلکہ وہ Jussieu کے کام کا کم و بیش ایک ترمیم شدہ تفصیلی بیان ہے جس میں کنڈول کی پیروی کی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ماہرین نباتیات ابھی قدیم نظریہ مخصوص تخلیق کا ساتھ دے رہے تھے۔ . . . . . .

. . . . بنتھام اور ہوکر تقسیم صرف پودوں کی شناخت میں آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے پیش کی گئی۔"

انھوں نے مل پتیا اور اثل پتیا خصوصیتوں پر زیادہ زور دیا۔ تقسیم اثل پنکھڑیوں سے شروع ہوتی ہے اور پہلا Cohort اثل پھلا بیض خانے اور ادنیٰ پھول والے زہرا وی پودوں کی وجہ سے Ranales رکھا گیا۔ جس میں فصیلہ Ranunculaceae شامل ہے۔ ان کی تقسیم میں دو امور ایسے ہیں جن پر کثرت سے تنقید کی گئی اول تو یک قبا دار کو اثل پنکھڑیوں سے علحدہ رکھا گیا دوسرے کھل بیجوں کا مقام بے محل ہے۔

بنتھام اور ہوکر نے دو بیج پتیا پودوں کو تین ذیلی گروہوں میں تقسیم کیا۔ پہلا Polypetalae دوسرا Gamopetalae تیسرا Monochlamydeae

Polypetalae میں کنڈول کی دو جماعتیں Thalamiflorue Calyciflorae شامل ہیں۔ لیکن اور بہت سے عائلوں جن کا نسلیاتی تعلق مبہم ہے ایک درمیانی گروہ Disciflorae میں رکھا گیا ہے۔ کیونکہ کم و بیش ان میں ایک زرریشی قرص پایا جاتا ہے۔ Gamopetalae اور Monochlamydeae، کنڈول کے تیسرے اور چوتھے گروہ ہیں Gamopetalae کو پھر تین سلسلوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلا آرڈر جس میں بیض خانہ ادنیٰ ہے۔ تیسرا آرڈر جس میں بیض خانہ اعلیٰ دو پھل پتہ دار ہے۔ اور درمیانی جس میں اعلیٰ بیض خانہ اور پھل پتوں کی تعداد دو سے زیادہ ہے۔ Polypetalae اور Gamopetalae کو کئی Chorts میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن Monochlamydeae کو آٹھ مختلف النوع سلسلوں میں بانٹ دیا گیا مثلاً Curvembryeae ایک فطری گروپ ہے۔ لیکن Unisexuals میں ایسے عائلے رکھ دئے گئے ہیں جن کے درمیان دور کا بھی نسلیاتی تعلق نہیں ہے۔

Monocotyledons کو سات سلسلوں میں تقسیم کیا ہے جن میں نہایت پیچیدہ بر مادگیں دار عائلے مثلاً Crchideae اور Scitamineae —— زیر مادگیں دار عائلے مثلاً Lilioceae وغیرہ

میں بٹ گئے ہیں لیکن ایسے عائلے جن میں گرد گل پنکھڑی نما نہیں ہے مثلاً Juncaceae اور Palmae ان کو علحدہ کیا گیا ہے اسی طرح Iroids اور Pandaceae ۔ یہاں پر گرد گل غائب ہے۔ Apocarpeae میں پھل پتے آزاد ہیں ۔ Glumaceae میں پھول نہایت سادہ ہیں۔

اس جماعت کا ایک اور نقص یہ بھی ہے کہ Monochlamydeae کے تحت ایسے عائلے رکھ دئے گئے ہیں، جن کا نسلیاتی تعلق دو گھیرے دار (یعنی ایسے عائلے جن میں کمامہ اور اکلیلہ پایا جاتا ہے) عائلوں سے ملتا ہے مثلاً Salicineae اور Cupuliferae کی پھولوں کی سادگی ایسے عائلوں کے ابتدائی پرکھوں سے ملتی ہوگی جواب غائب ہو گئے ہیں۔ اس لئے یہ عائلے موجودہ کسی گروہ کے قریب نہ ہوں گے۔ پھر بھی ان کو ایسے دو گھیرے دار عائلوں کے قریب رکھنا چاہئے جن کے آبا و اجداد ان سادہ پھول والے عائلوں کے آبا و اجداد سے حاصل ہوئے ہیں مثلاً Chenopodiaceae اور Caryophyllaceae کے قریب رکھنا چاہئے کیونکہ خمیدہ جنین دونوں کی مشترک خاصیت ہے۔

یقیناً یہ کہنا مشکل ہے کہ ایک گھیرے والے پھولوں کے عائلے دو گھیرے والے پھولوں کے عائلوں سے تنزل یافتہ ہیں یا ان سے ابتدائی۔ لیکن کسی ایک مبدا سے دونوں کے ارتقا کو اگر ڈھونڈ نکالا جائے تو کسی نظامی ترتیب میں اس سے مدد لی جا سکے گی۔ بنتھام اور ہوکر کے بموجب ایک مشترک مبدا سے Polypetalae پھر ان سے Gamopetalae حاصل ہوئے۔

ایک بیج پتیا پودوں کی ذیلی تقسیموں میں بیضخانہ کے نسبتی مقام یا گرد گل کی نوعیت پر زیادہ زور دیا گیا۔ اور اسی کو نسلیاتی تعلق کی کسوٹی سمجھا گیا ہے حالانکہ تمام عائلوں کا تنقیدی مطالعہ ہونا چاہئے تھا مثلاً Irideae اور Amaryllideae یقیناً Liliaceae سے Scitamineae یا Bromeliaceae کے بہ نسبت زیادہ قریب ہیں۔ حالانکہ دونوں میں Epigynons خصوصیت مشترک ہے اس لئے ان کو Scitamineae اور Bromeliaceae کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ نیز Liliaceae 'Juncaceae سے قریب ہونا چاہئے لیکن اس کو Palmac کے قریب

رکھا گیا ہے جس سے وہ کوئی قریبی نسلیاتی تعلق نہیں رکھتا۔

ایک فرانسیسی ماہر نباتیات Van Tieghem نے ۱۸۹۹ء میں ایک اور ترتیب شائع کی۔ اُس نے ابتدائی دو ذیلی تقسیموں کو قائم رکھا مثلاً Astigmateae (Gymonosperms) اور Strgmateae (Angiosperms) لیکن بند بیجوں کی ذیلی تقسیموں میں اُس نے جڑ کے نقطہ نمو پر زیادہ زور دیا۔ اس طرح سب سے اہم خاصیت تو بیضدان ہے اس کے بعد پنکھڑیوں کی موجودگی یا غیر موجودگی، اُن کا ملاپ اور بیضخانہ کا مقام بھی رکھا گیا ہے۔ اس غیر لچکدار نظام سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ اگر ایک مقام پر کوئی شکلیاتی خصوصیت اہم ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہی دوسری مقام پر بھی اہم ہو۔

ان سب ترتیبوں میں بہتر درجہ بندی Engler کی ہے۔ Engler ۱۸۴۴ء میں بمقام برلن پیدا ہوا۔ اس کی تقسیم پہلی مرتبہ ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ تقریباً تیس سال جامعہ برلن کا پروفیسر نباتیات رہا۔ ساتھ ہی ساتھ اس شہر کا بوٹانک گارڈن اور میوزیم اس کی نگرانی میں رہا۔ پہلی تقسیم بہت جلد مقبول ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں اس کو زیادہ تفصیل سے "Die Naturlichen Pflanzen familie" کے عنوان سے دوبارہ جاری کرنا پڑا۔ اس کے بعد مختلف طویل ضمیموں کے ذریعہ اس میں اضافہ ہوتا رہا چنانچہ اب یہ جماعت بندی بیس ۲۰ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

بنتھام وہوکر اور Engler کی تقسیموں میں اہم فرق یہ ہے کہ Jussieu کے گرو Polypetalae اور Monochlamydae کو یہاں ایک عنوان Archichlamydac کے تحت بیان کیا گیا ہے نیز یہ کہ اس میں ایک بیج پتے سب سے پیشتر رکھے گئے ہیں۔

اس درجہ بندی میں عائلہ کے گروہوں کو ایسے سلسلوں میں ترتیب دیا گیا ہے جن میں پھولوں کی ساخت کی پیچیدگی بڑھتی جاتی ہے۔ ابتدائی گروہوں میں پھول برہنہ ہیں یا یک قبا ہیں۔ اعلیٰ گروہ Dichlamydy ہیں۔ اس سے زیادہ ارتقائی عائلوں میں ان گلبرگوں کا ملاپ ہو گیا ہے ان کو Sympetalae کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ ارتقائی ایک ذیلی گروہ ہے جس کو Archichlamydeae سے تمیز کیا جاتا ہے۔

انگلر کا طریق، بنتھام اور ہوکر کے طریق سے علحدہ یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ اُس میں

chlanydae کا کوئی علیحدہ مخصوص گروہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کو مل پنکھڑیوں میں منتشر کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں انگلر کے نظام میں نہ صرف عائلوں کے نسلیاتی تعلق کو تبلایا گیا ہے بلکہ ان کے پھولوں کی ساخت سے عائلوں کا ارتقائی رجحان بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً Sympetalae کی نسبت انگلر کا خیال تھا کہ وہ ان ال پنکھڑیوں سے نہیں حاصل ہوئے ہیں بلکہ وہ ان کے مورثین سے بہت ابتدائی حالت میں ہی مل پنکھڑیا خصوصیت کے حامل ہوگئے ہیں۔

انگلر کی تقسیم پر حال حال میں بڑی زبردست تنقید کی گئی۔ اس خیال کے تحت اس پر نکتہ چینی کی گئی کہ بند بیج والے پودے Cycodeoideae (یعنی Benettites) کے پھول سے حاصل ہوئے ہیں۔ جن میں ایک بڑا مخروط کئی پیچیدار زہری غلاف سے گھرا ہوا ہے۔ اس پر نر اور مادہ بذری پتے لگے ہوتے تھے۔ اس خیال کی تائید کرنے والوں کا خیال ہے کہ اس طرح حاصل شدہ ابتدائی پھول کا عائلہ Ranales میں ملے گا۔ جہاں پر ایک مخروط پر آزاد گرد گل، کثیر زر ریشے اور کثیر آزاد پھل پتے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ Magnolia اس خاکہ کی اچھی ترجمانی کرتا ہے۔ لہذا اس خیال کے تحت تمام موجودہ بند بیجے Ranalian قسم سے حاصل ہوتے ہیں۔ نیز اس خیال کے تحت Achlamydeous monochlamydeous عائلے، Dichlomydeous عائلوں کی تخفیف یافتہ شکلیں ہیں۔ علاوہ ازیں یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سادہ عائلے Anemophilous ہیں۔

C. Roberston نے بے پنکھڑیوں کے گروہ Amentiferae کی ارتقائی کیفیات پر تحقیقات کی ہیں۔ چنانچہ اس کے نتائج کی نوعیت پر انگلر کی جماعت بندی کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا انحصار ہے۔ وہ یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ ابتدائی زہراوی پودوں کی زیرگی کیڑوں کے ذریعے عمل میں آتی تھی۔ بعد میں ایسے پودے حاصل ہوئے جن کے پھولوں کی زیرگی ہوا کے ذریعہ ہوتی تھی۔ لہذا آخرالذکر کسی طرح ابتدائی نہیں ہو سکتے۔ ایک نظریہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ بے پنکھڑے وابتدائی کھل بیجے بھی Anemophilous تھے اس لئے بے پنکھڑے بھی ابتدائی ہوئے یہ بھی ایک غلط نتیجہ ہے کیونکہ ارتقاء کھل بیجوں سے جو Anemophilous تھے پنکھڑیوں کی جانب ہوا اور ابتدائی زہراوی پودے

Entomophilous تھے ۔ ان سے بے پنکھڑے حاصل ہوئے جو Anemophilous ۔ اس خیال کو مزید تقویت بعض Gnetales سے ہوتی ہے ۔ جن میں زیرگی کیڑوں کے ذریعے ہوتی ہے ۔

اس کے علاوہ دوسرا اعتراض جو بے پنکھڑیوں کے ارتقائی ہونے پر کیا جاتا ہے وہ بیضہ خانہ کے سادہ اور اکہرے ہونے پر ہے ۔ لیکن Amentiferae کے بیضہ خانے نمایاں طور پر ایک سے زیادہ بیضہ خانوں کے ملاپ سے حاصل ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اکل پہلا بیض خانوں سے ترقی یافتہ ہے لہذا بے پنکھڑیوں کے بعد بیان کرنا چاہئے تھا ۔ نیز ایک بیج پتیا پودوں کا ذکر دو بیج پتیا پودوں کے بعد ہونا چاہئے تھا لیکن انگلر نے ایک بیج پتیا پودوں کو دو بیج پتیا پودوں سے پہلے رکھا ہے ۔ حالیہ رکازی پودے اس ترتیب کا بھی بہت کم ساتھ دیتے ہیں ۔

Charles Edwin Bessey پہلا امریکی ہے جس نے اپنا ایک علحدہ نظام تقسیم قائم کیا ۔ اس کے پہلے ملک میں عام طور پر بنتھام ہوکر اور انگلر کی جماعت بندیاں مروج تھیں ۔

۱۸۹۴ء Bessey کا ابتدائی نظام زیادہ تر کنڈول کی جماعت بندی کی ترمیم شدہ صورت تھی ۔ بسے اور بنتھام وہوکر کے نظامات میں اہم اختلافات یہ ہیں کہ گروہوں کے ناموں کی تبدیلیوں کے علاوہ یک بیج پتیا پودوں کی علحدہ تنظیم کی گئی ۔ نیز ایک قبادار کو دیگر آرڈروں میں منقسم کر دیا گیا ۔ کھل بیجے بالکل علحدہ کر دیئے گئے ۔ بسے اپنے پیش کردہ نظام میں مسلسل ترمیمیں کرتا رہا چنانچہ آخری بار (سنہ ۱۹۰۹ء) کے شائع شدہ نظام میں بہت سی باتیں بنتھام وہوکر کے موافق تھیں ۔ بسے نے زیادہ تر نسلی تعلقات کو پیش کرنے کی کوشش کی ۔

ایک اور قسم کی تقسیم Carl Moz نے سنہ ۱۹۱۴ء میں پودوں کے serum diagnosis پر رکھی جو انسانوں کے Soro-diagnosis کے اصول پر کی گئی ہے ۔

سنہ ۱۹۲۶ء سے سنہ ۱۹۳۴ء تک J. Hutchinson جو کیسو کے رائل بوٹانک گارڈن کے نگران کار تھے اپنی ترمیمات کے ساتھ ایک نظام تقسیم دو جلدوں میں پیش کیا ہے جو کئی امور میں بنتھام ہوکر اور انگلر کی جماعت بندیوں کی انقلاب انگیز تبدیلیوں پر منحصر ہے مثلاً سب سے پہلے انہوں نے Archichlamydeae میں اکل پنکھڑیے بے پنکھڑیے شامل کئے ہیں ۔ اس میں اس نے چوبی کو Ranales سے علحدہ اور پہلے بیان کیا ہے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اول الذکر کی چوبی حالت اور پھولوں کی چکردار ترتیب بہت ابتدائی ہے Hutchinson نے کوشش کی ہے کہ حتی الامکان اس کا نظام نسلیاتی تعلقات پر مبنی ہو گو انھیں اعتراف ہے کہ

اس کوشش میں وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے لیکن عام طور پر آجکل یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ نظام اگلے نظامات پر فوقیت ضرور رکھتا ہے۔
یہ ترتیب اس مفروضہ کے تحت کی گئی ہے کہ ایسے پودے جن میں گرد گل دو گھروں میں کمامہ اور کلیلچہ کی صورت میں موجود ہے ان عائلوں سے زیادہ قدیم ہے جن میں کمامہ اور کلیلچہ نہیں ہے۔ یہ خیال اس مفروضہ کی تائید کرتا ہے کہ ایک پھولدار پودے کے مختلف زہری اجزا پتوں کی متبدلہ شکل ہیں۔ یہ اجزا لازماً ابتدائی ہوئے۔ اگر ان میں ملاپ ہو تو یہ ایک ارتقائی علامت ہے۔ نیز ان کی پیچیدار ترتیب بہ نسبت گھیرے دار ترتیب کے ابتدائی ہے۔ اس کے علاوہ کثیر زرریشی حالت بہ نسبت چند زرریشی اور مل زرریشی حالت کے ابتدائی ہے۔ مزید براں خنثی شکل کیفیت یک جاتی کیفیت کی نسبت ابتدائی ہے۔
اس ترتیب میں گروہ چھوٹے ہیں۔ ان میں ایسے عائلہ رکھے گئے ہیں جن میں نسلیاتی تعلق بہت واضح ہے۔ بنتھام اور ہوکر کی یک قبا کو اصل پنکھڑیوں کے عائلوں میں حالیہ اور ارتقائی سمجھکر بانٹ دیا گیا ہے۔ ایک بیج پتوں کو دو بیج پتوں کے بعد رکھا گیا ہے۔ ان کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہ بہت ابتدائی زمانے میں دو بیج پتیا کے یا دوسرے ایسے ہی گروہوں سے حاصل ہوئے ہیں۔ حالیہ کازی پودوں کی دریافت ان نظریوں کی توثیق کرتی ہے۔
یہ امر اب بھی سہولت بخش ہے کہ دو بیج پتیا پودوں کی جماعت بندی میں Hutchinson کے سفارش کردہ دو گروہ باقی رکھے جائیں:-

1 Archichlamydae (PolyPetalae and Monochlamydeae)

2 Metachlamydae (Gamopetalae and Sympetaleae)

لیکن اگر پنکھڑیوں کے ملاپ کو ایک عام توافق خیال کیا جائے تو پھر ایک ایسی تقسیم کی جا سکتی ہے جو نسلی تعلقات پر ہی مبنی ہو مگر حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی انقلاب انگیز تجاویز پیش کرنا ابھی بہت قبل از وقت ہے کیونکہ اس صورت میں نتائج نہایت ہی عجیب ہونگے مثلاً Anonaceae کو Sapotaceae کے ساتھ اور Caryoplyllaceae، Primulaceae اور Gentianaceae کو قریب قریب رکھنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں دیگر فصیلوں کی تقسیم کا عمل اتنا آسان نہیں رہے گا۔

محمد ریاض الحسین قریشی ام۔ یس۔ سی (آخری)

آنسو

——— وہ جا رہا تھا ———

غنچے چٹک رہے تھے، پھول بیساختگی میں مسکرا رہے تھے، کالے کالے مست بھونرے کنواری کلیوں کا منہ چوم رہے تھے۔ بے بس کلیوں کا کچھ شرم سے کچھ غصہ سے منہ لال ہو گیا تھا۔ نیچر نور کے کرنوں میں نہا دھو کر بنی ٹھنی کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے دیکھا۔ سب کچھ دیکھا۔ اُس کے قدم رُک رہے تھے مگر وہ ٹھہر نہ سکا۔ ہر شئے دلکش تھی مگر اُس کے لئے جاذبِ نظر نہ ہو سکی۔

موسم کی دلفریبیاں ذرہ ذرہ میں بدمستیاں پیدا کر رہی تھیں لیکن اُس کے پُر رعب چہرہ پر سنجیدگی و متانت کی لہریں رقصاں تھیں اور اُس کے لبوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ۔

——— وہ چلا جا رہا تھا ———

بادل کی کڑک میں اُس نے بجلی کو مسکراتے دیکھا۔ اُس سے رہا نہ گیا ہنس پڑا۔ گھٹائیں شرم سے پانی پانی ہو گئیں۔

تاروں کے جلو میں، مہتاب اٹھلایا ہوا بڑھ رہا تھا۔ اُس کی پر نور شعائیں حسین شفاف چشموں پر

ناچ رہی تھیں۔ اس نے اس منظر کو بیتاب ہو ہو کر دیکھا۔ دل کی دھڑکنیں بڑھ رہی تھیں مگر ـــ وہ بڑھتا ہی گیا باغ اُجڑ چکا تھا۔ گلستان خارستان تھا۔ نہ پھولوں کی مسکراہٹ تھی نہ بلبل نغمہ ریز، نہ غنچے چٹک رہے تھے نہ بھونروں کا چکر۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ موت آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی گھور رہی تھی۔ وہ بڑھ رہا تھا۔ مگر قدموں میں لغزش تھی۔ یہی عالم تھا کہ دور سے ایک دلخراش آواز آئی "پی کہاں" قدم اُٹھ نہ سکے وہ ٹھہر گیا سنبھل نہ سکا گر پڑا اور اس کی حسرت نصیب آنکھوں میں اشک کا ایک قطرہ رقص کر رہا تھا۔

ادیب نے اُس کو "یاس" شاعر نے "درد" مغنی نے "سوز" سمجھا۔

بادی النظر میں سب کے سب حقیقت آشنا تھے۔ فلسفی سوچ رہا تھا۔ اس نے ہر انسانی جذبہ کا تجزیہ کیا۔ اس نے سب کی سُنی مگر عقل اُس گتھی کو سلجھا نہ سکی۔ وہ متحیر تھا اور بحر تفکر میں غرقاب!۔

یکایک مرنے والے کی ایک "آہ" نے فلسفی کو چونکا دیا ـــ وہ مر رہا تھا!! حقیقت عریاں ہو گئی، دل تڑپ اُٹھا، آنکھیں پرنم ہو گئیں اب اُس نے سمجھا کہ "آنسو" کی حقیقت کا انکشاف عقل سے ناممکن کیونکہ جس مسئلہ کو وہ حل کر رہا تھا اُس کا تعلق دماغ سے نہ تھا۔ دل کی دھڑکنوں میں اُس نے سُنا۔ بیساختہ بول اُٹھا۔ سبھوں نے جو کچھ سمجھا وہ رازِ حقیقت نہیں بلکہ عقل و نظر کا فریب ہے وہ پکار اُٹھا۔

"تفسیر حیات، معراج زندگی، روحِ انسانیت جو ایک حقیر آنسو میں ہے وہ سطحی نظروں سے پوشیدہ مگر متلاشی نگاہیں اور دھڑکتے ہوئے قلوب اس حقیقت سے آشنا۔ آنسو یاس ہے نہ درد ہے نہ سوز بلکہ انسانیت کا جوہر، روحِ وجود کائنات، جذبۂ محبت کا نچوڑ۔

سیّد احمد محی الدین (عثمانیہ)

ہندوستان کا مستقبل

"یہ مضمون فی البدیہہ اردو تحریری مقابلہ جشن یوم جامعہ میں لکھا گیا تھا اور اس کو انعام اول کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔"

"ادارہ"

ایشیائی عموماً شاہ پرست ہوتے ہیں وہ بادشاہ کو خدا کا سایہ یا ظل اللہ کہتے ہیں چنانچہ اہل جاپان کی شاہ پرستی کے قصے زبان زدِ خاص و عام ہیں وہاں کے بچہ بچہ میں جذبہ شاہ پرستی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ہندوستان بھی اس نعمت سے محروم نہیں ہے لیکن تقریباً ایک صدی سے یہاں کے باشندوں کی ذہنیتوں میں ایک خاص تغیر ہوگیا ہے۔ یورپی اقوام کی آمد سے قبل ہندوستانی شاہ پرست تھے۔ ہندوستان میں یورپی اقوام کی آمد سترھویں صدی عیسوی سے شروع ہوی۔ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد ہی سے یورپی اقوام نے یہاں اپنا اثر جمایا لیکن یہ اسقدر موہوم سا تھا کہ اُس کے بقا اور نشو و نما کی بہت کم اُمید تھی۔ جس وقت مغلیہ خاندان کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گُل ہوگیا تو اُن کا اثر زیادہ مقبول ہوگیا حتیٰ کہ انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہوگئیں انگریزی مصنوعات کی ہردلعزیزی بڑھ گئی اور ۱۸۵۷ء کے غدر جسکو "انقلاب" یا "جنگِ آزادی ہند" کا نام دیا گیا ہے، کے بعد سے انگریزوں کے قدم ہندوستان میں مستحکم طور پر جم گئے

اور تاجِ برطانیہ سے براہ راست تعلق پیدا ہو گیا۔ انگریزوں کی اس حکومت سے یہاں کے تمدن، تہذیب، معاشرت زبان اور روزمرہ کی زندگی پر اثرات پڑے۔ یہاں اس امر کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری ہوگا کہ مغربی سیاسیات کا اثر اہلِ ہندوستان کے دل و دماغ پر پڑا اور ہندوستانیوں کے اطراف ایک ایسا سیاسی ماحول اور اقتصادی حالات پیدا ہو گئے کہ وہ اپنے قدیم جذبہ شاہ پرستی کو بھولنے لگے اور ان میں ایک نیا تخیل پرورش پانے لگا وہ تخیل "جمہوریت" ہے۔ جس وقت ہندوستانیوں کے دل و دماغ جمہوریت سے روشناس ہوئے تو انہوں نے آزادی کا مطالبہ شروع کیا۔ اس خصوص میں یہاں ۱۸۸۵ء میں ایک قومی ادارہ قائم ہوا جس کو "کل ہند قومی کانگریس" کے نام سے یاد کرتے ہیں جس کے بانی ڈیوڈ ہیوم تھے ان کے علاوہ دادا بھائی نارو جی سر فیروز شاہ، بدرالدین طیب جی، تلک، گوکھلے، سر سیندر ناتھ بنرجی، لالہ لجپت رائے اور سر ولیم وغیرہ بانیان کانگریس کی حیثیت سے تاریخ کانگریس میں ممتاز ہیں اس خصوص میں گاندھی جی بھی قابل ذکر ہیں۔ گاندھی جی ہندوستان کی ایک مایہ ناز شخصیت ہیں جن کا نام نہ صرف ہندوستان کے ہر گوشہ میں سنائی دیتا ہے بلکہ یورپی ممالک میں بھی اُن کے نام اور کارہائے نمایاں سے لوگ واقف ہیں یہ ناانصافی ہوگی اگر ہم ان کے ہم کاروں کے نام بھول جائیں۔ مولانا شوکت علی مرحوم مولانا محمد علی مرحوم مولانا ابوالکلام صاحب آزاد۔ پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ مولانا کفایت اللہ صاحب۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور خان عبدالغفار خان صاحب کانگریس کی تاریخ میں ممتاز ہستیاں ہیں جنہوں نے اپنے بے لوث اور بیش بہا خدمات سے یہ ثابت کر دکھایا کہ ہندوستان مستقبل قریب میں وہ منزلیں طے کرے گا جس کے خواہاں اہل ہند ہیں۔ یہاں مختصر طور پر کانگریس کے قیام اُس کے مقاصد اور لائحہ عمل پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

کانگریس ایک قومی ادارہ ہے جس میں ہندو، مسلمان اور دیگر اقوام برابر کے شریک ہیں اس ادارہ میں کسی قسم کے رنگ و نسل اور مذہب و ملت کا امتیاز اور تفریق نہیں ہے۔ یہ ہندوستانیوں کی ایک ٹھیٹ قومی جماعت ہے اُس کا مقصد اور مُدعا ہندوستان کی آزادی ہے جو ایک صدی سے اہل ہند کے گلوں میں غلامی کا طوق پڑا ہوا ہے محض اس غلامی کی وجہ سے ہندوستان ترقی کے میدان میں پیچھے ہے ہندوستانی

عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کی تاریخ کو ہم نہیں بھول سکتے کیا ایک وقت نہیں تھا جبکہ ہندوستان کی شان و شوکت ۔ جاہ و جلال عزت وعظمت ۔ شجاعت وشہامت ۔ طریقہ کامرانی وحکمرانی ۔ سیاست وحکومت تجارت وصنعت وحرفت ۔ تہذیب وتمدن ۔ زبان و معاشرت اور اتحاد و اتفاق دوسروں کے لئے سبق آموز نہ تھا ؟ لیکن آج اس غلامانہ زندگی و ذہنیت کی وجہ سے ہم میں ان تمام خصوصیات کا فقدان ہے ۔ کانگریس کے حامیوں نے میدان آزادی میں نہایت استحکام جرات اور ہمت کے ساتھ قدم اُٹھایا ہے ۔ کانگریس اپنے ابتدائی دور میں بہت ہی گمنام رہی اور اُس کے اراکین اور کارکن سرگرم اور ممتاز نہ تھے لیکن ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہئے کہ اُس کا سبق وہی ایک آزادی تھا ۔ یہ قومی ادارہ ابھی پوری طرح سے پھلنے پھولنے نہیں پایا تھا کہ یہاں پھر وہی فرقہ بندی اور فرقہ واریت کا سوال پیدا ہوا ۔ بقول اقبال مرحوم کے

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں ؟

اور یہاں ایک فرقہ واری تفریق پیدا ہوگئی جس کے نتیجہ کے طور پر نواب سلیم اللہ خان کی تحریک پر بمقام ڈھاکہ زیر صدارت نواب وقار الملک سنہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور دوسرے سال آدم جی پیر بھائی کے زیر صدارت بمبئی میں اس کا اجلاس منعقد ہوا ۔ لیگ میں بھی اختلاف پیدا ہوگیا شفیع لیگ اور حسین لیگ کا علحدہ علحدہ قیام عمل میں آیا آخر میں وہ متحد ہوگئے ۔ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی مقتدر و احد نمایندہ جماعت ہے اُس کا اصلاحی پروگرام بھی کانگریس کی طرح ہے وہ بھی آزادی کی خواہاں ہے صرف فرق یہ ہے کہ کانگریس ایک قومی جماعت ہے اور لیگ ایک فرقہ واری جماعت جیساکہ اُس کے نام سے ظاہر ہے مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح ہندوستان کے سب سے بڑے سیاس اور مدبر ہیں اگر ہندوستان بھر میں کوئی حقیقی معنوں میں مدبر اور سیاست دان ہے تو وہ محمد علی جناح ہی ہیں مسٹر جناح نے مسلم لیگ کی نیم مردہ جماعت میں زندگی کی روح پھونک دی ۔

اب ہندوستان میں دو بڑی سیاسی جماعتیں قائم ہوگئیں دونوں نے متحدہ کوشش کی کہ ہندوستان کو آزادی ملنا چاہیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کا اعلان کیا گیا ۔ ہندوستانیوں کی

بارہا کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ انھیں ان اصلاحات سے مطمئن کرنا چاہا۔ ان اصلاحات کی رو سے انتخابی عنصر کی تعداد بڑھادی گئی۔ ہندوستانیوں کو کونسل میں شرکت کی اجازت دیگئی اور صوبجاتی حکومت میں بھی کچھ اختیارات عطا کئے گئے۔ ان اصلاحات کے بعد بھی برطانوی حاکم برابر مقتدر رہتے اور ہندوستانی اُن کے ماتحتین کی طرح خدمات انجام دیتے تھے۔ یہ اصلاحات ہندوستانیوں کے لئے ناقابل قبول تھے اُنھوں نے اس کے بعد آزادی کا پرزور مطالبہ شروع کیا برطانیہ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء جنگ عظیم میں اُلجھا رہا جنگ کے تباہ کن نتائج نے برطانیہ کو کسی قدر پریشانیوں اور مصائب میں گرفتار رکھا۔ اس وقت بھی اہل ہند کی آواز ایوان شاہی سے ٹکرائی اور انھوں نے ۱۹۱۹ء میں مانٹفرڈ اصلاحات کا اعلان کیا۔ ان اصلاحات کی رو سے امور مملکت کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ایک امور منتقلہ دوسرے امور محفوظہ اور کچھ اختیارات ہندوستانیوں کو مرکز اور صوبوں میں عطا کئے اور صوبوں میں دوعملی قائم کی گئی۔ یہاں ہندوستانیوں نے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا تھا بھلا اُن کے لئے یہ چند اختیارات کس طرح قابل قبول ہوسکتے تھے۔ ان اصلاحات کے بعد بھی ہندوستان میں سیاسی بے چینی اور انتشار پیدا ہوگیا اور ترک موالات کی تحریک کی ابتدا ہوئی اور ہر جگہ انگریزوں کا بائیکاٹ شروع کیا گیا اس سیاسی ہیجان اور ہل چل کو دیکھ کر انگریزوں نے مناسب یہ سمجھا کہ ایک کمیشن مقرر کیا جائے تاکہ ہر جگہ دورہ کرکے غیر جانب دارانہ طور پر اپنی رپورٹ معہ سفارشات کے حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کرے یہ کمیشن ۱۹۲۷ء میں سرجان سائمن کے زیر صدارت مقرر کیا گیا دو سال کی تحقیقات کے بعد کمیشن نے متفقہ طور پر رپورٹ معہ سفارشات کے حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کی۔ ہندوستانیوں نے اس کمیشن پر اعتراض کیا کیونکہ اس میں کوئی ہندوستانی عنصر شریک نہ تھا ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو ہندوستان کے حالات اور ہندوستان کے ماحول سے غیر مانوس اور ناآشنا ہوں کس طرح ہندوستان میں صحیح طور پر تحقیقات کرسکتے ہیں اور کس حد تک اُنکی سفارشات مستند قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ ہندوستانیوں نے صاف کہدیا کہ وہ اس کمیشن سے مطمئن نہیں ہیں اور اُنکی سفارشات ناقابل قبول ہوں گی اس کے بعد موتی لال نہرو کے زیر صدارت نہرو کمیٹی کا انعقاد عمل میں آیا اور نہرو رپورٹ شائع ہوئی جس میں ذمہ دارانہ حکومت Responsible government اور قلمروی درجہ Dominion Status کا مطالبہ

کیا گیا۔ اس سے انگریز چونکے اور انھوں نے ٹال مٹول شروع کی جس سے ۱۸۵۰ء کے کنیڈا کی یاد تازہ ہوئی آخر ایک عرصہ دراز کی سیاسی جدوجہد کے بعد انگریزوں نے طے کیا کہ ہندوستانیوں کو ایک ایسا طرز حکومت عطا کریں جو اُن کی معاشرت۔ ماحول، تہذیب اور فرقہ بندی کے اعتبار سے موزوں ہو کیونکہ ہندوستان میں نسلی۔ قومی۔ لسانی۔ تمدنی۔ معاشرتی اور جغرافی اختلافات بے حد ہیں۔ انھوں نے وفاق۔ Federation کو ہندوستان کے حالات اور ماحول کا لحاظ کرتے ہوئے اچھا اور موزوں طریق حکومت قرار دیا چنانچہ ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرس میں جس میں ہندوستان کے نمایندے اور والیان ریاست بھی شریک تھے وفاق کو ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا جس کا خیر مقدم سب سے پہلے مہاراجہ بیکانیر نے کیا۔ اس کے بعد دوسری کانفرس ۱۹۳۱ء اور تیسری کانفرس ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں Communal award کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بعد کافی غور و خوض کرکے انگریزوں نے ۱۹۳۵ء میں قانون حکومت ہند کا اعلان کیا جس کا نفاذ دو سال کے بعد ۱۹۳۷ء میں ہوا۔

اس قانون کی رو سے حکومت کے تین ادارے قرار دئے گئے ایک امپیریل گورنمنٹ دوسرا صوبجاتی حکومت۔ تیسرے ریاستیں اور وفاق کا اعلان کیا گیا ابتک ریاستیں اس میں شریک نہیں ہیں ریاستوں کا مسئلہ کسی قدر پیچیدہ ہے۔ مہاراجہ بیکانیر نے پہلی گول میز کانفرنس میں نہایت فراخ دلی کے ساتھ وفاق کا خیر مقدم کیا لیکن جب یہاں آئے تو غور کرکے دیکھا کہ یہ طریق حکومت ہندوستانیوں کے لئے موزوں نہیں اس لئے ریاستوں کی طرف سے مخالفت شروع ہوئی۔ کانگریس نے ابتدا میں شد و مد کے ساتھ مخالفت کی لیکن انگریزوں نے اُنھیں آٹھ صوبوں میں وزارتیں عطا کرکے منہ بند کردیا مسلم لیگ ہنوز مخالفت کررہی ہے حال میں جو پانچ مطالبات مسلم لیگ کی طرف سے شائع ہوئے تھے اُن میں سب سے پہلا مطالبہ یہ تھا کہ ۱۹۳۵ء کا قانون حکومت ہند اُن کے لئے ناقابل قبول ہے وفاق کی شرکت میں ریاستوں کا بھی سراسر نقصان ہے مالی بار ریاستوں پر بیحد پڑتا ہے علاوہ ازیں جن ریاستوں کے پاس اپنا سکہ اور ٹپہ ہے وہ غائب ہوجائیگا جس سے اُنکی خود مختاری بھی ختم ہوجاتی ہے اس لئے ریاستیں پس و پیش کررہی ہیں اب ریاستوں کو مزید ع‍‍ین سال کی مدت دی گئی ہے کہ وہ غور کریں صوبوں کی

حد تک ہندوستانیوں کو اختیارات عطا کئے گئے جس کو صوبجاتی "خوداختیاری حکومت" کہتے ہیں آٹھ صوبوں پر کانگریسی وزرار مقرر ہیں اور تین مسلم وزراتیں ہیں۔ صوبوں میں بھی پوری طرح سے ذمہ دارانہ حکومت قائم نہیں کی گئی ہے۔ گورنر کو وزرار کی نسبت بہت زیادہ اختیارات حاصل ہیں دستوری اختیارات اور ناگہانی اور اتفاقی حالات میں بھی اختیارات حاصل ہیں۔ آزادی کا کم امکان ہے۔

ہندوستان کا مستقبل حیات اجتماعی کا ایک اہم موضوع ہے اُسی وقت مستقبل کا اندازہ کیا جاتا ہے جبکہ ہم ماضی سے واقف رہیں کیونکہ مستقبل ماضی میں پنہاں ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "We look bookward in order to go forward" بیان بالا سے ہمیں واقفیت حاصل ہوگئی کہ ہندوستان کا ماضی کیا تھا اب ہم بآسانی مستقبل کی تلاش کرسکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان ایک براعظم ہے آب وہوا ور جغرافی اعتبار سے ہندوستان سب سے برتر ہے لیکن فرقہ وارانہ کشمکش اور فرقہ واریت نے ہندوستان کے مستقبل کو تاریک بنا رکھا ہے آج سے چند سال قبل ہمارا خیال تھا اور بالکل صحیح تھا کہ ہندوستان کا مستقبل شاندار اور درخشاں ہوگا لیکن اس فرقہ واریت کی زہریلی فضا نے یہاں کے حالات اور ماحول کو اس طرح مکدر کر رکھا ہے کہ ہمیں مایوس کن اور حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہندوستان ایک براعظم ہے یہاں کئی نسلیں آباد ہیں اور کئی تمدن ہیں ان حالات میں یہاں جمہوری حکومت قائم کرنا مشکل اور دقت طلب امر ہے کانگریس نے جب سے کہ اس کو آٹھ صوبوں میں وزارتیں اور اختیارات ملے ہیں قلمروی رتبہ کا مطالبہ شروع کیا انہوں نے دعوی کیا ہے کہ جس طرح کناڈا نیوزی لینڈ جنوبی افریقہ اور اسٹریلیا کو قلمروی رتبہ حاصل ہے اُسی طرح ہندوستان کو بھی قلمروی درجہ حاصل ہونا چاہئے انگریز بھی اس بات پر رضامند ہیں کہ ہندوستان کو قلمروی رتبہ عطا کیا جائے چنانچہ سرسیمول ہور نے بارہا اپنی تقاریر میں کہا ہے کہ "قلمروی رتبہ کوئی ایسی چیز نہیں جو ہندوستان کو عطا نہ کی جاسکے اور یہ اُس وقت عطا ہوگا جبکہ حالات قلمروی رتبہ لینے کے لئے ہندوستانی پیدا کریں"

اُس وقت قلمروی رتبہ مل سکتا ہے جب کہ ہندوستانی اپنے آپ کو کناڈا۔ نیوزی لینڈ اور دوسرے قلمروں کے لوگوں کی طرح حکومت کرنے کے اہل ثابت کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ آپس کے اختلافات اور کشیدگی کے

باعث ہندوستانیوں میں اس قسم کی اہلیت ظاہر نہیں ہو رہی ہے۔ ہر قدم پر نئے سیاسی تجربے ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں میں کارکردگی اور جفاکشی مفقود ہے۔ انگریزوں کا اعتراض ہے کہ اگر ہندوستانیوں کو قلمروی رتبہ دیا جائے تو وہ اُنکی تباہی اور مزید فرقہ واریت کا باعث ہوگا اور اختلافات اسقدر رونما ہوں گے کہ یہاں کے فریق ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے کیونکہ پہلے ہی سے ہندوستانیوں کی نااتفاقی اور نفاق کا سارے عالم میں ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔

۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کے بعد یہاں ایک مسئلہ رونما ہوا وہ اقلیتوں کا مسئلہ ہے اس قانون سے مسلمان اور دیگر اقلیتیں غیر مطمئن ہیں مسلمانوں کو تین صوبوں میں حکومت یا وزارتیں ملی ہیں۔ اقلیتیں اپنے حقوق اور جائداد کا تحفظ چاہتی ہیں جن کو کانگریسی پائمال کرنے کے درپے ہیں۔ اُن آٹھ صوبوں میں جہاں کانگریسی وزارتیں قائم ہیں سیاسیات کے پردہ میں انھوں نے ہندو تہذیب۔ ہندو مذہب اور ہندی زبان کا پرچار شروع کیا اور مسلمان اور دیگر اقلیتوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے شروع کئے۔ اُن کے حقوق اور جائیدادوں پر ہاتھ ڈالا گیا۔ کانگریسی وزارتوں کے اس طرز عمل سے فرقہ واری کشیدگی میں مزید اضافہ ہوا جس کا ردعمل یہ ہوا کہ کانگریسی وزارتوں کے مستعفی ہو جانے پر مسلم لیگ نے "یوم نجات" منایا۔

ہندوستان کے مستقبل کو شاندار بنانے اور قلمروی رتبہ حاصل کرنے کا صرف ایک ہی حل ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اقلیتوں کو چاہئے کہ وہ اپنی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے کانگریس میں جو یہاں کا بڑا سیاسی ادارہ ہے، شریک ہو جائیں اور کانگریس کو بھی چاہئے کہ اقلیتوں کی وحدت کو تسلیم کرے یعنی مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد معتقدر نمائندہ جماعت تسلیم کرلے بالفاظ دیگر مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی میدان میں قدم بڑھائیں۔ کارکردگی پیدا کریں اور خود میں اس قدر صلاحیت و ایثار پیدا کریں کہ معمولی معمولی اختلافات کو نظر انداز کر کے حکومت چلا سکیں۔ ہندوستان کو اپنا وطن سمجھیں اور ہندوستانیوں کی طرح سب مل جل کر زندگی بسر کریں فرقہ وارانہ کشیدگی کو دل سے دور کریں، آپس میں مذہبی رواداری پیدا کریں، اتحاد و اتفاق کا سبق سیکھیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنی پرانی عظمت و شوکت، شان و شکوہ

جاہ و جلال، دولت و ثروت، سیاست و حکومت اور اتحاد و یکجہتی کو نہیں بھولیں ان سب باتوں کے علاوہ ایک اور امر غور طلب رہ جاتا ہے وہ دفاع کا مسئلہ ہے ہر قوم اور ملک کی مرگ و زیست کا انحصار فوج پر ہے۔ ہندوستانیوں کے پاس نہ فوج ہے اور نہ وہ آڑے وقت اپنی آپ مدد کرسکتے ہیں۔ سب سے پہلے ہندوستانیوں کو چاہئے کہ فوجی کمان اپنے ہاتھ میں لے لیں اور ملک کی مدافعت کا مسئلہ اٹھائیں ورنہ بغیر قوتِ مدافعت کے قلمروی رتبہ حاصل کرنا بے سود ہوگا۔

غرض اگر مذکورہ بالا حالات یہاں پیدا ہو جائیں یعنی جذبہ قوم پرستی اور جذبہ وطن پرستی پیدا ہو جائے تو ہندوستان مستقبل قریب میں اُسی عظمت اور شان و شوکت اور جاہ و جلال کو پالے گا جو دو ایک صدی قبل اُسکی ملکیت تھی ساتھ ہی ساتھ تجارتی ترقی صنعتی ارتقاء اور قوت مدافعت کا کافی انتظام ہو اور سب سے اہم چیز یعنی فرقہ واری کشیدگی اور ناچاقی دور ہو جائے آپس میں اتحاد و اتفاق اور یکجہتی پیدا ہو جائے اور ہندوستان ایک سیاسی وحدت بن جائے تو ہم بہ بانگ دہل اعلان کرسکتے ہیں کہ ہندوستان کا مستقبل نہایت شاندار اور درخشاں ہوگا فقط

محمد شفیع الدین احمد بی۔ اے (آخری)

آخری پھول

شاخ نازک پہ تو ہے، ایک گلاب
رخ سے الٹے ہوئے ہے، اپنی نقاب

آخری پھول ھے بہار کا تو
اک سنبھالا ھے شاخسار کا تو

نازوالے عدم کی راہ گئے
خوش ادا اور خوش نگاہ گئے

اب وہ صبح و مسائے حسن کہاں
اب وہ رنگین فضائے حسن کہاں!

آہ، کوئی نہیں ترا دمساز
کون سنتا ھے درد کی آواز

لیکن اے پھول اس کا خوف نہ کر
نوحہ خواں میں ہوں تیرے بالیں پر

صبحدم تیری آہ وزاری ہے
عمر ساری یونہی گذاری ھے!

عبدالقیوم خاں باقی ام۔ اے
لکچرار ادبیات اردو

سلمیٰ ــــــــــ!

ذوق گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینہ سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

اب مضمون نگاری کے مشغلہ سے مجھے اُلجھن سی ہونے لگی ہے۔ جی گھبراتا ہے لکھنے کے نام سے۔ اس لئے میں تم کو خط لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس کو کم کروں گی۔ اب خواہ تم اس کو مضمون سمجھو یا خط۔

یہ دنیا ــــ یہ غموں اور دکھوں کی بستی ــــ یہاں تو ایک ننھے سے پھول کی سی زندگی لانی چاہئے یا پروانہ کی حیات اک شب۔ ان دونوں کی مختصر عمر دیکھو تو کتنی قابل رشک ہے۔ ایک صرف تھوڑی دیر کے لئے ہنسنے اور مسکرانے میں اپنی زندگی ختم کر دیتا ہے۔ دوسرا جل کر مرجاتا ہے۔ ایک رات کی حیات ہی کیا۔ شمع پگھلتی تھی کسی زمانہ میں۔ اس نئی روشنی کی شمع نے تو پلک جھپکانے کی بھی قسم کھائی ہے۔ آج کل تو چراغ کے نیچے ہی زیادہ روشنی رہتی ہے۔ مگر خیر۔ پروانہ تو کسی طرح ختم ہو جاتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ نہ معلوم کب سے جی رہے ہیں اور کب تک جئے جائیں گے ــــ

سلمٰی ـــــ میرے خطوط میں تم رنگینی و دلچسپی مت ڈھونڈو یہ تو تیر و نشتر ہوتے ہیں سماج کی دکھتی ہوئی رگوں کے لیے۔ جن کا منجمد خون بہتا بہتا نہیں۔

اُف تم نے کتنا بڑھا چڑھا کر مجھے مخاطب کیا ہے۔ تم نے کیا سمجھ لیا ہے مجھے ؟ انسان کے سمجھنے میں لوگ بہت غلطی کرتے ہیں۔ درحقیقت اس کا سمجھنا مشکل ہے ؎

جو نظر آتے ہیں نہیں انساں جو ہے انساں نظر نہیں آتا

تم شاعری کو محض الٹی سیدھی باتیں سمجھ کر اس سے گریز مت کرو۔ شاعر کا ایک ادنیٰ سا تخیل جو شعر کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے بڑے بڑے مضمون میں اسکی سمائی نہیں ہوتی۔ اس کے ہاتھ وہ چیز آئی ہے جو آپ کو صرف دوسری دنیا میں ملے گی۔ ہاے ـــــ تو مجھ جیسی مہمل ہستی کے لئے اپنے اتنے قیمتی الفاظ ضائع مت کرو۔ مگر تم نے کہاں سے سیکھی ہے یہ الفاظ کی مصوری ؟ خیالات کی یہ والہانہ بندش نگارش کی یہ انوکھی طرز ؟ بلا مبالغہ تم ایک مصور ہو، جذبات و حسیات کی مصور ـــ جن کو صحیح معنوں میں استعمال کرنیکی مجھ میں یقین مانو صلاحیت نہیں۔ دنیا کی نت نئی نیرنگیوں نے دل کے دیئے کو بجھا دیا ہے۔ میری زندگی کا ساز اب بجتا وجتا نہیں۔ خاطر جمع رکھو۔

خیال تو کرو ہم لوگ کتنے بے حس ہوتے جاتے ہیں۔ اپنے ابنائے جنس کا ذرا ہم میں درد نہیں۔ ہم زندگی کے قنوطی پہلو پر بھی مذاق کا رنگ چڑھانے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ دنیا ایک حزنیہ و المیہ افسانہ ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی رونے لگتا ہے۔ ایک غیر ارادی حرکت ہے یہ اس کی۔ عقل ـــ اُف یہ عقل و ہوش کی دنیا ـــــ اس کو ڈراونی سی معلوم ہوتی ہے۔ گو عقل و ہوش اس سے دور ـــــ بہت دور رہتے ہیں۔ ہم لوگ وضعداری میں مرے جاتے ہیں۔ ہر کام میں تصنع بناوٹ ہمارا شعار ہو گیا ہے۔ ہم مصنوعی چہرے بنا کر باہر نکلتے ہیں۔ ہمارا ظاہر و باطن بالکل الگ ہے تانگے اور جھٹکے میں بیٹھنے کی بھی سچ پوچھو تو ہماری اوقات نہیں۔ لیکن قرض کی موٹر میں پھرنے میں ہم اپنی شان سمجھتے ہیں۔ یہ ہماری تہذیب ہے !

اپنے غریب عزیزوں سے امراء کی محفلوں میں بات چیت کرتے ہمیں شرم دامنگیر ہوتی ہے

کہیں لوگ یہ سمجھ لیں کہ یہ بھی ہمارے عزیز ہیں۔ اس سے یہ پتہ چل جائے گا ناکہ کبھی ہم بھی ایسے ہی تھے — قدرت نے بڑے باپ کی بیٹی بنادیا' یا بڑی حیثیت والے کی اتفاق سے بیوی بنجائیں تو خود کو نہ معلوم کیا سمجھنے لگتے ہیں۔ غالباً باپ بھائی اور شوہر کو بھی اپنے حلقۂ تعارف میں اپنی اپنی خدمت اور اپنے اپنے عہدوں پر یہ فخر نہ ہوتا ہوگا جن کو بیویاں' بیٹیاں یا بہنیں اختیار کرتی ہیں۔ یعنی دوست احباب سے سلام علیک میں پیشقدمی کرنا بھی ان کے کسرِ شان ہو جاتا ہے۔ یہ غالباً وضعداری ہے! اسی میں ہماری شان ہے!! انکسار میں جو قوت ہے' خاکساری میں جو کشش و جاذبیت ہے وہ غرور میں نہیں۔ غرور تم کو دوسروں کی نگاہوں سے گرادیتا ہے۔ انکساری تمھاری عزت بڑھانے کا ایک زینہ ہے۔ جس کا دوسرا زینہ خلوص ہے۔ یہاں سے محبت حقیقی کا سراغ ملجاتا ہے۔ مجاز ہی تو حقیقت کی سیڑھی ہے۔ اگر خدا تک پہنچنا ہے تو ریاکاری کے سجدوں اور دنیا دکھاوے کی نماز سے زیادہ خلق سے حسنِ خلق کا برتاؤ رکھو۔ زبان کا صدمہ بھلائے نہیں بھولتا۔ دل ذراسی ٹھیس سے ٹوٹ جاتے ہیں یہ بغیر ہڈی کی زبان چشم زدن میں دل کے آبگینہ کو چور چور کردیتی ہے۔ اس کو قابو میں رکھو تو دنیا تمھیں سر آنکھوں پر لے گی۔ خالق کی خوشنودی مخلوق کی دلجوئی میں ہے۔ اور چیزیں ٹوٹ کر کم قیمت ہوجاتی ہیں مگر دل کا آبگینہ ٹوٹنے کے بعد قیمتی ہو جاتا ہے۔ دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اس ہرجائی کی محبت میں پڑکر اپنے جگر گوشوں کے دل کا خون کرنے سے بہتر ہے کہ تم نماز مت پڑھو۔ جس زبان سے خدا کی عبادت اور اسکی پرستش کے انمول الفاظ نکلتے ہیں اس کو تو جنت کی کلید بننا چاہئے۔ مگر تعجب ہوتا ہے یہ دیکھکر کہ اکثر ایسے ہی لوگ "ہمچو من دیگرے نیست" کے نشہ میں خلق کو اپنی حرکات وسکنات سے انتہائی دکھ پہنچاتے ہیں۔

خلق و مروت ایک جادو ہے جس سے انسان ہر دلعزیز بنجاتا ہے۔ لیکن بعض طبائع اس کی ہر دلعزیزی پر بھی خار کھاتے ہیں۔ اس میں نقائص ڈھونڈتے ہیں۔ اسکی خرابیوں کو اُجاگر کرنیکی ناکام کوششیں ہوتی ہیں۔

قلب کی بیماریاں —— اگرچہ جسمانی امراض سے زیادہ مہلک اور سخت تکلیف دہ ہوتی ہیں۔

لیکن بہت کم لوگ ہیں جن کو اپنے ان امراض کا خیال ہوتا ہے ۔ وہ تو محسوس بھی نہیں کرتے کہ یہ مرض ہے یا آسمانی رحمت ۔ اپنے عیوب کی تشخیص کا اتنا خیال نہیں رہتا جتنا اپنے امراضِ جسمانی کی تشخیص کا ۔ تمھاری جسمانی بیماری تو صرف تمھیں کو مبتلا رکھتی ہے ۔ تمھاری ہی حد تک اسکی دوڑ دھوپ قائم ہے تمھاری ہی صرف نیند حرام کر دیتی ہے ۔ لیکن تمھارے قلبی امراض ـــــ حسد، بغض، کینہ، عداوت، نفرت، غرور، تکبر، شان، میں پن، دوسروں کو ذلیل سمجھنا، دل آزاری، دلشکنی ان سے خیال تو کرو کتنے ایسے ہیں جو نالاں ہیں ۔ اس اپنے چھپتے مرض کی تشخیص کا تم کو کبھی خیال بھی ہوا ؟ اگر ابتک نہیں ہوا تو اب بھی وقت ہے ۔ اس کی چارہ جوئی کرو ۔ سنسار کی بددعا اچھی نہیں ہوتی ۔ خلق کی بے چینی میں خالق کی خلش مضمر ہے ۔

جھٹ خفا ہونا، زود رنج بننا یہ فطری امراض ہیں ۔ ان سے بچنا اپنے بس کا روگ نہیں بعض مواقع ہوتے ہی ایسے ہیں کہ انسان اگر زود رنج نہو تو دل پھٹ کر مرجائے ۔ دنیا میں صرف شادی مرگ ہی کے حادثے نہیں ہوتے ۔ یوں بھی لوگ مرجاتے ہیں ۔ ایک حد تک کوئی ظلم سہہ سکتا ہے ۔ اس سے تجاوز کر جائے تو خودداری کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے ۔ اس لئے جھٹ خفا ہونا اچھا نہیں تو برا بھی نہیں ۔

تم میرے پند و نصائح بھرے خط سے گھبرا تو نہیں جاتیں ؟ مگر تم کو نصیحت اور پھر میرے منہ یا قلم سے کیا اچھی معلوم ہوگی ۔ تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو ۔ تم خود سمجھو ۔ میں کیا سمجھاؤں تمھیں ۔ تمھیں میرے خیالات سے اتفاق ہے کہ نہیں ؟ میں بعض وقت اپنے خیالات کی روانی میں بہت بہہ جاتی ہوں ۔ یہ بڑی کمزوری ہے میری ۔ ان جذبات کی تو الفاظ میں تصویر ہی نہیں کھینچ سکتی جو تمھارے متعلق میرے دل میں موجزن ہیں ۔ بلکہ ساری دنیا آجاتی ہے میری نظروں میں ۔ اس طرح میرا تخیل بوجھل ہو جاتا ہے ۔ لیکن اگر انسان اپنے دلی جذبات کسی وجہ سے مجبور ہو کر ظاہر نہ کر سکے تو اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے دل میں جذبات ہی نہوں گے ۔ جو زیادہ سوچ سکتے ہیں وہ زیادہ بول نہیں سکتے ۔ دماغ کام میں رہے تو زبان عاجز و درماندہ رہ جاتی ہے ۔ اور جو زیادہ بک بک کرتے ہیں

ان کی عقل کو تو لگام نہیں ہوتی ۔ ہاں تو کیا کہہ رہی تھی ـــ ایک پرسکون عظیم الشان سمندر میں چھوٹی چھوٹی موجوں کی مسلسل روانی دیکھ کر کیا یہ اطمینان کیا جا سکتا ہے کہ اسمیں طوفان کبھی نہ آئے گا ؟ اور یہی کمزور موجیں کبھی پہاڑ کی طرح سر اٹھا کر چٹان جیسے ساحل سے نہ ٹکرائیں گی ؟ اگر اس قسم کے مشاہدے کا کبھی موقع ملا ہے تو تم اندازہ لگا سکتی ہو اس سے دوسری باتوں کا۔

بس اب اپنی اس دالہانہ بکواس کو ختم کرونگی ـــ کہ تمھارے ساتھ دوسرے بھی اس کو سن سن کر اکتا گئے ہیں ۔ قصہ مختصر ــ

ہزاروں حوادث ہیں یا زندگی ہے
یہی زندگی ہے تو کیا زندگی ہے

"تمہاری ناہید"

جہاں بانو بیگم ایم۔ اے (عثمانیہ)

ہماری غذا میں حیاتین کی اہمیت

ابتدائی زمانہ میں کچے پھل، ترکاری اور حیوانوں کے گوشت پر انسان گذر بسر کیا کرتا تھا اور یہی اسکی اصلی و فطری غذا تھی لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا انسان کائنات پر زیادہ سے زیادہ قابو حاصل کر کے عناصر کو اپنے قبضے میں کرتا گیا۔ اب وہ تمدن کے اُس درجہ پر پہنچ گیا تھا جہاں معاشی فرق مراتب پیدا ہوا اور معاش پر زیادہ قابو رکھنے والوں نے عیش پسندی شروع کی یہاں تک کہ حسی لذات میں بھی زیادہ سے زیادہ تنوع پسندی شروع ہوئی۔ اس کا اثر اور دوسری چیزوں کے علاوہ زیادہ تر غذا پر پڑا۔ چنانچہ سادی اور مقررہ غذاؤں کے بجائے مرکب اور مختلف النوع غذائیں وجود میں آئیں۔ ہر چیز میں افراط و تفریط شروع ہوئی۔ فطری غذا کی جگہ مصنوعی غذا نے لے لی۔ مزے کی خاطر انسان نے غذا کی روح یا دوسرے الفاظ میں "جوہر حیات یا حیاتین" کو بہت بڑی حد تک اپنی غذا سے گھٹا دیا۔

لیکن بہت جلد اس کو بعض تلخ تجربات ہوئے۔ چنانچہ مفکروں نے ہر چھوٹے چھوٹے واقعہ پر غور کرنا شروع کیا۔ یہی وہ چیز تھی جس سے وہ فطرت کی بہت ساری چیزوں کے رموز اور اسرار معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ حیاتین بھی ان میں سے ایک تھے جن کا انکشاف واضح طور پر اسی صدی کی ابتداء

میں ہوا۔ اوران کی تحقیق کا سہرا ایک انگلستانی سائینس دان ھاپ کنز (Hopkins) کے سر ہے
یہاں اُن واقعات کا مختصراً بیان کردینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا جن کے باعث مفکروں نے حیاتین کی
تحقیق کی طرف توجہ کی۔

اٹھارہویں صدی میں جہازراں جب لمبے سفر کو جاتے تھے تو اپنے ساتھ خوردونوش کی ایسی اشیاء
رکھتے جو زیادہ دن تک خراب نہ ہونے پائیں مثلاً روٹی، چاول، گیہوں، باسی گوشت اور دال وغیرہ۔
نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اکثر وہ ایک خاص قسم کی بیماری میں مبتلا ہوجاتے تھے۔ جسکی وجہ سے اُنکے مسوڑھے پھول
جاتے اور اُن سے خون بہنے لگتا تھا نیز پاؤں متورم ہوجاتے اوران میں درد ہونے لگتا تھا۔ کوئی دوا اس
مرض پر کارگر نہ ہوتی تھی۔ لیکن کپتان کوک سب سے پہلا شخص تھا جس نے تازہ پھل اور ترکاریاں کھلاکر
جہازرانوں کو اس بیماری سے نجات دلائی۔

انقلاب روس کے زمانہ میں جب غذا نایاب ہوگئی تھی ہسپتالوں میں ہڈیوں سے جلاٹین نکال کر
اس کا شوربا مریضوں کو دیا جاتا تھا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اس شوربے کے استعمال سے
بدہضمی اور اسی قسم کے بہت سے امراض، جو فتورِ فعلیت معدہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں تمام مریضوں کو
لاحق ہوگئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جسم میں حیاتین کی کمی کا نتیجہ تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں بھی اسی قسم کے
مشاہدات ہوئے۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد سے سائینس کے اس شعبہ نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اور
اب غذا کا سوال ساری دنیا میں ایک دلچسپ، اہم اور مفید مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ
اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں تین " نوبل انعام " اُن سائینسدانوں کو دئے گئے جو حیاتین پر
تحقیقاتی کام کررہے تھے۔ تقریباً پچیس سال کی لگاتار دماغی کاوشوں کے بعد حیاتین کی پوری اصلیت
معلوم ہوئی ہے، اور اب ہم اس قابل ہوگئے ہیں کہ مختلف اشیاء سے کئی ایک حیاتین اصلی حالت
میں علحدہ حاصل کرسکیں۔

جو غذا ہم کھاتے ہیں آنتیں اس میں سے ان اجزاء کو جذب کرلیتی ہیں جو ہماری جسمانی عمارت
کے بنانے میں ممد و معاون ہونیکے علاوہ نہایت ہی ضروری ہوتی ہیں۔ یہ اجزاء خون کی نالیوں کے ذریعہ

ان اعضا تک پہونچا دی جاتی ہیں جن کو ان کی ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن جسم کو بنانے والی اشیاء جو پروٹین اور معدنی نمک کہلاتی ہیں تقریباً ویسی ہی بے جان ہوتی ہیں جیسی کہ مکان کی تعمیری اشیاء ۔ وہ خود بخود جسم کے مختلف حصوں میں داخل نہیں ہوسکتیں بلکہ اُن کو معماروں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ جسم کا سب سے بڑا معمار ہماری قوت حیات ہے جس کے کئی مددگار ہیں ۔ ان مددگاروں میں سے بعض مددگار "حیاتین" کہلاتے ہیں ۔ یہ نام ان کی اسی خاصیت کی بنا پر انھیں دیا گیا ہے ۔

حیاتین جسم کے بنانے اور اس کی تعمیر میں تقریباً وہی کام انجام دیتے ہیں جو کسی مکان کے بنانے میں سنگتراش، خشت ساز، اور نجار انجام دیتے ہیں ۔ ان کارکنوں کے ناموں کی طرح حیاتین کے بھی نام ہیں ۔ یہ حیاتین' ا ' ب' ج ' د ' اور ہ ' سے منسوب کئے جاتے ہیں ۔ جس طرح سنگ تراش پتھر جماتا خشت ساز اینٹ رکھتا اور بڑھئی کھڑکیاں اور دروازے تیار کرتا ہے اور یہ سب ملکر ایک ہی عمارت کی تکمیل کرتے ہیں ۔ اسی طرح یہ مختلف حیاتین بھی ہمارے جسم میں مختلف افعال انجام دیتے ہیں ۔ اور یہ سب کے سب ملکر ہمارے جسم کی بالیدگی اور اُس کے وجود کو قائم رکھتے ہیں ۔

یہ تمام حیاتین معہ ان تعمیری اجزاء کے جن سے ہمارا جسم تعمیر ہوا ہے صرف صحیح غذا ہی میں پائے جاتے ہیں ۔ لیکن اگر غذا ناقص ہو تو نہ اس میں ایسے تعمیری اجزاء ہوں گے اور نہ حیاتین جو جسم کے نشوونما اور مناسب تعمیر کے لئے کافی ہوسکیں ۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جسم کے بعض حصے اور اعضاء صحیح طور پر اور مکمل نشوونما نہیں پاسکیں گے ۔ اور وہ کام انجام نہیں دے سکیں گے جن کا انجام دینا مطلوب تھا ۔ جس طرح ناقص تعمیری اشیاء یا غیر ماہر معماروں کی وجہ سے کسی مکان کی چھت تڑخ جاتی ہے اور پانی اندر رسنے لگتا ہے ۔ اسی طرح ہڈیاں جن کا کام جسم کو سدھارنا ہے خم ہو جائینگی یا ٹوٹ جائینگی ۔ دانت جن کا کام غذا چبانا ہے ناکارہ ہو جائیں گے یا ٹوٹ جائیں گے ۔ پٹھے ڈھیلے پڑ جانے کی وجہ سے ہاتھ پیر کھیل کود اور دوسرے کاموں کے قابل نہ رہیں گے ۔ پھیپھڑے جن کا کام جسم کو آکسیجن بہم پہونچانا ہے کمزور ہو جانیکی وجہ سے اپنا پورا کام انجام نہ دے سکیں گے ۔ معدہ اور آنتیں جن کا کام غذا کا ہضم کرنا، تحلیل کرنا اور فضلے کو جسم سے خارج کرنا ہے، بہت کمزور ہو جائیں گے ۔ اور اپنا کام پورا نہ کرسکیں گے ۔ مختصر یہ کہ ہماری ناقص غذا متعدد مہلک بیماریوں کا

باعث ہوگی۔

حیاتین ۱ ۱۸۸۸ء میں سوئٹزرلینڈ کے ایک سائینسدان لیونن (Lunin) نے یہ تبلایا کہ کامل غذا میں ایک نامعلوم کیمیائی شے کی سخت ضرورت ہے۔ اور لندن میں ۱۹۱۰ء میں ہاپ کنس بھی ذرا تفصیلات سے اسی نتیجہ پر پہونچا۔ اور اس کے چند سال بعد ۱۹۱۵ء میں امریکہ کے دو سائنسدان مک کالم (Mccallum) اور ڈے وس (Davis) نے تبلایا کہ غذا میں کم از کم دو حیاتینوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ۱۹۲۸ء میں سویڈن کے ایک سائینسدان ایولر (Euler) نے یہ نتیجہ نکالا کہ کیروٹین (Carotene) ان نامعلوم حیاتینوں کا نعم البدل ہوسکتا ہے۔ اسی طرح انگلستان میں مور (Moore) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جانور اپنے جسم میں کیروٹین کی مدد سے حیاتین جمع کرتے ہیں۔ اور بالآخر سوئٹزرلینڈ کے سائینسداں کیرر (Carrer) نے ۱۹۳۱ء میں حیاتین کا کیمیائی ضابطہ معلوم کرلیا۔

یہ حیاتین پودوں کے سبز پتوں پر دھوپ کے عمل سے تیار ہوتا ہے۔ اور وہ جانور جو سبز پتے کھاتے ہیں ان کے جسم میں حل شدہ حالت میں چربیوں میں موجود رہتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کی کلیجی، گردے، اور دوسرے اعضاء میں بھی محفوظ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیجی حیاتین ۱ کا سب سے بڑا مخزن ہے۔

تجربوں سے منکشف ہوا ہے کہ پودوں میں جو زرد رنگ سبزی کے ساتھ ملا ہوا کیروٹین کا ہوتا ہے وہ کیمیائی اعتبار سے حیاتین ۱ سے متعلق ہے۔ گاجروں میں زرد رنگ اسی کیروٹین کا ہوتا ہے جو حیاتین ۱ کا ایک عمدہ ماخذ ہے چند سال پیشتر دو سائینسدانوں نے یہ حیاتین خالص حالت میں علحدہ کیا ہے۔ کیروٹین جس سے یہ حیاتین حاصل کیا گیا ہے، بازار میں بہت زیادہ قیمت سے بکتا ہے۔ یعنی اسکے ایک گرام کی قیمت تقریباً چالیس روپیہ ہے۔ اور یہ مقدار پندرہ سو سے زیادہ اشخاص کے لئے کافی ہوتی ہے۔

اس حیاتین کا سب سے پہلا اثر تو ان غشائے مخاطی (Mucaus Membranes) پر ہوتا ہے جو پپوٹے، ناک، نرخرے، معدے، آنتوں اور مثانے کی استرکاری کرتے ہیں۔ اور اس کی کمی ان کو جلا کر

خشک کر دیتی ہے۔ جس سے جلد صحت مند اور پاک و صاف حالت میں نہیں رہ سکتی۔ نتیجتاً مختلف امراض کے جراثیم مثلاً ملیریا، ٹائی فس وغیرہ بآسانی جسم میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ حیاتین جسم کے نشو و نما اور بالیدگی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی ضرورت بڑوں کی بہ نسبت چھوٹے بچوں کو زیادہ ہوتی ہے۔ حیاتین ا حیوانات کے دودھ میں بھی موجود رہتا ہے۔ لیکن ایسی گائیں اور بھینسیں جنھیں سبز چارہ نہیں دیا جاتا یا جنھیں خشک اور جھلسی ہوئی گھاس دی جاتی ہے، انہیں حیاتین ا کافی میسر نہیں آتے اسی لئے خود اُن کی حالت ابتر ہو جاتی ہے۔ اور ان کے دودھ میں بھی حیاتین بہت ہی کم پائے جاتے ہیں۔ ایسا دودھ چھوٹے بچوں کے لئے مفید نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ مائیں سبز ترکاریاں اور حیاتین ا رکھنے والی دوسری غذائیں کھایا کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کے بچے پیدائش کے وقت بہت کمزور رہیں گے، اور شیر خواری کے زمانے میں بھی جبکہ اُن کا انحصار ماں کے دودھ پر ہوتا ہے بیماری کی طرف مائل ہوں گے۔ اور اسی طرح نتیجتاً ان کی موت واقع ہو جائیگی۔ ہندوستان میں شیر خواری کے زمانے میں اتنی کثیر تعداد میں بچوں کے کمزور پیدا ہونے اور کثیر تعداد میں فوت ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کی مائیں ایسی غذائیں نہیں کھاتیں جن سے اُن کو اس حیاتین کی کثیر مقدار میسر آسکے ہماری طرح پرندوں کو بھی اپنی صحت اور اپنے بچوں کے لئے حیاتین ا کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ حیاتین انڈوں کی زردی میں محفوظ کئے جاتے ہیں تاکہ نمو پانے والے چوزے کو اس کی کافی مقدار میسر آسکے اور وہ انڈے سے نکلنے کے بعد قوی اور مضبوط رہ سکے لہذا انسان کے لئے انڈا اس حیاتین کا دوسرا عمدہ ماخذ ہے

حیاتین ا کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ ہمارے جسم کو متعدی امراض سے بچاتا ہے۔ آنکھ، ناک، کان، پھیپھڑے، معدے اور آنتوں کی بیماریوں کے علاوہ "شب کوری" (رات کو نہ دکھائی دینا) کا عارضہ بھی اسی حیاتین کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یورپ کے سائنسدان متعدد تجربات سے اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ پچاس فی صد بچوں کا اندھا پیدا ہونا یا بعد میں بینائی کھو دینا اسی حیاتین کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور شب کوری کے علاج میں اس حیاتین کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی کمی سے جو دوسرے امراض پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ آلات تنفس کی خرابی، نزلہ، زکام، اشتہا کی کمی، سنگ مثانہ اور امراض گردہ ہیں۔

متعدد محققین نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ یہ حیاتین نہ صرف متعدی امراض اور مستذکرہ بالا بیماریوں کو روکتا ہے بلکہ ان کا ازالہ کرنے کے علاوہ اگر جسم میں زیادہ مقدار میں موجود ہو تو انسان کی طویل العمری کا بھی ذمہ دار ہے۔ اسی بنا پر ہماری غذا میں اس حیاتین کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اور صحت و قوت کو اچھی حالت میں رکھنے کے لئے نہ صرف دوران بالیدگی میں اسکی کافی مقدار کی ضرورت ہے بلکہ ہر زمانے میں اس کا لحاظ بہت ضروری ہے۔

ہندوستان میں عام طور پر سبزیاں پکانے کا جو طریقہ رائج ہے۔ اُس سے اس حیاتین کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ لیکن سبزی کو معمولی طور پر پکانے سے یا نیم جوش دینے سے یہ حیاتین ضائع نہیں ہوتا البتہ زیادہ دیر تک پکانے سے اور ہوا میں کھلا چھوڑنے سے یہ ضائع ہو جاتا ہے۔ چاول میں اس حیاتین کی بہت تھوڑی سی مقدار پائی جاتی ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ گرنی میں چھلکا نکلوانے اور پکانے سے پیشتر دھونے سے غائب ہو جاتی ہے۔ نہ صرف حیاتین ا بلکہ دوسرے حیاتین بھی جو اس میں پائے جاتے ہیں اس طرح پکانے سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چاول بیمار کے لئے بہت ہی ناقص قسم کی غذا ہے۔

حیاتین ا (سبز پتے کھانے والے جانوروں کی) کلیجی، مچھلی کے تیل (کاڈ لیور آئیل) انڈے، گوشت، گردے، گھی، مکھن اور دودھ میں پایا جاتا ہے۔ اور ترکاریوں میں پالک، آبی سلاد، سوجی، گوبھی، شلجم، چقندر، مولی اور بانس کے پتوں میں۔ گاجر، کرم کلہ، ٹماٹے، اور مکئی وغیرہ میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

حیاتین ب | ۱۸۸۰ء میں جاپانیوں کا ایک جنگی جہاز بہت طویل سفر کر رہا تھا۔ چند دن بعد ملاحوں میں ایک خاص قسم کی بیماری پیدا ہوئی۔ اور ملاحوں کی ایک معتدبہ تعداد نذر اجل ہو گئی۔ اس جہاز کے ایک بحری ڈاکٹر ٹکاکی (Takaki) نے اس بیماری کی وجہ کو ناقص غذا پر محمول کیا چنانچہ دوسرے بیمار ملاحوں کو گوشت، مچھلی، انڈے وغیرہ بطور غذا کے دئے جانے لگے، اور بہت جلد اس علاج سے اچھے ہو گئے۔ یہ نامعلوم مرض بری بری (Beri - beri) تھا جو بدقسمتی سے اب بھی جاپانیوں میں

پایا جاتا ہے۔

سنہ ۱۸۸۶ء میں آئیکمان (Ejik man) نامی ایک مشہور ڈچ سائینسداں نے جاوا میں مشاہدہ کیا کہ اُسکے تجربہ خانے کی مرغیوں میں ایک خاص قسم کی بیماری پھوٹ پڑی ہے بہت دنوں کی کد و کاوش کے بعد اُس نے یہ معلوم کیا کہ یہ مرض مرغیوں میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ ان کو مشین سے صاف کئے ہوئے یا بغیر بیج کے چاول دئے جائیں اس مرض کا نام اس نے " پالی نیوریٹز " رکھا۔ پس اس تحقیق سے یہ نتیجہ نکالا گیا تھا کہ چاولوں کے چھلکوں یا بیج میں ایک ایسی" ضروری یا لازمی شئے " موجود ہے جو مرغیوں کے اس مرض کو روکتی ہے۔ بعد میں اس " ضروری شئے " کا نام فنک (Funk) نامی سائینسدان نے حیاتین یا (Vitamin) رکھا۔ اس انکشاف کے تقریباً پندرہ سال بعد ھاپکنس نے متعدد تجربے کئے اور بالآخر سنہ ۱۹۰۶ء میں اس نے اس حیاتین کی حقیقت معلوم کر لی۔

حیاتین ب پودوں کے پتوں میں موجود رہتا ہے۔ لیکن ان کے بیجوں اور پھلوں میں خاص طور پر زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہ پودوں سے جانوروں اور انسانوں کی غذا کی شکل میں پیٹ میں داخل ہو کر تحلیل ہو جاتا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ ان اعضاء کو پہونچتا ہے جو دوسرے اعضاء سے کام لینے کا فعل انجام دیتے ہیں۔ اس لئے دماغ، قلب، جگر، گردہ، اور اعضائے ہاضمہ میں اس کی بڑی مقدار موجود رہتی ہے۔ اگر انسان حیوانات کے ان اعضاء کو بطور غذا استعمال کریں تو وہ حیاتین ب کے اچھے ماخذ ہوتے ہیں۔ حیاتین ا کیطرح یہ بھی جانوروں کے دودھ اور پرندوں کے انڈوں میں پایا جاتا ہے کیونکہ ان کے بچوں کی نشو و نما کے لئے یہ ضروری ہے۔ لہذا انسان کے لئے دودھ اور انڈے حیاتین ب کے عمدہ ماخذ ہیں۔

یہ حیاتین چربی، تیل، اور سفید شکر میں نہیں پایا جاتا، لیکن سرخ شکر اور شہد میں اس کی تھوڑی سی مقدار موجود ہوتی ہے۔ اس حیاتین کے بڑے بڑے ماخذ حسب ذیل ہیں :-

(۱) ہر قسم کے اناج :- گیہوں، جئی، چولم، اور راگی۔

(۲) دالیں :- مٹر، لوبیا، سیم وغیرہ کے بیج اور مختلف دالیں۔

(۳) ہر قسم کے سخنتے (Nuts)

(۴) سبزیاں :- پالک، شلجم کے پتے، مولی کے پتے، سلاد، آبی سلاد، ٹوماٹو، چقندر، گاجر کرم کلہ، گکرونڈا، اور پیاز،

(۵) دودھ، انڈے، کلیجی، اور حیوانات کے دوسرے غدودی اعضاء۔ خمیر اور اخروٹ۔

حیاتین ب :- حالیہ تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ "حیاتین ب" ایک پیچیدہ شئے ہے جو چند اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ اجزاء حیاتین ب۱، ب۲، ب۳، ب۴، ب۵ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ "حیاتین ب۱" تو وہ جزء ہے جو مرغیوں میں "پالی نیوریٹیز" اور انسانوں میں مرض "بری بری" کو روکتا ہے اور ب۲، جزء ہے جس کا تعلق ناقص تغذیہ کی ایک خاص صورت سے ہے۔

حیاتین ب۱ کی کمی کی وجہ سے ایک خاص قسم کی عصبی بیماری "بیری بیری" پیدا ہوتی ہے جس سے قوت حرکت صلب ہو جاتی ہے اور ابتداء میں مریض تھکاوٹ، سستی اور ٹانگوں میں درد محسوس کرتا ہے لیکن بعد میں یہ سکتہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایک عرصہ سے یہ مرض جاپان، چین، ہندوستان اور جزیرہ نما ملایا میں موجود ہے۔ اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے یہ بیماری بے بیج کے چاول، میدے کی روٹی، چینی، پنیر، خشک پھل، محفوظ گوشت۔ نقلی گھی، جیسی غذاؤں پر انحصار کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف تازہ پھل اور ایسی غذائیں جن میں حیاتین ب۱ موجود ہو اس بیماری کو روکتے ہیں۔

اس حیاتین کی اہمیت پر "برٹش میڈکل ریسرچ کونسل" کی رپورٹ میں ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے "یہ بات اب بالکل مسلمہ بن گئی ہے کہ حیاتین ب۱ نہ صرف مرض بری بری کی مدافعت کرتا ہے بلکہ نوعمری میں جسم کی نشو و نما کا بہترین مددگار ہے۔ اس کا تجربہ ننھے ننھے چوہوں پر کیا گیا۔ بالغوں میں معمولی وزن اور تندرستی برقرار رکھنے کے لئے اس کی مناسب مقدار نفع بخش تسلیم کر لی گئی ہے"

حیاتین ب۱ جسم کی تعمیر و مرمت کے کام آتا ہے لیکن یہ چند خاص کام بھی انجام دیتا ہے۔ (۱) دماغ اور اعصاب کو تندرست اور مضبوط رکھتا ہے۔

(۲) قلب، جگر، ہاضم غدود اور گردوں کو تندرست رکھتا ہے۔

(۳) جسم کی آنتوں اور عضلات کو تندرست بناتا ہے۔

(۴) اشتہا اور ہاضمی فعل کو برقرار رکھتا ہے۔

اس حیاتین کے استعمال سے ہاضمہ درست ہوتا ہے اور بھوک باقاعدہ ہوتی ہے اور اس کی کمی کی وجہ سے بدہضمی، اسہال اور قبض کی شکایت ہو جاتی ہے۔ عضلات کمزور اور اعصاب زود حس ہو جاتے ہیں۔ جسم کمزور اور لاغر ہو جانیکی وجہ سے متعدی امراض کی مدافعت نہیں کر سکتا۔ اور مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس حیاتین کا زیادہ ذخیرہ عرصہ تک جسم میں رکھا نہیں جاسکتا۔ مثلاً چوہوں اور کبوتروں میں حیاتین ب کی مقداریں چار ہفتوں میں ختم ہو جاتی ہے اس لئے حیاتین کا روزانہ خرچ ہونا اور جسم میں داخل ہوتے رہنا اچھی صحت کی ضمانت ہے۔

ہندوستان میں لاکھوں آدمی۔ چاول پر گذر کرتے ہیں۔ بعض تو اس کو کوٹ کر اس کا چھلکا علیحدہ کر دیتے ہیں، بعض صاف کرنے کے لئے اسے گرنی بھیج دیتے ہیں لیکن اکثر لوگ صاف کئے ہوئے چاول بازار سے خرید تے ہیں۔ اور تقریباً سب کے سب اس کو خوب دھو کر استعمال کرتے ہیں۔ غرض یہ سب اس طرح چاولوں سے حیاتین کی رہی سہی مقدار ضائع کر دیتے ہیں۔ جتنے بھی اناج ہندوستان میں پائے جاتے ہیں ان میں چاول حیاتین ب کے لئے سب سے زیادہ ناقص ہے۔ یہ حیاتین چاول کے دانوں کے بیرونی پرت میں بہت ہی قلیل مقدار میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاول کو ٹنے سے، دھونے سے یا جوش دیکر پیچ پھینک دینے سے حیاتین ب ضائع ہو جاتا ہے۔

حیاتین ب مختلف اناجوں اور خاص کر انڈے کی زردی اور چاول کے خول میں پایا جاتا ہے۔

حیاتین ب ۲ ۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں اس حیاتین کا پتہ چلا۔ دو نامور سائینسدانوں اسمتھ اور ہنڈرک نے تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ "حیاتین ب" میں دوسرا قائم الحرارت جز موجود ہوتا ہے جو حیوانوں کی بالیدگی اور ان کے تغذیہ کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بعد کی تحقیقات میں گولڈبرگر نے تبلایا کہ اس حیاتین کی کمی سے مرض پلاگرا ( ) وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ ایک غیر متعدی مرض ہے جو اٹلی، رومانیہ، بلقان اور ریاست ہائے امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ اس مرض کا تعلق نظام عصبی، غذائی نالی، اور

جلد سے ہے۔ یہ مرض غریبوں میں زیادہ ہوتا ہے جنکی غذا اناج اور سبزیوں کی حد تک محدود ہوتی ہے اور جن میں حیاتین ب۲ نہیں پایا جاتا۔ اس حیاتین کی کمی کی وجہ سے خارش اور دوسرے جلدی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ یہ حیاتین دراصل دو حیاتینوں کا مجموعہ ہے۔ ایک کا کام بیماری کا انسداد کرنا ہے اور دوسرے کا کام نشو و نما میں مدد دینا ہے۔ نشو و نما میں مدد دینے والا حیاتین دراصل "لیکٹو فلیون" Lactoflovin ہے جو نارنجی بھورے رنگ کا ہوتا ہے۔ جسے سب سے پہلے "کون" (Khun) نامی ہیڈل برگ کے سائنسداں اور اُس کے ہمکاروں نے تیار کیا تھا۔ اور انہیں لوگوں نے سنہ ۱۹۳۶ء میں اس حیاتین کو مصنوعی طور پر تیار کیا۔

حیاتین ب۲ کا سب سے عمدہ ماخذ خمیر ہے چکنائی کا گوشت، انڈے کی زردی اور دودھ پلانے والے جانوروں کا جگر ہے۔ لیکن مختلف مقداروں میں یہ ٹماٹو، مٹر دودھ اور انڈوں میں پایا جاتا ہے۔

حیاتین ب۳، ب۴، ب۵۔ یہ حیاتین انڈے کی زردی اور گیہوں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کی پوری تفصیلات تحقیق کے منزل تک نہیں پہونچی ہیں۔ فی الوقت صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ حیاتین ب۴ اور ب۵ سے جسم میں توانائی اور وزن قائم رہتا ہے۔ اور "ب۴" زیادہ تر چوہوں کی غذا سے بہت تعلق رکھتا ہے۔ چوہوں کو اپنی پرورش کے لئے حیاتین ب۳ اور ب۴ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور اسی طرح غالباً پرندوں کو بھی حیاتین "ب۴" کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ لیکن انسان جو تمام انواع حیوانی میں حیات کا سب سے عمدہ اور مکمل مظہر ہے۔ اُسے ان تمام حیاتینوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

حیاتین ج ابتداً یہ خیال کیا جاتا تھا کہ غذا میں ایک شئے ایسی موجود ہے جو ایک خاص مرض اسکربوط یا داء الحضر (Scurvy) کو روکتی ہے۔ ملاحوں میں یہ مرض ایک وبا کی صورت میں پایا جاتا تھا۔ اکثر یہ اُن کے طویل سفر کے دوران میں یا غذا میں تازہ ترکاریاں میسر نہ آنے سے پھوٹ پڑتا تھا۔ واسکوڈی گاما، پرتگال کا ایک مشہور ملاح۔ جب ہندوستان کے سفر پر نکلا تو راہ میں اسکے (۱۶۰) ساتھیوں میں سے (۱۰۰) اس مرض اسکربوط کے نذر ہو گئے۔ اس مرض کے علامات بتدریج نمودار

ہوتے ہیں سستی زیادہ پیدا ہوتی ہے ۔ مریض کا وزن گھٹنے لگتا ہے ۔ اور رنگ زرد ہو جاتا ہے ۔ خون میں کمی اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے ۔ جوڑوں میں سخت تکلیف ہوتی ہے اور اکثر دانت بھی گر جاتے ہیں ۔ جسم میں سرخ جسیموں کی کمی کیوجہ سے جلد پر سرخ رنگ کے یا بنفشی رنگ کے دھبے پڑ جاتے ہیں ۔ اس بیماری کی دوا آج سے تین سو سال پیشتر بھی بعض لوگوں کو معلوم تھی ۔ سر جیرڈ ہاکس نے جس نے مغربی افریقہ اور امریکہ میں بردہ فروشی کی بنیاد ڈالی تھی ۔ اس مرض کا علاج لیمو اور سنتروں کے رس سے کیا تھا ۔ چنانچہ ایک برطانوی بیڑے کا کپتان لنڈ (Lind) نے بھی کچھ تفصیلات سے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا ۔

جنگ عظیم کے زمانے میں جب ہندوستانی فوجیں عراق میں تھیں یہ بیماری بڑے زور سے پھوٹ پڑی تھی ۔ لیکن بہت جلد اس پر قابو پا لیا گیا ۔ اس کے بعد سپاہیوں کی غذا میں اس چیز کو ملحوظ رکھا گیا کہ اُس میں سبزی، ترکاری یا پھلوں کا کچھ نہ کچھ جز ضرور ہوا کرے ۔ دال کو پکانے سے پہلے اُسے گرم مرطوب ہوا میں رکھکر اُگا لیا جاتا تھا اور پھر اسے ساگ پات کے ساتھ ملا کر کھانے کے لئے سپاہیوں کو دیا جاتا تھا

حیاتین ج تمام تازہ سبز ترکاریوں، سبز خوردنی پتوں اور اکثر تازے پھلوں اور میووں میں کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے ۔ پودوں کے بیجوں اور خشک ترکاریوں میں یہ حیاتین نہیں پایا جاتا ۔ جیسے چاول، گیہوں، مکئی، اور چونرے (Nuts) لیکن اگر اناج کو پانی سے تر کیا جائے اور انھیں پھوٹنے کا موقعہ دیا جائے تو ان کے دانوں میں یہ حیاتین پیدا ہو جاتا ہے ۔ اگر سبز ترکاریاں اور میوے کم یاب ہوں تو حیاتین ج حاصل کرنے کا یہ ایک نہایت اچھا طریقہ ہے ۔

جب حیوانات ایسی تازہ سبزیاں اور پتے کھاتے ہیں جن میں یہ حیاتین موجود ہوتا ہے تو یہ ان کے جسم میں حل ہو کر خون اور جگر میں محفوظ ہو جاتا ہے ۔ شیر اور چیتے جیسے گوشت خوار درندے اس حیاتین کو اپنے شکار کردہ حیوانات کے خون اور جگر سے حاصل کرتے ہیں ۔ یہی حال گوشت خوار قوموں کا بھی ہے جیسے اسکیمو ۔ یہ حیاتین جانوروں کے دودھ میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ یہ گائے، بھینس اور بکری وغیرہ کے دودھ میں موجود رہتا ہے بشرطیکہ ان کا چارہ تازی سبز گھاس یا پتوں پر مشتمل ہو ۔ لیکن اگر ان جانوروں کو سبز گھاس میسر نہ آئے بلکہ خشک گھاس پر رکھا جائے تو ان کے دودھ میں حیاتین ج بہت ہی قلیل

مقدار میں موجود ہوگا۔ ایسی حالت میں ان کا دودھ شیر خوار بچوں کے لئے مفید نہ ہوگا۔
یہ حیاتین حیوانی اور نباتی چربیوں جیسے گھی، مکھن، مختلف تیلوں، خشک غذاؤں، جیسے شکر، میدہ، آٹا، چاول وغیرہ میں نہیں پایا جاتا۔ یہ حرارت سے بآسانی تباہ ہوجاتا ہے۔ چنانچہ دودھ یا ترکاریوں کو اُبالنے سے یا زیادہ پکانے سے ان کی بہت بڑی مقدار غائب ہوجاتی ہے۔ ہندوستان میں بچوں کی پرورش اور خصوصاً ان بچوں کی پرورش جن کو ماں کا دودھ میسر نہیں آتا اُبالے ہوئے اور بہت زیادہ جوش دئے ہوئے دودھ سے کیجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیاتین ج کی وجہ سے بچے بیمار پڑ جاتے ہیں۔ اور ہمیشہ لاغر اور نحیف رہتے ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کو پھلوں کا رس جیسے نارنگی، لیمو، ٹماٹو اور ترکاریوں میں شلجم وغیرہ کا رس دیا جائے۔

جسم کو حیاتین ج کی ضرورت حسب ذیل اغراض کے لئے ہوتی ہے۔

(۱) خون کو صاف اور صحیح ترکیب میں قائم رکھنے اور اسکورگوں سے رسنے سے بچانے کے لئے۔
(۲) عموماً پورے جسم اور خصوصاً ہڈیوں اور دانتوں کی تعمیر میں دوسرے حیاتین کی مدد کے لئے۔
(۳) آنتوں کو صحت مند رکھنے کے لئے۔
(۴) جراثیم کی مدافعت میں جسم کو مدد کردینے کے لئے۔

حیاتین ج چونے (کیلسیم) اور فاسفورس کے جسمانی اجزاء کو صحیح تناسب میں رکھتا ہے۔ یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اگر حیاتین ج نہ ہو تو جسم میں کیلسیم اور فاسفورس کی کمی ہونے لگتی ہے۔ جب ہڈیوں میں کیلسیم کی کمی ہوجائے تو اُن میں خم پیدا ہوجاتا ہے۔ حمل کے دنوں میں اور وضع حمل کے بعد ماں کو حیاتین ج کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ایام حمل میں اپنا جسم بنانے کے لئے بچہ ماں کے جسم سے فاسفورس اور کیلسیم کی بہت زیادہ مقدار حاصل کرلیتا ہے۔ اس لئے اس زمانے میں ماں کو ان کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ حیاتین حاملہ کو پوری مقدار میں میسر نہ آئیں تو نہ صرف ماں کی تندرستی برباد ہوجاتی ہے بلکہ بچہ بھی مریض اور لاغر پیدا ہوتا ہے ایسے بچوں میں ک ح (Riekets)' لاغری' اور دانتوں کے امراض پیدا ہوجاتے ہیں۔

حال ہی میں حیاتین ج پر بہت کچھ تحقیقاتی کام ہوا ہے اور یہ معلوم ہوگیا ہے کہ "ایس کوربک اسیڈ" (Ascorbic Acid) دراصل حیاتین ج کی ایک خالص اور قلمی شکل ہے۔ اس اسیڈ کو حاصل کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ "زینٹ گی اور گی" ہنگری کے ایک سائینسدان نے اس کو مرچ کی ایک خاص قسم سے حاصل کیا ہے اور دوسرے محققین نے اس پر تجربے کرکے اس کا کیمیائی ضابطہ بھی معلوم کرلیا ہے۔ "برمنگھم" میں آر۔ ڈبلیو۔ ہربرٹ (R. W. Herbert) اور اُس کے ساتھیوں نے اس اسیڈ کو یعنی حیاتین ج کو مصنوعی طریقہ پر تیار کرلیا ہے۔ وہ زمانہ دور نہیں جب ہم بہت جلد سبزیوں اور ترکاریوں کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

ذیل میں ایسی ترکاریوں اور سبزیوں کے نام دئے جاتے ہیں جو حیاتین ج میں کامل ہیں۔
تازہ کچا کرم کلہ، پالک، کچے مٹر یا دالیں، شلجم، تازہ لیمو کا رس، نارنگی، سنترے، ٹوماٹو کا رس؛ تازہ گاجر، سلاد، شلجم کے پتے، شکر قند کا رس، کچے آلو، نارنگی اور سنترے کا پوست، اناس کا رس وغیرہ

حیاتین د | ۱۹۱۹ء میں ایک روسی سائینسدان نے یہ دکھلایا کہ ایک بیماری ک ح (Riekets) جس میں ہڈیاں نرم ہو کر ٹیڑھی ہو جاتی ہیں، غذا میں کوئی تبدیلی کئے بغیر سیمابی بخار کے توسی لیمپ کے شعاعوں سے ہوسکتا ہے۔ اُسی زمانے میں ایک انگریز سائینسدان ڈاکٹر ای۔ میلن بی نے اپنے کتوں کا علاج جنکو ک ح کا عارضہ ہوگیا تھا مچھلی کے تیل اور مکھن سے کیا جو کامیاب ثابت ہوا۔ اسی سلسلے میں دو امریکن سائینس دانوں نے بھی تحقیقی کام شروع کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ وہی غذائیں جن سے ک ح پیدا ہوتا ہے اگر ان کو کچھ مدت کے لئے بالا بنفشی شعاعوں (Ultra violet rays) کے آگے رکھدیا جائے تو اس مرض کے لئے بہترین علاج ثابت ہوسکتی ہیں۔ مختلف تجربات کے بعد پتہ چلا کہ "کولیسٹرال" (Cho-lestrol) ایک شئے ایسی غذا میں پائی جاتی ہے جو بالائے بنفشی شعاعوں کے زیر اثر حیاتین د میں تبدیل ہو جاتی ہے اور یہی کولیسٹرال حیوانات کی جلد میں بھی پائی جاتی ہے۔ جب اُن کی جلد پر دھوپ پڑتی ہے تو کولیسٹرال بالائے بنفشی شعاعوں کو جذب کرکے حیاتین د میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح مانع "ک ح" ثابت ہوتی ہے۔

لیکن بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ حیاتین د کی اصل کولیسٹرال نہیں بلکہ ارگاسٹرال Ergastrol ،
ہے جو کولیسٹرال کی ایک نوٹ دائرسکل ہے ۔ پے در پے تجربات کے بعد آخر سائنس داں اسی ارگاسٹرال
سے حیاتین د کو اصلی قلمی حالت میں جدا کرنے میں کامیاب ہو گئے ۔ اس انکشاف کا سہرا دنیا کے
تین بڑے ملکوں کے سر ہے ۔ جرمنی میں ونڈاؤس نے ' لندن میں بورڈلان اور اس کے ساتھیوں
نے اور رونلنڈ میں ائی انک اور وان وچ نے علیحدہ علیحدہ اس کو حاصل کیا ۔ یہ انکشاف سنہ ۱۹۳۱ء
میں ہوا اور دنیائے سائنس میں بہت قدر کی نظروں سے دیکھا گیا ۔ کیونکہ حیاتین د پہلا حیاتین تھا
جس کو خالص حالت میں علیحدہ کیا گیا تھا ۔ اس کے بعد بھی حیاتین آ اور ج تین ماہ کے اندر اندر خالص
حالت میں علیحدہ کر لئے گئے ۔ مصنوعی طریقہ سے تیار کیا ہوا حیاتین آ بازار میں کیل سی فرول
(Calcifrol) کے نام سے بکتا ہے ۔ اس کے ایک گرام کی قیمت تقریباً (۸۰) روپئے ہے ۔
اور قوت میں یہ نصف ٹن " کاڈلیور آئیل " کے مساوی ہوتا ہے ۔ جو قیمت میں اس سے دس گنا
زیادہ ہوتا ہے ۔ اس کی قوت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کے ایک گرام میں تقریباً چار کروڑ
خوراکیں ہو سکتی ہیں ۔

حیاتین د دودھ ، مکھن ، گھی ، انڈے کی زردی ، اور مچھلی کے تیل میں پایا جاتا ہے ۔
جسم پر سورج کی شعاعوں سے بھی یہ پیدا کیا جاتا ہے ۔ ہمارے ملک میں بہت سے لوگ دھوپ
میں کھڑے ہو کر جسم پر تیل کی مالش کرنے کے عادی ہیں جو اس حیاتین کے حصول کا ایک نہایت مفید
طریقہ ہے ۔ غذا میں جب یہ حیاتین کافی مقدار میں نہیں ہوتا یا جسم اچھی طرح دھوپ نہیں کھاتا تو نوعمر
بچوں کی ہڈیاں اچھی طرح بننے نہیں پاتیں اور نرم ہو کر خم ہو جاتی ہیں ۔ اور بچے ک ح کا شکار ہو جاتے
ہیں ۔ اس حیاتین کی کمی سے بڑی عمر والوں کو بھی مرض آسٹوملیشیا (Ostomalacia) لاحق ہو جاتا
ہے ۔ ایسے بچے جن کی غذا حیاتین د کے لحاظ سے ناقص ہوتی ہے عصبی المزاج ، چڑچڑے ، بے چین
اور بے خوابی کے شکار ہو جاتے ہیں ۔ ان کے جوڑ پٹھے ڈھیلے اور ہڈیاں کمزور اور نرم ہو جاتی ہیں
وہ صحت مند بچوں کی بہ نسبت اوائل عمر میں کھڑے ہونا یا چلنا دیر میں سیکھتے ہیں ۔ آنتوں کے عضلات

ڈھیلے پڑجانے کے سبب ایسے بچے قبض یا دوسری معدہ کی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں ک ح ایک نہایت عام مرض ہے۔ کیونکہ وہاں ایسی غذائیں جن میں یہ حیاتین کثیر مقدار میں موجود رہتا ہے نہیں پائی جاتیں اور نہ وہاں دھوپ تیز نکلتی ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان میں رہنے والے لوگ خوش نصیب ہیں جہاں اتنی اچھی تیز دھوپ نکلتی ہے اور ایسی غذائیں بآسانی مہیا ہوسکتی ہیں جو حیاتین ڈ میں کامل ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مرض ک ح بہت کم پایا جاتا ہے۔ اور قدرتاً لوگ اس مہلک بیماری سے بچے رہتے ہیں۔

حیاتین س اس حیاتین پر بہت سے سائنس دانوں نے کام کیا ہے لیکن ۱۹۲۷ء میں ایونس اور اس کے ساتھیوں نے یہ شہادت بہم پہونچائی کہ حیوانوں کے تناسلی نظام پر اس خاص نامعلوم چیز کا اثر ہوتا ہے اور اس کو کارآمد رکھنے کے لئے ایک ایسی نامعلوم شئے کی ضرورت ہے جو چکنائی میں حل پذیر ہے۔ بعد میں اس نامعلوم شئے کا حیاتین س ہونا ثابت ہوا۔ اس حیاتین س کی کمی یا نقص کی باعث مردوں میں قوت رجولیت نہیں رہتی اور یہی چیز عورتوں میں بانجھ پن اور دوسرے رحمی امراض پیدا کرتی ہے۔

پہلے پہل چوہوں پر تجربات کئے گئے اور یہ معلوم ہوا کہ ان کے تناسلی نظام کے افعال جاری رہنے کے لئے ان کی غذا میں حیاتین ا اور س ناگزیر ہیں۔ اگر نر چوہوں کو ایسی غذا دی جائے جس میں حیاتین س موجود نہ ہو تو چند روز میں اُن کی منوی نالیاں (Sewiniferous tubes) کمزور ہوکر بیکار ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح اگر مادہ چوہے کو اس حیاتین سے پاک شدہ غذا دی جائے تو استقرار حمل تک تمام افعال تولید حسب معمول انجام پاتے ہیں اور جنین آٹھ روز تک برابر نمو پاتا ہے۔ لیکن اسکے بعد اُس کے نمو میں فرق پیدا ہوجاتا ہے اور بالآخر اسقاط ہوجاتا ہے اس مشاہدہ سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ حیاتین س جنین کے نمو کے لئے ضروری ہے اگر استقرار حمل کے پانچویں روز بھی حیاتین س غذا میں دیا جائے تو جنین بچ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر عورتیں اس حیاتین کو استعمال نہ کریں تو انہیں بچے پیدا نہیں ہوسکتے۔ یا اگر ہوتے بھی ہیں تو مرجاتے ہیں یا دوران حمل میں ضائع ہوجاتے ہیں۔

میسن (Mason) نے یہ ثابت کیا کہ حیاتین ھ کی مسلسل کمی کے باعث مردوں میں مردانہ قوت کا جو نقص پیدا ہو جاتا ہے اسے بعد میں اس حیاتین کو زیادہ مقداریں دے کر دور کرنا چاہیں تو وہ نقص دور نہیں ہو سکتا۔ لیکن عورتوں میں یہ دیکھا گیا۔ ہے کہ جب اس حیاتین کی مناسب مقدار دی جانے لگی تو ان کا بانجھ پن دور ہو جاتا ہے۔

حیاتین ھ کا سب سے بڑا ماخذ گیہوں کے جنین کا تیل ہے۔ دوسرے اناج کے جنینوں میں اسکی تھوڑی بہت مقداریں موجود ہوتی ہیں۔ حیوانی بافتوں خاص کر عضلات اور چربیوں میں کم مقدار میں پایا جاتا ہے۔ دودھ، مکھن، کاڈلیور آئیل جو دوسرے حیاتینوں کی کافی مقداریں رکھتے ہیں اس اہم شئے سے عاری ہوتے ہیں۔

اس قدر بیان سے قارئین پر حیاتین کی اہمیت، ان کا وقوع، اور افعال بخوبی واضح ہو گئے ہوں گے۔ ہمارے ملک میں عام صحت کی خرابی اور بعض امراض کی اشاعت کے ذمہ دار بہت بڑی حد تک وہ غذائیں ہیں جو حیاتین کے لحاظ سے ناقص ہوتی ہیں۔ اکثر بعض ناقص غذاؤں کا استعمال اور انہیں اس طریقہ سے پکانا کہ رہے سہے حیاتین بھی برباد ہو جائیں یہ ایسے امور ہیں جو بہت بڑی حد تک غذا کو حیاتین سے اور ہم کو صحت سے محروم کر دیتے ہیں۔ ہماری غذا کے ضروری اجزاء پروٹین، معدنی نمک، چربی، کاربوہائیڈرائیس اور "حیاتین" ہیں۔ ان اجزاء میں سے ہر ایک اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ دوسرا۔ اور ہر ایک اپنا صحیح کام انجام دینے کے لئے دوسرے کا محتاج ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے روزمرہ کے استعمال میں ایسی غذا کا انتخاب کیا کریں جو ان تمام اہم اجزاء کی صحیح قسم اور صحیح مقدار کا ایک اچھا آمیزہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ڈاکٹر اور سائنس دان حضرات "ملوان غذا" (Mixed dict) کی سفارش کرتے ہیں جو ہر لحاظ سے انسانی جسم کے لئے مفید ثابت ہوتی ہیں۔

میر شمشیر علی۔ بی ایس سی۔ (آخری)

امن و جنگ

سو رہی تھی نیند کے آغوش میں دنیا ابھی　　رنگ میں ڈوبا ہوا ہر زیست کا افسانہ تھا

تھا ابھی پابندِ موجِ عیشِ ہستی کا سکوں　　اضطرابِ گردشِ ایام سے بیگانہ تھا

جھولتی تھی چین کے جھولوں میں بے پروا نسیم　　اس گلستاں میں ابھی رنگِ خزاں آیا نہ تھا

بوئے گل دامن گلوں کا چھوڑ کر رسوا نہ تھی　　پہلوِ دریا سے بیگانہ ابھی قطرہ نہ تھا

ہاں نہ تھا اندیشۂ آثارِ بربادی ابھی　　شمعِ محفل سے ابھی کچھ دور ہی پروانہ تھا

بیخودی و کیف میں ہر نبض تھی ڈوبی ہوئی　　ہاں ابھی شیرازۂ رازِ سکوں بکھرا نہ تھا

یک بیک لیکن زمانے کو زوال آنے لگا
یعنی مستقبل کے آئینے میں بال آنے لگا

جنگ و استبداد کی دیوی نے پھر انگڑائی لی
پھر جمودِ دہر حرکت میں بدل جانے کو ہے

آ رہا ہے پھر وہی سیلِ فلاکت الاماں
امن کی کشتی پھر اس طوفاں میں بہہ جانے کو ہے

پھر ہوائے گلشنِ ہستی سموم آمیز ہے
پھر کوئی خونیں کہانی جنگ دہرانے کو ہے

خاک پھر ہو جائیں گے جل کر نشیمن امن کے
پھر زمانہ بجلیاں گردوں سے برسانے کو ہے

پھر زمینِ پر سکوں کھونے کو ہے اپنا سکوں
پھر مصیبت کارواں در کارواں آنے کو ہے

چپے چپے میں تباہی مسکرانے کو ہے پھر
ذرہ ذرہ پھر سراپا درد بن جانے کو ہے

اب وہ رات آنیکو ہے جسکی سحر ہوتی نہیں
اب وہ دن آئیگا جسکی دوپہر ہوتی نہیں

علی احمد بی۔ اے (آخری)

تبدیلئ شکل

(۱)

ہمارے لئے کوئی نئی بات نہ تھی مگر ڈاکٹر براڈلے کے شاہین صفت دماغ نے پھر پرواز شروع کی
"دیکھا تم نے" اس نے کہا "انسان کتنی متنزلزل نوعیت کا جانور ہے۔ غالباً اس وقت خدا کسی مضحکہ خیزی پر تلا ہوا تھا جب اس نے پہلے انسان کو بنایا۔ کیا تمھیں اس پر ذرا بھی تعجب نہیں کہ اس بڑھیا کو دیوانے کتے نے کاٹ کھایا اور بیچاری بے قصور کتوں کی سی حرکتیں کرتی ہوئی اپنے بنانے والے کے پاس سدھاری؟"

تازہ ترین اخبار میں سے میں نے براڈلے کو یہ خبر سنائی تھی کہ کسی بڑھیا کو کتے نے کاٹا۔ اس نے بروقت علاج نہیں کروایا اور مر گئی۔ کہا جاتا ہے کہ مرنے سے پہلے وہ کتوں کی سی حرکتیں کرتی رہی۔ اس خبر نے ڈاکٹر براڈلے کو میری دماغ پاشی پر مجبور کر دیا۔

"کیوں نہیں لارل!" اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "کوئی انسان کتے کو کاٹ کھائے تو وہ انسانوں کی سی حرکتیں کرتا ہوا مرے۔ کیوں نہ میں تمھیں کاٹوں اور تم ڈاکٹر بن جاؤ۔ کیوں نہ تم مجھے

کاٹ کھاؤ اور میں چوروں کو گرفتار کرنے لگوں ؟ "

" خدا کے کھیل خدا ہی جانے " میں نے اکتا کر جواب دیا

" اپنی قوت تجسس کو اس طرح چرچ کے حوالے نہ کرو " اس نے درشت لہجے میں جواب دیا " جب ہم کو مجبور کیا جاتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں تو ہم خدا کو مجبور کریں گے کہ وہ ہمارے اعتراضات کے جوابات جو اس نے بصورتِ کائنات دے رکھے ہیں ہم پر واضح کرے ۔ اور اسی جبر کا دوسرا نام سائینس ہے "

" یہ سب باتیں تمہاری ہیں " میں نے جل کر جواب دیا " مجھے تمہارے مضمون سے کوئی تعلق نہیں ۔ تم سائینسدان اور سائینس تمہاری کنیز ۔ تم اس کو جو چاہے نام دے لو جو چاہے کام تلاؤ میں تو زندگی کا مفہوم صرف اتنا سمجھتا ہوں کہ میں پیدا کیا گیا ہوں اور مارا جاؤں گا ۔ میرا پیدا کرنے والا اگر مجھ سے کوئی کام لینا چاہے تو کروں گا اور اگر مارنا چاہے تو مروں گا "

" بہتر ہوتا لارل تم پادری ہوتے " براڈلے نے طنزاً کہا " جو اپنی ساری زندگی اس تاریکی میں جھانکتے ہوئے گنواتے ہیں جہاں انکی دماغی بداعمالیاں انہیں طرح طرح کی بھیانک شکلیں دکھلاتی ہیں وہ کبھی اس تاریکی میں روشنی ڈالنا پسند نہیں کرتے ۔ وہاں انہیں خدا کہیں کسی کنواری کے بطن سے جنم لیتا ہوا نظر آتا ہے اور کہیں سولی پر لٹکا ہوا "

" مذہب کی توہین کرتے ہوئے تمھیں دوزخ کی اس ہولناک آگ کا تصور نہیں آتا ! کیا تم اس سے ڈرتے نہیں جس سے کہ ہر آسمانی کتاب میں ڈرایا گیا ہے ؟ " میں نے ڈراونے لہجے میں کہا جس کے جواب میں براڈلے نے جبڑے پھیلا کر ایک قہقہہ لگایا

" دوزخ کی آگ تم جیسے پٹرول صفت لوگوں کے لئے ہے " اس نے کہا " تم ہی کہتے ہو کہ ہمارے خالق کا بیٹا کفارہ ہوا اور تم ہی کہتے ہو کہ دوزخ کی آگ بھی کوئی شئے ہے ۔ بتاؤ میں کس کو سچ جانوں اور کس کو غلط ؟ " میں لاجواب ہو گیا مگر اپنی تسکین کے لئے مجھے کہنا پڑا " کفارہ ان کے لئے ہوا جو اس پر بلا چوں وچرا ایمان لے آئے ان کے لئے نہیں جن کے پاس اس پر اعتراضات کے دفتر موجود ہوں "

"کیا تم مجھے کفارے کا مفہوم سمجھا سکتے ہو!" اس نے کہا

"جیسے کسی مجسٹریٹ نے کسی ملزم کو (۵۰) پچاس روپیہ جرمانہ کیا لیکن ازراہ ہمدردی جرمانے کی رقم خود ادا کردی" میں نے جواباً کہا جو کہ اکثر پادری کہا کرتے ہیں۔

اس پر بھی براڈلے کی طرف سے ایک قہقہہ وصول ہوا

"جیسے کسی مجسٹریٹ نے" اس نے کہا "کسی مجرم کو قید کی سزا دی اور ازراہ ہمدردی خود جیل میں چلا گیا۔ جیسے کسی مجسٹریٹ نے کسی مجرم کو قصاص کی سزا دی اور ازراہ ہمدردی اپنی گردن دار پر رکھ دی۔

بیوقوف پادری مذہب کو نہ سمجھ سکے اور اپنے ساتھ اوروں کو بھی غلط راستہ پر ڈال دیا خدا ایک فلسفی قسم کی کوئی شئے ہے۔ وہ حد درجہ امن پسند اور معتدل مزاج ہے اور وہ کائنات کی ہر شئے کو اپنے ہی رنگ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ جنہیں اس نے مقید کر رکھا ہے وہ تو اس کی مرضی کے مطابق ہیں اور حضرت انسان کو جو اس نے غلطی سے آزادی دیدی تو ان تمام پند و نصائح کی ضرورت لاحق ہوئی۔ کفارے کا اصل راز میں تمھیں بتلاتا ہوں۔ مسیح ان کے لئے کفارہ ہوئے جو ان پر ایمان لے آئے ان پر ایمان لانے کے معنی یہ ہوئے کہ ان کے بتلائے ہوئے قواعد و قوانین کی پوری طرح پابندی کی۔ جب کسی نے پوری طرح پابندی کی تو وہ ایک انتہائی نیک آدمی ہوا جو یقیناً جنت کا مستحق ہے اور جنہوں نے پابندی نہ کی وہ عیسائی نہیں اس لئے مذہب کے خیال میں دوزخی۔ اس جھگڑے کو مسیح کے صلیب پر لٹکائے جانے سے کوئی دور کا رشتہ بھی نہیں۔ کفارہ دراصل ایک استعارہ ہے۔ رہا جنت دوزخ تو وہ خود آپ کی صحت جسمانی و روحانی اور ذہنی کرب و سکون کا نام ہے"۔

"تھوڑی دیر پیشتر آپ نے مجھے پادری بننے کو کہا تھا" میں نے مسکرا کر قصہ ختم کرنے کے ارادے سے کہا" اب مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ نہایت مناسب ہوگا اگر آپ ہر اتوار کو کلیسا میں چند منٹ لکچر دیں"

"میں ان گم کردہ راہ رہنماؤں سے دور ہی رہنا پسند کرتا ہوں" اس نے جواب دیا "مجھے لئے

تو یہی دلچسپ مشغلہ ہے کہ کبھی کسی کا پیٹ چیر کر آنتیں دھو ڈالوں اور کبھی کسی کے پھیپھڑوں کے غیر ضروری سوراخ بند کر دوں۔ تم سمجھتے ہو کہ میں کفارہ پر بحث کرتے ہوئے فطرت کی اس مضحکہ خیز حرکت کو فراموش کر سکتا ہوں جس نے ایک انسان کو کتے کی حرکتیں کرنے پر مجبور کر دیا"

(۲)

کئی مہینوں تک میں پرواز شدہ سائنسدان روسیو کی لیباٹری کے حادثے کے سبب بیمار پڑا رہا۔ صحت پانے کے بعد مجھے تفریحاً باہر جانا پڑا۔ کافی عرصے تک سوئٹزرلینڈ میں رہنے کے بعد میں واپس ہوا۔ جب میں کام پر رجوع ہوا تو مجھے ایک عجیب خبر ملی۔

ڈاکٹر براڈلے نے اپنے اختیارات کے تحت تین پاگلوں کو پاگل خانے سے یہ کہکر نکلوایا کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے انہیں سوئٹزرلینڈ لیجانے کی ضرورت ہے۔ پاگل خانے کا ایک چپراسی بھی ساتھ تھا۔ مگر ان کے سوئٹزرلینڈ پہنچنے کی کوئی اطلاع ملی نہ پیرس میں ان کا کوئی پتہ چلا۔

اس عجیب و غریب خبر نے مجھے کئی دنوں تک پریشان کر رکھا۔ دن گذرتے گئے حتیٰ کہ یہ بات عوام کے دلوں سے فراموش ہو گئی۔ میں بھی اسے تقریباً بھول چکا تھا مگر ایک روز اچانک ایک واقعہ نے اس کی یاد تازہ کر دی بازار سے گذرتے ہوئے میں نے دوا فروش کی دوکان پر ایک شخص کو دیکھا جس کی داڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں اور وہ ایک قدیم فیشن کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ مجھے اس کی صورت سے واقفیت کا گمان ہوا اور میں پلٹ کر اس کے قریب سے گذرا۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ وہ براڈلے تھا۔ میں نے دور جا کر اس کو دیکھنا شروع کیا۔ دوکان سے ایک تھیلا لیکر وہ ایک طرف کو چلا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے ایک ٹکسی لی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اپنی موٹر سائیکل پر چلتا رہا۔ حتیٰ کہ ہم پیرس کے غیر آباد حصے میں پہنچ گئے۔ یہاں ٹکسی رک گئی۔ براڈلے اترا اور ڈرائیور سے کچھ باتیں کرتا ہوا اپنا تھیلہ سنبھال کر ایک طرف کو ہولیا۔ غالباً اس نے ڈرائیور کو کافی انعام دیا تھا کیونکہ وہ خوش خوش نہایت تیز رفتاری سے واپس ہوتا نظر آیا۔

میں نے موٹر سائیکل کا انجن بند کر دیا تھا اور اسے ڈھکیل رہا تھا۔

اس طرف آبادی بہت کم تھی۔ دور دور فاصلے سے کچھ مکانات تھے۔ انہیں میں سے ایک مکان میں ڈاکٹر براڈلے داخل ہوا۔ میں نے بھی تیز تیز چل کر اس کو جا لیا۔ اور قبل اس کے کہ وہ دروازے کو اندر سے بند کر لے اسے آواز دی میری آواز پر وہ چونک پڑا اور اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ میں نے قریب پہنچ کر موٹر سائیکل اسٹانڈ پر کھڑی کر دی اور آگے بڑھا۔

"لارل!" اس نے نہایت تعجب سے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر" میں نے مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا

"تم یہاں کیسے؟" اس نے اسی حیرت سے دریافت کیا

"حیرت تو مجھے ہونی چاہئے کہ تم یہاں کھڑے ہو جبکہ دنیا تمھاری تلاش سے تھک چکی ہے" میں نے جواب دیا

"لیکن تم یہاں کیسے آئے؟ تم نے مجھے پہچان لیا؟" اس نے کہا

"میں اور تمہیں نہ پہچانوں!" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اس نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچا اور پھر مسکرایا

"اب جبکہ تم نے مجھے پالیا ہے" اس نے کہا "تو وعدہ کرو کہ مجھے چھوڑ وگے نہیں"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی سے دریافت کیا

"اچھا چلو اندر چلو" اس نے ہنستے ہوئے کہا "دیکھو کہ ہماری پر اسرار سکونت کس رنگ میں ہے"

عالم استعجاب میں اس کے پیچھے ہو لینے کے سوا مجھے اور کچھ نہ بن پڑا۔ ہم دونوں ایک نیم بوسیدہ ہال میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں میز پر ایک برقی قمقمہ رکھا ہوا تھا اور نہایت بے ترتیبی سے کچھ کاغذات، قلم ایک قلمدان اور کچھ تار پڑے ہوئے تھے۔ ایک کرسی پر وہ خود بیٹھ گیا اور دوسری میرے لئے چھوڑ دی۔ تھیلا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا میز پر رکھ دیا گیا۔

"آخر یہ ماجرا کیا ہے ڈاکٹر!" میں نے دریافت کیا "تم نے روپوشی کیوں اختیار کر لی۔ وہ پاگل کیا ہوئے۔ تمہاری ہیئت کیوں بدل گئی آخر یہ سب ہے کیا؟"

" تم یہ سب کچھ معلوم کرنا چاہتے ہو ؟" اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا " میں سب قصہ سناؤنگا تمھیں یاد ہے کہ مجھے اخبار میں سے ایک خبر تم نے سنائی تھی کہ کسی بڑھیا کو کُتّے نے کاٹ کھایا اور وہ کتوں کی سی حرکتیں کرتی ہوئی مرگئی ۔ میں نے اس پر بہت دلچسپی کا اظہار کیا تھا ۔ مجھے یکایک خیال پیدا ہوا کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے ایک انسان کی انسانیت چھین لی ۔ سوچ سوچ کر میں نے بہت سے نتیجے اخذ کئے مگر ان کے تجرباتی ثبوت کی ضرورت تھی ۔ اس ثبوت کے حاصل کرنے کے لئے مجھے جرم کرنا پڑا مگر میں مجرم نہیں ہوں ۔ میرا ضمیر مجھے ملامت نہیں کرتا ۔ اگر ایک اہم تحقیقات کے سلسلے میں دو ایک آدمیوں کی جان چلی جائے تو کیا حرج ہے جبکہ موٹروں کی دوڑ اور ہمالیہ کی چڑھائی میں کئی آدمی مرجاتے ہیں "۔

" تو کیا وہ پاگل مرگئے ! " میں نے نہایت ہی حیرت سے دریافت کیا ۔

دو مرگئے اور دو زندہ ہیں " اس نے جواب دیا

" اور عنقریب وہ بھی آپ کے اس مہمل تجربے کی بھینٹ ہو جائیں گے " میں نے حقارت سے کہا کیونکہ مجھے ان کی اس طرح بلا وجہ موت بری معلوم ہورہی تھی ۔

" میں کوشش تو کروں گا کہ ان کے مرنے سے پہلے میرا تجربہ ختم ہو جائے پھر بھی کچھ کہا نہیں جاسکتا " اس نے جواب دیا " " شرم نہیں آتی تمھیں " میں نے درشت لہجے میں کہا " گویا انسان کی جان تمھارے لئے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی ۔ قتل کرتے ہو اور کہتے ہو ضمیر ملامت نہیں کرتا !! "

" زیادہ گرم نہ ہو جاؤ لارل ! " براڈلے نے بھی درشتی سے کہا " میں اپنی ہستی کو اس وقت تک حکومت کے حوالے نہیں کرسکتا جب تک کہ میرا تجربہ ختم نہ ہو جائے اور میرے راستے میں حائل ہو کر کہیں تم بھی میرا شکار نہ بن جاؤ "

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں غصہ سے کانپنے لگا اور میری زبان بے قابو ہوگئی " ٹھہر ! اے انسان نما درندے میں ابھی تجھے گرفتار کروا دیتا ہوں ۔ مجھے دھمکی دیتا ہے کہ میں بھی اس بیہودہ تجربے کا شکار نہ ہو جاؤں ۔ لے اب دیکھ کون شکار ہوتا ہے "۔

غصہ میں کانپتا ہوا میں اُٹھنے لگا ۔ مگر جو ہی کہ کرسی کے دستے پر ہاتھ رکھا ایک طاقتور برقی رو

میرے جسم میں دوڑ گئی اور میں بیہوش ہو کر گر پڑا ۔

(۳)

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز مجھے سنگھائی جارہی ہے اس کی تیز بو دماغ میں اتر رہی ہے میں نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف دیکھا ۔ میں ایک پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اور ڈاکٹر براڈلے میرے بازو بیٹھا ہوا مجھے امونیا سنگھا رہا تھا ۔ آہستہ آہستہ دماغ پر زور ڈالنے سے یاد آیا کہ میں برقی رو سے بیہوش ہو گیا تھا ۔ ڈاکٹر سے میں لڑ پڑا تھا ۔ ڈاکٹر ایک خونی ہے ۔

اس خیال کے آتے ہی میں نے فوراً اٹھنا چاہا مگر معلوم ہوا کہ پتلی پتلی سلیوں سے میرے ہاتھ پاؤں پلنگ کے ساتھ بندھے ہوے ہیں ۔ میں نے اسے گالیاں دینی شروع کیں اور وہ خاموش رہا حتیٰ کہ میں تھک کر خاموش ہو گیا ۔

" میں سمجھتا تھا کہ تم میرے دوست ہونیکی حیثیت سے مجھے کچھ مدد دو گے " قدرے توقف کے بعد اس نے مہر سکوت توڑی " مگر سب سے زیادہ بیہودہ تم ہی نکلے ۔ تم نہ خود کچھ کام کرنا چاہتے ہو نہ اوروں کو کچھ کرنے دیتے ہو تم چاہتے ہو کہ دنیا جہاں ہے وہیں رہے ۔ تھوڑے سے قطعہ زمین کے لئے ہزاروں سپاہی نذرِ اجل ہو جائیں تو کوئی بات نہیں لیکن سائنس کی ایک اہم تحقیقات کے لئے دو ایک ناکارہ جانوں کا ضائع ہونا تمھارے نزدیک بڑا جرم ہے ۔ میرے نزدیک تم ہی سب سے زیادہ ناکارہ آدمی ہو اور سب سے پہلے تمھاری جان لی جانی چاہیے "

میرے جسم میں جھرجھری پیدا ہو گئی ۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں زندہ نہیں بچ سکتا ۔ میں نے حواس ٹھکانے کر کے ادہر اُدہر دیکھنا شروع کیا ۔

ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں تھے جو کافی تاریک تھا ۔ تازی ہوا بمشکل مل سکتی تھی ۔ اسکا صرف ایک دروازہ تھا اطراف میں رسیاں اور زنجیریں کثیر تعداد میں تھیں ۔ چند میز ایک طرف پڑے ہوئے تھے جن پر مختلف شیشیاں رکھی تھیں ۔ وسط میں میرا پلنگ پڑا تھا جس میں بندھا ہوا تھا اور میرے بازو براڈلے بیٹھا ہوا مسلسل بکے جا رہا تھا ۔ خدا جانے وہ کیا کیا کہہ گیا میں نے کچھ نہ سنا ۔ آخر کار وہ اٹھا اور

کمرے کے باہر چلا گیا۔

میں نے آزادی کی ممکنہ کوشش کی مگر یہ میرے امکان سے باہر تھا۔ رسیاں مضبوط تھیں اور میں انہیں نہیں توڑ سکتا تھا۔ بظاہر مکان میں اور کسی متنفس کا وجود معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں اپنی آزادی سے مایوس ہوگیا اور موت میری نظروں میں پھرنے لگی۔ اس بے بسی پر مجھے بچوں کی طرح رونا آیا۔ اور میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے طویل بیہوشی اور برقی جھٹکے نے مجھے کمزور کر دیا تھا میں نڈھال ہوگیا اور مجھے نیند آگئی۔

(۴)

بیدار ہوا تو کمرہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ روشن معلوم ہو رہا تھا۔ دروازے میں سے کافی روشنی اندر آرہی تھی غالباً باہر سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔

مجھے بھوک سے تکلیف ہو رہی تھی۔ کچھ سوچ کر میں نے ڈاکٹر کو آواز دی اور فوراً ہی اس کا جواب سنائی دیا اور تھوڑی دیر میں وہ کمرے میں داخل ہوا۔

" غالباً اب آپکا دماغ کسی قدر پرسکون ہے " اس نے کہا " کہیئے رات کیسی گذری ؟"

مجھے اس مزاج پرسی پر بہت غصہ آیا اور میں نے ڈانٹ کر کہا۔

" کیا مجھے بھوکا مارنے کا ارادہ ہے؟ خدا غارت کرے تمھیں "

" اوہ ! مجھے معاف کرنا " اس نے جواب دیا " غالباً آپ کو ناشتے کی ضرورت ہے ابھی لاتا ہوں۔ ذرا دیر ہوگئی۔ مگر میرا کیا قصور کہ آپ اب تک سوتے پڑے رہے " یہ کہکر وہ کمرے سے باہر چلا گیا اور کچھ دیر بعد مکھن روٹی اور چائے لے آیا۔ اور پلنگ کے بازو ایک چھوٹی سی تپائی پر رکھ دیا۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔

" کوئی کتا تو ہوں نہیں جو بغیر منہ ہاتھ دھوئے ناشتہ کروں ؟" میں نے کہا

" عنقریب ہو جائیں گے " اس نے جواب دیا " اب تو خیر آپ منہ ہاتھ دھولیں گے مگر یہ رویہ آئندہ شائد برقرار نہیں رہ سکتا "

اس نے جیب سے تفنچہ نکالا اور اسے بائیں ہاتھ میں سنبھال کر سیدھے ہاتھ سے میرے دونوں ہاتھ

آزاد کردئے ۔ میں اٹھ بیٹھا ۔ اور خود اپنے پاؤں کھول لئے ۔ میرے پیچھے وہ میری طرف پستول تانے کھڑا تھا ۔ اس کے اشارے پر میں دروازے کی طرف چلا اور ایک کمرے میں سے گذرتا ہوا حمام پہنچا ۔ اس نے اشارے سے مجھے اندر جانے کو کہا اور میں حمام میں داخل ہوگیا ۔ یہاں ضروریات کی تمام چیزیں رکھی ہوئی تھیں ۔ دروازہ باہر سے بند کرلیا گیا اور آدھے گھنٹے بعد میرے کھٹکھٹانے پر کھولا گیا ۔ میں نہا دھو کر فارغ ہو چکا تھا ۔ باہر نکلا اور پستول کی نال کے آگے چلتا ہوا پھر اپنے پلنگ پر پہنچ گیا ۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی ۔ میں نے اسے گرم کرکے لانے کے لئے کہا تو اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا ۔

"میرے پاس اول تو کوئی ملازم نہیں اور آپ مجھ پر حکومت نہیں کر سکتے ۔ بہتر ہے کہ آج ٹھنڈی چائے ہی پی لیجئے کل سے ہمیشہ گرم چائے ملیگی"

مجھے یہ تمام واقعات ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے کسی نے خواب میں مجھ سے مذاق کیا ہو ۔ پریشانی کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آ رہی تھی ۔ بہرحال میں نے ناشتہ ختم کیا اور پلنگ پر باندھ دیا گیا ۔ وہ بھی اس طرح کہ پاؤں تو خود مجھے ہی باندھنے پڑے اور ہاتھ ڈاکٹر نے باندھے ۔

جب ڈاکٹر نے میرے پلنگ کو ڈھکیلنا شروع کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کو پہیئے لگے ہوئے ہیں ۔ اسطرح مجھے ڈھکیلتا ہوا وہ ایک بڑے ہال میں داخل ہوا ۔ یہاں عجیب عجیب چیزیں تھیں ۔ یہ ڈاکٹر کا تجربہ خانہ تہا ۔ میں چونک پڑا جب مجھے عجیب و غریب طریقے سے غرّانے کی آواز سنائی دی ۔ یہ آواز میرے سرہانے کی طرف سے آ رہی تہی میں نے سر پھیرا کر دیکھنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر نے میرے ہاتھ کھولدئے میں اُٹھ بیٹھا ۔ اور اس عجیب آواز کی طرف پلٹا ۔

فرط حیرت سے میرے منھ سے چیخ نکل گئی ۔ دو آدمی تھے ۔ پوری طرح برہنہ ۔ ایک دوسرے سے کسی قدر فاصلے پر زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے ۔ ایک آدمی کے بدن پر بڑے بڑے بال اُگے ہوئے تھے ۔ جو زرد سیاہ اور خاکستری رنگ رکھتے تھے ۔ اس کے دانت بڑھے ہوئے لوکدار اس کے نچلے ہونٹ پر نظر آ رہے تھے اور وہ درندوں کی طرح غرّا رہا تھا ۔

دوسرا بھی بالکل برہنہ تہا اور اس کا بدن سیاہی مائل سفید چھوٹے چھوٹے بالوں سے بھرا ہوا تھا

اسکا منھ لمبوترا اور کان بڑے بڑے اور لٹکے ہوئے تھے ۔ جبڑے پھیلے ہوئے تھے اور وہ کتوں کی طرح بھونک رہا تھا۔

" یہ دیکھو " ڈاکٹر براڈلے نے ان درندہ ہیئت انسانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" یہ ہیں میرے تجربے کی کامیابی کے زندہ ثبوت "

" یہ ایسے کس طرح ہوگئے ! " میں نے دریافت کیا ۔

" یہ تمھیں اس وقت پوری طرح معلوم ہوگا جب تم بھی ان سے مشابہ کوئی شکل اختیار کرلوگے"

میرے جسم میں رعشہ پڑگیا اور میں نے حقارت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا

" صاحب موصوف ایک پاگل ہیں " اس نے بڑے بڑے بالوں والے انسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

" اس شخص نے میرے تجربہ میں بہت اچھی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا ہے ۔سب سے پہلے میں نے اس کو ایک چیتے کے دانت کے ذریعے متاثر کیا۔ بڑی مشکلوں سے میں نے ایک زخمی زندہ چیتا حاصل کیا تھا۔ اس کو پارے کا انجکشن دیا گیا یعنی مرکیورس کلورائیڈ کافی مقدار میں اس کے جسم میں داخل کیا گیا اور اس شخص کا ہاتھ اس کے منہ میں دیا گیا ۔ چیتے نے اسے کتر دیا۔ لیکن زیادہ زخمی کرنے کی اس کو اجازت نہ دی گئی وہ صرف دو دانت چوتھائی انچ اندر اتار سکا ۔ اس کے بعد خود اس کو پارے کا انجکشن دیا گیا کئی دن تک اس کی روزانہ دیکھ بھال کی گئی کہ کہیں زہریلا اثر اس کی جان نہ لے لے ۔ کافی مدت کے بعد میں نے یہ دیکھا کہ اس کی آواز میں ارتعاش پیدا ہونا شروع ہوا اور وہ تقریباً غرانے لگا۔ چیتا ابتک زندہ تھا ۔ میں نے ایک مخدوش تجربے کی ٹھانی اور دونوں کو بیہوش کرکے بازو بازو لٹایا اور بہ یک وقت دونوں کے آپریشن کئے تین گھنٹے کے اندر میں نے نہایت کامیابی کے ساتھ چیتے کے تمام غدود انسانی غدودوں کی جگہ منتقل کردئے ۔ اور معدہ اور گردے بھی بدل دئے ۔ اس آپریشن میں چیتا تو مرگیا مگر جناب ابھی تک زندہ ہیں اور اس ہیئت میں تبدیل ہوگئے ہیں دیکھ رہے ہو کہ اسکی آنکھیں چھوٹی ہوگئی ہیں ۔ بدن پر چیتے کے سے بال اُگ آئے ہیں ناخن بڑھ کر آگے کو مڑ گئے ہیں اور

دانت نوکدار ہو گئے ہیں۔ اور مولانا پہلے کی بہ نسبت چوگنی طاقت رکھتے ہیں۔ بغیر کلوروفارم کے مانتے نہیں
دوسرے صاحب وہ چپراسی ہیں جو پاگلوں کی خدمت گذاری و نگرانی کے سلسلے میں تشریف لائے تھے
سب سے پہلے تو ان کو ایک دیوانے کتے سے کٹوایا گیا۔ اس کے بعد میں نے وقتاً فوقتاً ان کے خون کا
امتحان کیا خوردبین سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ خون میں چند سیاہ باریک ذرات غیر ضروری طور پر موجود ہیں۔
کچھ عرصہ گذرنے کے بعد یہ ذرات غائب ہو گئے۔ امتحان سے معلوم ہوا کہ یہ سب ذرات اس کے مرکز دماغی
کی تعلیقی رگ میں جمع ہو گئے ہیں اور مرکز کی طرف آنے والے خون کیساتھ ملجاتے ہیں اور واپس ہوتے ہوئے
پھر دھانے پر مجتمع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے اس پر بھی وہی عمل کیا کہ کتے کے غدود گردے اور
معدہ ڈال دیا۔ اور آج یہ کتے کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس کا منہ لمبوترا ہو گیا ہے کان لانبے ہوکر
لٹکنے لگے۔ ناخن بدل گئے اور کلائیاں تپلی ہو گئیں جسم پر بال اگ آئے زبان تپلی ہو گئی ہے اور حلق کی ساخت
میں بھی کافی فرق ہو گیا اور آپ کتے کی طرح بھونکتے ہیں۔ ان کی طاقت جسمانی پہلے کی بہ نسبت قدرے
کم ہو گئی ہے

یہ دونوں عجیب الخلقت ہر وقت تو خاموش رہتے ہیں مگر مجھے دیکھتے ہی غراتے ہیں۔ کئی ہزار
فرانک میں نے انکی غذا میں صرف کر دئے ہیں۔ میری وہ کثیر جمع شدہ رقم جس کا تم ہمیشہ خاص طور پر تذکرہ کیا
کرتے تھے ان لوگوں کے پیچھے اب قریب الختم ہے۔

دو قیمتی آدمی جو میری بدقسمتی سے مر گئے اگر آج زندہ ہوتے تو گھوڑے اور گائے کی صورت میں ہوتے"

"اور میں" میرے منہ سے بے اختیار نکلا

"ہاں آپ جیسی ہستی کا مجھے ایک زمانہ سے انتظار تھا" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
" آپ پر فطرت ایک اور مذاق کا اظہار کرنے والی ہے۔ آپ کی ذاتی چیزیں شتر مرغ کو دے دی جائینگی
اور دیکھا جائیگا کہ آپ کی صورت کیسی دلچسپ معلوم ہو گی جب آپ اپنی لمبی گردن ہلاتے ہوئے چونچ سے
آواز نکالیں گے اور پروں سے ہوا میں ایک لطیف نغمہ پیدا کریں گے"۔

میری پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔

مستقل یکو اس کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر نے انہیں انکی غذا دینی شروع کی جو کچے گوشت اور ہڈیوں پر مشتمل تھی۔ مجھ سے یہ ہولناک منظر دیکھا نہ جارہا تھا۔

"آپ کے بعد میرا تجربہ پلٹ جائیگا۔ اب میں حیوانوں سے انسانوں کی فطرت کا اظہار کراؤں گا اب کتے اور گدھے سوٹ پہنے ہوئے بازاروں میں خرید و فروخت کرتے نظر آئیں گے۔ اور میرے تجربے کی ارتقاء یہ ہوگی کہ ہر نوعیت کا جانور اشرف المخلوقات کی ہمسری اور برابری کا دعویٰ کرے گا۔"

گھنٹے بھر بعد مجھے پھر اپنے تاریک کمرے میں مقید کر دیا گیا۔

دن گذر گیا اور رات آئی۔ ایک قیدی کی طرح مجھے کھانا ملتا رہا۔ رات بھر میں سو نہ سکا اور جب صبح کے قریب میری آنکھ بند ہوئی تو میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ اس تبدیلیٔ ہیئت پر میں موت کو ترجیح دونگا۔

(۵)

صبح میں دیر سے اُٹھا ڈاکٹر میرے انتظار میں پستول لئے کھڑا تھا

"غالباً رات میں آپ کو بہت اچھی طرح نیند آئی ہوگی" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "کیوں کیا آپ کو شتر مرغ بہت پسند ہے؟"

میں خاموش رہا۔ رسیاں کھلنے پر میں حمام کی طرف چلا۔

"آپ پہلے آدمی ہیں جنہیں میں نے یہ بتلا دیا ہے کہ آپ کے لئے کونسا ڈھانچہ پسند کیا گیا ہے ورنہ اور کوئی بھی اس قسم کی معلومات حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔"

میں خاموشی کے ساتھ حمام میں داخل ہو گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔

مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ نہا دھو کر میں نے کپڑے نہیں بدلے بلکہ ننگا دروازے تک آیا۔ کپڑوں کو ہاتھوں میں تول کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک طرف کو ہٹ گیا۔

دروازہ کھلتے ہی میں نے کپڑے ڈاکٹر کے منہ پر پھینک دئے اور جست کر کے اس سے لپٹ گیا۔ اس نے ایک فائر کیا اور گولی حمام میں جا لگی۔ میں نے پوری طاقت سے اس کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا اور ساتھ ہی اس کو حمام میں ڈھکیل دیا۔ وہ اوندھا گر پڑا میں نے دروازہ بند کر دیا اور بے تحاشا

کمرے سے باہر کی طرف بھاگا - میرے کپڑے غالباً ڈاکٹر کے چہرے سے لپٹ گئے تھے اس لئے میں انھیں نہ لے سکا - مجھے اس کی پروا بھی نہ تھی کہ میں برہنہ تھا یہی کافی تھا کہ میں شتر مرغ تو نہ تھا۔ مکان سے باہر نکلنے میں مجھے کوئی دقت نہ ہوئی - اور میں نے بے تحاشا سڑک پر دوڑنا شروع کیا۔ اتفاقاً قریب ہی ایک موٹر جاتی ہوئی ملی اور موٹر نشینوں نے مجھے پاگل سمجھ کر میرے قریب موٹر دھیمی کی - میں اچک کر سوار ہوگیا - وہ بے تحاشا چلانے لگے اور مجھے ڈھکیل دینا چاہا - میں نے انہیں بمشکل سمجھایا کہ میں پاگل نہیں ہوں کیونکہ میرے منھ سے الفاظ برابر نہیں نکل رہے تھے - اور ان لوگوں کو مجھ پر اعتبار کرلینے میں تامل تھا بمشکل میں نے کہا " ایک زبردست واردات ہوگئی ہے۔ فوراً قریب ترین اسٹیشن چلو "

ان لوگوں نے مجھے اندر بٹھالیا اور ایک شخص نے اپنا اوورکوٹ مجھے دیا تاکہ میں اپنا بدن ڈھانکو مجھے اپنی برہنگی کا بالکل خیال نہ تھا۔

ہم ایک پولس اسٹیشن پہنچ کر رکے - میں لپک کر اترا اور دوڑا - میری عجیب ہیئت کی وجہ سے سارجنٹ نے مجھے اندر جانے سے روکنا چاہا مگر میں اسے ڈھکیل کر اندر گھس پڑا - جو افیسر مجھے سب سے پہلے دکھائی دیا میں اس کے پاس پہنچا اور ہانپتے ہوئے کہنا شروع کیا

" میں لارل ہوں - سپرنٹنڈنٹ پولس - حلقہ ۱۱۲ - ایک زبردست واردات قتل ہوگئی ہے - مجرم فرار ہونے والا ہے فوراً میرے ساتھ چلئے "

ہم معہ چند مسلح جوانوں کے اس زندان سائنس کی طرف لپکے - جس وقت ہم قریب پہنچے تو دیکھا کہ مکان جل رہا ہے اور ڈاکٹر براڈلے میری موٹر سائیکل پر ایک طرف جارہا ہے - ایک کانسٹبل نے پے درپے فائر شروع کئے - اور بالآخر موٹر سائیکل کے پہیئے بیکار کردئے - ہم نے فوراً ہی ڈاکٹر کو جالیا مگر وہ اپنی کنپٹی پر پستول کی نال رکھکر کھڑا تھا - "میری مخلوق ختم ہوگئی" اس نے دیوانگی کے عالم میں کہا " اب تمھیں کچھ ہاتھ نہ آئیگا " قبل اسکے کہ ہم کچھ سوچ سکتے اس نے لبلبی دبالی اور گولی اسکے سر کے پار ہوگئی۔

بے جان لاش ہمارے ہاتھ آئی جو قانونی کارروائیوں کے بعد دفن کردی گئی میں گھر سدھارا -

اب میں کسی سائینسدان سے دوستی رکھتے ہوئے گھبراتا ہوں - آج تک میرے اکثر احباب میری برہنہ دوڑ کا قصہ بیان کرکے مجھ پر قہقہے لگاتے ہیں -

سید ظہیر الدین حسین رونق بی - ایس - سی۔

خواجہ عماد الدین محمود گاوان

ابتدائی حالات | خواجہ عماد الدین محمودؒ گاوان، جس نے سلطنت بہمنی کے زیر سرپرستی سرزمین دکن میں اپنے پیچھے دائمی شہرت اور ایک عظیم الشان یادگار چھوڑی ہے۔ نسل کے اعتبار سے ایک ترک تھا۔ اس کے آباو اجداد شاہان گیلان کے وزراء تھے۔ انہی میں سے ایک شخص نے اپنی ذاتی قابلیت اور جوانمردی سے رشت میں اپنی بادشاہت قائم کی تھی اور یہ خود مختار حکومت اس کے خاندان میں ایک عرصہ تک قایم رہی۔ آخر کار شاہ طہماسپ صفوی والی ایران نے اس کی خود مختاری کا خاتمہ کرکے اس کو اپنی سلطنت کا ایک جز بنا لیا۔ محمودؒ گاوان ۸۰۸ھ مطابق ۱۴۰۵ء میں قریہ قاوان میں پیدا ہوا اور اسی بنا پر عرف عام میں وہ گاوان کے لقب سے مشہور ہوا اس کا باپ خواجہ محمدؒ اور چچا شمس الدین امیر محمدؒ والی گیلان کے وزراء تھے۔ بچپن میں محمود گاوان کی تعلیم و تربیت کا خاص طور پر انتظام کیا گیا تھا۔ جب سن شعور کو پہونچا تو امور سیاست میں اپنے چچا کا مشیر بن گیا۔ لیکن بہت جلد اس نے اپنی اس خدمت سے علیحدگی اختیار کی اور مکہ معظمہ چلا گیا۔ اس کے چند دنوں بعد اس کے چچا شمس الدین نے بھی ہجرت کی شمس الدین نے ترک وطن سے قبل اپنے بیٹے خواجہ محمدؒ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ لیکن خواجہ محمدؒ کی کمزور حکمت عملی سے

فائدہ اٹھا کر اس کے دشمنوں نے سلطنت میں فساد مچایا اور شورشیں برپا کیں۔ ان مفسدوں کے سرغنے حاجی محمد قندھاری اور شیخ علی تھے۔ امیر محمد والی گیلان ان دونوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح ناچتا تھا۔ ان کے ظلم و ستم اور گیلان کی اندرونی کشمکش سے تنگ آکر محمود گاوان اپنے عزیز وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گیا اور تجارت کو کسب معاش کا ذریعہ بنایا۔ تاجر کی حیثیت سے مختلف ممالک کی سیر کرتا ہوا ۸۵۵ھ میں ہندوستان کی بندرگاہ دابھول[۱] میں داخل ہوا اس وقت اس کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ تھی۔

دکن کی عام حالت اس زمانہ میں دکن پر خاندان بہمنی حکمران تھا اور سلطنت بہمنیہ اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس کے علمی فنی اور تجارتی چرچے نہ صرف ہندوستان کے اندر بلکہ دور دراز ایشیائی سلطنتوں میں ہو رہے تھے۔ سلطان فیروز شاہ بہمنی اور احمد شاہ بہمنی کے عہد میں سلطنت بہمنی علم اور تمدن کے اعتبار سے بہت ترقی کر چکی تھی۔ لیکن سیاسی اور فوجی اعتبار سے اسکی حالت کمزور تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سلطنت چاروں طرف سے دشمنوں سے گھری ہوئی تھی۔ ایک طرف خاندیس اور گجرات کے سلاطین حملے کرتے تو دوسری طرف راجایان اڑیسہ اور وجیانگر اس کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ ان بیرونی مملکتوں کے حملوں کے علاوہ اندرون ملک باہمی اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ احمد شاہ ولی بہمنی کو تخت دلانے میں ایک شخص خلف حسن بصری نے بہت مدد کی تھی۔ احمد شاہ ولی بہمنی نے تخت نشین ہوتے ہی اس کو ملک التجار کا خطاب عطا کیا اور اس کا دربار میں بہت رسوخ ہو گیا۔ اسکے اس بڑھتے ہوئے اقتدار کو ملکی فریق دیکھ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے متحد ہو کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ مختصر یہ کہ اس پرآشوب زمانہ میں محمود گاوان دکن میں داخل ہوا۔

محمود گاوان کی شہرت اور عظمت کی سب سے پہلی وجہ خود اسکی ذاتی علمی قابلیت تھی۔ چنانچہ بیدر کی رونق اور علمی چہل پہل اس عالم اور مدبر شخصیت کو اپنے طرف کھینچے بغیر نہ رہ سکی اور ہندوستان پہنچنے کے بعد سب سے پہلے اس کے قدم محمد آباد (بیدر) کی طرف بڑھے جہاں ان دنوں سلطان علاء الدین ثانی فرمانروا تھا، جو خود عالم اور فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ اہل علم کا بڑا قدردان تھا۔ اس کو محمود گاوان جیسے

---

[۱] یہ بندرگاہ علاقہ کوکن میں واقع تھی

جہاں دیدہ عالم و فاضل شخص کی صحبت میں بہت لطف آیا اور چند ہی روز میں بادشاہ اس کا گرویدہ ہو گیا اور اسکو بہت عزیز رکھنے لگا۔ محمود گاوان پہلے ہی اپنے وطن کو خیرباد کر دیا تھا۔ جب اس نے بہت سے ہم وطنوں کو محمد آباد (بیدر) میں اعلیٰ مناصب پر دیکھا اور بادشاہ وقت کو مہربان پایا تو پھر دکن ہی کو اپنا وطن بنایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علاءالدین نے اُسے ایک ہزاری منصب عطا کر کے امراء میں شامل کر لیا۔ محمود گاوان کی ترقی کا یہ پہلا زینہ تھا۔ سنہ ۱۴۵۶ء میں علاءالدین کے بہنوئی جلال خان نے تلنگانہ کے صوبہ میں بغاوت کی اور محمود شاہ خلجی والی مالوہ سے مدد کا طالب ہوا سلطان علاءالدین نے اس مہم کے لئے محمود گاواں کو مقرر کیا۔ محمود گاوان نے اپنی جوانمردی اور بہادری کے جوہر دکھلائے جلال خان اور اس کے بیٹے سکندر خاں کو میدان جنگ میں سخت شکست ہوئی اور انہوں نے قلعہ گولکنڈہ کو محمود گاوان کے حوالہ کر کے امان کی درخواست کی۔ بادشاہ سے اُس کے قصور معاف کئے اور اسکو دوبارہ حاکم گولکنڈہ مقرر کیا۔ محمود گاوان کی اس کامیابی پر علاءالدین نے اسکو بہت سا انعام و اکرام دیا۔

سنہ ۱۴۵۸ء میں جب علاءالدین کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا ہمایون شاہ تخت نشین ہوا جو تاریخ دکن میں "ہمایون ظالم" کے نام سے مشہور ہے۔ علاءالدین نے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے کو یہ وصیت کر دی تھی کہ "محمود گاوان کی خاص طور پر قدردانی کرے کیونکہ اس شخص سے بہمنی سلطنت کو آئندہ تقویت پہونچیگی"۔ باپ کی اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ہمایون شاہ نے محمود گاوان کو ملک التجار کا خطاب عطاء کیا اور بیجاپور کا طرفدار مقرر کر دیا۔ اپنے زمانہ طرفداری میں محمود گاوان نے صوبہ کے انتظامات کو درست کیا اور صوبہ کو ہر قسم کے شور و شر سے محفوظ رکھا۔ سنہ ۱۴۶۱ء میں جب ہمایون شاہ کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا نظام شاہ جسکی عمر صرف آٹھ سال کی تھی تخت نشین کیا گیا۔ بادشاہ کی کمسنی کے باعث اُمور سلطنت کی انجام دہی کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس کے ارکین بادشاہ کی ماں نرگس بانو (جو تاریخ میں ملکہ مخدوم جہاں کے نام سے مشہور ہے) خواجہ جہان اور محمود گاوان تھے۔ کم عمر بادشاہ کی تخت نشینی سے فائدہ اُٹھا کر سلطان مالوہ اور راجہ اڑیسہ سلطنت بہمنی پر حملہ کر بیٹھے۔ راجہ اڑیسہ کو محمود گاوان نے سخت شکست دی۔ ابھی یہ جنگ ختم نہونے پائی تھی کہ مالوہ کے حکمران محمود شاہ خلجی نے بھی حملہ کر دیا۔ سنہ ۱۴۶۲ء میں اس نے قندھار کے قریب بہمنی

لشکر کو شکست دے کر بیدر کا رخ کیا۔ محمود گاوان نے نہایت دوربینی سے کام لیکر محمود شاہ گجراتی سے مدد طلب کی اور اسکی مدد سے محمود شاہ خلجی والی مالوہ کو شکست دیکر سرزمین دکن سے باہر کر دیا۔ اس جنگ کے ایک سال بعد ۱۴۶۳ء میں نظام شاہ کا عین شادی کی رات انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال پر اس کا بھائی محمد شاہ تخت نشین کیا گیا جس کو تاریخ میں محمد شاہ لشکری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ بھی کمسن تھا اس لئے سلطنت کے کاروبار وہی کمیٹی انجام دیتی تھی جو نظام شاہ کے عہد میں قائم کی گئی تھی۔ محمد شاہ کے ابتدائی دور میں خواجہ جہاں انتہائی خودسر ہو گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۶۶ء میں نظام الملک ترک کے ہاتھ اس کا کام تمام کیا گیا۔ خواجہ جہاں کے قتل کے بعد سلطنت بہمنی میں محمود گاواں کے علاوہ اور کوئی ایسا شخص نہ تھا جو کاروبار سلطنت بہ حسن و خوبی انجام دے سکے۔ اسی بنا پر محمود گاوان کو "وزیر کل" بنایا گیا اور اسی کے ساتھ ساتھ خلعت خاص اور خواجہ جہاں کا خطاب بھی دیا گیا۔ اُس وقت کے شاہی فرامین میں اس کے لئے حسب ذیل الفاظ استعمال کئے جاتے تھے۔

"مخدوم جہانیان معتمد درگاہ سلطان آصف جم نشاں امیر الامراء ملک نائب مخدوم خواجہ جہاں"

مذکورہ بالا خطاب سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ محمود گاوان کی کافی شہرت ہو چکی تھی۔ حقیقت میں محمد شاہ لشکری کا عہد حکومت اس کے جلیل القدر سپہ سالار اور دانشمند مدبر محمود گاوان کے کارناموں کا آئینہ ہے۔ خواجہ جہاں کا وزرا بہمنی میں وہی مرتبہ ہے جو خواجہ نظام الملک طوسی کو وسط ایشیاء کے وزیروں میں حاصل ہے۔

۱۴۶۳ء سے ۱۴۶۸ء تک اس نے اندرونی نظم و نسق کو درست کیا اور جب سلطنت بہمنیہ میں پورا امن ہو گیا تو پھر اس نے اپنی توجہ فتوحات کی جانب مبذول کر دی۔ ۱۴۶۹ء میں اس نے ایک جرار لشکر کے ہمراہ جانب کوکن کوچ کیا یہاں کے قزاقوں کو شکست دے کر گوا پر قبضہ کیا۔ گوا کی حفاظت کیلئے بہ کشتیوں کا بیڑہ مقرر کر دیا۔ گوا سے واپسی پر اس نے قلعہ بلگام کو فتح کیا جو وجیانگر کے راجاؤں کا مستحکم اور سرحدی قلعہ تھا۔ ان دونوں علاقوں کو فتح کر کے محمود گاواں جب بیدر پہونچا تو محمد شاہ نے دارالخلافہ میں اس کا نہایت شاندار استقبال کیا۔ اس کی اس کامیابی پر ملکہ مخدوم جہاں اسکو "بھائی"

سے مخاطب کرنے لگی ۔ بادشاہ نے اس کے خطابات میں اور اضافہ کیا " حضرت مجلس کریم سید عظیم ہمایون اعظم صاحب السیف والقلم مخدوم جہانیاں معتمد بارگاہ سلطان آصف جم نشان امیرالامراء ملک نائب مخدوم ملک التجار محمود گاواں المخاطب بہ خواجہ جہاں " ان فتوحات کے بعد خواجہ جہاں نے جملہ سیاسی کاروبار اور فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی ۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ کل سیاہ و سفید کا مالک بن گیا لیکن اس ترقی سے اس نے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کبھی کوشش نہیں کی مرتے دم تک خواجہ جہاں اپنے ملک اور اپنے بادشاہ کا سچا خیر خواہ تھا ۔ اسکی کوششوں کی بدولت سلطنت بہمنی کے حدود میں بہت ترقی ہوئی ۔ اس کے حدود مغرب میں کوکن سے لیکر مشرق میں مچھلی بندر تک اور شمال میں برار سے جنوب میں مالیگاؤں تک پھیلے ہوئے تھے ۔ اگر محمود گاواں جیسا سیاس ، دانا مدبر اور کارآزمودہ جنرل نہ ہوتا تو محمد شاہ لشکری کا اُن بیرونی حملوں کا مقابلہ کرکے اُس زمانہ کی سیاسی حالت پر قابو پانا بہت دشوار تھا ۔ ایسے نازک موقع پر بیرونی حملوں کی مدافعت کرکے سلطنت کو محفوظ رکھنا محمود گاواں کا سب سے اہم اور نہ مٹنے والا کارنامہ ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں حکومت تلوار کے زور سے قائم ہوتی ہے لیکن قیام کے بعد استحکام اور بقا کا انحصار تلوار پر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے ایک اچھے اور عمدہ نظم و نسق کی ضرورت ہوتی ہے ۔ دنیا میں وہی حکومت اچھی سمجھی جاتی ہے جو اپنی مملکت میں بہترین نظم و نسق جغرافی ماحول اور حالات کا لحاظ کرتے ہوئے قائم کرے ۔ اس نظم و نسق کے اعتبار سے بھی محمود گاواں کی عظمت اور بڑھ جاتی ہے قبل اس کے کہ ہم اس کے قائم کردہ نظم و نسق کو واضح کریں بہتر ہوگا اگر اس کے پیشتر کے نظم و نسق کا سرسری تذکرہ کردیا جائے ۔ سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے انتقال کے وقت سلطنت بہمنی کے قبضہ میں ، مہاراشٹر ۔ ورنگل (تلنگانہ) رائچور اور مدگل کرناٹک میں شامل تھے ۔ محمد شاہ اول کے عہد میں اسکے فاضل وزیر سیف الدین نے اس علاقہ کو چار حصوں میں تقسیم کردیا اور ہر حصہ کا نام " طرف " رکھ کر ان پر ' طرفدار ' مقرر کردیئے محمود گاواں کے زمانہ تک یہ تقسیم برقرار رہی ۔ لیکن جب محمود گاواں کی کوششوں سے سلطنت کے حدود میں اضافہ ہوا تو پھر قدیم تقسیم میں بھی تبدیلی ضروری تھی محمود گاواں نے

سلطنت بہمنی کو ۸ حصوں میں تقسیم کیا۔ اور ہر طرف پر ایک طرفدار مقرر ہوا۔ حسب ذیل ۸ اطراف تھے۔ (۱) بیجاپور (بشمول رائچور۔ مدگل) (۲) حسن آباد (بشمول گلبرگہ۔ ملدرگ اور شوراپور) (۳) دولت آباد (۴) کوکن (بشمول گوا اور بلگام) (۵) راجمندری (جسمیں گولکنڈہ۔ نلگنڈہ) (۶) ورنگل (۷) گاویل (۸) ماہور۔ ہر ایک ’طرف‘ پر ایک ایک ’طرفدار‘ مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کے اخراجات سرکاری خزانہ سے ادا کئے جاتے تھے۔ طرف (صوبہ) کے اندر جتنے بھی قلعے ہوا کرتے تھے انکا انتظام خواجہ جہاں سے پہلے اسطرح ہوا کرتا تھا کہ طرفدار خود اپنے علاقہ کے قلعوں پر خود ہی قلعہ دار مقرر کرتا تھا لیکن محمود گاوان نے اس طریقہ کو توڑ دیا۔ سلطنت کے جملہ قلعوں پر مرکزی حکومت کی جانب سے قلعہ دار مقرر کئے جاتے تھے اور انکی تنخواہیں مرکزی خزانہ سے ادا کی جاتی تھیں۔ اس انتظام کی اصلی غرض وغایت یہ تھی کہ طرفداروں کی قوت اور طاقت میں کمی کردی جائے اور انہیں اس بات کا موقع نہ دیا جائے کہ وہ علم بغاوت بلند کرسکیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ خواجہ جہاں کی یہ کوشش تھی کہ مرکزی حکومت کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہونچائی جائے۔ تاکہ وہ صوبوں کی حکومت پر پورا قابو رکھ سکے۔ نظم ونسق کے سلسلے میں اسکا دوسرا کام فوجی تنظیم ہے۔ فوجی تنظیم کو ہر زمانہ میں خاص اہمیت رہی ہے کیونکہ حکومت کی کامیابی کا دارومدار ملک کی حفاظت اور امن وامان کا قیام فوج کی کارکردگی پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک کی فوجی طاقت کمزور ہو تو پھر غنیم بہ آسانی اس ملک پر حملہ کرسکتے ہیں۔ چونکہ محمود گاواں کے عہد وزارت میں سلطنت بہمنی چاروں طرف سے دشمنوں سے گھری ہوئی تھی اس لئے سلطنت کی حفاظت اور بقا کے لئے ضروری تھا کہ ایک کارآزمودہ فوج ہمیشہ تیار رہے۔ بہمنی سلطنت کی ابتدا میں فوجی تنظیم اس طرح ہوتی تھی کہ بڑے بڑے جاگیرداروں کو زمینات عطا کی جاتی تھیں اور انہیں اس امر کا مجاز گردانا جاتا تھا کہ وہ اپنی جاگیر کی آمدنی سے ایک مقررہ تعداد پیدل اور سوار فوج کی رکھیں تاکہ وقت ضرورت سلطنت کی مدد کرسکیں۔ جاگیردار عموماً پانصدی اور ہزاری ہوا کرتے تھے۔ افسران پانصدی کو ایک لاکھ ہون اور افسران ہزاری کو دو لاکھ ہون ملا کرتے تھے۔ یہ رقم یا تو خزانہ شاہی سے دی جاتی تھی یا جاگیرات دئے جاتے تھے۔ بالعموم جاگیرات ہی دئے جاتے تھے۔ اس طریقہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئیں تھیں

مثلاً جاگیردار اپنی جاگیری محاصل کا بیشتر حصہ اپنے ذاتی اخراجات پر صرف کردیتے تھے۔ فوج کی انہیں کوئی پروا نہ تھی اور جب مرکزی حکومت کو فوج کی ضرورت پڑتی تو کرایہ کے گھوڑے اور آدمی فراہم کرکے مرکزی حکومت کے حوالہ کردیتے۔ اس خرابی کو شمالی ہند میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے محسوس کیا اور اپنی فوجی اسکیم کے ذریعہ اس کا سدباب کیا۔ لیکن دکن میں سب سے پہلے اس خرابی کو محسوس کرکے اس کو دور کرنے کا خیال محمود گاواں کو پیدا ہوا اور اس کی کامیابی کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ اس نے تمام جاگیرات ضبط کرلئے اور سپاہی سے لے کر امرا تک کے لئے اس نے سرکاری خزانہ سے نقد تنخواہیں مقرر کردیں اس کے علاوہ سپاہیوں کو خوش رکھنے کے لئے بہت سے تدابیر وقتاً فوقتاً اختیار کرتا رہا۔ کبھی تو انہیں پیشگی تنخواہیں دی جاتی تھیں اور کبھی انعام واکرام سے سرفراز کیا جاتا تھا تاکہ وہ میدان جنگ میں دلجوئی سے کام کریں۔ ان ہی عنایات کا نتیجہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے میدان کارزار پر بہ آسانی غلبہ پا جاتا تھا اُسکے زمانہ میں فوج کی حالت نہایت عمدہ تھی چنانچہ ایک پرتگیزی سیاح ڈوارٹ باربوسا نامی اس زمانہ کی فوجی حالت کے متعلق یہ لکھتا ہے کہ " فوج میں سواروں کی کثرت تھی جو عموماً ایران وترکستان وغیرہ کے رہنے والے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے اور ان کا لباس سوتی کپڑے کا ہوتا تھا۔ اور سروں پر مختصر ٹوپیاں اوڑھتے تھے۔ گردنوں میں ترکی کمانیں اور ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے ہوتے تھے۔ تیراندازی میں بہت مشاق تھے۔ توپوں کا رواج ہوچکا تھا اکثر توپچی ایرانی ہوا کرتے تھے۔ پیدل فوج کے پاس کٹار۔ نیزا اور تلواریں ہوا کرتی تھیں"[1]

نظم ونسق کے سلسلہ میں آخری چیز اس کا انتظام مالگذاری ہے۔ اس نے دیہات۔ تعلقات اور اسمات کی باضابطہ پیمائش کروائی اور ان پر محاصل بہ لحاظ زرخیزی لگائے جاتے تھے لگان کے وصول کرنے میں خاص قسم کی رعایتیں کی جاتی تھیں تاکہ رعایا پر ظلم وستم نہ ہوسکے تاریخ ہند میں محمود گاواں ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے مالگذاری کی طرف توجہ کی۔ گو اس نے اس سلسلہ میں کوئی مکمل نظام نہیں مرتب کیا لیکن پھر بھی وہ پہلا شخص ہے جس نے اس کی ابتدا کی۔ جس کی تقلید شیر شاہ اور پھر اکبر نے کی۔ باغات سے اس کو خاص دلچسپی تھی۔ بیدر میں ہمہ اقسام کے میوہ کے درخت لگوائے۔ زعفران کی کاشت کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا

[1] سفرنامہ باربوسا

کہا جاتا ہے کہ کشمیر کے بعد بیدر کی زعفران بہت عمدہ مانی جاتی تھی۔

محمود گاوان نہایت ذی علم اور بہت بڑا عالم تھا۔ ہر علم میں اس کو کافی مہارت حاصل تھی بالخصوص علم طب اور ریاضی میں اسکو خاص ملکہ تھا۔ نظم و نثر میں بھی اس کو کافی دخل تھا۔ اس کے خطوط کا مجموعہ جسکو " ریاض الانشار" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انہی خطوط کے ذریعہ ہم کو نہ صرف محمود گاواں کی خانگی زندگی کے حالات معلوم ہوتے ہیں بلکہ بہمنی نظم و نسق۔ فوجی تنظیم اور اس زمانہ کی سیاسیات کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ریاض الانشار کے علاوہ اس نے فن انشار پر بھی ایک کتاب لکھی ہے جسکو " مناظر الانشاء " کہتے ہیں۔ اس کتاب کی تالیف میں بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے عربی اور فارسی زبان کی مستند کتابوں سے مدد لی ہے۔ اس میں فن انشار کے متعلق جملہ لوازمات صاف طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً اس نے بتایا ہے کہ فصاحت کسے کہتے ہیں اور اس کے لوازمات کیا ہیں صنایع اور بدایع کی حقیقت کیا ہے۔ کلام کی فصاحت و بلاغت کے لئے کن کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس سے اسکے وسعت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے۔

محمود گاوان نہ صرف خود عالم تھا بلکہ علم دوست بھی تھا۔ اس کا دربار ہمیشہ علم دوست حضرات سے معمور رہتا تھا۔ دور دراز ملکوں کے علم دوست علمار اور فضلار کو دعوت علم دیا کرتا تھا۔ اس کے بزم سخن کے مشہور عالم ملا عبدالکریم ہمدانی (جس نے خواجہ جہاں کی سوانحعمری لکھی ہے) ملا شمس الدین اسکا ملازم اور اس زمانہ کا فارسی کا مشہور شاعر سامی تھے اس نے مولانا عبدالرحمٰن جامی کو جو اس زمانہ کے بلند پایہ شاعر تھے محمد آباد (بیدر) آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن چند خاص مجبوریوں کے باعث وہ نہ آسکے لیکن انہوں نے اس دعوت پر اپنی مشہور کتاب "تحفۃ الاصرار" خواجہ جہاں کی خدمت میں روانہ کی اور اس کے ساتھ فارسی میں یہ قطعہ بھی روانہ کیا ؎

جامی اشعار دلاویز تو چنیں است لطیف — بود آں حسن ادا لطف معانی تارش

ہمرہ قافلۂ ہند رواں کن کہ رسد — شرف عز و قبول ملک التجارش [۱]

خود ذی علم تھا اور عالموں کی صحبت سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ خواجہ جہاں سے اہل دکن میں علمی

[۱] معجزۂ محمود

ذوق، ذہنی تربیت اور دماغی نشو و نما کے لئے شہر محمد آباد (بیدر) میں ۱۴۷۲ء میں ایک نہایت عالیشان مدرسہ تعمیر کروایا۔ یہ وہی مدرسہ ہے جو محمود گاواں کا سب سے درخشان کارنامہ تصور کیا جاتا ہے اور جس کی شہرت اس زمانہ میں تمام دنیاء اسلام میں ہو چکی تھی۔ مدرسہ آبادی کے وسط میں واقع ہے جس کا طول شرقاً غرباً ۵ ، گز شمالاً جنوباً ۵۵ گز ہے۔ مدرسہ کے سامنے دو مینار جنکی بلندی تقریباً ۱۰۰ فٹ ہے نصب کئے گئے تھے لیکن اب ان میناروں میں سے صرف ایک باقی رہ گیا ہے۔ مدرسہ کے چاروں طرف اساتذہ اور طلباء کے رہائشی کمرے تھے۔ صحن میں ایک مسجد تھی۔ مدرسہ کے کل مصارف اور طلباء کی تعلیم و تربیت کا نہایت اعلیٰ پیمانہ پر انتظام تھا۔ ممالک مصر، شام اور ایران سے علماء بلوائے گئے تھے جنہیں معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ مدرسہ میں مقیم اور نادار طلباء کو کھانا کپڑا مفت دیا جاتا تھا۔ اس مدرسہ کی وجہ سے بیدر کی علمی چہل پہل میں نمایاں اضافہ ہو گیا۔ اور بیدر کو دکن میں علمی اعتبار سے وہی اہمیت حاصل تھی جو سلاطین شرقی کے زمانہ میں جونپور کو خلیفہ ہارون اور مامون کے عہد میں بغداد کو حاصل تھی۔ لیکن افسوس کہ زمانہ کے انقلاب نے اس عمارت کے ایک حصہ کو تباہ کر دیا اور آج نہ وہاں عالموں کے علمی مباحثے ہیں اور نہ قرآن خوانی بلکہ ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت ہے جو اپنے علم پرور بانی کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ اور یہ ایسی علمی یادگار ہے جس کی شمالی ہند میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ سر رچرڈ ٹمپل نے اپنے سفرنامہ حیدرآباد کشمیر اور سکم میں لکھا ہے کہ " ہندوستان کی قدیم علمی عمارتوں میں جو اس وقت موجود ہیں یہ عمارت بہت ہی عمدہ اور بے مثل ہے " خواجہ جہاں کا بنایا ہوا یہ مدرسہ اورنگ زیب کی غلطی سے ۱۰۸۷ھ میں تباہ ہو گیا۔ اسکی تباہی کے متعلق یہ روایت ہے کہ " گولکنڈہ کی مہم کے زمانہ میں اورنگ زیب نے اس مدرسہ کے کچھ حصہ کو بارود خانہ بنوایا۔ اتفاق سے رات میں بجلی گری اور مدرسہ تباہ ہو گیا۔

علمی قابلیت، نظم و نسق کی صلاحیت اور اعلیٰ فوجی مہارت کے ساتھ ساتھ جو صفت اسکی شہرت اور نام آوری کا باعث ہوئی وہ اسکی سخاوت اور سادہ زندگی ہے۔ اسکی سادگی کا مقابلہ ہم ایک صاف اور شفاف نہر سے کر سکتے ہیں جو نہایت خاموشی سے بہ رہی ہے اور غوغا و زور و شور سے پاک ہے مگر

جس طرف سے گذرتی ہے اس کے کناروں پر کی کھیتیاں لہراتی ہوئی نظر آتی ہیں اسکی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ بھیس بدل کر سینکڑوں محتاجوں کو غنی کر دیا۔ خزانہ درویشاں اسکی تجارت سے جمع کی ہوئی آمدنی کا خزانہ تھا جس کے ذریعہ زاہدوں، عالموں اور نادار طلباء کی مدد کی جاتی تھی۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ باوجود اس جاہ و مرتبہ کے جو اس کو دکن میں حاصل تھا اس نے اپنے عزیز پیشہ تجارت کو مرتے دم تک نہیں چھوڑا۔

اس کو محمد شاہ لشکری کی ناقدری اور محمود گاواں کی بدقسمتی تصور کرنا چاہئے کہ اس مدبر اور فاضل ہستی کا حیرتناک عروج عبرتناک انجام کی صورت میں نمودار ہوا محض ایک بے بنیاد اور سازشی خط کے الزام میں بادشاہ نے متاثر ہو کر اس کو قتل کرا دیا۔ اس کے قتل کا اصلی واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں دکن میں دو سیاسی فریق تھے ایک تو ملکی اور دوسرا غیر ملکی جس کو اس زمانہ کی اصطلاح میں "آفاقی" کہتے تھے۔ ملکی فریق کی کوشش یہ تھی کہ غیر ملکی فریق کو ملک سے پاک کیا جائے چنانچہ ان کی اس کوشش کا پہلا ظہور واقعہ چاکنہ میں خلف حسن بصری کے قتل کی شکل میں نمودار ہوا۔ خلف حسن بصری کے قتل کے بعد انکی نظریں ہمیشہ محمود گاواں پر پڑتی تھیں جو غیر ملکی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ہم وطنوں کو بڑی بڑی جائدادیں عطا کر کے اپنے اقتدار کو تقویت دے رہا تھا۔ ملکی فریق کا رہنما ملک حسن نظام الملک بحری طرفدار راجمندری تھا۔ محمود گاواں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو نظام الملک دیکھ نہیں سکتا تھا اور اس بات کا متلاشی تھا کہ وقت ملے اور اس کا کام تمام کر دیا جائے۔

محمد شاہ لشکری اور محمود گاواں اڑیسہ پر حملہ کرنیکی غرض سے دارالخلافہ سے روانہ ہوئے بجواڑہ سے دس میل کے فاصلہ پر بمقام کندہ پلی شاہی کیمپ قائم کیا گیا۔ اس مقام پر نظام الملک بحری اور اس کے ساتھیوں نے ایک جعلی خط اڑیسہ کے راجہ کے نام تحریر کیا جس کا مضمون یہ تھا "محمد شاہ کی شراب خواری اور ظلم نے ہم سب کو اُس سے بددل کر دیا ہے اور آپ کی ادنیٰ توجہ سے دکن کی فتح ممکن ہے کیونکہ سرحد پر کوئی ہشیار افسر موجود نہیں ہے۔ ملک کے اکثر امراء میرے اثر میں ہیں جس وقت آپ بے خوف و خطر اپنے لشکر کے ساتھ مملکت دکن میں داخل ہو جائیں گے میں بھی ہر طرف سے مخالفت

کھڑی کردوں گا اور بادشاہ کو نکال باہر کردینے کے بعد مملکت دکن کو آپ ہم آپس میں برابر تقسیم کرلیں گے“ ف
اس خط پر محمود گاواں کی مہر لگا کر بادشاہ کے پاس بھیجدیا گیا۔ بادشاہ اس خط کو پڑھتے ہی بہت غصہ میں آیا اور فوراً محمود گاواں کو طلب کیا۔ اس دوران میں محمود گاواں کو اس راز کا پتہ چل گیا اس کے ساتھیوں نے اسے بغاوت کرنے یا ملک سے فرار ہونیکی رائے دی لیکن وہ بادشاہ کا وفادار اور دیانتدار ملازم تھا انکی رائے سے اختلاف کیا اور دربار میں حاضر ہوگیا۔ بادشاہ نے اس سے سوال کیا کہ ”اگر کوئی شخص اپنے آقا کے ساتھ نمکحرامی کرے اور یہ امر پایہ ثبوت کو پہونچ جائے تو اس کی کیا سزا ہے“ خواجہ جہاں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ ”اگر پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو ایسے بدبخت کی سزا سوائے شمشیر آبدار کے کیا ہوگی،“ ف اس پر بادشاہ نے خواجہ جہاں کو خط دکھایا خواجہ نے مہر کے متعلق اقبال کیا کہ وہ اسی کی ہے لیکن مضمون سے انکار کیا۔ محمد شاہ نشہ میں تھا فوراً اپنے حبشی غلام جوہر کو قتل کا حکم دیا۔ محمود گاواں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ”میں تو اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکا ہوں اگر آج قتل نہیں ہوا تو کل اپنی موت مرجاؤں گا مگر میرا قتل ملک کی خرابی اور حضور کی بدنامی کا موجب ہوگا“ چنانچہ بعد کے آنے والے واقعات سے خود اسکی عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ ادھر اسکی آنکھ بند ہوئی ادھر سلطنت بہمنی کا شیرازہ بکھرا۔ بادشاہ نے اسکی درخواست کی کوئی پروانہ کی۔ اسکے حکم کے مطابق ۵ ماہ صفر ۸۸۶ھ مطابق ۱۴ اپریل ۱۴۸۱ء میں بمقام کندہ پلی اس اولوالعزم اور جلیل القدر ہستی کا سر تن سے جدا کیا گیا۔ اسکی نعش کو بیدر کے جنوب میں ایک تالاب کے کنارے جو بیان کیا جاتا ہے اسی کا بنایا ہوا ہے دفن کیا گیا۔
اس کا مقبرہ آج تک اچھی حالت میں موجود ہے۔ قتل کی تاریخ جو ملا عبدالکریم ہمدانی نے نکالی ہے اسکے مزار پر کندہ ہے

سال فوتش گر کسے پرسد بگوی
بے گناہ محمود گاواں شد شہید

جوہر غلام کی خونخوار تلوار کا وار خواجہ جہاں کی گردن پر نہیں پڑا تھا بلکہ سلطنت بہمنی کے استحکام کی جڑ پر لگا تھا۔ خواجہ جہاں کے مضبوط اور طاقتور ہاتھوں نے تمام فتنہ و فساد کو دبائے رکھا تھا اور جب اس کے آہنی پنجہ کی گرفت چھوٹ گئی تو پھر ہر طرف شورش برپا ہو گئی۔ کسی بڑے شخص کا

ف تاریخ فرشتہ

ذی اقتدار ہونا جس قدر ملک کے لئے مفید ہے اسی قدر مضر بھی ہے۔ کیونکہ جب تک اس شخصیت کا وجود رہتا ہے اس وقت تک کوئی فتنہ و فساد نہیں ہوتا اسکے بعد پھر ہر طرف سے فتنہ و فساد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جو حال خلافت بنی امیہ کا اندلس میں حاجب منصور کے بعد ہوا۔ وہی حال سلطنت بہمنی کا محمود گاواں کے بعد ہوا۔ محمود گاوان کا قتل دکن میں فرقہ واریت کا انتہائی عروج تھا۔ اس کے قتل کے بعد ہی ملکیوں اور غیر ملکیوں میں سخت کشمکش ہونے لگی۔ اس باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور دراز کے صوبیدار اپنی خودمختاری کی سوچ میں لگے رہے۔ مرکزی حکومت کی ان پہ کوئی گرفت نہیں تھی گاوان کے قتل کے بعد ترکوں اور ایرانیوں نے دربار سے اپنے تعلقات منقطع کرلئے اسکے دو وجوہ تھے اوّل تو یہ کہ انکو ڈر ہونے لگا کہ اگر وہ مرکز سے تعلقات برقرار رکھیں تو آئندہ ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو محمود گاواں اور خلف حسن بصری کا ہوا۔ دوم یہ کہ وہ شاہی دربار اور دکنی فریق سے بدلہ لینا چاہتے تھے اس وقت بادشاہ کی آنکھ کھلی اور یہ محسوس کرنے لگا کہ محمود گاواں کو قتل کرنے میں اس نے زیادتی کی۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا خود کردہ را علاج نیست طرفدار درباری حاضری سے صاف طور پر انکار کرنے لگے سب سے پہلے فتح اللہ عماد الملک نے درباری حاضری سے انکار کیا۔ اسکے بعد دیگر طرفداروں نے بھی انکار کردیا سلطنت بہمنی کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ جب محمد شاہ لشکری کا بھی محمود گاواں کے قتل کے دو سال بعد انتقال ہوگیا تو پھر ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوگیا اور آخر کار خواجہ جہاں کو قتل ہوئے ۲۵ سال بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ ۱۵۲۶ء میں سلطنت بہمنی کا خاتمہ ہوگیا اور بہمنی سلطنت کے حصے بخرے ہوگئے۔

غرض محمود گاواں ایک فیاض، عالم اور مدبر وزیر اعظم تھا۔ اس نے سرزمین دکن میں وہ خدمات انجام دی میں جسکو تاریخ دکن کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ جسطرح تاریخ ہند میں سلطان ناصر الدین محمود کا عہد اس کے نامور وزیر بلبن کے کارناموں کی وجہ سے درخشاں ہے اسطرح محمد شاہ لشکری کا عہد تاریخ دکن میں محمود گاواں کے اعلیٰ کارناموں کا آئینہ ہے۔ تاریخ میں محمد شاہ لشکری کا عہد محض اسکے وزیر کے کارناموں کی بنا پر زندہ ہے جس سلطنت کی بنیاد علاء الدین حسن گنگو بہمنی نے ڈالی تھی جسکو محمد شاہ اول اور اس کے وزیر سیف الدین نے مستحکم کیا تھا اور جسکو فیروز شاہ بہمنی نے اپنے تمدنی کارناموں سے آراستہ کیا تھا محمود گاواں نے اپنی فوجی قابلیت کے ذریعہ اسکے انتہائی حدود تک پہونچا کر اسمیں علمی جھلک پیدا کردی تھی فقط

محمد بشیر الدین (سال چہارم)

احساسات

یہ نظم ترکی ادبیات کے ایک افسانہ "ایثار کی عظمت" سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے اس افسانہ میں ایک پرستارِ حُریت ترک ماں اپنے لڑکے کو مخاطب کر کے قوم و ملت کی سربلندی کیلئے مجاہدانہ سرفروشی کا حیات افروز درس دیتی ہے۔

اے وطن کی آبرو و عظمت و عزّ و وقار
ہے وطن کی ساری امیدوں کا تجھ پر انحصار
ہو رگوں میں خون کے بدلے رواں حبِّ وطن
تیرے دل میں ہوں فقط جذباتِ قومی موجزن
سعیٔ پیہم، عزم راسخ ہیں یہ اسرارِ حیات
قوتِ کردار سے تسخیر کر تو کائنات

آسماں سے بھی ستارے توڑ لا سکتا ہے تو
یاد رکھ! یہ یاد رکھ!! دنیا ہلا سکتا ہے تو
اپنے نطق سحر زا سے کرنا تو عالم کو دنگ
نام سنکر تیرا ہو ہیبت زدہ روحِ فرنگ
زندگی تیری ہو اک زریں حدیثِ انقلاب
جس کو سن کر جاگ اُٹھیں اقوام جو ہوں محوِ خواب
تو ہر اک سینے میں بھر دے سوزِ ملّت کے شرار
عظمت و شوکت ہو تیرے ہر عمل سے آشکار
سربلند رکھنا جہاں میں اپنا تو قومی نشاں
عظمت و شوکت ہو اس کی دہر میں وردِ زباں
عظمت و اقبال کے پرچم کو لہراتا ہوا
قصرِ استبداد کی بنیاد کو ڈھاتا ہوا

حریت کی آگ کو ہر دل میں بھڑکاتا ہوا
قلبِ ملت میں عمل کا خون دوڑاتا ہوا
قومی عظمت کا ترانہ اپنی تو گاتا ہوا
قصۂ دار و رسن کو پھر سے دہراتا ہوا
عظمتِ ایثار کا تو راز سمجھاتا ہوا
ہاں! کٹا دے سر کو بھی وقتِ ضرورت جھومتا
کار فرما تجھ میں ہو ذوقِ حیاتِ جاوداں
نوجواں! اے نوجواں! اے قوم کی روحِ رواں
خدمتِ قوم و وطن ہو زندگانی کا شعار
تو متاعِ زندگی کو قوم پر کر دے نثار

محمد علی نیر بی۔ ایس۔ سی
(ابتدائی)

"خواب ناز"

اُٹھو اُٹھو میرے چاند ! یہ نیند کیسی ۔

میں جاگتی ہوں تم سوتے ہو ۔ یہ پاس محبت نہیں ۔ ہم تمہارے لئے جاگیں اور تم سو جاؤ نہیں یہ ٹھیک نہیں ۔ میرے اچھے لال دیکھو ہوائیں منتظر ہیں تمہاری ترنم ریز آواز کو فضا میں پھیلانے کیلئے ۔

اُٹھو اُٹھو میری جان ! یہ بے وقت نیند کیسی ———

تمہاری معصوم صورت میری روح ، میرے دل اور ہنسی کو سرعت سے اپنی ہنسی میں ہمیٹ رہی ہے ۔ گرم گرم سانس میری رگوں میں منجمد خون کو پگھلا رہی ہے ۔ کیا یہ تم نہیں جو میری رگوں مں دوڑ رہے ہو؟ میری سوئی ہوئی آرزوں کو دعوت ہوشیاری دیکر خود سو رہے ہو ——— !

اُٹھو اُٹھو میری تمناؤں کے مرکز ! یہ نیند کیسی ———

آہ خاموشی ، سکوت ، سکون یہ چیزیں ناقابل برداشت ہیں ۔ خواہشیں مچل رہی ہیں ۔ آرزوئیں بیتاب اور تمنائیں مضطرب ۔ موسیقی سے لبریز اور شیرینی میں ڈوبی ہوئی آواز سننے کے لئے ۔ محبت کا ایک کلمہ اور عنایت کا ایک لفظ سننے کے لئے

اُٹھو اُٹھو میری آرزوں کے رنگین خواب ! یہ نیند کیسی ــــــــــ

چاند ابر کے دھندلکے میں سے تمہاری لاپروائی اور میری بیتابی کس حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ اسکی پھیکی اور اداس روشنی میں کبھی تم کو دیکھتی ہوں اور کبھی اُس کو۔ چاند کی اُداسی اور ناتوانی دیکھ کر اس حسین دوشیزہ کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے، جس کے رنگین شباب کو خزاں کے پھول کی طرح بیماری نے بے وقت مرجھا دیا ہو، اور جس کا زرد بے رنگ چہرہ زمانہ کی نیرنگی کا مرقع اور جس کے سفید مرمریں ہاتھ محتاج جنبش ہوں، جس کی بے رنگ آنکھیں مایوسیوں کی آماجگاہ بن کر سبق عبرت پڑھا رہی ہوں۔ آہ اداس منظر۔ میں سہمی جا رہی ہوں ــــــــــ

اُٹھو اُٹھو میرے دلنواز !

ہوائیں کیسی سرد چل رہی ہیں۔ میں خیالات کے سیلاب اور حسن خوابیدہ کے نظارہ میں بیخود ہوئی جا رہی ہوں۔ کسی بات کا ہوش نہیں۔ آہ تمھیں ذرا بھی پرواہ نہیں۔ کیسے ناقدرشناس ہو تم !

اُٹھو اُٹھو . . . . .

تم نہیں جانتے کہ میں تمھیں کس قدر چاہتی ہوں۔ بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے، جذبات نگار پیدا ہوئے، شاعر پیدا ہوئے لیکن کسی نے بھی وہ الفاظ نہیں چھوڑے جو میرے جذبہ کی ترجمانی کرسکیں۔ اور نہ مجھ میں اتنی قابلیت ہے کہ تمھیں اپنی محبت کا حال سُنا سکوں۔ زبان تو نہیں شاید میری آنکھیں، مامتا کے جوش کو، دل کی گہرائی میں پنہاں رہنے والے راز کو عریاں کرسکیں۔ پڑھو میری آنکھوں میں ــــــــــ

اُٹھو اُٹھو میرے سفینۂ زندگی کے ناخدا اُٹھو !

میری چاہت کو تم نے نہ سمجھا۔ میں ذرہ ناچیز ہوں۔ لیکن اس ذرہ میں خدا نے ایک جوہر نایاب پوشیدہ رکھا ہے۔ اور وہ ہے تمہاری محبت۔ تم اس کو بے حقیقت نہ سمجھو۔ میں فانی ہوں مگر میری محبت غیر فانی۔ میری زندگی ایک تنکے سے زیادہ کمزور۔ لیکن اس ادنی تنکے میں بھی اتنی قوت ہے کہ زمانہ کی ہوا اُس کا رخ نہ پھیر سکے گی۔ وہ فنا بھی ہوگا تو محبت ہی کے طوفان میں !

آہ رات بہت زیادہ ہوگئی تم نہ اُٹھو گے !!

میرے خیالی دنیا کے ننھے راجا ! شاید میرا جذب دل کمزور رہا اور میرے نالے بے اثر۔ تمہاری نیند مست۔ ہاں میرے متوالے کنیا یہ بھول نہ جاتا کہ صرف تم میری ہی زندگی کا سہارا ہو بلکہ ملک کے سچے خدمت گذار اور قوم کی نیا کے کھیون ہار بھی۔

سو رہو میری آنکھوں کے تارے ! سو رہو ——

میری خاموش آہیں تمھاری نیند میں خلل انداز نہ ہونگی ——

نجم السحر　　（عثمانیہ）

مصور کا جنون

آرنلڈ بنیٹ کے مشہور ڈرامہ گریٹ اڈونچر کو اپنایا گیا ہے۔
ذیل میں اس کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے

(جہانگیر ہوٹل۔ نہایت آراستہ کمرہ جسمیں ٹیلیفون بھی ہے۔ اس کمرے کے تین دروازے ہیں۔ ایک درو[ازہ]
عام راستہ کی طرف دوسرا سونیکے کمرے کی طرف واقع ہے۔ وقت دوپہر۔ حامد اور نرس بیٹھے با[تیں]
کررہے ہیں۔)

حامد۔ آپ نے اپنی تشریف آوری سے مجھے بیحد ممنون کیا۔

نرس۔ آپ کا مزاج تو ٹھیک ہے؟

حامد۔ رات سے کچھ پستی محسوس کررہا ہوں۔ ممکن ہے مسلسل تکان کا نتیجہ ہو۔

نرس۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ اس قدر بار لینے کی کیا ضرورت تھی۔ (حامد کھانستا اور کانپتا بھی [ہے])
کیا جاڑا محسوس ہو رہا ہے؟

حامد۔ خفیف سا۔ اگر اجازت ہو تو گرم کوٹ پہن لوں (اُٹھنا چاہتا ہے)

نرس ۔ (اٹھتے ہوئے) تشریف رکھئے ۔ میں لے آتی ہوں ۔ (کوٹ لاتی ہے ۔ حامد اُٹھکر کوٹ لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے) ضرورت نہیں ۔ میں خود پہنا دونگی ۔ (حامد کو کوٹ پہنا دیتی ہے ۔ گنڈیاں لگاکر بیٹھ جاتا ہے ۔ نرس بھی بیٹھ جاتی ہے)

حامد ۔ آپ کا بیحد شکریہ ۔

نرس ۔ شکریہ کی کیا بات ۔ (ہاتھ سے حامد کے کوٹ کو پاؤں کی طرف کھینچتے ہوئے) پاؤں بھی گرم رکھا کیجے ۔ اس کوٹ کا کپڑا تو آپ کے جسم پر خوب کھل رہا ہے ۔

حامد ۔ ہاں یہ کپڑے کی خوبی ہے ۔

نرس ۔ (لاڈ سے ۔) نہیں بلکہ آپکی (حامد ہنستے ہوئے کھانستا ہے) دیکھئے کھانسی بڑھ گئی ہے ۔ ذرا کھانے میں احتیاط برتئے ۔

حامد ۔ آج کل دنیا کی کیا خبریں ہیں ۔ باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملتا ۔ اور نہ کئی روز سے اخبار ہی دیکھ سکا ۔

نرس ۔ کوئی خاص خبر نہیں ۔ شہر تمام میں اور سب اخباروں میں بس چرچا ہے تو تمھارے آقا کی موت کا ۔

حامد ۔ ہاں کیا اس قدر زیادہ تذکرہ ہو رہا ہے ۔

نرس ۔ کیوں نہو ۔ کیا وہ کوئی معمولی شخص تھا ۔ نہایت مشہور قابل اور یکتائے روزگار اپنے زمانہ کا مانی اور بہزاد کہا جائے تو بجا ہے ۔ اس کی موت سے ملک کو سخت ترین نقصان پہونچا ہے ۔ اسکے نام سے ملک اور قوم کی عزت وابستہ تھی ۔ لوگ مرثیے لکھ رہے ہیں مختلف انجمنوں کی طرف سے تعزیتی جلسہ ہو رہے ہیں ۔ اکثر اخباروں نے اظہار افسوس کے طور پر لمبے چوڑے اداریے لکھے ہیں چنانچہ روزنامہ مصور کا شاندار اداریہ خود میں نے پڑھا ہے ۔

حامد ۔ اوہو ۔ شاندار اداریہ ۔ خوب !

نرس ۔ یہی نہیں بلکہ تقریباً پورا اخبار اسی قسم کے مضامین اور خبروں سے بھرا ہوا تھا ۔

حامد ۔ خوب ایک مصور کی موت پر اتنا گہرا سوگ ۔

نرس ۔ تم کو اس کی کیا قدر ۔ ٹھیک ہے گھر کی مرغی دال برابر ۔

حامد ۔ مگر یہ مرثیے تو ٹھیک نہیں معلوم ہوتے ۔

نرس ۔ کیوں ؟ بڑے آدمیوں کی موت پر تو مرثیے اکثر لکھے جاتے ہیں ۔

حامد ۔ لیکن ۔لیکن . . . .

نرس ۔ نہیں آپ کا خیال غلط ہے ۔ ضرور لکھنا چاہئے ۔

حامد ۔ اچھا تو اخبار میں کیا لکھا تھا ۔

نرس ۔ کیا مجھے سب کچھ یاد ہے ۔ پورا اخبار انہیں خبروں سے بھرا ہوا تھا ۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ اڈیٹر نے اپنے ادارے میں اس امر کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے کہ مرحوم مصور، حامد صاحب نہایت تنہائی پسند اور چڑچڑی طبیعت کے انسان تھے ۔

حامد ۔ واہ چڑچڑی طبیعت کیا معنی ۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ اور یہ بھی غلط کہ ان کو تنہائی بہت پسند تھی بلکہ وہ بیہودہ گویوں اور فضول بکواس کرنے والوں سے بہت کم ملتے تھے ۔

نرس ۔ میں اس کا تصفیہ کرنے نہیں بیٹھی ہوں ۔ جو پڑھا تھا کہدیا ۔

حامد ۔ خیر۔ اسکے علاوہ اور کوئی خاص بات ؟

نرس ۔ ہاں ۔ یہ بھی لکھا تھا کہ ہمارے خیال میں مانی کے بعد اگر کوئی مصور صحیح معنی میں گذرا ہے تو وہ ہمارے ملک کے مایۂ ناز سپوت حامد صاحب ہی تھے ۔

حامد ۔ ہاں کیا ایسا لکھا ہے ۔

نرس ۔ اگر ان باتوں سے تمھیں اتنی دلچسپی ہے تو اخبار کیوں نہیں پڑھ لیتے ۔

حامد ۔ اپ نے بالکل ٹھیک کہا ۔ یقیناً مجھے وہ اخبار پڑھ لینا چاہئے ۔ (اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے)

نرس ۔ (روکتے ہوئے) بیٹھئے ! فرمائیے کس چیز کی ضرورت ہے ۔

حامد ۔ اخبار کے لئے فون کرنا چاہتا ہوں ۔

نرس ۔ آپ آرام سے بیٹھے رہیں ۔ میں فون کرتی ہوں ۔ (فون کی طرف جاتی ہے)

حامد ۔ ۱۸۱۴ سے ملانا ۔

نرس ۔ میں جانتی ہوں (نمبر ملاتے ہوئے) چار ۔ ایک ۔ آٹھ (موتھ پیس پر ہاتھ رکھکر ۔ حامد سے) فرمائیے کیا کہوں ۔

حامد ۔ آٹھ روز کے اخبار بھجوانے کے لیئے کہدو (ریسور پر سے ہاتھ اُٹھالیتی ہے ۔)

نرس ۔ ہلو ۔ کہاں ۔ سے ۔ ہاں ۔ میں جہانگیر ہوٹل کمرہ نمبر ۹۲ سے ۔ دیکھو منیجر صاحب اخبار سے کہنا کہ کمرہ نمبر ۹۲ کے مقیم آٹھ روز کے پرچے چاہتے ہیں ۔ ہاں ۔ آج ہی ابھی ابھی فوراً بھجوادینا ۔ ہاں بل بھی ساتھ ہی بھجوادو ہاں ۹۲ ہاں ہاں جہانگیر ہوٹل ۔ ہاں وہ کمرے ہی پر رہیں گے ۔ (آلہ رکھکر واپس آتی ہے ۔ کرسی پر بیٹھ کر کمرے پر ایک غائر نظر ڈال کر) یہ گراما فون آپ نے کب خریدا ؟

حامد ۔ آج صبح ایک ایجنٹ آگیا تھا ۔ میں نے ہر چند انکار کیا لیکن وہ بھی دہن کا بڑا پکا تھا ۔ ہزارہا تعریفیں کرکے آخر گلے باندھ دیا مگر بہت سستے داموں مل گیا ہے ۔ چھ درجن ریکارڈس بھی لیئے ہیں ۔

نرس ۔ سو دو سو میں خریدا ہے ؟

حامد ۔ (ہنسکر) نہیں ساڑھے چار سو میں ۔

نرس ۔ غالباً ریکارڈ کے ساتھ ۔

حامد ۔ نہیں ریکارڈ کی قیمت علحٰدہ ہے ۔

نرس ۔ واہ کیا کہنے ساڑھے چار سو میں خریدا ہے اور اس کو سستا بھی کہتے ہو ۔ تب تو آپ بڑے امیر آدمی معلوم ہوتے ہیں ۔ (حامد ہنستا ہے)

حامد ۔ ایک ریکارڈ تو لگاؤ ۔ دیکھیں آخر آواز کیسی ہے ۔

نرس ۔ کیا بجاکر تک نہیں دیکھا ۔

حامد ۔ میری طبیعت خراب تھی ۔ میں لینا ہی کب چاہتا تھا ۔ وہ تو زبردستی گلے باندھ کر گیا ۔ ایجنٹ باجا بجاکر سنانا تو چاہتا تھا ۔ لیکن خود میں نے منع کردیا ۔ (نرس جاکر ریکارڈ لگاتی ہے)

باجا بج رہا ہے۔ ریکارڈ کے ختم پر باجا بند کرکے نرس واپس آکر اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہے۔ اطلاعی گھنٹی بجتی ہے۔)

نرس۔ اندر آؤ (ایک لڑکا اخبار کا پلندا اور ایک خط لئے داخل ہوتا اور سلام کرکے دونوں چیزیں نرس کے حوالہ کرتا ہے نرس اخبار لیکر حامد کے حوالہ کرتی ہے۔ خط کھول کر بل دیکھتی اور اپنی جیب سے پاکٹ نکال کر جمع کرکے کو پیسے دیتی ہے چھوکرا پیسے لیکر سلام کرکے چلا جاتا ہے۔ حامد اخبار ونکا کٹا ہاتھوں لیکر کھانستا ہے۔) نرس آپ کو تکلیف ہوگی لائیے میں پڑھ دوں۔

حامد۔ (پہلے اخبار کو دیکھکر) دیکھئے تو اسی اخبار میں کچھ کیفیت معلوم ہوتی ہے (پڑھتا ہے) "ملک کے نامور مصور کی موت" "دنیائے مصوری کا سخت نقصان" "ایک ماہر فن کی ناقابل تلافی کمی" کیا سب اخباروں میں ایسی ہی خبریں ہیں؟ (اس اخبار کو رکھکر دوسرا اخبار دیکھتا ہے۔) "دنیا کے ایک قابل ترین شخص کی اندوہناک موت" (نرس میز سے ایک اخبار لیکر دیکھتی ہے)

نرس۔ (اخبار دیتے ہوئے۔) یہ پڑھیے۔

حامد۔ (اپنے ہاتھ کا اخبار رکھکر نرس کے ہاتھ سے اخبار لیتا ہے۔) "وطن کو آٹھ آٹھ آنسو رونا چاہیئے" "فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ سخت تکلیف کا باعث ہوگی"

حامد۔ (کچھ سوچ کر چباتے چباتے) لیکن۔ لیکن میں تو ایسا نہیں سمجھتا تھا کہ۔ اگر حقیقت میں تکلیف دہ واقعہ ہے۔

نرس۔ تم کو پورا احساس کیوں ہونے چلا؟ تم تو ان کے ساتھ رات دن رہتے تھے۔ اس لئے تمھاری نظروں میں انکی کوئی غیر معمولی اہمیت ہی نہیں۔

حامد۔ (اخبار دیکھکر) "اگرچہ بعض اوقات مرحوم کے خاص خاص منتخب کردہ نمونے چیستان سے کم نہیں ہوتے تھے" (غصہ سے) "چیستان" بیوقوف کہیں کا۔ سمجھا تو یہی سمجھا۔

نرس۔ (ایک اور اخبار پیش کرتے ہوئے) پڑھیے۔ دیکھئے لکھا ہے (خود پڑھتی ہے) "سارا ملک ماتم کر رہا ہے"

حامد۔ ہاں کیا سارا ملک ماتم کر رہا ہے۔

نرس ۔ تمھیں اس کی کیا قدر (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

حامد ۔ یہ گھنٹی کیوں بج رہی ہے ۔ میں سمجھ گیا ۔ بجنے دو ۔ یہی ناکہ اخبار ٹے وغیرہ اب پھر سے مجھے روزانہ دق کرنا چاہتے ہیں ۔ بس میں تو ان سے تنگ آگیا ہوں ۔

نرس ۔ تم کیوں تنگ آگئے (حامد پریشان ہوتا ہے) وہ اب تم سے کیوں ملنے چلے (گھنٹی بجتی ہے) کب تک گھنٹی بجتی رہے گی ۔

حامد ۔ (اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے) میں ابھی بند کردیتا ہوں ۔

نرس ۔ (اُٹھتے ہوئے) نہیں ۔ نہیں تم بیٹھو ۔ میں بات کرتی ہوں (فون کے پاس جاکر آلہ لیتی ہے) ہلو آپ کون ۔ ہاں ۔ آہا آپ ہیں بہت خوب ۔ (ریسیور پر ہاتھ رکھکر حامد سے) سنئے حضرت باباہشنگ انکی دلہن اور انکی بیٹی رضیہ بانو آپ سے ملنا چاہتے ہیں ۔

حامد ۔ (تعجب سے) باباہشنگ ۔ کیا خوب نام ہے ۔ میں نے آج تک نہیں سنا ۔ یہ ہے کون بلا ؟

نرس ۔ تعجب ہے کہ آپ اپنے شہور آدمی کوتک نہیں جانتے (فون پر) جی ہاں ابھی جواب دیتی ہوں (حامد سے) کہو کیا جواب دوں

حامد ۔ کہدو کہ میں گھر پر نہیں ہوں ۔

نرس ۔ تو آپ ان سے نہیں ملیں گے ۔

حامد ۔ کیا تم ملنا چاہتی ہو ۔

نرس ۔ کیوں نہیں ایسے بزرگوں سے ملنے کو میں بڑی سعادت سمجھتی ہوں ۔

حامد ۔ تمھاری خواہش ہو تو بلالو ۔

نرس ۔ (فون پر) ہلو ۔ ہاں سنئے ۔ آپ تشریف لاسکتے ہیں ۔ (آلہ رکھکر آتی ہے)

حامد ۔ چونکہ آپ موجود ہیں اس لئے میں انہیں بلوا رہا ہوں ورنہ میں تو ان سے کبھی نہ ملتا ۔

نرس ۔ عجب شرمیلے انسان ہو ۔ کیا اپنے آقا کا تو اثر نہیں پڑا ہے ۔ وہ غریب بھی تو انتہادرجہ کا شرمیلا آدمی تھا ۔

حامد ۔ غلط انتہا درجہ کا کون کہتا ہے ۔

نرس ۔ ارے جانے بھی دو خفا کیوں ہوتے ہو انتہا نہ سہی ۔ بڑی حد تک وہ شرمیلے تھے ۔ مجھے ایسی شرم نہیں آتی ۔

حامد ۔ اجی تمھارے ساتھ تو مجھے بھی شرم نہیں آتی ۔

نرس ۔ ایک تم ہی پر کیا منحصر ہے ۔ مجھ سے ملنے کوئی شخص بھی نہیں شرماتا ۔ (ایک ملازم ہوٹل داخل ہوتا ہے ۔)

ملازم ۔ حضرت بابا تشریف لائے ہیں ۔

حامد ۔ (لاپرواہی سے) یہاں بلا لاؤ (ملازم باہر جاتا ہے ۔ بابا اور دو عورتیں داخل ہوتی ہیں ۔ نرس اُٹھ کر انکے استقبال کے لئے آگے جا کر سلام کرتی ہے ۔ وہ لوگ قریب آتے ہیں ۔ حامد اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے ۔)

نرس ۔ (حامد سے) آپ بیٹھے رہئے (بابا سے) آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے (سب لوگ بیٹھ جاتے

بابا ۔ کیوں میاں کیا شکایت ہے ؟

حامد ۔ بخار آرہا ہے ۔

بابا ۔ آپ یہاں کب سے ٹھیرے ہوئے ہیں ؟

حامد ۔ کل ہی منتقل ہوا ہوں ۔

بابا ۔ احتشام صاحب آپ خفا نہوں تو ایک بات دریافت کروں ۔

حامد ۔ ضرور فرمائیے خفا ہونا کیا معنی (آہستہ سے) احتشام صاحب ؟ !

بابا ۔ مجھے معلوم ہوا کہ آپ مرحوم مصور حامد صاحب کے ادنیٰ ملازم تھے ۔

رضیہ ۔ کل رحیم بخش صاحب مہراجی نے ہم سے بیان کیا ۔

نرس ۔ یہ سب انکی چالبازی ہے ۔ میں اس بھید سے بخوبی واقف ہوں ۔ یہ تو ان کے معتمد خاص اور بڑے دوست تھے ۔

بابا۔ (ہاتھ جوڑکر) صائب! میاں مجھے معاف کرنا بڑی غلطی ہوئی۔ مجھے اس کا علم نہ تھا۔ ادہوکس بلاکی جھوٹ ہے ایک معتمد خاص کو ادنیٰ ملازم مشہور کردیا۔ توبہ! توبہ!

حامد۔ خیر کیا مضائقہ۔

بابا۔ نہیں صاحب یہ تو بڑی بُری بات ہے۔

حامد۔ (سگریٹ کا کیس پیش کرتے ہوئے) ملاحظہ فرمائیے۔

بابا۔ میں زیادہ تر حقہ پیتا ہوں۔

حامد۔ معاف فرمائیے۔ یہ ہوٹل ہے گھر نہیں۔

بابا۔ کوئی مضائقہ نہیں میاں فکر مت کرو ہم فقیر آدمی ہیں جو ملے وہ کھالیا اور جو بھی ملے پی لیا (سگریٹ لیتا ہے۔ نرگس سگریٹ سلگاتی ہے) جیتی رہو مائی (حامد سے) میاں تم شاید میرے سے واقف نہیں ہیں۔ (سگریٹ کا کش لیتا ہے)

رضیہ۔ احتشام صاحب آپ میرے ابا۔ بابا شنگ فقیر با تدبیر اور مشہور واعظ ہیں۔

بابا۔ (کش لیکر) بڑا مزیدار سگریٹ ہے میاں (کش لیکر) شکر ہے اللہ کا (کش لیتا ہے) صائب تم تو میرا وعظ بہت وقت سنے ہوں گے۔

حامد۔ جی نہیں۔

بابا۔ اللہ رحم کرے (جلدی جلدی دو تین کش لیتا ہے۔ سگریٹ پھینک کر نرس سے) مائی ایک اور سگریٹ تو دینا (نرس سگریٹ کیس پیش کرتی ہے۔ سگریٹ لیتے ہوئے) اللہ جل شانہٗ نے کیا کیا نعمتیں پیدا کی ہیں۔ اماں اس کو سلگا تو دینا (نرس سگریٹ سلگاتی ہے) شکریہ مائی (حامد سے) ہاں باوا میں تم سے یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ مرحوم (ٹھنڈا سانس لیکر) اللہ اس کو غریق رحمت کرے جنت عطا کرے، میرا ہی مرید تھا۔

رضیہ۔ خدا بخشے۔

حامد۔ غالباً وہ تو آپ کے مرید نہیں تھے۔

بابا ۔ اجی واہ تمھیں کیا معلوم ۔ خاموش بھی رہو ۔ کیا ان کے باپ دادا کے تعلقات پیر پاشا کے ساتھ نہیں تھے ۔

حامد ۔ (سوچتے ہوے) ہاں شاید شاید ہوں گے ۔

بابا ۔ میں کہہ رہا ہوں ۔ تم کل کے ملازم تم کو کیا معلوم ۔ اجی تم نے تو ان کے سگے چچیرے بھائی کو تک خبر نہیں کی ۔

حامد ۔ مگر معاف فرمائیے وہ آپ کے مرید تو نہیں تھے ۔

بابا ۔ ارے توبہ ۔ میں کہہ رہا ہوں کہ تم نہیں جانتے ۔ ایسا ہی تھا تو مرنے سے پہلے مجھے بلوا لیا ہوتا ۔ جب سب معلوم ہو جاتا ۔

حامد ۔ خیر اس سے مجھے بحث نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان عقائد کے انسان ہی نہیں تھے ۔

بابا ۔ (زور سے کش لیکر غصہ سے) پھر کیا خاک تھے ۔

حامد ۔ ان کا کوئی خاص مذہب ہی نہیں تھا ۔

بابا ۔ (خفگی سے) خاموش ۔ ایسی بیہودہ باتیں مت کرو ۔ میں کہہ رہا ہوں کہ وہ میرے مرید تھے ۔ کہو رضیہ ۔ تم کو بھی علم ہے نا ؟

رضیہ ۔ جی ہاں اچھی طرح سے ۔

حامد ۔ آخر اس تمام بک بک کا ماحصل ۔

بابا ۔ واہ یہ بھی خوب ! بک بک کیسے ۔ یہ تو بڑا ہی اہم مسئلہ ہے ۔

حامد ۔ کیا خاک اہم ہے ۔

بابا ۔ کیوں نہیں میاں یہ پیری مریدی کا معاملہ ہے (ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہے)

حامد ۔ مرنے کے بعد کاہے کی پیری مریدی ہے ۔

بابا ۔ (ہنستے ہوئے) کیا سب ورثا بھی مر گئے ہیں ۔

حامد ۔ ہاں قبلہ ۔ میں بھی یہی کہہ رہا ہوں ۔ آپ ورثا کے پاس جائیں ۔

رضیہ۔ اجی وارثوں میں چچا بھائی تو بڑا اکھڑ آدمی ہے۔

بابا۔ اسی لئے ہم آپ پاس آئے ہیں۔

حامد۔ مگر میں مرحوم کا وارث نہیں ہوں۔

بابا۔ قطعاً نہیں قطعاً نہیں (ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) مگر میاں تم ان کے معتمد خاص تھے۔ ہوں۔ معتمد۔

نرس۔ معتمد تھے تو کیا ہوا۔ ایک تصویر تک بھی تو ان کے ہاتھ نہیں آئی۔

رضیہ۔ تصویریں کہاں سے ملتیں۔ انکی تصویروں کو تو لوگ ترستے تھے۔

بابا۔ واہ بھئی واہ۔ انکے کام اور فن کا اگر کوئی قدرداں تھا تو مصور جنگ۔ حامد کی تصویر کا پتہ چلنا مشکل تھا۔ پس آدمی کو بھیجا اور منہ مانگی قیمت دیکر منگوا ہی لیا۔ میاں احتشام میں کیا بتاؤں میاں۔ اس کا دیوان خانہ کیا ہے نگار خانہ چین معلوم ہوتا ہے

حامد۔ ہاں تو سب انکی تصویریں وہاں موجود ہیں۔

بابا۔ ہاں وہ بڑا شوقین آدمی ہے۔ بڑے اچھے اخلاق کا انسان ہے۔ بھئی۔ میں جب کبھی جاتا ہوں پچیس پچاس دئے بغیر نہیں چلاتا

رضیہ۔ مجھے بھی تو کچھ نہ کچھ دیتے رہتے ہیں۔

بابا۔ بڑا سخی سردار ہے۔ اللہ اس کی ہزار سالہ عمر کرے۔ بڑی باریک نظر والا امیر ہے میاں واہ وا واہ۔

نرس۔ کیا وہ خود مصور ہیں۔

رضیہ۔ نہیں بلکہ تصویر شناس ہے۔ مگر کچھ مشق بھی کرلیتے ہیں۔

بابا۔ (انگوٹھا اور پہلی انگلی ملاکر) بڑا پہچاننے والا۔ بڑی تیز نظر کا انسان ہے۔ واہ جی واہ ایسے انسان بہت کم ہوتے ہیں۔

حامد۔ کیا واٹر کلر کی تصویریں بھی ہیں۔

رضیہ ۔ واٹر کلر میں تو لاجواب کام ہے ۔ ہاں احتشام کیا تم کو یاد ہے کہ حامد صاحب واٹر کلر میں چائنیز وائٹ بھی استعمال کرتے تھے ۔ کیا وہ قدیم انگریزی اسکول کی طرح شفاف رنگ میں چائنیز وائٹ کا جوڑ دیتے تھے (ہنستے ہوئے) مگر ان تمام اصطلاحات سے تم کیا خاک واقف ہوں گے ۔

حامد ۔ وہ چائنیز وائٹ کو تو پانی کی طرح استعمال کرنا جانتے تھے ۔

رضیہ ۔ (خوشی سے) خوب ۔ تم کو کم از کم یہ بات تو یاد رہ گئی ۔ چائنیز کا کام دیکھا بھی ہے؟ بڑی نمائش کی تصویر نمبر ۵ اس کا نمونہ ہے سمجھتے ہو نا چائنیز وائٹ کیا ہے ؟

حامد ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں ۔

رضیہ ۔ میں سمجھ گئی ۔ اُستاد سے شاید تم نے یہ ایک بات سیکھ لی تھی ۔ ورنہ تم کیا جانو ۔

حامد ۔ (غصہ سے) سیکھ لی تھی ۔ تمھارے جیسے چمپن کو سکھاتا ہوں (رضیہ' بابا ہنستے ہیں)

بابا ۔ میاں احتشام ۔ خفا مت ہو میاں ۔ بیٹی رضیہ بھی اس فن کی ماہر ہے تمھاری معلومات فقط روزانہ دیکھنے کی حد تک ہیں لیکن ۔

حامد ۔ اجی جائیے جناب ۔۔

نرس ۔ خفا کیوں ہوتے ہو ۔ صحیح ہے ۔ آقا کے ساتھ رات دن رہنے کی وجہ سے آپ کو کچھ معلومات ہو گئی ہونگی ۔ ورنہ آپ کا عملی تجربہ ہی کیا ۔

رضیہ ۔ کیا وہ تمھارے استاد بھی تھے ۔

حامد ۔ میں خود استاد ہوں ۔ (رضیہ بے ساختہ پن کے ساتھ قہقہہ لگا کر ہنستی ہے ۔ بابا بھی ہنستا ہے اور نرس بھی)

رضیہ ۔ خوب ہاں اُستاد ۔ تو فرمائیے ۔ واٹر کلر میں کتنے شاہکار بنائے ہیں ۔

حامد ۔ پچاسوں ۔

رضیہ ۔ (ہنستے ہوئے) ماشاء اللہ ۔ کیا کہنے ۔ واہ جی استاد واہ (ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

حامد ۔ (اُٹھتے ہوئے) میں ۔ (نرس فوراً اُٹھ کر ہاتھ سے روکتے ہوئے اس کو بٹھا دیتی ہے)

نرس۔ آپ بیٹھئے میں بات کرتی ہوں۔ (نرس جاکر فون پر گفتگو کرتی ہے)

رضیہ۔ آپ بڑے جھٹ خفا واقع ہوئے ہیں۔

حامد۔ آپ کا مطلب ؟

بابا۔ نہیں بابا خفا نہو۔ رضیہ کا یہ مقصد ہے کہ آپ حامد صاحب کے ملازم تھے۔ آپ کو کچھ معلومات ہونگی۔ آپ اپنے اُستاد کی برابری تو نہیں کرسکتے نا میاں؟

حامد۔ میں کسی کے باپ کا ملازم نہیں۔

رضیہ۔ (قہقہہ لگاکر) ہاں ٹھیک ہے۔ آپ ملازم نہیں معتمد تھے نا ؟

بابا۔ ارتوبہ۔ معاف کرنا میاں میں بھول گیا تھا۔ (نرس واپس آتی ہے۔)

نرس۔ (بیٹھتے ہوئے) ڈاکٹر صاحب آرہے ہیں۔

حامد۔ ڈاکٹر! کون ڈاکٹر؟

نرس۔ وہی ڈاکٹر رنگا سوامی کے مددگار ڈاکٹر محمد حسین جو مرحوم کے معالج تھے۔

حامد۔ کس لئے آرہے ہیں۔

نرس۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

حامد۔ مگر میں تو ملنا نہیں چاہتا۔

نرس۔ ایں! یہ کیا معنی۔ اس وقت آپ کا ڈاکٹر سے ملنا ضروری ہے۔

حامد۔ وہ کیوں۔؟

نرس۔ آپ بیمار ہیں۔ علاج معالجہ کی ضرورت ہے۔

بابا۔ ٹھیک ہے میاں۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب آجائیں تو اچھا ہی ہے۔

رضیہ۔ یقینی آپ کو علاج کی سخت ضرورت ہے۔

حامد۔ مگر میں تو بیمار نہیں ہوں۔

نرس۔ آپ کو بخار آرہا ہے اور کیا بیماری چاہئے۔

رضیہ ۔ ممکن ہے اور کوئی شکایت ہو ڈاکٹر معلوم کرلے ۔

بابا ۔ جو بھی مرض ہو ۔ بابا علاج تو ضرور ری ہے ۔

نرس ۔ جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے ۔

حامد ۔ بخار ۔ خود بخود کم ہوجائے گا ۔ یہ ڈاکٹر کیوں پیچھا کرتے ہیں ؟

بابا ۔ کیا مضائقہ میاں ۔ یہ ڈاکٹر بڑا اچھا آدمی ہے ۔ میں اس کو جانتا ہوں ۔

رضیہ ۔ بڑا تجربہ کار ۔ خصوصاً دماغ کے علاج کا تو ماہر ہے ۔ (حامد غور سے دیکھتا ہے)

حامد ۔ مگر مجھے دماغ کی شکایت تو نہیں ہے ۔ کیا تم مجھے پاگل سمجھتی ہو ۔

رضیہ ۔ (مسکراتے ہوئے) معاف فرمائیے ۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا ۔ میں نے ایک عام بات کہی تھی ۔

بابا ۔ نہیں میاں خفا مت ہو اس کا یہ مطلب نہیں تھا ۔ آپ تو بھلے چنگے ہیں ۔ سبحان اللہ کیا اچھی صحت ہے ۔ (محمد اکبر داخل ہوتا ہے ۔)

اکبر ۔ (بابا ہشنگ کو دیکھ کر) آہا قبلۂ عالم آپ یہاں تشریف فرما ہیں ۔ مزاج شریف ؟

بابا ۔ (ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ۔) آپ کی عنایت (اکبر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

اکبر ۔ (رضیہ سے) کہو بی رضیہ اچھی تو ہو ۔

رضیہ ۔ جی ہاں اور آپ کا مزاج ؟

اکبر ۔ (ہنستے ہوئے) اجی ہمارا مزاج کیوں پوچھتی ہو ۔ آپ لوگوں کا مزاج پوچھتے پوچھتے ہمارا مزاج خود بخود بحال ہوجاتا ہے ۔ (حامد سے) معاف فرمائیے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ احتشام الدین صاحب آپ ہی ہیں ۔

حامد ۔ (روکھے پن سے) تم کون ؟ (نرس سے) تم نے تو مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر آنیوالے ہیں مگر ۔

اکبر ۔ (جلدی سے) اجی ہاں جناب سنئے بھی تو ۔ میں ڈاکٹر نہ ہوا تو کیا ڈاکٹر کا بھائی ہوں (بابا سے) کیوں پیر جی ٹھیک ہے نا ؟

بابا ۔ جی ہاں میاں صحیح ہے اس میں کیا شک ۔

حامد۔ آخر تم ہو کون۔

اکبر۔ اجی جناب کہہ تو دیا کہ میں ڈاکٹر محمد حسین کا (حقیقی کو کھینچکر) حقیقی بھائی۔ اور تین روزناموں کا نامہ نگار ہوں۔

نرس۔ یہ سب کچھ صحیح لیکن آپ چاہتے کیا ہیں۔

اکبر۔ کچھ نہیں۔ روپیہ پیسا، کھانا یا از قسم پارچہ وغیرہ وغیرہ کچھ نہیں صرف ــــ

نرس۔ (ترشروئی سے) بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ نے فون پر اپنے آپ کو ڈاکٹر بتایا تھا۔

اکبر۔ (ہنستے ہوئے) جی ہاں۔ اگر میں ایسا نہ کہتا تو مجھے آنے کون دیتا۔

حامد۔ خیر یہ فرمائیے کہ آپ کے آنے کا مقصد؟

اکبر۔ جی ابھی عرض کرتا ہوں۔ ہاں جناب۔ خیر احتشام صاحب کیا آپ وثوق کے ساتھ یہ بتا سکتے ہیں کہ مرحوم اپنی موت سے قبل کسی عورت سے عشق و عاشقی میں مبتلا تھے اور اس سے شادی بھی کرنا چاہے تھے۔

رضیہ۔ (تعجب سے) ایں۔ یہ کیا گل کھلا؟

حامد۔ (حیرت سے) خاموش! یہ کیا لغویت بک رہے ہو۔

اکبر۔ اب تو مجھے بھی کچھ یقین ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور تھا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟

حامد۔ میں ایسی فضول باتیں سننا نہیں چاہتا۔

اکبر۔ جناب دوسرے یہ کہ وطن سے باہر مرحوم نے جس مسخرے پن کی زندگی بسر کی ہے اگر آپ اپنی دستخط سے اسکی ایک تحریری تفصیل مرحمت فرمائیں تو میں آپکی خدمت کرنیکے لئے تیار ہوں۔

حامد۔ کیا کہا؟ مسخرے پن کی زندگی۔

اکبر۔ گھبرائیے نہیں۔ یہ کھد دینے سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس حقیقت سے ہم لوگ بخوبی واقف ہیں۔ اس وقت صرف آپ کی تصدیق درکار ہے فرمائیے (جیب میں سے نوٹوں کا کٹا نکال کر پیش کرتے ہوئے) لیجئے پانسو روپیہ آپ کی نذر ہیں۔ آپ حالات بیان کیجئے

میں خود لکھ لیتا ہوں۔ آپ صرف دستخط فرما دینا۔

حامد۔ مجھے ان پیسوں کی مطلق پرواہ نہیں۔ میں ہرگز ہرگز دستخط نہ کروں گا۔

اکبر۔ (جیب سے نوٹوں کا ادرایک کٹا نکال کر) لیجئے اور پانسو ہیں (باباکے منہ میں پانی آتا ہے)

بابا۔ (حامد سے) میاں۔ احتشام میاں لے لو بابا فقط دو حرف دستخط میاں لے لو لے لو۔

حامد۔ ہرگز نہیں میں ایسے دس ہزار کو ٹھکرا دوں گا۔

اکبر۔ (بابا سے) آخر یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایک معمولی بات کے لئے ایک ہزار دے رہا ہوں۔

بابا۔ اکبر صاحب۔ آپ بُرا نہ مانیں۔ آج میاں احتشام کا مزاج صبح سے خراب ہے۔

اکبر۔ شاید۔ یہی سبب ہو۔ ورنہ ایک ملازم کی یہ ہمت نہیں ہوسکتی۔ حیرت ہے کہ اس مفلسی کے عالم میں یہ جرأت۔

رضیہ۔ واہ۔ اتنے مالدار آدمی کا معتمد بھی کہیں قلاش ہوا ہے۔

اکبر۔ اجی رہنے بھی دو۔ آپ لوگ اصل حقیقت سے تو واقف ہی نہیں۔ مرحوم نے اپنے خاص چچیرے بھائی تک کیلئے کچھ نہیں چھوڑا ہے۔ تقریباً پوری جائداد نمائش گاہ کے لئے وقف کردی ہے۔ مرحوم کا وصیت نامہ دستیاب ہوگیا ہے۔ ان کے پاس نقد دھرا ہی کیا تھا۔ جو ایسے ویسوں کو ملتا۔

رضیہ۔ کیا انکی پوری تصویریں نمائش گاہ میں رہیں گی۔

اکبر۔ جی ہاں۔

رضیہ۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں تو ہر روز ان تصویروں کو دیکھا کروں گی۔

بابا۔ افسوس! مرحوم نے دوسروں کے حق میں بڑا برا کیا۔

اکبر۔ جی نہیں بلکہ بڑا اچھا کام کیا۔ دیکھئے اگر (احتشام کو بتا کر) ان کو دولت ملتی تو کیا کرتے۔

بابا۔ افسوس! اس غریب کو ابھی نہیں مرنا چاہئے تھا۔

حامد۔ نہیں۔ وہ مرا نہیں (سب یکدم کھلکھلا کر ہنستے ہیں)

اکبر۔ (ہنستے ہوئے) ہاں مرا نہیں بلکہ بہانا کر کے سو گیا ہے۔

حامد۔ زندہ ہے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ زندہ ہے۔

اکبر۔ بالکل ٹھیک، میں سمجھ گیا۔ دوسری دنیا میں نا۔ (بابا وغیرہ ہنس رہے ہیں)

حامد۔ نہیں بلکہ اسی دنیا میں — اسی دنیا میں۔

نرس۔ دیکھئے احتشام صاحب۔ آپ بہت تھکے معلوم ہوتے ہیں۔ براہ کرم اب آرام کیجئے۔

بابا۔ میری ناقص رائے بھی یہی ہے۔

اکبر۔ (ہنستے ہوئے) ہاں تو وہ اسی دنیا میں زندہ ہے۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے غالباً عالم بالا میں۔

حامد۔ آپ کے سامنے۔ میں۔ میں ہی حامد ہوں (سب قہقہے لگا کر ہنستے ہیں۔ حامد چڑتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو دیکھکر بار بار ہنستے ہیں)

رضیہ۔ (ہنستے ہوئے باباسے) میرے خیال میں اس وقت انہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ اب ہم چلیں۔

اکبر۔ کچھ (اپنے سر پر انگلی سے مارتے ہوئے افسوس کے ساتھ) خلل سا معلوم ہوتا ہے۔

حامد۔ (جوش کے ساتھ) خلل ہوگا تمھارے دماغ میں۔ میں سچ سچ کہہ رہا ہوں (اکبر ہنستا ہے)

بابا۔ (اکبر سے) واقعی آرام کی ضرورت ہے۔ اب ہم کو چلنا چاہئے۔

رضیہ۔ جی ہاں بہتر تو یہی ہے۔

نرس۔ اب آپ حضرات تشریف لیجائیں تو مہربانی ہوگی۔

بابا۔ (نرس کو گھورتے ہوئے دیکھکر) رضیہ

رضیہ۔ جی ابا جان۔

بابا۔ (غصہ سے) دیکھ رہی ہو اس چقندر کی حالت

حامد۔ (غصہ سے) آپ بھی تو شلجم سے کم نہیں۔

رضیہ۔ ابا جان اس وقت چلنا ہی مناسب ہے (بابا اٹھتا ہے۔ اس کے ساتھ رضیہ بھی)

اکبر ۔ (بابا سے) کیا قبلہ واقعی چلے ؟

رضیہ ۔ آپ بھی چلیں تو بہتر ہے ۔

اکبر ۔ مگر میرا کام ۔

بابا ۔ اکبر میاں ذرا سوچ سمجھ سے کام لو ۔ ایسی بینڈکیوں کی موجودگی میں بھی کوئی کام بنا ہے ۔

حامد ۔ جناب میں جنتا رہا ہوں دیکھئے ۔

اکبر ۔ آپ کیوں خفا ہوتے ہیں ۔ آرام سے بیٹھئے ۔

رضیہ ۔ آپ مریض ہیں ۔ زیادہ اثر لیں تو مزاج خراب ہو جائے گا ۔

بابا ۔ ٹھیک ہے ٹھک ہے (تینوں ملکر جاتے ہیں)

اکبر ۔ (جاتے جاتے پلٹ کر) ذرا دماغ ہلکا ہو تو پھر سے سوچ لینا ۔ دیکھو آخری مرتبہ بھی کہتا ہوں ۔ پندرہ سو پندرہ سو ۔

حامد ۔ (غصہ سے ٹھوکر تا کر) ٹھوکر مارتا ہوں ایسے پندرہ سو کو (تینوں چلے جاتے ہیں)

نرس ۔ یہ لوگ آپ کو اس طرح ستاتے رہیں گے ۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ میرے گھر چل کر رہیں ۔

حامد ۔ واقعی میں ان بیہودوں سے تنگ آگیا ہوں ۔ بہت جلد مجھے یہاں سے چلے جانا چاہئے ۔

غلام محمد خان ام ۔ اے (عثمانیہ)

دھوکے

ہر سوزِ دل کو ساز بنانے لگا ہوں میں
ہستی کو ایک راز بنانے لگا ہوں میں

مر مر کے تیری یاد میں جیتا ہوں بار بار
افسانے کو دراز بنانے لگا ہوں میں

ہر گام پر تلاش حقیقت نہیں مجھے
ہر رنگ کو مجاز بنانے لگا ہوں میں

بے چین ہر نفس ہے پریشان ہر نظر
پتھر کو پر گداز بنانے لگا ہوں میں

کیفیتِ تصور جاناں نہ پوچھئے
دل کو فسوں طراز بنانے لگا ہوں میں

نالے کو بے حجاب بنانے لگا ہوں میں
ذرّے کو آفتاب بنانے لگا ہوں میں

باغوں میں گنگناتا ہوں کیا گیت حُسن کے
ہر پھول کو گلاب بنانے لگا ہوں میں

ہر محشرِ خیال ہے وجہِ سکونِ دل
تسکیں کو اضطراب بنانے لگا ہوں میں

گم ہوں کسی کے جلوۂ رنگیں میں اسقدر
اس زندگی کو خواب بنانے لگا ہوں میں

بیخود ہوا ہوں عشق کا افسانہ چھیڑ کر
ہر سانس کو رباب بنانے لگا ہوں میں

کیفِ سخن کی ہوش ربائی نہ پوچھیے
ہر شعر کو شراب بنانے لگا ہوں میں

عزیز احمد (عثمانیہ)

شانتی نکتین

کلکتہ سے ۱۰۰ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے جس کا نام بولپور ہے۔ یہیں ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کی وہ مشہور درسگاہ ہے جو شانتی نکتین کے نام سے موسوم ہے۔ پہلے پہل ٹیگور کے والد دیوندرناتھ ٹیگور نے اس مقام پر ایک آشرم کی بنا ڈالی تھی تاکہ لوگ مصروف کن دنیا کے ہیجان اور انتشار سے دورامن وآشتی کی تلاش میں یہاں منہمک ہو جائیں۔ اسی لئے اس کو شانتی نکتین یعنی "امن کا گھر" کہا جاتا ہے۔ ابتدا میں انہوں نے جن تین درختوں کے سایہ میں آرام لیا تھا وہاں ابتک اون کی سالانہ یادگار بڑے پیمانہ پر منائی جاتی ہے۔

اس درسگاہ سے ٹیگور کا مقصد حقیقت میں اُس قدیم ہندوستانی نظام تعلیم کا احیاء ہے جس میں شاگرد واُستاد مِل جُل کر فطرت کی روح افزا آغوش میں انسانیت اور روحانیت کے درس حاصل کرتے تھے۔ دور جدید کی روز افزوں تری مادیت ٹیگور کی شاعرانہ طبیعت پر شاق گذری۔ اُنہیں ہندوستان کی حقیقی نجات اسی میں نظر آئی کہ نوجوان نسل کی پرداخت ایک ایسے معصوم ماحول میں ہو جو انتہائی سادگی پاکیزہ خیالات، عشق فطرت اور روحانیت سے معمور ہو۔ اس بنگالی شاعر اعظم نے اپنی ادبی زندگی کے

حدود میں وسعت دی، اصلاح ملک کے جز کو شامل کیا اور ایک انقلاب انگیز نظام تعلیم کی طرح ڈالی ابتدا میں ٹیگور کو اس ادارہ کے چلانے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے طلبا کی کمی، اخراجات کی زیادتی اور قابل اساتذہ کے فقدان پر قابو پایا۔ جب عطیوں اور چندوں سے کام نہ چلا تو انھوں نے نہ صرف اپنی ساری جائداد بلکہ شاعری کے نوبل پرائز کی گراں قدر رقم بھی اس ادارہ کے لئے وقف کر دی جس کی وجہ سے آج یہ انوکھی درسگاہ سینکڑوں تشنگانِ علم کی پیاس کو بجھاتی ہے اور انہیں تہذیب جدید کی ہنگامہ آرائیوں اور جلوہ فروشیوں سے دور ارضی حسن اور سماوی جمال کی برکتوں میں پیام حیات اور درس زندگی دیتی ہے۔

اس درسگاہ کا نصاب تعلیم، طرز تعلیم، طریقہ امتحان اور وظائف روزانہ دوسری درسگاہوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ٹیگور کی میٹھی گیتوں کی آواز طلوع آفتاب سے قبل خوابوں کی حسین دنیا میں ایک خوشگوار تغیر پیدا کرتی ہے۔ لڑکوں کی ایک جماعت کا ٹیگور کی گیتوں کو روزانہ علی الصبح خوش الحانی سے گانا بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ان دلکش نغماتِ صباحی سے بیدار ہو کر لڑکے باولیوں میں پانی نہاتے ہیں اس کے بعد وہ کھلے میدانوں میں یا درختوں کے نیچے ۱۵ منٹ تک خاموش عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں اور ایک جگہ جمع ہو کر دیوندرناتھ ٹیگور کی منتخبہ نظمیں گاتے ہیں۔ سادہ ناشتہ کے بعد ۷ بجے صبح سے تعلیم کا آغاز ہوتا ہے اور لڑکے اپنی اپنی جماعتوں کو روانہ ہوتے ہیں۔ یہ جماعتیں ہماری درسگاہوں کی طرح بند کمروں میں نہیں ہوتیں بلکہ کھلی ہوا میں، بڑے بڑے سایہ دار درختوں کے نیچے یا موسم برسات کے زمانہ میں عمارتوں کے ورانڈوں میں ہوتی ہیں۔ اساتذہ اور طلبا جب کبھی سلسلہ درس وتدریس، تقاریر ومباحث، عبادت یا تقاریب میں شریک ہوتے ہیں تو اپنے ساتھ ایک مربع فٹ کا چمڑا رکھتے ہیں جس پر وہ بیٹھ جاتے ہیں۔ ساڑھے گیارہ بجے طلبا، کھانے سے فارغ ہو کر دو بجے تک اپنے اوقات حسب مرضی گذارتے ہیں۔ جماعتیں باقاعدہ طور پر دو سے ساڑھے چار بجے تک ہوتی ہیں۔ جماعتوں کے اختتام پر لڑکے تفریح کے لئے اطراف واکناف میں دور دور تک چلے جاتے ہیں یا دوسرے کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں۔ غروب آفتاب کے وقت پھر ایک مرتبہ تمام لڑکے ۱۵ منٹ تک خاموش

عبادت میں مشغول ہوتے ہیں اور منتخبہ نظمیں گانے کے بعد منتشر ہو جاتے ہیں۔ بڑی عمر کے چند لڑکے مدارس شبینہ میں درسگاہ کے ملازمین اور اطراف کے دیہاتی لوگوں کو مفت تعلیم دیتے ہیں۔ رات کے کھانے سے ایک گھنٹہ پہلے تمام طلبار کسی نہ کسی دلچسپ تفریحی مصروفیت میں شریک ہوتے ہیں۔ ان لمحات فرصت میں اساتذہ دلچسپ قصوں کے ذریعہ انہیں مصروف رکھتے ہیں یا برقی فانوسی تقاریر کے ذریعہ اُنکی معلومات میں بیش بہا اضافہ کرتے ہیں۔ بسا اوقات خود طلبار اپنی دلچسپی کے سامان اور تفریحی مشاغل ترتیب دیتے ہیں جسمیں اساتذہ بڑی خندہ پیشانی سے شریک ہوتے ہیں۔ رات کے کھانے کے ایک گھنٹہ بعد ۹ بجے گھنٹی بجتی ہے اور لڑکے سونے کے لئے کمروں میں چلے جاتے ہیں۔ چاندنی رات میں طلبار کو اسکی آزادی ہے کہ وہ جنگلوں میں جنتِ نظر اور فردوس گوش کے سامانوں، نغمہ و رقص کے جمیل بادلوں مترنم نور و نقش حسن کی لازوال فیوضات سے حیات کی شعریت کو شاداب رکھیں۔ بڑی عمر کے لڑکے درسگاہ کے سادہ اقامت خانوں میں رہتے ہیں اور باری باری سے اوقات طعام میں اپنے بھائیوں کی ہر طرح سے خدمت بجا لاتے ہیں۔ چھوٹے لڑکے جنکی عمر ۷ یا ۸ سال کی ہوتی ہے شادی شدہ اساتذہ کے گھروں پر دس دس کی تعداد میں کھانا کھاتے ہیں۔ تمام لڑکوں کو اپنا کام آپ کرنے کا عادی بنایا جاتا ہے۔ ایک دفعہ تو تمام طلبار نے ایک مہینہ تک بغیر کسی ملازم کے محض باہمی اشتراک عمل کے ذریعہ درسگاہ کے تمام کام نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دئے اور بچت مدرسہ کے فنڈ میں دیدی۔

شانتی نکیتن میں ایک مندر ہے جسمیں طلبار ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ جمع ہوتے ہیں۔ یہ ایک دلچسپ معبد ہے۔ اسمیں نہ تو دیویاں ہیں نہ دیوتا، نہ نقش و نگار ہے نہ قربان گاہ ٹیگور جب شانتی نکیتن میں ہوتے ہیں تو لڑکوں کے سامنے ایسے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہیں جن سے اخلاق، عادت و کردار کی درستی اور روحانی مسائل کی تفہیم ہو سکے۔ انکی عدم موجودگی میں قدیم اساتذہ اس کام کو انجام دیتے ہیں۔ صبح و شام خاموش عبادت کا جو طریقہ ہے اسمیں طلبار کو ادارہ کی جانب سے کسی قسم کی مذہبی ہدایت نہیں دی جاتی بلکہ مقام کی نوعیت، ماحول کی رومانیت، فضا کی روحانیت اور احساسات اخوت و عالمی برادری کے تخیل کو براہ راست اثر انداز ہونے کا موقع دیا جاتا ہے۔ وہ آزاد ہیں کہ

جس طرح چاہیں اپنے احساسات، خیالات و مشاعر کے ذریعہ اظہار عبودیت کریں ۔۔ آستانِ قدرت پر صرف سجدہ ہو جائیں یا والہانہ اشکباری کے لئے وقفِ تماشائے عالم!

شانتی نکیتن میں اساتذہ اور طلباء کے تعلقات اتنے خوشگوار اور اتنے استوار ہیں کہ شاید ہی کسی درسگاہ میں ہوں ۔ طلبہ مجسمہ عجز و انکسار تو اساتذہ جذبات تفوق و تعزز سے معرا ہوتے ہیں ۔ یہاں بعض اُستاد ایسے بھی ہیں جو بغیر کسی ماہوار کے کام کرتے ہیں انہیں صرف علم سے محبت ہوتی ہے اور درسگاہ کے مقصد اعلیٰ سے انتہائی ہمدردی اور گہرا شغف ۔ یہ اپنا وقت ۔ روپیہ اور توانائی محض طلباء کی بہتری کی خاطر صرف کرتے ہیں ۔ جو اساتذہ کہ ماہوار لیتے ہیں وہ اتنی کم ہوتی ہے کہ صرف سادہ ضروریاتِ زندگی کے لئے کافی ہوسکتی ہے ۔ درسگاہ کے تمام اراکین کا صرف ایک اور ایک ہی خیال ہوتا ہے ۔۔ یعنی طلباء کی ہمہ جہتی ترقی، فلاح اور بہبود ۔ یہ نیک خیالی محض دلکش لفظی ترکیبوں، بلیغ صنعتوں، چُست محاوروں، پرلطف عشائیوں یا سرکاری تقاریب کی زینت تکلم اور لطفِ سخن طرازی کی نمایش کے لئے نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اور حیات کے ہر لمحہ میں عملی طور پر جلوہ فرما ہوتی ہے ۔ اساتذہ اور ارباب درسگاہ طلبا کے ڈراموں، موسیقی، کرتب، کھیلوں، سیر و تفریح اور تمام دلچسپ مشاغل میں خوشی خوشی نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ حصہ بھی لیتے ہیں ۔ یہاں عمر کا فرق اور حفظِ مراتب کا غیر شعوری تصور تقریباً عنقا ہے ۔ اساتذہ طلباء کے ساتھ بڑے بھائیوں کی طرح، دوستوں کی مانند بلکہ اکثر اوقات بچوں کی طرح ملتے جُلتے، کھیلتے کودتے ہیں ۔ یہ انکے خوشی و غم میں ہر طرح سے شریک رہتے ہیں ۔ طلباء کے قہقہوں میں انکی مسرت اور انکے آنسوؤں میں ان کی سوگواری نمایاں رہتی ہے ۔ ٹوکیو یونیورسٹی کے طلباء کو ایک وقت مخاطب کرتے ہوئے انہی تعلقات کے متعلق ٹیگور نے کہا کہ "بچہ کے اُستاد کے لئے وقت کی سب سے اہم ضرورت خود بچہ بنجانا ہے ۔ تھوڑی دیر کے لئے اسے یہ بھول جانا چاہئے کہ وہ عالم یا عاقل ہے ۔ طلباء کا حقیقی رہنما وہی ہوسکتا ہے جسے تفاوت عمر، فرق مراتب اور احساس برتری کا مطلق خیال نہو ۔ بڑے بھائی کی طرح اُس کے ساتھ علم و عمل کے نیک راستہ پر چلنے کے لئے اساتذہ کو ہمیشہ تیار رہنا چاہئے" شریفانہ سلوک اور برادرانہ شفقت

کی وجہ سے طلباء بھی اساتذہ کا بے حد ادب کرتے ہیں۔ اپنے اعمال و افعال سے کبھی انہیں شکایت کا موقع نہیں دیتے۔ اپنے اساتذہ کی خاطر ہر قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ درسگاہ سے جدا ہونے کے بعد اپنے محبوب استادوں کی خلش آفریں یاد انکی زندگی کا بہترین سرمایہ ہے

اس درسگاہ کا انتظام بالکلیہ کسی ایک ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل کے سپرد نہیں۔ تمام اہم امور کا تصفیہ ایک مجلس انتظامی کے سپرد ہے جو منتخبہ اساتذہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ مجلس اپنے میں سے کسی ایک مدرس کو ہر سال اپنا صدر منتخب کرتی ہے تاکہ وہ روزانہ کا انتظامی کام انجام دے۔ ہر مضمون کے لئے اساتذہ میں سے ایک ناظم شعبہ منتخب کیا جاتا ہے جو متعلقہ اساتذہ کے تعاون سے اس مضمون کی کتابیں، نصاب اور طریقہ تعلیم تجویز کرتا ہے لیکن ہر استاد کو اس کا کامل اختیار ہے کہ وہ اگر چاہے تو اپنا مخصوص طریقہ تعلیم ہی رائج کرے طلبہ کی بھی شعبہ واری علمی و ادبی انجمنیں ہوتی ہیں جنکی بڑھتی ہوئی مصروفیات ان کے ذوق ادب اور شوقِ شعر و شاعری کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں انجمن ڈرامہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ انجمن انگریزی، سنسکرت اور بنگالی زبان کے بہت سے ڈرامے پیش کر چکی ہے۔ اس انجمن کو ٹیگور کی خاص سرپرستی حاصل ہے۔ چنانچہ اس نے ٹیگور کے کئی ڈرامے پیش کئے ہیں جنمیں نہ صرف طلباء، اساتذہ بلکہ خود ٹیگور بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔ بعض ڈرامے شہر کلکتہ میں بڑی کامیابی کے ساتھ اسٹیج کئے جا چکے ہیں۔ ڈرامہ نگاری کا ذوق طلباء میں سرایت کر چکا ہے۔ بہت سے طلباء تفریح کے وقت اپنے ڈرامے دوستوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان میں اساتذہ بھی عملی حصہ لیتے ہیں۔ طلبہ کی انتظامی انجمنیں درس گاہ کی بالکلیہ ذمہ دار ہوتی ہیں۔ طلباء سے جو لغزشیں سرزد ہوتی ہیں ان پر انتظامی انجمن کافی بحث کرتی ہے اور پھر سزا تجویز کرتی ہے۔ کسی طالب علم کے نمایاں کام پر طالبعلمانہ اعزاز بھی عطا کرتی ہے۔

طلباء کی لغت کے خوفناک لفظ امتحان کی وحشت بھی شانتی نکیتن میں دلچسپی سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہاں سال میں صرف ایک مرتبہ امتحان ہوتا ہے جسمیں یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ لڑکے نے اپنے موضوع کے متعلق کتنی باتیں حفظ کی ہیں، کتنے صفحات رٹے ہیں اور کتنی مثالیں یاد کی ہیں۔ سل میں حافظہ سے زیادہ ذہانت کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے کوئی لڑکا آزمائش میں پورا

نہ اترے لیکن اس کے جماعتی کام کے متعلق متعلقہ استاد کی رائے تشفی بخش ہو تو اس کی کامیابی یقینی ہو جاتی ہے ۔ امتحان کے وقت طلبا کئی وضع میں بیٹھے ہوئے پرچوں کے جوابات دیتے نظر آتے ہیں ۔ اکثر ادہر ادہر سبزۂ مخمل پر یا جھاڑوں کے نیچے مصروف رہتے ہیں اور بعض منچلے تو جھاڑوں کے اوپر بھی بڑی بڑی شاخوں پر اطمینان سے بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ لیکن وقت مقررہ پر سب اپنے پرچے واپس کر دیتے ہیں ۔ اساتذہ کو لڑکوں پر کافی اعتماد ہوتا ہے اس لئے کوئی نگرانی نہیں کیجاتی اور لڑکے بھی اس اعتماد کو صدمہ پہونچانے کی کوشش سے احتراز کرتے ہیں ۔

درسگاہ میں ایک دواخانہ ہے جسمیں بیمار لڑکوں کا نہایت مستعدی سے علاج کیا جاتا ہے ۔ بجائے نرسوں کے اس میں خود طلبا یکے بعد دیگرے خوشی خوشی تیمار داری کے فرائض انجام دیتے ہیں ۔ جو لڑکے سخت بیماریوں کا شکار ہوتے ہیں وہ بھی کلکتہ کے بہترین شفا خانوں پر اپنے مدرسوں کے معمولی دواخانہ کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ یہاں ان کی دلجوئی، آرام و تشفی کیلئے ہمیشہ اُنکے پر خلوص دوست ہمہ تن مصروف رہتے ہیں ۔

شانتی نکیتن کے نظام تعلیم کے متعلق سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ نظام موجودہ ترقی یافتہ دنیا سے بہت پیچھے ہے ۔ ایک ایسا تعلیمی نظام جسمیں دورحاضرہ کی مادی ضرورتوں اور میکانی احتیاجات کی گنجایش نہ ہو کس طرح ممکن ہے کہ زندگی کے روز افزوں مسائل، حیات کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں اور سب سے زیادہ سائنٹفک تہذیب کی واجبات سے عہدہ برا ہونے میں ہماری نوجوان نسل کی مدد کر سکے ۔ لیکن ہمیں یہ بھی اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ شانتی نکیتن کا مقصد اعلیٰ طلبا کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ وہ آئندہ زندگی کی مادی کشمکش میں سادہ تربیت، اور فطری تعلیم کی وجہ سے توازن قائم رکھ سکیں تاکہ مغربی تہذیب کا طوفان اور مادی تمدن کا سیلاب انہیں اس طرح بہا کر نہ لے جائے کہ وہ تمام مشرقی روایاتِ شرافت و اخلاق و کردار کو بالکلیہ فراموش کر دیں ۔

محمد بن عمر ام ۔ اے (عثمانیہ)
لکچرار کلیہ گلبرگہ

عناصر کی قلب ماہیت

عناصر کی قلب ماہیئت کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے جوہر کی ساخت کا مختصر طور پر ذکر کیا جائے تاکہ جوہر کے نمونہ کا موجودہ تصور ہمارے ذہن نشین ہو جائے۔

کسی جوہر کی دنیا کو نظام شمسی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جس طرح ہمارے نظام شمسی میں سورج درمیان میں اور اس کے اطراف مداروں پر سیارے گردش کر رہے ہیں اُسی طرح ہر جوہر ایک مرکزہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ مرکزہ مجموعی طور پر مثبت برقی بار کا حامل ہوتا ہے۔ مرکزہ کے اطراف مختلف مداروں پر برقیے گردش کرتے ہیں۔ برقیوں پر منفی برقی بار ہوتا ہے۔ برقیوں پر کا منفی برقی بار مرکزہ پر کے مثبت برقی بار کی تعدیل کر دیتا ہے اور ایک توازن قائم رہتا ہے۔ جوہر کے وزن کا انحصار زیادہ تر مرکزہ پر ہی ہوتا ہے کیونکہ برقیہ کا وزن بہت کم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہائیڈروجن کا مرکزہ جو تمام مرکزوں سے کم وزن مرکزہ ہے برقیہ سے اٹھارہ سو (۱۸۰۰) گنا وزنی ہوتا ہے۔

جوہر کی بیرونی ساخت کا علم حاصل کرلینے کے بعد علمائے طبیعات نے اپنی توجہ جوہر کے مرکزہ کی جانب منعطف کی۔ کسی جوہر کی ماہیئت بدلنے کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ کسی طرح اس کے مرکزہ میں

تبدیلی پیدا کی جائے ۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے ۔ اولاً اس لئے کہ یہ اتنا چھوٹا ہوتا کہ اس پر ضرب لگانا مشکل ہوتا ہے اور ثانیاً اس لئے کہ اس کے ذرات آپس میں مضبوطی کے ساتھ بندھے ہوئے ہوتے ہیں ۔ اگر کسی مرکزہ کے قطر کو اس کے جوہر کے قطر کا $\frac{1}{10000}$ فرض کیا جائے تو اس کا رقبہ جوہر کے رقبہ کا $\frac{1}{100000000}$ ہوگا ۔ پس اگر ہم نشانہ لئے بغیر کسی جوہر میں کسی ذرہ کو داخل کریں تو اس کا مرکزہ سے ٹکرانے کا امکان دس کروڑ (۱۰۰۰۰۰۰۰۰) میں ایک ہوگا ۔ اس لئے ہمارے اکثر نشانہ خطا ہو جائیں گے ۔ اور ذرات بیکار جائیں گے ۔

فرض کرو کہ ہم کسی مادہ کو ہدف پر رکھتے ہیں اور پروٹان کے ایک ذرہ کو ایک ہزار دولٹ کے تفاوت قوہ میں سے گذار کر اس ہدف پر ضرب لگاتے ہیں تاکہ اس مادہ کی قلب ماہئیت ہو جب پروٹان اس مادہ تک پہونچیگا تو اپنے مثبت برقی بار کے باعث اس مادہ کے برقیوں کو کشش کرے گا ۔ اس طرح برقیوں کی حرکت بڑھ جائے گی اور پروٹان کی توانائی میں کمی واقع ہوگی ۔ اس امر کا بہت کم امکان ہے کہ یہ ذرہ اس مادہ کی پہلی جوہری تہہ کے کسی مرکزہ کو جاکر لگے ۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ ذرہ آگے بڑھے گا اور دوسری تہ میں داخل ہوگا ۔ لیکن یہاں اس کی توانائی بہ نسبت پہلے کے کم ہوگی ۔ اس لئے کہ اس نے پہلی تہ کے برقیوں کو حرکت میں لاکر اپنی توانائی کا کچھ حصہ کھودیا ہے ۔ دوسری تہ میں بھی مرکزہ پر ضرب لگانے کا امکان کم ہے ۔ یہاں بھی یہ اپنی توانائی کا کچھ حصہ برقیوں کو حرکت میں لاکر کھودے گا اور آگے بڑھے گا ۔ اس طرح یہ ذرہ ایسی سو تہوں میں سے گذر جائے گا قبل اس کے کہ اس کی توانائی اتنی کم ہو جائے کہ یہ کسی موثر ضرب لگانے کے ناقابل ہو جائے ۔ اور چونکہ ہر تہ میں ذرہ کے مرکزہ میں داخل ہونے کا امکان دس کروڑ میں ایک ہے اس لئے کل سو تہوں میں یہ امکان دس لاکھ میں ایک ہوگا ۔ ان ہی مشکلات کے باعث عناصر کی قلب ماہئیت بڑے پیمانہ پر ناممکن ہے اور ہماری بہت سی صرف کردہ توانائی ضائع ہو جاتی ہے ۔

حسب ذیل طریقوں سے مرکزہ میں تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے ۔

(۱) جہ شعاعوں یا بلند تعدد والی لا شعاعوں کے ذریعہ

(ب) بلند قوہ والی ابھرنی نلیوں یا سائیکلوٹران سے حاصل کردہ پروٹانس کے ذریعہ
(ج) ڈیوٹرانس یا ہائیڈروجن کے مرکزہ کے ذریعہ
(د) عہ ذرات یا ہیلیم کے مرکزہ کے ذریعہ
(ھ) نیوٹرانس کے ذریعہ جن کو مذکورہ بالا چار طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ سے کسی مرکزہ کو بمبار کرکے حاصل کرسکتے ہیں۔
لیکن برقیے کسی طرح بھی مرکزہ میں تبدیلی نہیں پیدا کرسکتے۔

جہ شعاعیں ان سب میں کم موثر ہوتی ہیں اور ان کے حصول کے اچھے ذرائع بھی مہیا نہیں ہیں۔ اس لئے عناصر کی قلب ماہیئت میں ان کا زیادہ حصہ نہیں ہے۔

نیوٹرانس زیادہ دلچسپ ذرّات ہوتے ہیں۔ ان پر کوئی برقی بار نہیں ہوتا۔ اس لئے مرکزہ کے مثبت برقی بار کا ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ جسکی وجہ سے انہیں مرکزہ میں داخل ہونے کے لئے زیادہ قوت سے جانے کی ضرورت نہیں۔ نیوٹرانس قدرت میں آزادانہ حالت میں اسی لئے نہیں پائے جاتے کہ یہ کسی مرکزہ میں بھی آسانی کے ساتھ داخل ہوجاتے ہیں اور فوراً مقید ہوجاتے ہیں۔

جب کوئی ذرہ کسی مرکزہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کی توانائی حرکت کی شکل میں مرکزہ کے مختلف ذرات میں تقسیم ہوجاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب کسی ذرہ کو اتنی توانائی حاصل ہوجاتی ہے جتنی کہ اُس کو دیگر ذرات کی قوت کشش سے علٰحدہ کرنے کے لئے کافی ہو، وہ اپنے آپ کو علٰحدہ کرلیتا ہے اور مرکزہ کی قوت کشش سے باہر ہوجاتا ہے۔ جب یہ واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو مرکزہ کم و بیش قائم شکل اختیار کرلیتا ہے اور اس طرح مادّہ کی قلب ماہیئت ہوجاتی ہے۔ بعض مرتبہ صرف ایک ذرّہ کے اخراج سے ہی قائم شکل بن جاتی ہے لیکن بعض اوقات ایسا نہیں ہوتا۔ اس وقت مرکزہ کسی برقیہ یا کسی پازیٹران کو خارج کرکے اپنے آپ کو درست کرلیتا ہے اور قیام پذیر شکل اختیار کرلیتا ہے۔

اس موقع پر یہ بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ کس طرح طبیعات میں مرکزہ کی تبدیلیاں مساواتوں کے ذریعہ ظاہر کی جاتی ہیں۔ کسی جوہر کو اُسکی مخصوص کیمیائی علامت ہی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اس علامت

کے اوپر اس کے مرکزہ میں موجودہ پروٹانس اور نیوٹرانس کی مجموعی تعداد اور علامت کے نیچے صرف نیوٹرانس کی تعداد لکھ دی جاتی ہے۔ اس طرح Be^9_4 سے بیریلیم کا وہ جوہر مراد ہوگا جس میں پروٹانس کی تعداد چار ہے اب فرض کرو کہ بیریلیم کا جوہر ہیلیم کے مرکزہ سے بمبار کیا جاتا ہے۔ ہیلیم کا مرکزہ پہلے بیریلیم کے مرکزہ میں قید ہو جائے گا۔ اس سے کاربن کا ایسا ہم مقام حاصل ہوگا جس میں سات نیوٹرانس اور چھ پروٹانس موجود ہوں گے

$$Be^9_4 + He^4_2 \longrightarrow C^{13}_6$$

لیکن کاربن کے اس ہم مقام میں بہ نسبت معمولی کاربن کے جوہر کے توانائی زیادہ ہوگی۔ اس لیے اس میں سے فوراً ایک نیوٹران خارج ہو جائے گا اور ایسا کاربن کا مرکزہ حاصل ہوگا جس کا وزن بارہ ہوگا۔

$$C^{13}_6 \longrightarrow C^{12}_6 + N^1_0$$

ان دونوں تعاملوں کو ایک مساوات کے ذریعہ اس طرح ظاہر کرسکتے ہیں

$$Be^9_4 + He^4_2 \longrightarrow C^{13}_6 \longrightarrow C^{12}_6 + N^1_0$$

اس نوع کی ایسی بہت سی مثالیں معلوم ہیں جن میں جب کسی جوہر کو ع ذرہ سے بمبار کیا جاتا ہے تو ع ذرہ اس جوہر کے مرکزہ میں مقید ہو جاتا ہے اور آخر میں ایک نیوٹران خارج ہوتا ہے۔ ہمیں ایسے تعامل بھی معلوم ہیں جنکی نوعیت اس تعامل کا عکس ہے۔ ان تعاملوں کا سب سے پہلے فیدر (Feather) نے مطالعہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ جب نائٹروجن کو نیوٹران سے بمبار کیا جاتا ہے تو بوروں پیدا ہوتی ہے اور ع ذرہ خارج ہوتا ہے

$$N^{14}_7 + N^1_0 \longrightarrow N^{15}_7 \longrightarrow B^{11}_5 + He^4_2$$

ان طریقوں سے دوری جدول پر کے تقریباً تمام عناصر کے کئی کئی ہم مقام تجربہ خانہ میں تیار کرلئے گئے ہیں۔ جو ہم مقام قیام پذیر شکل میں نہیں ہوتے ان میں سے بعض ذرات خارج ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں تابکاری پائی جاتی ہے۔ اس واقعہ کو مصنوعی تابکاری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مصنوعی تابکاری معلوم ہو جانے سے تحقیقات کا ایک وسیع میدان علماء سائنس کے ہاتھ آگیا ہے۔

آٹھ سال کے تھوڑے سے عرصہ میں مصنوعی تابکاری نے بڑی عملی اہمیت حاصل کرلی ہے ۔

تابکار عنصر تمام خواص میں اس عنصر کے مشابہ ہوتا ہے جس کا کہ وہ ہم مقام ہوتا ہے ۔ سوائے اس کے کہ یہ تابکار شکل میں ہوتا ہے اور اصل عنصر جس کا کہ یہ ہم مقام ہوتا ہے تابکار نہیں ہوتا ۔ تابکار عنصر اپنی تابکاری کی وجہ سے ہر مقام پر پہچانا جاسکتا ہے ۔ اس خاصیت سے فائدہ اُٹھا کر تابکار عناصر کو پیچیدہ کیمیائی تعاملات کے مطالعہ میں استعمال کرتے ہیں ۔ جس عنصر کے طرز سلوک کے متعلق اشتباہ ہو اس کو تابکار شکل میں لینے سے وہ تعامل میں حصہ لیتے وقت ہر مقام پر پہچانا جاسکتا ہے ۔ اکثر نامیاتی اور بعض غیر نامیاتی مرکبات کی ساخت کے متعلق یقین نہیں ہوتا ۔ مصنوعی تابکاری کی خاصیت سے فائدہ اُٹھا کر اُن کی ساخت کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔

مصنوعی تابکاری نے طب میں بھی جگہ حاصل کرلی ہے ۔ لاشعاعوں کی جگہ مصنوعی تابکار عناصر سے خارج ہونیوالے نیوٹرانس کی شعاعیں استعمال کی جاسکتی ہیں ۔ لاشعاعیں جلد کے ہائیڈروجنی مرکبات کو روانتی ہیں ۔ نیوٹرانس کی شعاعوں کی روانی کثافت ، لاشعاعوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوتی ہے ۔ کسی مرض کی حقیقی وجہ یا کسی نظام کے نقص کا حقیقی مقام معلوم کرنے کے لئے بھی تابکار عناصر استعمال کئے جاتے ہیں ۔ اِس کے لئے اُس مرکب میں جو جسم میں داخل کیا جاتا ہے ایک تابکار عنصر شریک کرلیا جاتا ہے یہ مرکب جس راستہ سے بھی گذرے گا وہ راستہ اُس کی تابکاری کی وجہ سے بہ آسانی معلوم کرلیا جائے گا ۔ اگر نظام میں کسی مقام پر کوئی خرابی ہو تو اُس کا بھی پتہ چل جائیگا ۔

سیّد محمد حیدر رضا زیدی ۔ ام ۔ ایس سی

نوجوان سے

زندگی سے منزلِ اوّل میں تو گھبرا گیا
سوزِ ہستی سے ابھی خالی ہے شاید دل ترا

آ اِدھر تجھ کو بتاؤں نوجواں رمزِ حیات
زندگی تیری غلط اور ہے غلط تیری ممات

شورشوں کے دم سے قائم ہے جہانِ آرزو
ورنہ اک گورِ شکستہ تھا مکانِ آرزو

غم جسے کہتے ہیں وہ ہے روغنِ شمعِ حیات
عیش کیا ہے رہزنِ نورِ جبینِ کائنات

زندگی کا منظرِ اوّل ہے یہ بزمِ جہاں
موت کے پردہ میں رہتی ہے حیات جاوداں

زیست کیا ہے؟ حرکتِ دائم میں کھو جانے کا نام
جلتے جلتے خود سراپا طور ہو جانے کا نام

اُٹھتی ہے موجِ دریا پھر مچلنے کے لئے
شمع جلتی ہے سراپا نور بننے کے لئے

اے شناور ڈر گیا کیوں حلقۂ گرداب سے
بے خبر یہ امتحاں ہے دست و بازو کیلئے

شکوۂ جور فلک تیرے لئے زیبا نہیں
درد سے گھبرائے یہ انسان کا شیوا نہیں

چارسو دنیا میں ہے ہنگامۂ محشر بپا
تو ابھی ذوق تن آسانی کا ہی مدحت سرا

گریہ داؤد کا ہنگام اب جاتا رہا
زورِ بازو کی نمائش کا زمانہ آگیا

تھام لے دامن عمل کا اور بن محفل طراز
گوش برآواز ہیں سب چھیڑ دے ہستی کا ساز

فطرتِ آزاد کو آزادِ رسم و راہ کر
سینۂ مشرق میں پیدا اک دلِ آگاہ کر

روحِ آزادی پڑھے ہے پھر تیرے دامن پر نماز
پھر بنے محمودِ اعظم جو ابھی تک ہے ایاز

پھر سروشِ غیب دے تجھ کو ترقی کا پیام
موت تیری زندگی کو پھر کرے جھک کر سلام

مرزا متین احمد بیگ سروش متعلم بی۔ اے

ہمیں تاریخ کا مطالعہ کیوں کرنا چاہئے

تاریخ کا مطالعہ بعض حضرات کے نزدیک مادی منفعت کا ذریعہ نہیں ان کا خیال ہے کہ وہ انسانیت کے "دور شباب" کے علمبردار ہیں اور زمانہ ہائے دراز کے حاصل کئے ہوئے معلومات اُن کی زندگی کا طرہ امتیاز۔ان کے سامنے ٹھکرائی ہوئی "جھوٹی حقیقتوں" کا مطالعہ نفرت آگیں سیاسی نظریوں کی چھان بین سماج کی فرسودہ اشکال کی پردہ دری اور ان لوگوں کی زندگی کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرنا جو صرف بربریت اور جہالت کے دور میں پیدا ہونے کے سبب مخصوص عظمت اور شہرت کے مالک بن بیٹھے صرف اپنے قیمتی اوقات کا خون کرنا ہے باوجود اس کے بعض کا خیال ہے کہ تاریخ اپنے اندر لاتعداد کام کی باتیں بھی رکھتی ہے اول تو یہ کہ گذشتہ دور کا مطالعہ ہماری ذہنی تفریح کا اعلیٰ ذریعہ ہے دوسرے ہم اس کے ذریعہ فطرت انسانی کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں تاریخ کا مطالعہ ہمیں ان "شاہکار غلطیوں" سے آگاہ کردیتا ہے جو "انسانیت کے دور حماقت" میں سرزد ہوئی تھیں اور ہم ان سے اپنے کو محفوظ رکھ سکتے ہیں ہم اپنی تاریخی معلومات کی مدد سے زمانہ کے آثار کا مطالعہ کرسکتے ہیں اور مختلف فضاؤں کا مقابلہ کرنیکے لئے ہر وقت اپنے آپ کو تیار کرسکتے ہیں۔

لیکن میں ان دونوں میں سے کسی کا ہمنوا نہیں جیسا کہ مجھے معلوم ہے "حقیقت کی طرف ہمیشہ درمیانی راہ جاتی ہے" ان لوگوں کے متعلق جن کے نزدیک تاریخ فضول سی شئے ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کا طرزان کے نظریہ کا عملی بطلان ہے دور جدید کا ایک آزاد خیال سیاست دان کیا امریکن آزادی انقلابِ فرانس، فتوحات نپولین میں اپنی مشکلات کا حل نہیں تلاش کرتا ! زندگی کے کسی شعبہ سے کسی بھی مشہور و معروف انسان کو چن لیجئے ــــ وہ ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اُس نے ماضی سے کچھ نہیں سیکھا یا اسکی شخصیت نے گذرے ہوئے واقعات کی گود میں پرورش نہیں پائی ہے ماضی کا کٹر دشمن نہایت نٹ کھٹ انقلابی اپنے تخیل میں کسی ہیرو کی پرستش کرتا ہے ۔

ایک لمحہ کے لئے فرض کرلیجئے کہ کچھ لوگ ماضی کے تمام آثار مٹانے میں کامیاب ہوگئے ہر فرسودہ اور پرانی چیز کو ٹھوکروں سے پامال کردیتے ہیں، ماضی کے تمام اسباق فراموش کرجاتے ہیں، تمام انجمنیں ختم کردی جاتی ہیں، سماج کی تمام صورتیں مسخ کردی جاتی ہیں، تمدن کی تمام قسمیں آثار قدیمہ کتابیں، روایات زمین کے چہرے سے غائب کردی جاتی ہیں ہمیں نئی چیزیں پھر سے ایجاد کرنی پڑینگی نئے اصول نئے راستہ اور نئے طریقے نکالنے پڑیں گے لیکن پہلے سے دس گنا وقت رکھنے والی ذہانت بھی اس سعی میں ناکام رہے گی ماضی کی "سعی مسلسل" سے جتنا کچھ ہوسکا ہے اس قدر اب از سر نو تعمیر کرنا قطعی محال ہوگا اور ہمیں قصر بابل کا افسانہ حقیقت نظر آنے لگے گا ۔

اب آئیے ہم ان سے باتیں کریں جو سمجھتے ہیں کہ تاریخ کے ہزاروں استعمال ہیں اگر ان کا خیال ہے کہ تاریخ ہمیں ایک ہی قسم کے کئی واقعات کی مثالیں پیش کرتی ہے تو میں انہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ بالکل ایک ہی نوع کے حادثات تاریخ کے صفحات پر کبھی نظر نہیں آئیں گے ۔

تاریخ انسانی دائمی انقلاب کا ایک مسلسل بیان ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جہاں معمولی سا واقعہ بھی دوبارہ رُونما نہیں ہوتا ہستی کا افسانہ مختلف مناظر اور ٹکڑوں میں منقسم ایک تمثیل ہے اس کی مثال شطرنج کے کھیل کی طرح نہیں ۔ تاریخ سے اخذ کئے ہوئے سیاسی نظرئے مفید ہونیکی بجائے نقصان پہونچا سکتے ہیں ۔

وہ حضرات جن کا خیال ہے کہ تاریخ ہمیں انسانی فطرت کے اندر جھانکنے کی صلاحیت بخشتی ہے ان کے لئے بہترین جواب یہ ہے کہ انسانی نفسیات کا جو مطالعہ ہم شکسپیر۔ فیلڈنگ اور اسکاٹ کے افسانوں اور ناولوں میں کرسکتے ہیں وہ کہیں نہیں کرسکتے ہمیں انسانی سیرتوں کا مطالعہ میکبتھ رچارڈ۔ اور ہیملٹ سے بہتر کہیں نظر نہیں آسکتا۔

تمام علوم کا مقصد خصوصی "انسان کا مطالعہ" ہے ہر وہ شعبۂ علم جہاں ہماری دلچسپی کے سامان مفقود ہیں ہماری بہت کم توجہ کا مستحق ہوگا۔ اور تاریخ ہی ایسی چیز ہے جو اس مقصد کو پورا کرتی ہے انسان کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم اس کا سالہاسال کے واقعات اور مختلف ادوار کے آئینے میں مطالعہ کریں ہم انسان کے متعلق موجودہ تہذیب و تمدن کی روشنی میں کوئی رائے نہیں قائم کرسکتے اور نہ اسکی مسلسل اور مکمل شکل ہمیں نظر آسکتی ہے ہوسکتا ہے کہ اب بھی اس کے اندر چند پوشیدہ قوتیں ہوں کوئی حیرت انگیز چیز جو دھیرے دھیرے پرورش پا رہی ہو لیکن ہمیں جو کمی نظر آرہی ہے وہ ماضی میں یقینی طور پر تلاش کیجا سکتی ہے عروج کی مسلسل اور پیہم سعی میں ہم گم شدہ حقیقتوں کو ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ گذشتہ واقعات کے "تودوں" میں چند ایسی "دبی چنگاریاں" مل جائیں جو مستقبل کو روشن کرنے میں ہماری امداد کرسکیں۔

تاریخ ہماری کشمکش کو آگے بڑھانے میں مواد اور پشتانہ بھی فراہم کرسکتی ہے ہمارے لئے تمام گذشتہ معلومات اور ایجادات سے باخبر ہونا اشد ضروری ہے اس کے ساتھ ضرورت ہے کہ ہم ان میں اضافہ بھی کرتے رہیں اور ان عمارتوں پر دوسری اونچی اور بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کریں ترقی کو آسان کرنے کے لئے ہمیں پرانی شاہراہوں پر ضرور چلنا ہوگا ہمیں ماضی کے تحفے قبول کرنے ہوں گے اور مستقبل کے لئے کچھ چھوڑنا ہوگا۔ ہمارے لئے تمام موجودہ آلات کو پھینک کر ان کی جگہ نئے آلات ایجاد کرنا قطعی ناممکن ہوگا پھر ہماری معاشرتی اور سیاسی زندگی کے لئے بھی تاریخ اہم چیز ہے ہم موجودہ سماج اور سیاسی انجمنوں کو خیرباد نہیں کہہ سکتے۔ انگلستان کو از سر نو سنوارنا ناممکن ہے ہم لندن کے ہرے بھرے گاؤں اور برمنگھم کو دارالسلطنت میں نہیں تبدیل کرسکتے ہماری تمام سعی و کاوش اس سلسلہ میں ناکام

رہے گی ہم تمام رسم و رواج ۔ ادیان و مذاہب کو جنہیں ہم فرسودہ اور مہمل سمجھتے ہیں یک بیک کچل نہیں سکتے ہم ابھی تک کیتھولیت جس کو نیست و نابود کرنے کے لئے لوتھر نے اپنی ساری قوت صرف کر دی تھی بہت سے ممالک میں مستحکم و مضبوط پاتے ہیں۔ اس وقت تک کوئی ترقی ترقی نہیں کہی جاسکتی جب تک اسکی بنیاد موجودہ اداروں کے صحیح علم اور بنی نوع انسان کی ضروریات پر نہ ہو ۔ یہ سب سے بڑی حماقت ہو گی اگر ہم موجودہ اداروں کو بغیر ان کے دور ارتقائی کا مطالعہ کئے منقلب کرنیکی کوشش کریں ۔

بغیر ان کی پیدایش کا صحیح علم رکھتے ہوئے معاشرتی مسائل کے حل کرنیکی کوشش کرنا سماجک نظام کے لئے اصول مرتب کرنا بغیر اس علم کے کہ کس اصول کا دور ختم ہو گیا اور کس کا باقی ہے ۔ یہ سب بہت سنجیدہ غلطیاں ہیں ۔ ضرورت ہے کہ ہم ماضی کے آئینہ میں مستقبل کے خدوخال کا مطالعہ کریں ۔

شنکر موہن لعل ماتھربی ۔ اے

درسگاہِ نیم شبی

دیر ہوئی کہ دنیا خاموش فضامیں لمبی تان کر سو رہی ہے ہر شئے پر سکون اور ہر ذی روح عالم غفلت میں خوابِ نوشین سے لطف اندوز ہے ——— ہاں اس خاموش فضامیں گھڑیال نے ٹن ٹن دو بجائے ہیں۔ شمع کی نبض چھوٹ رہی ہیں۔ فانوسِ محفل دم توڑنے کو تیار ہے۔ خمار خواب نے شبہائے شب کو دنیا و مافیہا سے بیخبر کر دیا ہے۔ عفریت خواب کی اطراف عالم پر حکمرانی ہے۔ نیند کا جادو چاروں طرف چھایا ہوا ہے۔ جفاکش اور آسودہ حال لوگ میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں ——— لبتہ غور و فکر، جرم و گناہ، عیش و عشرت اور یاس و ناامیدی کی آنکھیں ابھی تک کھلی ہوئی ہیں۔ مے نوش ایک مرتبہ پھر اپنے جام آتشین کو بھر رہا ہے۔ راہزن اپنے دورۂ نیم شبی پر روانہ ہونے کو ہے۔ خودکشی پر آمادہ ——— ناشکرا انسان ——— زندگی جیسی نعمت خداوندی کے خلاف ——— اپنا ست گناہ دراز کرنا ہی چاہتا ہے!

آج میری طبیعت قدیم ادبی کارناموں کے مطالعہ یا موجودہ تصانیف کی اوراق گردانی کی ت مائل نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ——— امشب اس سنسان راستے پر قدم فرسائی کروں جہاں

ابھی چند لمحات پیشتر زندگی کے نیرنگ کار جلوے برس رہے تھے اور ان کی تجلی ریزیاں پورے شباب پر تھیں ـــــ لیکن اب وہ اس طرح خاموش نظر آتی ہے جیسے کوئی شریر بچہ اپنی ہی شوخیوں کے آغوش میں آسودۂ خواب ہو جاتا ہے !!!

بجھتے ہوئے چراغ کی زرد رو شعاعیں ہر سو پھیل رہی ہیں۔ چاروں طرف ایک ہو کا عالم طاری ہے۔ تاریکی نے دنیا کو سیاہ کفن میں لپیٹ دیا ہے۔ اس تفکر زا سماں میں اگر کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ تو وہ گھڑی کی ٹک ٹک ہے۔ یا کبھی کبھی کتوں کی بھوں بھوں اس طلسم سکوت کو توڑتی ہوئی گوش گذار ہوتی ہے انسانی غرور و سرکشی کی تمام ہنگامہ خیزیاں سرد ہو چکی ہیں ـــــ ہر طرف باب عبرت وا ہے . . . نادان انسان ! اس قدر کھوکھلی بنیاد پر تیری یہ خود پرستی !!!

وہ ساعت دور نہیں جب اس عارضی ویرانی کے بجائے ایک دائمی ویرانی کا پرچم لہرائے گا۔ اپنے سینکڑوں باشندوں کی طرح یہ شہر بھی صفحۂ ہستی سے معدوم ہو جائے گا ـــــ اور یہاں سوائے ایک لق و دق صحرا کے کچھ بھی نظر نہ آئے گا۔

ایسے ہی کتنے شہر ہوں گے جن کا ڈنکا اقصائے عالم میں بجتا ہوگا۔ جن کی شہرت کا فلک سیر طوطی اسی طرح بولتا ہوگا۔ جنکی فضاؤں اور وادیوں میں ایسے ہی بے پایاں مسرتوں اور سچی خوشیوں کے چشمے بہتے ہوں گے ـــــ سراب ہستی نے انھیں بھی اپنی ابدیت کا فریب دیا ہوگا ـــــ لیکن اُن کا نام و نشان ایسا مٹا کہ بعد کی نسلیں ان کے سراغ سے عاجز ہو رہی ہیں۔ دردمند سیاح جب ان کی بربادیوں کے عبرت فزا نظاروں کو دیکھتا ہے تو اس کا دل لرز اٹھتا ہے ـــــ دنیوی ساز و سامان کی حقیقت اس پر بے نقاب ہو جاتی ہے۔ بے ثباتی عالم کا نقشہ اس کی آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے !!!

وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ یہیں ان کا فلک بوس قلعہ تھا۔ یہاں ان کی حکومت کے دفاتر تھے۔ لیکن قلعہ کی جگہ سبزہ زار لہلہا رہا ہے اور دفاتر کی جگہ حشرات الارض اور درندوں کے مساکن نظر آتے ہیں ـــــ ان کے معابد اور عشرت گاہوں کی جگہ چند مجہول تودہائے خاک باقی ہیں !!

ان کی تباہی کا سبب ؟ ان کی تباہی کا سبب یہ تھا حرص اور نفس پرستی نے ہستی کی بنا دولت کو کھوکھلی کردیا۔ وہ امور سلطنت سے غافل ہوگئے۔ ملک و قوم کے ناخدا فرزندان وطن کو ٹھکرا دیا گیا داد و دہش کے جملہ دروازے عیش و عشرت اور شراب و کباب کے حصول کے لئے وقف کردئے گئے ان کے جاہ و جلال ۔ زر جواہر اور مال و خزانے نے ایسے جملہ اداروں کو ترغیب دی جنھوں نے دو ایک مرتبہ پسپائی کے بعد بھی دامن استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور بالآخر فریق ثانی کو نیست و نابود کرکے دم لیا۔

اب ان بازاروں میں جہاں انسانوں کا بے پناہ سمندر ٹھاٹھیں مارا کرتا تھا نہ آدم ہے نہ آدم زاد — ان کی تباہی اور بربادی کے افسانے عام ہو رہے ہے۔ ان کی خستہ حالی اور سیہ کاری پر کوئی بھی پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا۔

کتنے فلک زدہ یتیم ۔ کتنے غریب الوطن اور کتنے بے خانماں ایسے ہیں جنھیں دنیا نے "عاق" کردیا ہے۔ سب ان سے دور رہتے ہیں — فاقہ مستی اور عریانی کے علاوہ اور کوئی انکا رفیق و ہمدم نہیں۔ انکی فلاکت معراجِ کمال کو پہونچ چکی ہے۔ عرصہ حیات ان پر تنگ ہوچکا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو ان پر ترس کھائے۔ جو ان کو دیکھتا ہے منہ پھیر کر چلا جاتا ہے — ان کی زبوں حالی اس حد تک پہونچ چکی ہے کہ رحم بھی ان سے آنکھیں چراتا ہے — ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ تن ڈھانکنے کو چیتھڑا تک نصیب نہیں اور بعض ایسے ہیں جو بیماری سے گھل گھل کر بالکل سنکنی سے ہوگئے ہیں !!!

کتنی بدنصیب عورتیں ایسی ہیں جن کا دن عید اور رات شب برات ہوتی تھی — مگر زمانہ نے پلٹا کھایا — اور دنیا کی ہر مصیبت ان کے لئے مخصوص ہوکر رہ گئی ۔ ان میں سے بعض ایسی بھی ہوں گی جو انھیں خود غرضوں کے آستانوں میں جبہہ سا ہونگی جنھوں نے انھیں دغا دی۔ یا ایسے مردہ دلوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہوں گی جن کے دل دکھ درد کے احساس کے بالکل عاری ہیں۔ یا ایسے ننگِ انسانیت اوباشوں سے امداد طلب کرتی ہوں گی جن کا شعار ہی درشت کلامی ہے۔

خداوندا! مجھے انسان بنایا تھا تو درد کے درماں اور جراحت کی چارہ گری پر بھی اختیار دیا ہوتا۔ نہیں تو غم و آزار کے ان مناظر کو بھی میری نگاہوں سے اوجھل کر دیتا !!!

آہ ! بے درد دنیا !! ان تیرہ بختوں کی فریاد کو پہونچنے کے بجائے انہیں نشان ملامت بناتی ہے۔ ان کی جانکاہ مصیبت پر بھی بندگان مطلب کی رگِ دردمندی میں کوئی جنبش کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی —— لیکن بڑے لوگوں کی موہوم سے موہوم تکلیف کا احساس بھی ان کے قلزم جذبات میں حشر برپا کر دیتا ہے فصاحت و بلاغت کی تمام طاقتیں ان کے لئے صرف کردی جاتی ہیں۔ ان کی حمایت میں زمین و آسمان کو ایک کر دیا جاتا ہے —— غریبوں کے سر مصیبتیں قیامت ہی کیوں نہ توڑ ڈالیں انکو سوائے ایک ماتم خاموش کے اور کوئی چارۂ کار نہیں —— کیونکہ وہی قانون جو دوسروں کے لئے مسیحائی کرتا ہے ان کے حق میں مار ضحاک بن جاتا ہے۔

کاش ! میرا دل اتنا حساس نہ ہوتا !! اے کاش ! میری قسمت میرے دل سے اس قدر بیگانہ نہ ہوتی !!! اور میں ان بیکسوں کی مدد کر سکتا —— ہائے ! کس قدر قابل رحم ہے وہ ہستی جو دوسروں کی امداد کرنا چاہے لیکن خود بے دست و پا ہو !! —— یقیناً یہ شخص اس پیکرِ حسرت سے بھی زیادہ قابل رحم ہے جو دوسروں کے کرم کا محتاج ہے !!!

مرزا متین احمد بیگ سروش
متعلم بی۔ اے (ابتدائی)

پناہ گزین آبادی کے معاشی مسائل

ان افراد کو جو کسی نہ کسی سبب سے مجبوراً اپنا وطن ترک کر کے کسی دوسرے ملک میں سر چھپانا چاہتے ہوں اور جو اپنے وطن سے ہمیشہ کے لئے یا ایک طویل مدت تک قطع تعلق کرنے پر مجبور ہوں پناہ گزین کہتے ہیں۔ یہ بھی نقل وطن کی ایک صورت ہے خصوصاً ترک وطن خارجی کی لیکن معاشیات میں نقل وطن کی اصطلاح عموماً اس صورت حال کے لئے استعمال کی جاتی ہے جبکہ آبادی خالصاً معاشی اسباب کی بنا پر ترک وطن کرے۔ مثلاً کسی ملک میں اجرتیں کم ہوں تو وہاں کے بعض باشندوں کا کسی ایسے ملک میں جا بسنا جہاں اجرتیں زیادہ ہیں گویا ذرائع معاش حاصل کرنے کے لئے آبادی کے ایک حصہ کا دوسرے مقام پر تبدیل ہو جانا۔ واضح رہے کہ اس صورت حال کو نقلِ وطن تو کہا جا سکتا ہے لیکن پناہ گزینی نہیں کہہ سکتے۔ پناہ گزینی کے مفہوم میں "جبر" کے عنصر پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ مثلاً کچھ عرصہ قبل جرمنی سے یہودیوں کا اخراج عمل میں آیا۔ اس مثال میں جرمن یہودی اپنا وطن ترک کر رہے تھے اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نقل وطن کی مثال تو ہے لیکن یہاں اجرتوں کا اضافہ یا کسی اور قسم کی تشویق و تحریص نہیں بلکہ یہ نقل وطن بالجبر ہے۔ الغرض پناہ گزینی نقل وطن کی ایک صورت تو ہے لیکن یہ نقل وطن کسی معاشی ترغیب

و تحریص کے باعث نہیں ہوتا بلکہ بالجبر ہوتا ہے ۔ گویا پناہ گزینی وہ نقل وطن ہے جو جبراً ہو۔

پناہ گزینی کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک حصہ ملک کے باشندے اسی ملک کے دوسرے حصہ میں جا بسیں ۔ مثلاً کوئٹہ کے زلزلہ کے بعد یا بہار کے زلزلہ کے بعد وہاں کے بعض افراد نے دکن یا صوبۂ متوسط کی راہ لی ۔ اس قسم کی پناہ گزینی کو ہم " اندرونی پناہ گزینی " کہہ سکتے ہیں ۔ دوسری صورت وہ ہے جبکہ ایک ملک کے افراد مجبوراً اپنا ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں جا بسیں ۔ اس کی مثال جرمنی کے یہودیوں کی ہے جنھوں نے جرمنی سے نکل کر فلسطین، شنگھائی، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ میں پناہ لی ہے ۔ چنانچہ کچھ عرصہ قبل شنگھائی میں یہودی پناہ گزینوں کی تعداد گیارہ سو رہی ۔ جس میں دو تہائی تعداد بالکل مفلس تھی ۔ جنگ سے پہلے وزیر اعظم برطانیہ کے بیان کے بموجب ۱۹۳۳ء سے گیارہ ہزار مرد، عورتوں اور بچوں کو انگلستان میں اترنے کی اجازت دی گئی ۔ اس قسم کی پناہ گزینی کو خارجی پناہ گزینی کہا جاسکتا ہے ۔

پناہ گزینی کے اسباب :- اب دیکھنا یہ ہے کہ پناہ گزینی کے اسباب کیا ہوسکتے ہیں ہم نے پناہ گزینی کے مفہوم کی تشریح کرتے ہوئے یہ تبلایا کہ پناہ گزینی کے مفہوم میں جبر کا عنصر زیادہ نمایاں ہوتا ہے ۔ اسی لئے ظاہر ہے کہ پناہ گزینی کے اسباب بھی جبری ہوں گے ۔ پناہ گزینی کا ایک سبب تو قدرتی جبر ہے یعنی زلزلہ، طوفان، قحط یا وبا کے باعث لوگ مجبوراً اپنا وطن ترک کرکے دوسرے ملک میں جا بسیں یا اس حصہ ملک کو چھوڑ کر دوسرے حصہ میں پناہ لیں ۔

پناہ گزینی کا ایک دوسرا سبب انسانی دباؤ ہوسکتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں ۔

(۱) انقلاب :- پناہ گزینی کا ایک سبب انقلاب حکومت ہوسکتا ہے ۔ مثلاً روس کا انقلاب روس میں مختلف اسباب کے باعث انقلاب نمودار ہوا ۔ اور وہ طبقہ جو پہلے برسر حکومت تھا نہایت بے دردی سے تباہ و برباد کیا جانے لگا ۔ انقلاب کے بعد اس طبقہ کے افراد کو طبقہ " ارزلیہ " کی حکومت کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا ۔ یہ صورت حال بعض افراد کے لئے ناقابل برداشت تھی چنانچہ انہوں نے ترک وطن کیا اور دوسرے ملکوں میں پناہ لی ۔

(۲) جارحانہ وطن پرستی :- ایک دوسری وجہ جارحانہ وطن پرستی ہے جارحانہ قومیت کا نتیجہ علی العموم جنگ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جس کی وجہ سے ایک طاقتور ملک دوسرے کمزور ملک پر قبضہ کرلیتا ہے اور وہاں کے باشندے اس ملک میں یا تو خود اپنی مرضی سے رہنا پسند نہیں کرتے یا نئے ملک کی حکومت قائم ہو جانے اور اس کے ظلم وستم کی تاب نہ لاکر دوسرے ملک میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اسپین پر جب حملہ ہوا اور مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ کردیا گیا تو وہاں کے بچے کھچے مسلمانوں نے دوسرے ممالک کا رخ کیا آج کل ہرہٹلر کی بربریت سے تنگ آکر چیک اور پولینڈ کے باشندے خود کو زندہ درگور محسوس کر رہے ہیں۔

(۳) دور بسطیٰ میں مذہبی تعصب خصوصاً یورپ میں پناہ گزینی کا باعث بنا رہا۔ تاریخ کے اوراق اب تک میری ملکۂ انگلستان کے خون ریز افسانوں سے رنگین ہیں۔ اس زمانہ میں وسط یورپ پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک کی مذہبی لڑائیوں کا آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ پراسٹنون کا فرانس سے اخراج لوئی چہاردہم کے عہد کا مشہور واقعہ ہے۔

(۴) نسلی تعصب :- آج کل بھی پناہ گزینی کے مسئلہ میں شدت کا اہم سبب نسلی تعصب ہے ہرہٹلر نے اپنی قومیت کی بنیاد اسی جذبہ پر رکھی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ آرین قوم ہی برسر اقتدار رہ سکتی ہے۔ اور یہودی یعنی اسرائیلیوں کو اس کے ملک میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی بنا پر اس نے اپنے ملک سے یہودیوں کو دھڑا دھڑ نکال باہر کردیا اور یہودیوں سے ایسا کام لیا جارہا ہے جو ان کی صحت کے لئے مضر ہے۔ ڈاکٹر وکلا اور کاروباری افراد ہر گھنٹہ چھ آٹھ پفینگ کمانے کے بھی قابل نہیں ہیں (پفینگ ایک تانبے کا سکہ ہے جو جرمنی میں رائج ہے اور جو انگریزی پنس کے نویں حصہ کے برابر ہے) اکثر یہودی جب زخمی ہو جاتے ہیں تو ان کی جگہ پولستانی قیدیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ان پر بے حساب غیر معمولی پابندیاں عاید کی جارہی ہیں مثلاً یہودی عورتوں کو اشیاء خورونوش فراہم کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں کیونکہ ایک یہودی خاندان کی عورت کو دوپہر سے قبل کسی قسم کی خرید و فروخت کی ممانعت ہے اور دوکانیں دوپہر سے بند ہو جاتی ہیں ان کو پینے کے لئے دودھ تک میسر نہیں آتا۔

کپڑا خریدنے کے لئے ان کو راشن کارڈ تک نہیں دیا جاتا محض اس قیاس کی بنا پر کہ انہیں کے اکثر افراد تاجر تھے اور وہ ضرور کپڑا محفوظ رکھتے ہوں گے۔ ان کو وائرلیس اور ریڈیو تک کے رکھنے کی اجازت نہیں اور انھیں نکال دینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ غرض اس قسم کی بے انتہا سختیاں ان پر آئے دن کی جاتی ہیں اس سے ہٹلر کا مقصد یہ ہے کہ وہ تنگ آکر دوسرے ممالک کو بھاگ نکلیں۔

پناہ گزینی کے اثرات :۔

پناہ گزینی کی تعریف اور اس کے اسباب کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ پناہ گزینی سے کون سے معاشی مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔ اور ان کو کس طرح حل کیا جاسکتا ہے۔ مشہور معاشی آدم اسمتھ کا قول ہے کہ of all sorts of luggage man is the most difficult to be transported

اس مقولہ کی صداقت اس وقت واضح ہوگی جبکہ ہم پناہ گزینی کے اثرات اور ان اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے ہر ملک نے پناہ گزینوں پر جو پابندیاں عاید کی ہیں اس کا مطالعہ کریں گے۔

بیان کیا گیا ہے کہ پناہ گزینی دو قسم کی ہوسکتی ہے ایک تو" اندرونی پناہ گزینی" اور دوسرے " خارجی پناہ گزینی" اندرونی پناہ گزینی کے اثرات کچھ اس قدر زیادہ اہم نہیں ہیں کیونکہ جو باشندے اس صورت میں اپنا وطن ترک کرکے دوسرے حصہ میں جا بستے ہیں وہ بالآخر اس ملک کے باشندے ہوتے ہیں البتہ خارجی پناہ گزینی کے اثرات نہایت اہم ہوتے ہیں۔

پناہ گزینی جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ترک وطن خارجی ہی کی ایک شکل ہے اور ترک وطن خارجی سے ملک کی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے ظاہر ہے کہ یہ اضافہ ملک کے لئے غیر معمولی ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ ملک میں شرح پیدائش کے باعث جو اضافہ ہوتا ہے اسمیں پناہ گزینی سے مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اب اگر کسی ملک کی آبادی متوازن ہو تو ظاہر ہے کہ یہ توازن بگڑ جائیگا (متوازن آبادی سے مراد ایسی آبادی ہے جس کے وسائل معاش اسکی تعداد کی بہ نسبت نہ بہت زیادہ ہوں اور نہ بہت کم) اور اس کی وجہ سے ملک کی معاشی حالت کو نقصان پہونچے گا۔ لیکن اگر آبادی متوازن نہ ہو یعنی ذرایع معاش نسبتاً وافر ہوں اور قدرتی وسائل کی بہتات ہو تو اس صورت میں پناہ گزین آبادی کو اس ملک میں بس جانے کا نہایت اچھا موقع

رہتا ہے۔ اول الذکر صورت پناہ گزینوں کے لئے نہایت تکلیف دہ ہے اس لئے کہ ان کو اس ملک میں جہاں متوازن آبادی Optimum population ہو کوئی جائے پناہ نہیں مل سکتی۔ یعنی متوازن ملک میں پناہ گزینوں کی آبادکاری ایک خاردار مسئلہ ہے اول تو یہ کہ پناہ گزینوں کی ایسے ملک میں آبادکاری نہایت دشوار ہے دوسرے علی العموم حکومتیں ان کے داخلہ کی ممانعت کردیتی ہیں یا ان پر کڑی شرطیں عاید کردیتی ہیں۔ چنانچہ آج کل مختلف ملکوں میں یہودیوں کے داخلہ پر پابندیاں عاید کی گئی ہیں مثلاً جاپان میں ۲۵ رنومبر ۱۹۴۸ء سے یہودیوں کے داخلہ کی ممانعت کردی گئی ہے۔ اس میں اس حد تک شدت برتی جارہی ہے کہ یہودی اساتذہ کے تقرر کو بھی روا نہیں رکھا جاتا۔

یہاں تک تو یہ بیان کیا گیا کہ پناہ گزینوں کو ملک میں داخلہ کی اجازت دینا اسی صورت میں ممکن اور ایک حد تک مفید ہوسکتا ہے جبکہ آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے قدرتی وسائل وافر ہوں لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر یہ حالت نہ ہو اور پھر پناہ گزینوں کو ملک میں جگہ دی جائے تو کیا اثرات ہوں گے۔

ایک ایسے ملک میں جہاں متذکرہ بالا حالات موجود نہ ہوں لیکن اگر پناہ گزین کسی نہ کسی طرح اپنے لئے جگہ حاصل کریں تو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اہل ملک کبھی گوارہ نہ کریں گے کہ پناہ گزیں اس ملک میں بسیں اور خصوصاً اس ملک کی قدیم آبادی کا معاشی موقف کمزور ہو جائے گا۔ اور اگر پناہ گزین کچھ سرمایہ بھی رکھتے ہوں تو پھر قدیم آبادی کی حالت اور بھی خراب ہو جائے گی ایسی صورت میں نہ صرف پیدائش دولت اور آبادی میں عدم توازن پیدا ہو جائے گا بلکہ تقسیم دولت میں بھی ناانصافی ہوگی۔ پناہ گزین آبادی اپنے سرمایہ کی بنار پر ملک کے قدرتی وسائل کا استحصال کرنا شروع کردے گی اور قدیم آبادی منہ تکتے رہ جائیگی کم و بیش یہی حالت فلسطین کی ہے کہ وہاں سرمایہ دار یہودی سکونت اختیار کرتے جارہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ زرخیز زمینوں کو خریدتے جارہے ہیں اس طرح عرب اپنے حق سے محروم ہورہے ہیں اسی بنار پر عربوں نے وہاں ہنگامہ بپا رکھا ہے اور یہودی توطن پذیری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کررہے ہیں۔

پناہ گزیں آبادی بالعموم دو پیشوں میں مشغول ہوسکتی ہے ایک تو آزاد پیشے مثلاً طبابت وکالت وغیرہ

میں دوسرے صنعت و حرفت میں مزدوروں کی حیثیت سے۔ دوسرے پیشوں میں ان کا داخلہ اس لئے ناممکن ہوتا ہے کہ عموماً ان کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا۔ مثلاً تجارت یہ اس لئے نہیں کرسکتے کہ اس کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت ہے یا زراعت میں اس لئے داخل نہیں ہوسکتے کہ زمینات خریدنے کے لئے علی العموم ان کے پاس روپیہ نہیں ہوتا۔ اب زراعت میں شرکت کی ایک ہی صورت رہ جاتی ہے وہ یہ کہ زرعی مزدوروں کی حیثیت سے کام کریں۔ لیکن یہ بھی ان کے لئے ایک حد تک دشوار ہے کیونکہ وہ مقامی طریقہائے کاشتکاری سے ناواقف ہوتے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کو اس لئے داخلہ نہیں مل سکتا کہ کوئی حکومت اتنی فیاض نہیں ہے کہ اپنے ملک والوں کو چھوڑکر ان پناہ گزینوں پر رحم کھائے۔ الغرض ان کے لئے جو راہِ معاش کھلی ہوئی ہے وہ یہی ہے کہ یا تو آزاد پیشے اختیار کریں یا صنعت و حرفت میں بحیثیت مزدور کام کریں یا خانگی ملازمت اختیار کریں۔

اب ہم دیکھیں گے کہ ان کے ان دونوں پیشوں میں مشغول ہونے سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اگر پناہ گزین آبادی یا اس کا ایک حصہ آزاد پیشوں مثلاً طبابت وکالت وغیرہ میں مشغول ہو تو ظاہر ہے کہ اول اول تو اس کا اثر کچھ زیادہ نمایاں نہیں رہے گا لیکن رفتہ رفتہ ملک کی قدیم آبادی کے ایک حصہ کی آمدنی میں تخفیف ہوگی۔ اگر ان پناہ گزین پیشہ وروں پر پابندی عائد نہ کی جائے تو اس امر کا اندیشہ ہے کہ ملک کی قدیم آبادی کے ایک طبقہ کو نقصان پہونچ جائے۔ چنانچہ اسی بنا پر ہنگری میں یہودی پناہ گزینوں پر پابندیاں عاید کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ وہ سینما و تھیٹر کی تعمیر نہیں کرسکتے۔ سیلون میں تو آنکھوں اور دانتوں کے یہودی پناہ گزین اطبا کو داخلہ کی اجازت نہیں ہے۔ ہنگری کی مجلس مقننہ میں ایک مسودۂ قانون اس امر کا پیش کیا گیا تھا کہ صرف ۶ فیصد یہودیوں کو طبابت و قانون میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے۔

اب صنعت و حرفت میں پناہ گزینوں کی بحیثیت مزدور حصہ لینے سے جو اثرات مرتب ہوں گے اس پر غور کیجئے۔ واضح رہے کہ ہم اس ملک سے بحث کر رہے ہیں جہاں آبادی متوازن ہے۔ یہاں مزدوروں کی اجرتوں میں بتدریج تخفیف ہوگی اس لئے کہ محنت کی رسد اس کی طلب سے زیادہ ہے لیکن اس واقعہ سے کہیں یہ شبہ نہ پیدا ہو کہ اس سے اس صنعت کو فائدہ ہوگا۔ بہ ظاہر یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ

اگرچہ مزدوروں کو نقصان ہوا لیکن آجروں کو اس سے فائدہ ہوگا۔ کیونکہ تخفیفِ اجرت کے باعث مصارف پیدائش میں کمی ہوگی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس طرح مصارف پیدائش میں تخفیف ہوگی لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس تخفیفِ مصارف سے آجر فائدہ نہ اٹھاسکیں اس لئے کہ مزدوروں کی اجرتوں میں تخفیف کے باعث بہت ممکن ہے کہ ان کی قوتِ خرید گھٹ جائے یا اگر مصنوعات کسی خاص ملک کو برآمد کی جاتی تھیں تو اس ملک سے اس پناہ گزین آبادی کے اخراج کے باعث برآمد میں کمی ہوجائیگی۔ بہرحال یہ ہوسکتا ہے کہ اس تخفیفِ مصارف کا اثر تخفیف طلب سے زائل ہوجائے اور آجروں کو بحیثیت مجموعی کوئی فائدہ نہ ہو اس طرح مزدوروں کے طبقہ کا نقصان تو صریح اور واضح ہے اور آجروں کے فائدہ کا کوئی تیقن نہیں ہے۔

پناہ گزینوں کا متوازن آبادی والے ملک میں آبادکاری کا بہت زیادہ نمایاں اثر اس ملک کی زراعت پر پڑتا ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ پناہ گزین بالعموم زراعت میں مشکل ہی سے مشغول ہوسکتے ہیں اسی لئے زراعت پر ان کی توطن پذیری کے اثرات بالواسطہ ہوتے ہیں۔ نمایاں اثر تو یہ ہے کہ اس ملک کی زمینات پر زیادہ بار پڑے گا۔ اس لئے کہ پہلے سے زیادہ آبادی کو خوراک کی بہم رسانی ضروری ہے بالفاظ دیگر اشیاء کے خور و نوش کی قیمتوں میں اضافہ ہوجائیگا۔ اور اس طرح یہ اضافہ خواہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو ملک کی زراعت پیشہ آبادی کے لئے فائدہ مند ہوگا لیکن یہ فائدہ کچھ زیادہ دیرپا نہ ہوگا اس لئے کہ ہم نے یہ فرض کیا ہے کہ پناہ گزین ایک متوازن آبادی والے ملک میں مقیم ہیں اس لئے بہت ممکن ہے کہ چند ہی سال بعد قانون تقلیل حاصل کا عمل شروع ہوجائے اور زمینات پر ضرورت سے زیادہ بار پڑنے لگے گا۔ اس طرح زراعت پیشہ طبقہ کو کثیر نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ اس سلسلہ میں ایک امر اور غور طلب ہے۔ اگر حالت یہ ہو کہ ملک کی زرعی پیداوار اس خاص ملک کو برآمد کی جارہی تھی جس ملک کے پناہ گزین یہاں سکونت پذیر ہیں تو ظاہر ہے کہ اس بیرونی طلب میں تخفیف ہوگی اور اس طرح بحیثیت مجموعی بہت ممکن ہے کہ ملکی مزارعین کی آمدنی میں اضافہ نہ ہو بلکہ اس امر کا اندیشہ ہے کہ کہیں ان کو نقصان نہ پہونچے۔ کیونکہ جس ملک کے پناہ گزینوں نے یہاں سکونت اختیار کی ہے ان کی قوتِ خرید

یقیناً اتنی نہ ہوگی جتنی کہ اس وقت تھی جبکہ وہ اپنے وطن میں مقیم تھے۔ اس لئے اشیائے خورونوش کی اندرونی قیمتوں میں جو اضافہ ہوگا وہ ممکن ہے کہ بیرونی طلب کی تلافی نہ کرسکے۔ اور اسطرح بحیثیت مجموعی مزارعین نقصان میں رہیں گے۔ اس صورت حال سے وہ افراد تو ضرور متاثر ہوں گے جو زرعی اشیار کی حمل ونقل میں مصروف رہیں۔ خواہ مزارعین کی آمدنی متاثر ہو یا نہ ہو لیکن اس طبقہ کا نقصان اس لئے لازمی ہے کہ جب برآمد میں تخفیف ہوگی تو ان کی آمدنیوں میں بھی کمی ہوگی واضح رہے کہ یہ صورت اس وقت ہوگی جبکہ پناہ گزینوں کی تعداد کافی ہو۔

یہاں تک تو ہم نے ایک ایسے ملک کا تذکرہ کیا جہاں آبادی متوازن ہے۔ اسی پر سے اس ملک کا قیاس بھی کرلیا جاسکتا ہے جہاں آبادی وسائل قدرت کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے ظاہر ہے کہ وہاں اس قسم کی آبادکاری اور بھی برے اثرات پیدا کرے گی۔

اب ہم دیکھیں گے کہ ایک ایسے ملک میں، جہاں آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے وسائل قدرت زیادہ ہیں، ان پناہ گزینوں کی سکونت کے باعث کیا مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

ایسے ملک میں پناہ گزین آبادی کی سکونت سے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں اول تو یہ کہ محنت حسب ضرورت دستیاب ہوسکتی ہے جس کے باعث وہاں کے وسائل قدرت سے استفادہ آسان ہوجاتا ہے۔ ماہر مزدوروں کی دماغی صلاحیتوں سے ملک مستفید ہوتا ہے۔ اور ملک اُن مصارف سے بچ جاتا ہے جو غیر ملکی ماہرین کی خدمات حاصل کرنے میں لاحق ہوتے ہیں۔ اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے جرمنی و آسٹریا کے نکالے ہوے یہودیوں کو جو ماہر مزدور ہیں چند ماہ قبل اسٹریلیا و نیوزی لینڈ میں قیام کی اجازت دی گئی بعض دفعہ تو اس قسم کی آبادکاری سے ملک میں بعض خاص صنعتوں کا وجود ہوتا ہے۔ مثلاً انگلستان کی صنعت پارچہ بافی، جس کے باعث انگلستان کو دیگر ممالک کے بمقابل امتیازی حیثیت حاصل ہے، اُن پراٹسٹنٹوں کی رہین منت ہے جن کو لوی چہار دہم نے سولہویں صدی عیسوی میں فرانس سے خارج کردیا تھا اور جنھوں نے انگلستان میں پناہ لی تھی۔

یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر موجودہ یہودی پناہ گزینوں کی حالت اور ان کے مسائل کے حل کے

متعلق کچھ نہ کہا جائے۔ اس وقت ہر ہٹلر یہودیوں کا سخت دشمن ہے اس کی ایک وجہ تو نسلی تعصب ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جنگِ عظیم میں جرمن یہودیوں نے جرمنی کو رقمی امداد نہ دی تھی بلکہ اپنا روپیہ پیسہ باہر کے بنکوں میں محفوظ کر دیا تھا۔ انہیں جرمنی کی اس حالت سے سروکار نہ تھا۔ غرض یہ کہ اسی بناء پر ان کو نکال باہر کیا جارہا ہے۔ یہودی توطن پذیری کے مسئلہ نے اس وقت بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۲۱ر نومبر کو فلسطین کے متعلق حکومت مصر و برطانیہ کا ایک معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ تمام عربوں کو جو اس سلسلہ میں نظر بند کر دئے گئے ہیں رہا کر دیا جائیگا نیز یہودیوں کی آمد میں کمی کی جائیگی اور ان کا فلسطین میں تا حکم ثانی عام داخلہ بند کر دیا جائے گا ایک طرف عالم اسلام اور نازیت یہودیوں سے نالاں ہیں تو دوسری طرف برطانیہ اور امریکہ ان کی اشک شوئی میں مصروف ہیں۔ فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کے باعث کشت و خون کا بازار گرم رہا اور نہ صرف ممالک عربیہ بلکہ تمام عالم اسلام نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی آخر جرمنی کے ایک اشارہ چشم پر فان راتھ کے قتل کے بعد چودہ ہزار یہودیوں کو گرفتار کیا گیا ان پر کثیر جرمانے عائد کیے گئے ان کے تھیٹر سینما بند کر دئے گئے اور انکی دوکانیں لوٹ لی گئیں۔ جرمنی کے مقبوضہ علاقہ پولینڈ کے یہودیوں کی حالت بھی بری ہے پولٹیکن کے نامہ نگار نے ان کی افسوس ناک حالت کا جو خاکہ کھینچا ہے اس سے عبرت ہوتی ہے۔ ان کو خاردار تاروں کے حصار میں مقید رکھا گیا ہے۔ اس رقبہ پر پولس کی سخت نگرانی ہے۔ ان سے بارہ بارہ گھنٹے مسلسل جبریہ کام لیا جاتا ہے انھیں صرف ۳۰ منٹ کا وقفہ دیا جاتا ہے۔ (۷۰) سال تک کی عمر والے مرد اور ۵۵ سال تک کی عمر والی عورتوں کو کام کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ ان جرمنوں کو بھی نکل جانے پر مجبور کیا جارہا ہے جن کی بیویاں یہودی النسل ہیں یہ لوگ تنگ آکر خودکشی کر رہے ہیں تاکہ کم از کم ان کی اولاد ہی جرمنی میں رہ سکے۔ ایسے یہودی جو تخلیہ کر کے چلے جارہے ہوں ان کو اپنے ہمراہ کسی قسم کے مال اسباب یا روپیہ پیسہ لے جانے کی اجازت نہیں ہے ان کی ملک اور جائداد حکومت چھین لیتی ہے البتہ صرف ۱۵ پونڈ ان کو ساتھ لے جانے کے لئے دے دئے جاتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ مخالف یہود تحریک ہے اور دوسری طرف ۱۹۳۳ء سے

اب تک گیارہ ہزار سے زائد یہودیوں کو انگلستان نے اپنے سایہ عاطفت میں رہنے کے لئے جگہ دی جرمنی اور آسٹریا سے نکالے ہوئے یہودیوں کو چند ماہ قبل آسٹریلیا نیوزی لینڈ میں بھی قیام کی اجازت دی گئی ہے۔ شنگھائی میں بھی گذشتہ چند مہینوں میں جرمنی سے نکالے ہوئے یہودیوں کی ایک کافی تعداد کو پناہ دی گئی ہے۔ گیانا اور ٹنگانیکا میں بھی ان کو بسایا جارہا ہے ان سب پر طرفہ تماشہ یہ ہے کہ سینیر مسولینی نے بھی حبشہ میں ایک یہودی ریاست کے قیام کی تجویز ہر ہٹلر کے سامنے پیش کی تھی اگر یہ تجویز عملی جامہ پہن لیتی تو یہ مسئلہ بڑی حد تک حل ہوجاتا۔ یہ صورت حال مستبعد اور تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن مندرجہ بالا اصولی تشریح کی روشنی میں ناقابل فہم نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ نہ تو فلسطین، عالم اسلام اور دیگر ممالک کی یہ سب چینیاں بے بنیاد ہیں اور نہ برطانیہ و امریکہ کی یہ ہمدردیاں کسی بلند اخلاقی اصول کی آئینہ دار ہیں بلکہ ان کے پس پردہ سیاسی اور خالص معاشی اغراض کارفرما ہیں۔ اس مسئلہ کا صحیح حل تو یہی ہوسکتا ہے کہ ہٹلر کے نظریہ کی غلطی کو واضح کیا جائے۔ اور اس کو اس طرز عمل سے باز رکھا جائے لیکن ہٹلر کو سمجھائے کون؟ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ موجودہ معاشی قومیت کے بندھنوں کو ڈھیلا کیا جائے اور خصوصاً وہ ممالک جن کے پاس وسائل قدرت وافر ہیں ان یہودیوں کو پناہ دیں اس طرح ایک طرف ان ممالک کو ان باہارت یہودیوں کی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملے گا اور دوسری طرف ان یہودیوں کی پناہ گزینی کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔

افضل الدین خان سال چہارم (معاشیات)

غالب کا ایک شعر

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

مرزا غالب کی خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہ ان کے شارحین کی تعداد اس قدر کثیر ہے جو کسی دوسرے اُردو شاعر کو میسر نہیں آئی اور ان کے اشعار کا مفہوم سمجھنے میں اتنا وسیع اختلاف ہے کہ کسی نے ان کے کلام کو مہمل سمجھا اور کسی نے ان کو مبہم ٹھہرایا۔ دورِ موجودہ کے بعض گرامی قدر اساتذہ نے کلام غالب کی شرح لکھنے کی تکلیف گوارا فرمائی ہے اور فصاحت و بلاغت، شعر فہمی اور نکتہ سنجی کے حیرت انگیز نمونے پیش کئے ہیں چنانچہ اکثر اشعار کا مفہوم ع شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا کی تفسیر ہو کر رہ گیا ہے۔ زیب عنوان شعر بھی انھیں میں سے ہے۔

علامۂ نظم طبا طبائی کا ارشاد ہے "جس طرح آفتاب کے سامنے شبنم نہیں ٹھہر سکتی اسی طرح تیرے مقابلہ کی تاب آئینہ نہیں لا سکتا"۔ جانشینانِ داغ میں سے ایک صاحب فرماتے ہیں "تیرے جلووں نے آئینہ خانہ کا بالکل ایسا نقشہ کر دیا جیسے سورج کے نکلنے سے باغ میں شبنم کا ہو جاتا ہے"۔ یعنی جس طرح سورج کے مقابلہ میں شبنم نہیں ٹھہر سکتی اسی طرح تیرے جلووں کے مقابلہ میں آئینہ کی

آب وتاب بھی نہ ٹھہر سکی ۔"

فاضل شارحین کی استادی میں تو کلام نہیں مگر افسوس ہے کہ زیر نظر شعر کی شرح کرنے میں ان حضرات نے دقتِ نگاہ سے کام نہیں لیا اور بادی النظر میں جو معنی ذہن نشین ہوے وہ بیان کردیے میں یہ تو نہ کہوں گا کہ ان کے بیان کیے ہوئے معنی بالکل غلط ہیں ہاں یہ ضرور عرض کیا جاسکتا ہے کہ غالب غالب نہ ہوتے اگر ان کے پیش نظر یہی مفہوم ہوتا ۔

علامہ طبا طبائی وغیرہ کو غالبا مرزا کے اس شعر سے مغالطہ ہوا ؎

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　　ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اوّل تو غزل کے ایک شعر سے دوسرے شعر کا مفہوم سمجھنے میں مدد لینا اصولاً غلط ہے غزل کا ہر شعر بجائے خود مستقل ہوتا ہے ۔ مسلسل غزل کو مستثنیات میں سمجھنا چاہیے ۔ اکثر شاعر ایسی کیفیتوں کی تصویر بھی کھینچتا ہے جو ایک دوسرے سے قطعی متضاد ہوتی ہیں مثلاً نواب فصیح الملک کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی　　　چڑھی ہے یہ آندھی اتر جاے گی

رہیں گی دم مرگ تک خواہشیں　　　طبیعت کوئی آج بھر جاے گی؟

دوسرے تھوڑے سے تامل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس شعر میں فنا کی تعلیم کا ذریعہ خوش جمالی نہیں بلکہ عنایت کی نظر ہے اس لئے پرتو سے مراد اثر ہوگا ۔ اس کے برعکس زیر بحث شعر میں وجہ شبہ سورج کی روشنی ہے ۔ ظاہر ہے کہ سورج کی روشنی سے شبنم کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا بلکہ تپشِ آفتاب اسے بھاپ بناکر اڑادیتی ہے اس لئے فنا کی تعلیم والے شعر سے استدلال صحیح نہیں ۔

کسی روشن تر چیز کے سامنے آئینہ کا مدھم پڑجانا بھی صحیح نہیں آئینہ کی خاصیت روشنی کا عکس لیکر اس کو اور جلا دیدینا ہے ۔ مان لیجیے کہ جلوۂ محبوب کے سامنے آئینہ کی آب وتاب نہیں ٹھہر سکتی لیکن آئینہ اپنی جگہ بدستور قائم رہے گا اور سورج کے مقابلہ میں خود شبنم فنا ہوجائے لیکن مٹتے مٹتے بھی

اس کے قطروں کی تابانی زائل نہیں ہوگی۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ شاعر نے شبنم اور آئینہ نہیں بلکہ شبنمستان اور آئینہ خانہ استعمال کیا ہے۔ شبنمستان سے اگر وہ سبزہ زار مراد لیا جائے جس پر اوس پڑی ہوئی ہو تو شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ پرتو خورشید نے شبنمستان کی رونق کو پھیکا کر دیا۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ پرتو خورشید سے قبل شبنمستاں میں کوئی نظر فریبی۔ کوئی تابانی نہیں ہوتی۔ میر انیس نے جس منظر کی مصوری ان الفاظ میں کی ہے۔ ع

تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ پرتوِ خورشید ہی کا رہین منت ہے یہ مانا کہ فروغ شبنمستان کا زمانہ بہت مختصر ہوتا ہے اور پرتوِ خورشید سے جہاں شبنمستاں جگمگا اٹھتا ہے وہاں شبنم فنا بھی ہو جاتی ہے۔ مگر یہ تو اصول فطرت ہے۔ ع میری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی۔ کلی چٹکنے کے بعد پھول کی زندگی بھی تو مختصر ہوتی ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ غنچہ گل سے زیادہ حسین ہے ؟

جلوۂ یار کے مقابلہ میں آئینہ کی چمک کیا، روشن تر چیز کا نسبتاً مدہم ہونا مسلم ہے۔ غالب کو کیا ضرورت تھی کہ اس مضمون پر خامہ فرسائی کرتے جو مسلمات شاعری میں داخل ہے۔ موازنہ ہوا کرتا ہے برابر کی چیزوں میں۔ آفتاب اور شبنم۔ جمال محبوب اور آئینہ خانہ کی آب و تاب کو آپس میں کیا نسبت ؟ ان کے مقابلہ کا خیال غالب ایسے سلیم المذاق شاعر پر بہتان ہے۔

یہ شعر محاکات اور تخئیل کی ایک لطیف مثال ہے۔ غالب نے ایک نہایت حسین منظر کی تصویر کھینچی ہے۔ برسات یا جاڑوں میں سورج نکلنے کے بعد کسی سبزہ زار میں جاکر فطرت کا بے پناہ منظر ملاحظہ کیجئے۔ آفتاب کی شعاعوں سے شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخمل کی زمردین چادر پر بے شمار موتی ٹکے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ چمک دمک ذاتی نہیں ہوتی بلکہ جمال ہم نشین کا اثر ہوتا ہے شبنم میں فی نفسہ کوئی چمک نہیں ہوتی۔ سورج کی کرنیں اسے لے اڑتی ہیں اور پورا شبنمستان جگمگ جگمگ کرنے لگتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ بالکل اسیطرح

رخ محبوب کے عکس سے آئینہ خانہ جگمگا اٹھتا ہے ۔ شیش محل میں برقی قمقمہ روشن کردیجئے پھر دیکھئے آئینوں کے فروغ کا کیا عالم ہوتا ہے نظر خیرہ ہو جائے گی ۔ شاعر کے نزدیک رخِ محبوب میں بدرجہا زیادہ تابانی نہیں ہوتی اب اگر محبوب آئینہ خانہ میں جلوہ فگن ہو اور اس کا عکس نظر آئے تو رونق کا کیا عالم ہوگا ۔ اس کو غالب ایسے ذکی الحس اور لطیف الخیال شاعر کے دل سے پوچھئے ۔

ماخوذ

ماہ لقا بائی چندا

اگرچہ اس موضوع پر اختر حسن صاحب نے ایک مبسوط مضمون لکھا تھا
جو مرقع سخن جلد اوّل میں شایع ہو چکا ہے لیکن شہر بانو نقوی صاحبہ نے ماہ لقا کے
حالات نہایت دلچسپ لکھے ہیں جو یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(مدیر)

ماہ نامہ جو ایک ضخیم فارسی تاریخ ہے غلام حسین خان جوہر نے ۱۲۲۹ھ میں ماہ لقا کے کتاب خانے سے استفادہ حاصل کر کے لکھی۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک نایاب قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ ماہ لقا بائی چندا کے حالات اور سوانح حیات بیشتر اسی تاریخ سے معلوم ہوتے ہیں اور اس کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ماہ لقا بائی کا جد اعلیٰ قوم چغتائی برلاس سے تھا۔

۲۰ ذیقعدہ ۱۱۸۱ھ کو ماہ لقا شہر فرخندہ بنیاد میں پیدا ہوئی۔ مہتاب کنور بائی المخاطب "صاحب جی صاحبہ" محل رکن الدولہ بہادر مدارالمہام وقت نے لاولدی کی بنا پر چندا کو گود لے لیا اس طرح ایوان وزارت میں اس نے پرورش پائی۔ تعلیم و تربیت کے لئے اساتذہ باکمال مقرر کئے گئے

اور ساتھ ہی فن موسیقی کی تعلیم بھی ان اساتذہ سے دلوائی گئی جو اس فن لطیف میں یدطولی رکھتے تھے۔ قدرت نے چندا کو حسن و جمال کی چلتی بولتی تصویر بنا کر خلق کیا تھا۔ اپنے علم و ہنر، حسن و خلق کی وجہ حضرت غفران مآب کی اس پر خاص عنایت تھی۔ معرکہ نرمل اور پانگل کی مہم میں علی الترتیب ۱۱۹۶ھ اور ۱۲۱۷ھ میں حضور والا نے ماہ لقا کو اپنے ہمراہ رکھا آخر الذکر مہم سے فتحیاب واپس ہوکر جشن آراستہ کیا اور چندا کو " ماہ لقا " کے خطاب اور نوبت سے مفتخر کیا۔ ہر مجرے کے لئے اکہزار انعام مقرر ہوا۔

ماہ لقا نہایت متمول تھی۔ اس کے انتقال کے بعد جب اس کی دولت کا احصا کیا گیا تو باغات اور عالیشان عمارات کے علاوہ نقد جنس کی قسم سے ایک کروڑ روپیہ کا شمار ہوا۔ ماہ لقا کی جاگیر میں سیدپلی، چندا پیٹھ، پلے پہاڑ، علی باغ، حیدرگوڑہ اور اڈک میٹ " شامل تھے۔

آج جس سرزمین پر جامعہ عثمانیہ کی باشکوہ دنیا آباد ہو رہی ہے کبھی اس پر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی ایک باکمال حورتمثال عورت جو اُردو کی سب سے پہلی شاعرہ تھی حکمراں رہ چکی ہے۔

چندا کو تعمیر کا بیحد شوق تھا۔ اپنی زندگی ہی میں اس نے ایک لاکھ کے مصارف سے اپنا مقبرہ اپنے ہی مرتبہ نقشہ کی بنا پر تعمیر کرایا تھا۔ آج یہ مقبرہ جو اس شاعرہ بے مثال کی یاد تازہ کرتا ہے " کوہ مولیٰ علیؑ " کے دامن میں سرسبز و فرحت افزا مقام پر واقع ہے۔ کوہ شریف کا پختہ دالان اور حوض بھی اسی کی یادگار ہے کمال ایلچی بیگ کی شاندار حویلی اور متصلہ مسجد بھی اسی کی بنوائی ہوئی ہے۔

امراء و اعیان سلطنت ماہ لقا کا احترام کرتے تھے اور حضرت مغفرت منزل نے اس کے متعلق فرمایا تھا " مانند ماہ لقا بائی دیگرے بہ ایں کمالات پیدا شد مشکل است "۔ مہاراجہ چندو لعل اور نواب اعظم الامراء ارسطو جاہ بہادر ماہ لقا کی بڑی عظمت کرتے اور اس کی شاعری کا لوہا مانتے تھے۔ دولت آصفیہ کے اس عہد کے مدار المہام نواب میر عالم بہادر اسی کے متعلق کہا کرتے تھے " جلیس بے تمیز بہ ایں جدتِ طبع و رسائی فہم مثل ماہ لقا بائی کم دیدہ شد " نواب موصوف نے فارسی نظم میں اس کا

ایک سراپا بھی لکھا ہے جس میں تقریباً سوا دو سو اشعار ہیں ماہ لقا بائی چندا مسافر نواز اور غریب و عالم پرور واقع ہوئی تھی۔ کئی ادیبوں اور شاعروں کی اس نے سرپرستی قبول کی تھی چنانچہ میر درد کے عزیز شاگرد حافظ تاج الدین محمد مشتاق دہلوی جب حیدرآباد آئے تو ان کے فضل و کمال پر نظر کرتے ماہ لقا بائی نے انکی مہمانی کی اور بعد میں اسی کے توسط سے حافظ صاحب مہاراجہ چندو لعل کے دربار میں داخل ہوئے جہاں سے دو سو روپیہ ماہوار مقرر ہوگئی۔ سنہ ۱۲۴۰ھ میں چندا کا انتقال ہوا اس وقت اس کی عمر ساٹھ برس کی تھی۔ کسی شاعر نے تاریخ وفات کہی جو اس کے مقبرہ پر کندہ ہے " راہی جنت شدہ ماہ لقای دکن " چندا کی بیشمار پروردہ لڑکیاں تھیں لیکن صرف انمیں سے " حسین لقا " نے شہرت حاصل کی اسٹیشن نامپلی کے قریب اسی حسین لقا بائی کا ایک کشادہ مکان اور وسیع باغ اب تک موجود ہے۔ اگر ایک طرف " ماہ لقا بائی چندا " کی جائداد اڈکمیٹ میں جامعہ کی شاندار پرشکوہ عمارتیں نظر آتی ہیں تو دوسری طرف حسین لقا بائی کے مکان اور باغ میں چند ہی دن قبل تک کلیہ اناث قائم تھا اور اب بھی فوقانیہ نسوان موجود ہے۔

چندا اردو کی اولین شاعرہ ہے جس نے اپنا مکمل دیوان چھوڑا۔ وہ فنی شاعرہ ہرگز نہ تھی بلکہ اس نے جتنے کچھ بھی شعر کہے وہ سب کے سب فطری لگاؤ کی باعث سرانجام ہوے ماہ لقا تفریحاً شعر کہا کرتی تھی اس لئے اس کی شاعری کسی خاص پیغام یا فنی خوبیوں سے معرا ہے۔ تاہم اس کی غزلیں داخلی شاعری کی تمام خصوصیات کی حامل ہیں۔ اس نے ایک نفیس کتب خانہ بنایا تھا جس میں اس نے اپنے مذاق کے مطابق نادر کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔

ماہ لقا نے فن موسیقی کی باضابطہ تعلیم حاصل کی تھی اور اس میں ید طولیٰ پایا تھا۔ ساتھ ہی قدرت نے اپنی پوری فیاضی کیساتھ حسن و جمال کی نعمت اسے عطا کی تھی۔ عہد طفلی بھی اس کا ناز و نعم میں گذرا تھا اور جوانی کا زمانہ تو صرف عیش و عشرت ہی کے لئے وقف تھا۔ ماحول کا اثر اس کے ذوق شعری پر بہت اچھا مرتب ہوا۔ ماہ لقا کے اشعار اس کے ذاتی حالات اور خیالات کے آئینہ دار ہیں۔ اس کی غزلوں سے اس کے واردات قلبی اور تاثرات ذہنی کی بلندی اور نفاست ظاہر ہوتی ہے۔

اس کا کلام ایک ایسی عورت کا کلام معلوم ہوتا ہے جو شباب و حسن کے نشہ سے مخمور ہو اور جو دائمی اور سچی محبت کی پیاسی ہو۔ عامیانہ افکار اور مبتذل جذبات سے اسکی شاعری کا دامن بے لوث ہے۔ فلسفہ حیات کو وہ بجز اس کے کہ :-

خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است" اور کچھ نہیں سمجھتی۔ اس کی شاعری میں خیام کا پیام ایک نرالے رنگ کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ "دنیائے آیندہ" سے مایوس نہیں، مگر وہ اس دنیا کو حقیر اور بے حقیقت بھی نہیں سمجھتی۔ ماہ لقا کے خیال میں مادہ اور روح یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ دنیا جس میں ہم رہتے بستے ہیں مادی ہے۔ اس کا رنج و محن، عیش و نشاط، محبت و نفرت نیز اس کے تمام کاروبار فانی ہیں۔ دوسری دنیا جو اس زندگیٔ مستعار کے بعد ہمیں نصیب ہوگی اصل میں ہماری حیات روحانی کی جولانگاہ اور منزل مقصود ہوگی۔ غرض مولانا روم اور عمر خیام دونوں کا فلسفہ حیات اسکی شاعری میں نہایت غیر محسوس طور پر ہم آہنگ ہے۔ اس کی شاعری کا مطالعہ کرنیوالا حیات بعد الممات کے خوش آئند لمحات کے تخیل سے آسانی کے ساتھ مرجانے پر اپنے کو تیار پاتا ہے۔ وہ شاید زندگی کو بھی اپنے لئے آسان اور کیف آور سمجھنے لگتا اور موت بھی اسے ڈراونی نظر نہیں آتی ہے۔ اس کی شاعری میں یہ رنگ نہایت گہرا ہے اور اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اسکی اپنی زندگی اور ماحول و معاشرت نے اس کی شاعری میں خیام کی رجائیت اور سرشاری کا عنصر غالب کردیا تھا۔ ساتھ ہی جناب امیر علیہ السّلام کے ساتھ اسکی گہری عقیدت نیز بے سہارا غیر مطمئن زندگی نے اس کی روح میں انتشار و بے چینی کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ اس سے وہ اتنی متاثر تھی کہ اسکی شاعری پر دوسری دنیا اور دوسری حیات کے متعلق ایک خاص فلسفہ چھا گیا تھا اسی بنا پر جب کبھی وہ جناب علی علیہ السّلام سے کوئی التجا کرتی ہے تو دین و دنیا اور زندگی و آخرت کا ذکر ساتھ ہی ساتھ کردیتی ہے۔

۱۲۲۶ھ میں خود اس نے اپنا دیوان مرتب کیا۔ اس دیوان میں ایک سو پچیس[۱۲۵] غزلیات ہیں اور ہر غزل پانچ شعر کی ہے۔ اس نے نہ صرف پنجتن پاک کے نام کے پانچ پانچ شعر کہے ہیں بلکہ تقریباً تمام

غزلوں کے مقطعے منقبت میں ہیں۔

ماہ لقا کی شاعری کا عروجی دور تقریباً تیرھویں صدی ہجری کا ربع اول ہے۔ ۱۲۲۵ھ میں میر محمد تقی میرؔ نے داعی اجل کو لبیک کہا چند ہی سال کی تقدیم و تاخیر سے دہلی میں میرؔ دردؔ اور سوداؔ جیسے اُردو کے عدیم النظیر سخنور اس کے معاصر تھے اور شہر فرخندہ بنیاد میں شاداںؔ، فیضؔ اور ایمانؔ جیسے مایۂ ناز شعرا موجود تھے۔

ماہ لقا چندا کی شاعری نے اکثر شعراء وقت اور امراء دولت پر خاص اثر ڈالے ہیں اور اسی فن لطیف کی وجہ سے چندا کا نام ابد آباد تک تاریخ ادب میں زندہ رہے گا۔ اُردو زبان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اس کا دامن صنف لطیف کے ادبی افکار اور شعری کاوشوں سے بھی بڑی حد تک مالا مال ہے۔

چندا کا پیرایہ بیان بحد شیریں اور لطیف ہے۔ اس کی شاعری میں مابہ الامتیاز اسکا استعمال "ضمائر تانیث" ہے۔ مثال کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یا علیؑ چندا ترے گلشن سے پاتی ہے بہار
مثل بلبل جو اسے دیکھے غزلخواں کیوں نہو

چندا کی جو کونین میں امداد کروگے
سو جان سے ہوگی وہ تصدق مرے مولا

حضرت علیؑ مرتضیٰ علیہ السّلام کی کنیزی کا اس کو فخر حاصل ہے وہ دونوں جہاں میں سرخروی کی حاجت مند ہے ؎

سرخرو ہرگز نہ ہو چندا کسی سے دہر میں
یہ جناب مرتضیٰ کی ہے کنیزی کا غرور

عاشق ہے نیم جان نئی لے سے تان بھر
شاہ و گدا تو دنگ ہوئے تیرے رقص پر

سدا مولا سے چندا مانگتی ہے یہ دعا بیخود
مجھے دو سرخروئی دو جہاں میں اپنی بخشش سے

چندا کی شاعری میں فطرتاً نسائیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ داخلی رنگ کتنا گہرا ہے ملاحظہ ہو ؎

دیکھے خور نکلے ہے جوں نور سحر میں غوطہ
خوب سجتی ہے ترے بر میں یہ پوشاک سفید

اشک کی طرح نہ ٹھہرا کوئی دم آنکھوں میں
دل میں رہتا ہے مرے گرچہ وہ طفل بدخو

مری نازک مزاجی کی خبر رکھتا نہیں ہرگز وہ سنگین دل نہیں ممکن کسی کا ہو کبھی عاشق

اس کی شاعری خود اپنی زندگی کی آئینہ دار ہے وہ اپنے خیالات کی بلا تکلف ترجمانی کرتی ہے ؎

ثابت قدم ہے جو کوئی چندا کے عشق میں صف میں وہ عشق بازوں کے سالار ہی ہا

چندا کے کلام میں رنگینی اور ظرافت بھی بہت ہے۔ اس نے اکثر مقامات پر اپنے حسن و شباب کی تعریف کی ہے لیکن انداز بیان ملاحظہ ہو ؎

ناز چندا کو نہ ہو کیوں نوجوانی پر فلک جس کو ہر دم ہے بھروسہ مرتضیٰ سے پیر کا

چندا کی شاعری کی آخری اور پہلی خصوصیت " موسیقیت " ہے اس نے اپنے مرتبہ دیوان میں انگشت شمار بحریں استعمال کی ہیں اور یہ سب بحریں ایسی ہیں کہ جنھیں موسیقی سے قریبی تعلق ہے ۔ عاشقانہ رنگ اس کی شاعری پر چھایا ہوا ہے ۔

ایسی ہی ہستیاں ہیں جنھیں ہم بجا طور پر صنادید دکن کہہ سکتے ہیں رزم گاہ شجاعت و جرائت میں چاند سلطانہ ، اور میدان شعر و سخن میں چندا اور خاںجہ سلطانہ شہر بانو دکن کی تاریخ میں زندۂ جاوید رہیں گی فقط

شہر بانو نقوی بی۔اے (آخری)

ناکارہ اشیاء سے دولت کا حصول

سائینس کے ہزاروں کارناموں میں سے ایک ادنیٰ لیکن اہم کارنامہ یہہ ہے کہ اشیاء جواب تک استعمال کے بعد بیکار سمجھہ کر پھینک دی جاتی تھیں، کام میں لانے کے بعد کثیر دولت کے حصول کا ذریعہ بنائی گئی ہیں۔ لفظ مستعملہ کا مفہوم بالکل بدل گیا ہے۔ حقیقی معنوں میں بیکار چیز اس وقت تک بیکار نہیں ہوتی جب تک کہ ہم اس کو بیکار نہ کرنا چاہیں۔

ضائع شدہ اشیاء مثلاً کچرا۔ کوڑا کرکٹ وغیرہ سے نہایت قیمتی اشیاء حاصل کی جارہی ہیں۔ اسکی ابتدا سب سے پہلے مارچ ۱۹۳۱ء میں چانسری ڈویژن (Chancry Division) سے ہوئی۔ شہر برنگھم کے محکمہ صفائی کے ایک ذمہ دار عہدہ دار نے بیان کیا کہ وہ شہر کے فضلے سے ہر سال ۶۰۰۰ پونڈ قیمت کی کارآمد اشیاء حاصل کرتے ہیں۔

برنگھم میں صرف شدہ اشیاء سے برقی قوت حاصل کی جاتی ہے جو ان اشیاء کے لانے والی لاریوں کو مہیا کی جاتی ہیں۔ اس کے دیگر حصے قیمتی کھاد تیار کرنے میں استعمال ہوتے ہیں جو وہاں کے باغوں۔ پھولوں اور ترکاریوں کی نشو و نما کے لئے نہایت مفید ہے۔ اس طرح یہ لفظ بہ لفظ صحیح ہو گیا ہے کہ

" اس کی کوئی ضائع شدہ چیز ضائع نہیں ہونے پاتی "

کچرے کی گاڑیاں کچرا ہر سمت سے سمیٹ کر کارخانہ جات پہنچاتی ہیں جہاں طاقتور ہوائی پنکھوں کے ذریعہ گرد و غبار دور کر لیا جاتا ہے اور پھر اس کو بڑے بڑے پیپوں میں بھر لیا جاتا ہے اور انھیں بآسانی دلدلی زمینوں پر لیجا کر بکھیر دیا جاتا ہے جن سے عمدہ گھاس اور فصلیں حاصل کی جاتی ہیں۔

باقی ثفل کو برقی مقناطیسوں کے نیچے سے گذارا جاتا ہے جو لوہے اور فولاد کو کلیتاً کھینچ لیتے ہیں۔ ٹین کے ٹکڑے۔ آہنی نلیوں کے ٹکڑے۔ ریزر کی پتیاں۔ سیکل و موٹر وغیرہ کے پرانے پرزہ وغیرہ وہ عام اشیاء ہیں جو ان میں شامل ہوتی ہیں۔ ان سب کو بھٹیوں میں پہنچایا جاتا ہے جہاں پگھلا کر انھیں نئی نئی چیزوں میں ڈھال لیتے ہیں۔

دیگر اشیاء مثلاً پھٹے کپڑے۔ پرانے کاغذ کے ٹکڑے۔ گراموفون کے رکارڈس۔ اور دیگر بیشمار چیزیں جدا کی جاکر مختلف اغراض کے لئے کام میں لائی جاتی ہیں۔ ان میں بعض مثلاً موز کے چھلکے اور ہڈیاں قیمتی کھاد بناتے ہیں۔ جب تقسیم کے مختلف مرحلے طے ہو جاتے ہیں تو باقی حصہ ایندھن کے طور پر کارخانہ کی برقی بھٹیوں میں استعمال کیا جاتا ہے جہاں سے ان کچرا لانے والی گاڑیوں کو قوت محرکہ عطا کی جاتی ہے۔ بھٹیوں میں ایندھن کے کام آجانے کے بعد جو فضلہ میل باقی رہ جاتا ہے اس کو بھی رائیگاں نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو اعلیٰ قسم کے فرشی اینٹ بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

برمنگھم نے ایک سال میں اپنی صرف شدہ اشیاء سے ۷۰۰۰ پونڈ کی کھاد۔ ۴۰۰۰ پونڈ کی گریس ۳۵۰۰ پونڈ کا تعمیری مادہ اور دیگر کئی اشیاء جو ۱۶۰۰۰ پونڈ قیمت کی تھیں حاصل کیں۔ انگلستان اور ویلز میں قریب ۱۱۰۰۰۰۰۰ ٹن گھروں کا کچرا۔ ۳۰۰۰۰۰۰ ٹن گلیوں کا۔ اور ۱۰۰۰۰۰۰ ٹن تجارتی کچرا کام میں لایا جارہا ہے اندازہ لگایا گیا کہ صرف لندن ہر سال ۲۰۰۰۰۰۰ ٹن کچرا وغیرہ ضائع کردیا کرتا تھا جسکی قیمت تقریباً ۲۵۰۰۰۰ پونڈ ہوگی۔

اس معاملہ میں ایک دوسرا اہم خطہ براڈ فورڈ کا ہے۔ وہاں کے بدرو (Sewage works) سے گریس حاصل کیا جاتا ہے جو ۲۷ سال میں ۱۳۳۴۰۰۰ پونڈ کا حاصل ہوا۔ اس کارخانہ کے تحت

۵۳ ایکر تقطیری قطعہ ہیں
بدرو کی گندہ اور فضول چیزیں اب گندہ نہیں رہیں۔ انگلستان کے بعض حصوں میں اس سے کھاد تیار کی جاتی ہے۔ امریکہ میں اس سے خارج شدہ گیسوں کو اندرونی احتراقی انجنوں مثلاً موٹر وغیرہ میں قوت پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

چارلٹ (Chorlatte) واقع شمالی کیرولینا کے شکر کے کارخانہ میں ان گیسوں کو بڑے بڑے جاذب حوضوں میں جمع کرتے ہیں جہاں کچھ تخلیص کا عمل کرکے انہیں گیسی مخزنوں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس عمل کے پہلے سال کے دوران میں ۹۰ ملین (۹۰۰۰۰۰۰) گیلن بدروئی فضلہ سے چار صد ھزار (۴۰۰۰۰) مکعب فٹ گیس ایک ماہ کی مدت میں حاصل کی گئی اور اس مقدار سے ۲۵ ہزار کیلو واٹ گھنٹہ طاقت حاصل کی گئی۔

یہ گیس ۷۰ فیصد میتھین (دلدلی گیس) پر مشتمل تھی جو بنسن مشعل میں تقریباً بے رنگ لیکن نہایت گرم شعلہ سے جلتی ہے اس کو معمولی پٹرول انجنوں میں (Carburettors) نکال کر بھی استعمال کیا جاتا ہے
چند دنوں پہلے پلین فیلڈ (New jersey) کے ایک بھاپ حرارتی کارخانہ میں بدروئی ابخرات کو جلانے کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی گئی۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس میں گرم کرنے کی طاقت معمولی تیار شدہ گیس سے ۵۰ فیصد زائد ہے پھر کوئلہ جمع کرنے اور راکھ خارج کرنے کی محنت کی بھی بچت ہو جاتی ہے۔

ابرڈن میں ۱۲ ہزار ٹن فضلہ کو کارآمد بنانے کے لئے ایک کارخانہ قائم کیا گیا۔ جہاں نرم اور باریک مٹی ۵ ہزار تین سو دو ٹن۔ دھاتی تیل ایک ہزار ۹۱ ٹن۔ ٹن کے ٹکڑے ۳۲۹ ٹن۔ مختلف قسم کی دھاتیں ۳۰ ٹن۔ ایک ہزار آٹھ سو ٹن سے زائد مختلف پرزہ اور بیس ہزار بوتلیں استعمال کی گئیں جن سے ۸۰۰ پونڈ حاصل کئے گئے۔

انہی بارہ مہینوں کے دوران (Govan Repuse works) ۲۵۰۰۰ پونڈ کی برقی قوت حاصل کی گئی سنہ ۱۹۳۴ء اور سنہ ۱۹۳۵ء میں گلاسگو میں برق جو ۳۱ ہزار ٹن کوئلہ کی معادل تھی حاصل کی گئی۔ اگست سنہ ۱۹۳۴ء

یں گلاسگو گیس کمیٹی نے لکھا کہ پانچ ہزار گیلن کیمیائی دھون جو اب تک ضایع کردیا جاتا تھا مائع ہنزول میں تبدیل کیا جاکر ۲ شلنگ ۳ پنس فی گیلن کے حساب سے فروخت کیا جارہا ہے ۔

دھوئیں میں نادر دھاتیں ۔ نہ صرف دولت ردی کی ٹوکری میں چلی جاتی ہے بلکہ باورچی خانوں اور کارخانوں کی چمنیوں سے بھی خارج ہوجاتی ہے ۔ Teddington کی سرکاری کیمیکل ریسرچ لیبرٹری میں یہ دریافت کیا گیا کہ صنعتی دھوئیں کے ساتھ نادر دھاتیں خارج ہوجاتی ہیں جن میں سے گیلیم ایک نہایت ہی قیمتی شئے ہے ۔ اس کی اس قدر قلت ہے کہ ۱۹۳۶ء میں اسکی انگریزی سپلائی اونس میں محسوب کی گئی ۔ یہ ٹیلی ویژن کے آلے کے برقی عکسی خانوں میں استعمال کی جاتی ہے اور اعلیٰ تپش کے تپش پیماؤں کی تیاری میں بھی مستعمل ہے ۔ یہ تخمینہ کیا گیا کہ ہر سال ۱۰۰،۰۰۰ پونڈ قیمت کی گیلیم راکھ اور دخان میں ضایع ہوجاتی تھی ۔ دوسری دھات جو دخان سے حاصل کی گئی وہ جرمینیم ہے جس کی طبّی معلوں میں کمی ہے ۔

تیل سے پانی کا حصول ایک زیادہ عام ادویاتی شئے ایوڈین ہے جو کیلیفورنیا کے تیل کے کنوؤں سے حاصل شدہ پانی سے حاصل کی جاتی ہے جو اب تک بیکار سمجھا جاتا تھا ۔

ہم جانتے ہیں کہ پانی اور تیل آپسمیں مل نہیں سکتے لیکن کس قدر تعجب ہے کہ اس تیل سے جو جہازوں میں استعمال ہونیکے بعد ناکارہ ہوکر نکلتا ہے خالص پانی جدا کیا جاسکتا ہے ۔ جہازوں کا صرف شدہ تیل عموماً سمندر میں پھینک دیا جاتا تھا جس کے زہریلے اثرات سے کئی بحری پرندوں اور مچھلیوں کی موت واقع ہوتی تھی ۔ لیکن چندسال پہلے ایک انجنیر مسٹر اے ۔ ای ۔ رڈلے (Ridley) نے اسپیشین ایجاد کی جس کے ذریعہ اس استعمال شدہ تیل کو پھر قابل استعمال بنایا جاسکے ۔ اس نے اس سے قابل استعمال تیل خالص پانی اور کولتار حاصل کیا ۔ اس قسم کے آلے ۱۹۳۵ء میں بعض جہازوں میں نصب کئے گئے تھے ۔

جب پٹرولیم پہلے پہل دریافت کیا گیا تھا اسکی صرف ایک کسر کروسین (معمولی مٹی کا تیل) مفید سمجھی جاتی تھی ۔ پٹرول اندرونی احراقی انجن کی ایجاد تک اور دیگر کسریں مثلاً سائموجین ۔ ریگولین ۔

پٹرولیم ایتھر۔ پٹرولیم نفتہ۔ پٹرولیم بنزین۔ چپڑنے کا تیل۔ وسیلین اور موم ایک عرصہ تک بیکار سمجھی جاتی تھیں۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے صرف پٹرولیم سے جو چیزیں تیار کیں انکی قیمت ۴۰۵، ۳۶۱، ۲۹۶ پونڈ تھی۔

موٹر کا ایندھن ایک لاتعداد اشیا سے کشید کیا جا سکتا ہے۔ صنوبر کی لکڑی سے اس کی کشید عام طور پر کی جاتی ہے۔ راب جو کہ شکر کی صنعت کا ایک ضمنی حاصل ہے اب موٹر ایندھن کے حصول میں مستعمل ہے اس سے الکوہل ایسٹون اور بیوٹل الکوہل بھی (جو سلولوزینٹ اور مصنوعی ریشم کی تیاری میں مفید ہیں) حاصل ہوتے ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر دھار نے اپنی تحقیقات کے دوران میں یہ معلوم کیا کہ بنجر زمین جہاں گھاس کا ایک تنکا تک نہیں اُگ سکتا۔ راب کی مدد سے جو اب تک بیکار خیال کی جا کر بہا دی جاتی تھی نہایت ہی زرخیز زمین میں تبدیل کی جا سکتی ہے۔

Midlothion (اسکاٹ لینڈ) میں ایک خاص قسم کی چکنی مٹی سلٹ کے مانند ملتی ہے جسکے کئی ہزار ٹن ہر سال نکالے جاتے ہیں اس سے موٹر سپرٹ نیفتہ جلانے کے تیل۔ اور چپڑنے کے تیل کشید کئے جاتے ہیں۔ تیلوں کی کشید کے بعد اس مستعملہ مٹی سے اینٹ بنا لیتے ہیں۔ ایک خاص قسم کی سمنٹ کی تیاری میں جسکو (Pozzolana) کہتے ہیں اس کو شریک کیا جاتا ہے۔

مٹی سے تالیفی پتھر بھی بنایا جاتا ہے۔ مسٹر ڈبلیو آرٹنر کے بتلائے ہوئے طریقہ سے ایک ٹن مٹی سے ۲۵ مربع گز آئس روک اور رمی روک پتھر بنا سکتے ہیں۔ کوئلہ کی کان کے فضلہ سے عمارات کے لئے قیمتی مادہ حاصل ہوتا ہے۔ Ordell میں صرف سنہ ۱۹۳۵ء میں کوئلہ کے فضلہ سے ۲۵ ہزار ٹن اینٹ تیار کئے گئے۔ مفید کوئلہ حاصل کر لینے کے بعد جو ناقابل استعمال کوئلہ بچ جاتا ہے اس سے ایک چیز fusain تیار کرتے ہیں جسکو کوک کے ساتھ ملا دینے پر سخت ترکوک حاصل ہوتا ہے اور یہ کفایت کے ساتھ ہوائی بھٹیوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں جرمن تجار کمبرلینڈ سے کچ دھاتوں سے لوہا حاصل کر لینے کے بعد کا بچا ہوا میل نہایت اعلیٰ قیمت دے کر خریدا کرتے تھے۔ اس میل سے انہوں نے مصنوعی جواہرات تیار کر کے کثیر

منافع حاصل کیا۔

کولتار کا استعمال افزائش حسن کے لئے کولتار ایک لزج سیاہ تیل نما مادہ ہے۔ یہ دنیا کی تمام صنعتوں کے ضمنی حاصلوں میں سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ ابتداً اس کو فضول خیال کرکے پھینک دیا جاتا تھا۔ لیکن ایک انگریز کیمیادان نے جس کا نام ولیم ہنری پرکن تھا اس کی تشریح کرکے اس سیاہ اور تاریک شئے سے خوبصورت ارغوانی رنگ حاصل کیا۔ اس سے کئی اور اجزا جدا کئے گئے جو مختلف رنگوں کی تیاری میں مستعمل ہیں۔ قطع نظر رنگ سازی کے "روپ سنگھار" کمپنیوں کے مالک کے لئے بھی یہ نہایت اہم ہے۔ اس سے کریم۔ غازۂ عارض۔ اور کئی عطریات مثلاً یاسمین۔ مشک۔ نارنج اور خس وغیرہ حاصل کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر اس سے دافعات تعدیہ اور کئی ادویات مثلاً Aspirin (مقامی بے حسی پیدا کرنے کی دوا) Phenacetin (بخار روک دوا) اور Veronal (خواب آور دوا) وغیرہ کشید کرتے ہیں۔

اس سے دھماکو اشیاء مثلاً T. N. T. (ٹرائی نائٹروٹالوین) اور پکرک ترشہ جو بم سازی میں مستعمل ہیں حاصل کئے جاتے ہیں۔

گھاس پھوس کے تنکوں سے Legnin تیار کیا جاتا ہے جو دباغی اور صنعت رنگ سازی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ استعمال شدہ ربر سے بھی رنگ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ تارپین۔ حل پذیر ربر اور میل کٹ مالیات بھی حاصل ہوتے ہیں۔

کارخانوں میں جہاں لکڑی کاٹنے کے بعد چھوٹے چھوٹے بیکار ٹکڑے بچ جاتے ہیں ایک مشین میں جس میں گھومنے والے چاقو ہوتے ہیں ڈالدیا جاتا ہے۔ یہاں لکڑیاں کھپچیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں جنھیں ایک دوسرے مشین میں جسکو (Gun) کہا جاتا ہے ڈالکر بھاپ دباؤ کے تحت داخل کرتے ہیں۔ کھپچیاں بالکل سکڑ جاتی ہیں۔ بھاپ خارج کرلی جاتی ہے اور مادہ کو پیٹا جاتا ہے۔ بعد ازاں ماقوائی دباؤ سے تختوں میں تبدیل کرلیتے ہیں۔ ایسے تختہ اکثر بطور رحاجز استعمال ہوتے ہیں۔

ایسے ہی تختے گنوں سے شکر کھینچے جانے کے بعد بچے ہوئے کھو جڑ سے تیار کئے جاتے ہیں۔
جنگ عظیم کے دوران میں جرمنی اور سوئیڈن نے چارہ کی قلت کی وجہ سے لکڑی کے برادہ کو سوڈیم بیڈراکسائیڈ (کاوی سوڈا) کے ساتھ پکا کر گھوڑوں کو کھلایا۔

قیمتی اشیاء میں جنھیں ایک کفایت شعار بیوی بھی بغیر کسی خیال کے پھینک دیتی ہے سیب کے چھلکے۔ سنگترے کے چھلکے۔ ہڈیاں۔ پرانے کپڑوں کی دھجیاں۔ چربیاں اور سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے بھی اہم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا جداگانہ مفید استعمال ہے۔

سیب کے چھلکے Pectin کا ماخذ ہیں جس کے بغیر جیلی نہیں بن سکتی اور جو لذیذ مربہ بنانے میں بھی ضروری ہے۔ سنگترے کے چھلکوں میں تیل ہوتا ہے۔ ہڈیوں کو پانی کے ساتھ جوش دینے پر ایک شئے جلاطین حاصل ہوتی ہے جو مٹھائیوں۔ چاکلیٹ۔ صابن۔ ادویات۔ اور عکاسی جھلی وغیرہ کی تیاری میں استعمال کی جاتی ہے۔ جلاطین کشید کرنے کے بعد ہڈیوں میں مزید قیمتی شئے فاسفورس باقی رہ جاتی ہے جو مصنوعی کھادوں کا اہم جز ہے۔

کپڑے کی دھجیوں سے عمدہ کاغذ کپڑے کی دھجیاں عمدہ کاغذ اور مصنوعی ریشم میں تبدیل کی جاسکتی ہیں۔ یارک شائر کی آبادی کا ایک کثیر حصہ سوتی چندیوں کو مصنوعی ریشم میں تبدیل کرنے میں مشغول ہے۔ ریشم کو بھی جو استعمال کے بعد خراب ہو گیا ہو لارڈ براڈ فورڈ کے بتلائے ہوئے طریقے سے عمدہ مخمل میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ براڈ فورڈ اس تحقیق میں دیوالیہ ہو چکا تھا لیکن بعد میں اسکی کامیابی نے اسکی حالت سدھار دی۔

پھینکے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے نکوٹین کا قیمتی ماخذ ہیں۔ اس تمباکو میں دیگر کیمیاوی اجزا بھی ہوتے ہیں جو مصنوعی کھادوں کی تیاری میں مفید ہیں۔

۱۹۳۶ء میں نیشنل انسٹیٹوٹ آف ریسرچ میں محققین نے دریافت کیا کہ کوکو کے بیج کے چھلکوں میں ویٹامن D ہوتی ہے۔ یہ ویٹامن (D) کیلسیم کے نمک اور فاسفیٹیں رکھنے والے اجسام کے نہایت موافق ہے۔ تجربوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ان چھلکوں کے دو پونڈ اگر گائے کو چارہ کیساتھ

اضافہ دیدیا کریں تو دودہ میں بھی وٹامن کا تناسب بڑھ جاتا ہے ۔

بیکار چربی کا ایک عام استعمال صابن کی تیاری ہے ۔ اس سے مصنوعی مکھن تیار کر سکتے ہیں۔ بکری کے گوشت اور اسکی سخت چربی (پیٹھ یا گردوں کی) سے نہایت مقوی مصنوعی مکھن اور دہی تیار کیا جاتا ہے ۔

کسی کھاد سے اب تک زراعت کو اسقدر نفع حاصل نہیں ہوا جسقدر کہ (Gauno) سے حاصل ہوا ہے ۔ اس کو مچھلی کی کھاد بھی کہا جاتا ہے ۔ یہ بحری پرندوں کی بیٹ ہے اور عموماً بعض جزیروں مثلاً ساحل پیرو اور آفریقہ کے مغربی سواحل پر تہوں کی صورت میں پائی جاتی ہے ۔ اس میں پودے کی غذائیت کے کیمیاوی اجزا نہایت فراوانی کے ساتھ موجود ہیں اور لطف یہ ہے کہ بالکل ٹھیک تناسبوں میں ملے ہوئے ہیں ۔ اس وقت تک تیار کردہ کوئی تالیفی کھاد اس پایہ کی نہیں ۔

پہلے پہل انگلستان نے اس کو ۱۸۴۰ء میں استعمال کیا۔ لیکن پیرو کے باشندے اس سے صدہا سال سے واقف ہیں چنانچہ ان کے ہاں یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ "گانو گو ولی نہیں۔ لیکن کئی کرامات دکھاتا ہے"

پیرو کے معدنے اس طرح حاصل ہوتے ہیں کہ پرندے مچھلی کی افراط کی وجہ ساحل پر خوب مچھلی کھا جاتے ہیں اور ہضم کرنے کے لئے ان جزیروں میں چلے جاتے ہیں ۔

پرانے موٹر ٹائر جو گھس کر خراب ہو جاتے ہیں بہت کام آتے ہیں ۔ فرانس میں کسان ان ٹائروں کو کھیتوں میں جلاتے ہیں ان سے خارج ہونیوالا تیز چبھتا ہوا بخار کیڑوں کو مار ڈالتا ہے ۔

بحیرہ مردار ایک قیمتی دفینہ خیال کیا جارہا ہے جہاں بے انتہا دولت دفن ہے ۔ اس سے قیمتی اشیاء کیمیائی اور معدنی حاصل کیجارہی ہے ۔ یہاں ہمیں اسکی ایک عمدہ مثال ملتی ہے کہ کسطرح سائینس ناکارہ اشیاء کو کارآمد بنالیتی ہے ۔

بحیرہ مردار ۴۷ میل لمبا اور دس میل چوڑا ہے ۔ اس کا رقبہ تقریباً ۳۶۰ مربع میل ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۱۳۰۰ فٹ نیچے گویا دنیا کا نچلا ترین آبی خطہ ہے ۔ ہر روز دریائے جاردن اس میں

۶ ملین ٹن (۶۰۰۰۰۰۰ ٹن) پانی گرتا ہے۔ سرما میں تو اور کئی دریا اور ندیاں بھی آکر گرتی ہیں۔ بحیرہ سے پانی کے اخراج کے لئے سوائے عمل تبخیر کے کوئی اور راستہ نہیں ہے اور چونکہ آنے والے پانی نمکوں سے لدے ہوتے ہیں اس لئے اس کا پانی بہت نمکین ہوتا چلا ہے۔ چنانچہ معمولی سمندر کا پانی ۴ تا ۶ فیصد نمکین ہوتا ہے لیکن بحیرہ مردار کا پانی ۲۳ تا ۲۶ فیصد مرتکز ہے۔ اس نمکینی کی وجہ اسمیں کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی اسی وجہ سے اس کو بحیرہ مردار کا نام دیا گیا دریائے جاردن سے آنے والی مچھلیاں یہاں مرجاتی ہیں اور اسطرح پرندوں کو غذا مہیا ہوتی ہے۔ پانی کی اعلیٰ نمکینی پانی کو زیادہ کثیف بنا دیتی ہے جس کی وجہ تیراک کے ڈوب جانے کا زیادہ امکان نہیں۔

بحیرہ مردار میں تقریباً ۱۲ ملین ٹن نمک موجود ہیں اور ہر سال ۸۵۰ ٹن کی زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ اسمیں ایک صد ملین ٹن پوٹاش۔ اور ۸ صد ملین ٹن برومین ہے۔ یہ مقداریں دنیا کو سالہا سال تک کے لئے کافی ہوسکتی ہیں۔

برومین ایک سرخ طیران پذیر مائع ہے۔ اس سے سوڈیم برومائیڈ۔ پوٹاشیم برومائیڈ۔ اور ٹیم برومائیڈ حاصل کئے جاتے ہیں جو طب عکاسی اور رنگریزی کی صنعت میں اور ایتھلین ڈائی برومائیڈ کی تیاری میں استعمال کئے ہوتے ہیں۔

پوٹائس، جو ایک سفید نمک نما شئے ہے کھاد کی حیثیت سے قیمتی ہے۔ دھماکو اشیا کی تیاری میں اسکی خاص اہمیت ہے۔ بحیرۂ مردار کی دولت میں زیادہ نمایاں حصہ اسی کا ہے۔

بحیرہ مردار سے حصول دولت کا خیال سائینسدانوں کو تقریباً نصف صدی پیشتر سے پیدا ہوچکا تھا لیکن پہلے عملی اقدام ایک نوجوان ارضیاتی انجنیر نے کیا جس کا نام Novomeysly تھا۔ یہ شخص جنگ عظیم سے تین سال پہلے ساحل بحیرہ پر تجربات انجام دے رہا تھا۔ پھر وہ ۱۹۳۰ء میں فلسطینی پوٹاش کمپنی کا منیجنگ ڈائرکٹر بن گیا جس نے حکومت فلسطین سے یہ مراعات حاصل کرلئے کہ کمپنی تبخیر یا دیگر ذرائع سے بیرہ مردار کے معدن معدنی نمک اور کیمیائی اشیا حاصل کرکے انہیں بازار میں فروخت کرسکتی ہے نابدہ کی رو سے ۷۵ سال بعد تمام ملکیت حکومت کی ہوگی۔ گو اس دوران میں کمپنی اپنے نفع کا ایک

کثیر حصہ حکومت کو ادا کرتی رہے گی۔

۱۹۳۲ء سے اشیاء کا حصول شروع ہوا جبکہ ۲۵۰ ٹن برومین اور دس ہزار ٹن پوٹاشر حاصل کئے گئے اور چار سال بعد ۱۲۰۰ ٹن برومین اور تیس ہزار ٹن پوٹاش بازار میں بھیجے گئے۔

پانی کو پمپ کے ذریعہ خارج کرکے بڑے بڑے برتنوں میں جو ۴۰ ایکڑ تک پھیلے ہوئے ہیں اور جو مختلف گنجائش کے ہیں رکھا جاتا ہے۔ پمپ کی نلیوں کا قطر ۳۰ انچ اور لمبائی ۲۵۰ فٹ ہے ان کا دہانہ ساحل سے دو ہزار تین سو پچاس فٹ دور رہتا ہے اور یہ پانی میں ۵، فٹ کی گہرائی تک ڈوبے رہتے ہیں جہاں پانی میں پوٹاش اور برومین کا ارتکاز سطح پر کے پانی سے دگنا ہوتا ہے۔

پانی کو سورج کی گرمی کے ذریعہ تبخیر سے اڑا دیا جاتا ہے۔ برتنوں میں نمک رہ جاتے ہیں تبخیر کے پہلے مرحلہ میں زیادہ حصہ عام نمک کا حاصل ہوتا ہے پھر کارنا لائٹ کا درجہ آتا ہے جس میں پوٹاشیم اور میگنیشیم کے نمک ہوتے ہیں۔ جب کارنا لائٹ علحدہ کرلیا جاتا ہے تو brine رہ جاتا ہے جس میں برومین اور میگنیشیم کلورائیڈ ہوتے ہیں۔ کلورین اور بھاپ کے عمل سے خالص مائع برومین حاصل کرلی جاتی ہے۔

فلسطینی پوٹاش کمپنی کے قیام سے پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بحیرہ مردار کے اطراف میں صرف وہیں کے باشندہ رہ سکتے ہیں۔ لیکن تجربہ نے ثابت کردیا کہ نہ صرف دیگر اقوام وہاں رہ سکتی ہیں بلکہ وہاں کی آب وہوا صحت بخش بھی ہے۔

زمین پر کسی اور مقام کے بہ نسبت یہاں آکسیجن کا مفید تناسب فی مکعب فٹ زائد ہے اس لئے ہوا میں ٹانک خواص زیادہ ہیں سورج کی حرارت مسلسل ہے اور سال بھر میں صرف ۲ انچ بارش ہوتی ہے۔ وہاں کے سمندر میں نہانا نہ صرف ایک دلچسپ تفریح ہے بلکہ امراض کا علاج بھی۔ ان ہی وجوہات کی بناء پر وہاں دن بدن کئی صحت گاہیں تیار ہوتی جارہی ہیں۔

امریکہ کی مغربی ریاستوں سے برآمد ہونے والے سونے کا $\frac{1}{6}$ حصہ کیچڑ۔ دلدلی زمینوں اور دریاؤں کی ریت سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بڑی بڑی مشینوں کے ذریعہ کئی ڈول کا ایک سلسلہ زمین میں

ڈالا جاتا ہے جو ایک معینہ وقت میں اسقدر مادہ باہر لاڈالتے ہیں کہ اسکے اسی وقت میں نکالنے کے لئے ۵۰۰۰ آدمی درکار ہوں۔

حاصل شدہ ریت یا مٹی کو چھان کر پانی کی تیز رو کے نیچے سے گذارا جاتا ہے یہانتک کہ نہایت باریک ذرات باقی رہ جاتے ہیں سونے کے ذرات اسی مٹی میں چھپے رہتے ہیں۔ اس طریقہ سے ایک فیصد کا ½ حصہ بھی ضائع نہیں ہونے پاتا۔

ایسی دنیا میں سب سے بڑی مشین کیلیفورنیا میں دریائے Yaba کے جنوبی کنارہ پر ہے۔ اس مشین کی ہیئت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسکی فولادی تختیوں کو یکجا کرنے ۵۰۰۰، پونڈ کیلئے درکار ہوسے۔ تمام مشنری کا وزن، ایک ہزار تین سو ٹن ہے۔ اسمیں منگنیزی فولاد کے بنے ہوئے ۱۲۶ ڈول ہیں جن میں ہر ایک کی گنجایش ۱۸ مکعب فٹ ہے۔

اس طریقہ سے ہر سال ۱۵۰۰ پونڈ کا سونا پیدا کیا جاتا ہے۔

دیگر قدرتی اشیاء کا استعمال شمالی چلی میں نائٹریٹس کے کثیر مطروحہ دریافت کئے گئے ہیں۔ یہ نائٹریٹس کھاد کی تیاری اور دھماکو اشیاء کی تیاری میں استعمال ہوتے ہیں۔

ان امکانات نے کہ ایک دن یہ مطروحہ خرچ ہو جائیں گے سائنس دانوں کو نائٹریٹس تالیفی طور پر تیار کرنے کی تحریک دلائی۔ محققین نے ہوا سے نائٹروجن کے حصول کے دو طریقے دریافت کرلیے ایک ہابر کا طریقہ اور دوسرا برقی قوس کا طریقہ۔

پہلے طریقہ میں نائٹروجن ہوا سے اور ہیڈروجن آبی گیس سے بلند دباؤ کے تحت حاصل کئے جاتے ہیں اور ایک حامل کی موجودگی میں امونیا میں تبدیل کرلیے جاتے ہیں۔ اس امونیا کو اکساکر نائٹرک ترشہ اور پھر نائٹریس میں تبدیل کرلیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ امپیریل کیمیکل انڈسٹریز لمٹیڈ اور جرمنی میں بطور خاص استعمال ہوتا ہے۔

برقی قوس کے طریقے میں ہوا کو ایک برقی قوس میں سے گذارا جاتا ہے جہاں نائٹروجن اور اکسیجن ملکر نائٹرک آکسائیڈ بناتے ہیں جو پانی میں جذب ہوکر نائٹرک ترشہ اور پھر نائٹریٹس پیدا کرتا ہے۔

ایک زمانہ سے اس کی کوشش کی گئی کہ زمین کی اندرونی حرارت کو کسی کام میں لایا جائے۔ آئس لینڈ میں گرم پانی کے چشموں کا پانی شہر کے دواخانوں اور بعض دولتمند شہریوں کے مکانوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ چند سال پہلے کیلیفورنیا میں ایک انجن کے چلانے کے لئے بھاپ استعمال کی گئی جس سے ۱۵۰۰ اسپی طاقت حاصل ہوئی۔ اٹلی اپنے جنوبی حصوں کے آتش فشاں پہاڑوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے چنانچہ Larderello میں آتش فشانوں کے دہانوں پر جہاں سے بھاپ وغیرہ خارج ہوتی ہے بڑے بڑے نل لگا دئے گئے جن کے ذریعہ یہ بھاپ کارخانہ جات میں پہنچائی جاتی ہے۔

سر چارلس اے پارسن نے، جو بھاپ مشینوں کا ماہر ہے، یہ رائے ظاہر کی کہ ہم اس سے بخوبی واقف نہیں کہ زمین کے اندر کیا ہے لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہئے۔" یہ مہم قطبین کی مہم سے زیادہ اہم ہے۔ صنعت کی امداد کے کثیر امکانات ہمارے پیروں کے نیچے موجود ہیں۔ مشینوں کو چلانے کے لئے زمین کی اندرونی حرارت کو استعمال کرنیکے علاوہ اور نئے عناصر کا پتہ چلانا بھی ممکن ہے۔"

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح ہم غریب ہونیکے باوجود اپنی کثیر دولت محض اس کے استعمال سے نا آشنا ہونیکی وجہ سے ضائع کر رہے ہیں۔ دولتمند ممالک صرف سونا چاندی اور روپیہ پیسہ ہی کو دولت نہیں سمجھتے۔ ان کی نظروں میں کچرا۔ کوڑا۔ مٹی۔ پتھر غرض ہر قسم کی بے کار سے بے کار چیز دولت ہے۔ ضرورت ہے کہ سائنس کے طالب علم ان معمولی چیزوں پر غور کریں اور کھوروں سے دولت لوٹیں۔

(ماخوذ)

محمد رفیع الدین متعلم بی ایس۔سی (آخری)

موضع پھل ماڑی کی معاشی تحقیق

"یہ مضمون ۱۳۴۲ف میں لکھا گیا تھا اور اس پر سکینزی انعام دیا گیا"
"ادارہ"

تجزیہ

(۱) محل وقوع

(۲) صفائی کی حالت

(۳) آبادی :- مردم شماری - آبادی کی تقسیم - تعلیمی حالت - شرح پیدائش و اموات - اضافہ آبادی -

(۴) ذرایع معاش -

الف - زراعت :- زراعت پیشہ آبادی کی تقسیم -

زمین :- اقسام زمین - تقسیم انتشار اراضی - تقسیم و انتشار اراضی کی موجودہ حالت -
تقسیم و انتشار اراضی کے وجوہات -

آلات زرعی :- مختلف قسم کے آلات اور اُن کا استعمال

آبپاشی :- ذرایع آبپاشی -

مویشی :- جملہ تعداد اقسام مویشی - مویشیوں کی رہائش اور غذا - قلت چارہ کے اسباب مویشیوں کے امراض -

کھاد:- اقسام کھاد قلت کھاد اور اسباب۔

تخم:- فراہمی تخم کا طریقہ۔ حفاظت فصل۔

فروخت پیداوار:- فروخت پیداوار کے طریقے۔ عدم یکسانیت اوزان اور پیمانہ جات۔

زرعی مقروضیت:- موضع کی جملہ مقروضیت کا اندازہ مہاجنی لین دین کے طریقے اور ان کی مثالیں۔ قرضہ کی ادائی میں زمینات کی فروخت۔ پیدا آور و غیر پیدا آور قرضے۔ قرضداری کے مقامی اسباب۔

ب۔ صنعت و حرفت و دیگر پیشے۔

(۵) اصلاحی تجاویز۔

الف۔ عام تدابیر۔

ب۔ مخصوص تدابیر۔

محل وقوع موضع پھل امڑی ضلع اطراف بلدہ تعلقہ دھارور و سمت مرمٹواڑی میں واقع ہے اس کے شمال میں مادار یڈی پلی و جنتے پلی جنوب میں اتا پورا اور اخنا پورا و مشرق میں گولہ گوڑہ لنگم پلی اور مغرب میں کا ناپورا اور حیث گڈھ ہیں۔ قریب ترین ریلوے اسٹیشن حیٹ گڈھ ہے جو موضع سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ دریافت سے معلوم ہوا ہے کہ یہ موضع بہت قدیم زمانہ سے آباد ہے۔ موضع کا کل رقبہ (۲۷۶۸) ایکڑ ۱۰ گنٹے ہے

صفائی کی حالت موضع میں علی العموم خس پوش کچی دیواروں کے مکانات نظر آتے ہیں پختہ مکانات صرف ساہوکار اور معدودے چند خوش حال پٹہ داروں کے ہیں۔ یہ مکانات ایک اونچے پتھریلے ناہموار اور غیر مسطح مقام پر بنائے گئے ہیں۔ بارش کے زمانہ میں مکانات کے سامنے کیچڑ ہو جاتا ہے اور بارش کا پانی بہہ کر آبادی سے نیچے کی زمینات کی طرف چلا جاتا ہے۔ مکانات کے سامنے اور بازو اور گلیوں میں کوڑا کرکٹ اور غلاظت کا انبار لگا رہتا ہے۔ گھروں کے بازو اور سامنے کسان گوبر اور کچرا گڑھوں میں کھاد تیار کرنے کی غرض سے ڈالتے رہتے ہیں۔ موضع میں رفع حاجت کا عام طور پر کوئی خاص انتظام نہیں ہے۔ اس لئے دن میں بچے مکانات کے سامنے رفع حاجت کرتے ہیں۔ اہل دیہہ کے

اکثر خس پوش مکانات کا اندرونی حصہ نہایت تنگ و تاریک اور ڈھکا ہوا رہتا ہے۔ جہاں ہوا کا گزر مشکل سے ہوتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کسان اپنے مویشی کو گھر کے اندر ہی کمرہ کے متصل باندھتا ہے۔ مویشی کی غلاظت وغیرہ کی صفائی کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ چنانچہ پورے مکان میں عفونت پھیلی رہتی ہے۔ مکانات کو گوبر سے لیپا جاتا ہے اور صحن میں گوبر کا چھڑکاؤ بھی ہوتا ہے۔ موضع کے صفائی کی حالت افسوسناک ہے اور اس کا اثر وہاں کے باشندوں کی صحت پر پڑنا ناگزیر ہے۔

آبادی موضع ہذا کی کل آبادی ۱۳۴۷ف کی مردم شماری[ف] کی رو سے (۲۲۹) خاندان یا (۱۳۳۶) نفوس ہے اہل ہنود کی آبادی (۱۱۲) خاندان یا (۸۷۲) نفوس ہے مسلمانوں کے (۳۷) خاندان ہیں جو (۱۷۹) افراد پر مشتمل ہیں۔ (۵۵) خاندان یا (۲۰۵) افراد اچھوت ہیں۔ (۱۲) خاندان یا (۷۰) افراد کا تعلق لنگایت قوم سے ہے۔ گویا کل آبادی کا (۶۵٫۲۷) فیصد حصہ ہندو (۱۳٫۸۴) فیصد مسلمان (۱۵٫۳۴) فیصد اچھوت (۵٫۳۶) فیصد حصہ لنگایت ہے۔

منجملہ (۱۳۳۶) نفوس کے (۳۹۰) مرد (۴۹۵) عورتیں اور (۲۵۰) لڑکے اور (۲۰۱) لڑکیاں ہیں۔ منجملہ (۳۹۰) مردوں کے شادی شدہ مرد (۳۱۸) یا (۸۱٫۵۴) فیصد ہیں۔ متاہل (۴۷) یا (۱۲٫۰۵) بے زن مرد (۳۱) یا (۹٫۵۶) فیصد ہیں۔ (۴۹۵) عورتوں میں شادی شدہ عورتوں کی تعداد (۳۳۵) ہے۔ (۷) کنواری ہیں۔ (۱۵۳) عورتیں بیوہ ہیں بالفاظ دیگر (۶۸٫۷۷) فیصد عورتیں شادی شدہ اور (۱٫۵) فیصد کنواری اور (۳۰٫۸) فیصد عورتیں بیوہ ہیں۔ شادی شدہ لڑکے اور لڑکیاں (نابالغ) علی الترتیب (۱۸) اور (۳۶) ہیں۔

مندرجۂ بالا اعداد و شمار سے شادی شدہ افراد کی کثرت ظاہر ہے۔ کمسنی کی شادی کے رواج کو اس کثرت کا ایک سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ قدامت پرستی رسم و رواج کی پابندی اور اولاد کی خواہش کے باعث اہل دیہہ علی العموم پانچ چھ سال میں لڑکی کی اور سات آٹھ سال میں لڑکے کی شادی کر دیتے ہیں۔ معاشی

ف۔ یہ مردم شماری بذات خود امرداد ۱۳۴۷ف میں کی گئی ہے۔

نقطہ نظر سے کمسنی کی شادی کے نقصانات بدیہی ہیں۔

تعلیمی حالت موضع ہذا میں پڑھے لکھے افراد کی تعداد (۵۰) ہے یعنی کل آبادی کا (۳،۷) فیصد حصہ خواندہ ہے۔ دو پاٹھ شالہ ہیں جس میں کل بیس لڑکے زیر تعلیم ہیں۔ یہ پاٹھ شالے خانگی حیثیت سے چلائے جاتے ہیں۔ یہاں لڑکوں کو کوئی باضابطہ تعلیم نہیں دی جاتی ہے بلکہ تلنگی کی بالکل ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور معمولی حساب سکھایا جاتا ہے۔ بہرحال تعلیمی نقطہ نظر سے موضع کی حالت حیدرآباد کے عام مواضعات کی مانند ہے۔

شرح پیدائش واموات مندرجۂ ذیل اعداد شمار سے شرح پیدائش واموات کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے۔

	شرح پیدائش		شرح اموات[1]	
۱۳۴۰ف	۱۰،۰۴	فی ہزار	۱۴،۲۲	فی ہزار
۱۳۴۱ف	۹،۷۲	”	۱۷،۶	”
۱۳۴۳ف	۲۹،۴	”	۲۴،۶	”
۱۳۴۴ف	۸،۵		۸،۵	”
۱۳۴۵ف	۱۹،۴		۶،۸	”
۱۳۴۶ف	۱۸،۷		۵،۳	”

مندرجۂ بالا اعداد شمار سے ظاہر ہو رہا ہے کہ علی العموم شرح پیدائش شرح اموات کی بہ نسبت زیادہ رہتی ہے۔ ذیل کے جدول میں پیدائش واموات کی کیفیت مختلف سنین میں بلحاظ مذہب دکھائی گئی ہے۔

پیدائش[2]

سنہ	مسلمان		ہندو		جملہ
	مرد	عورت	مرد	عورت	
۱۳۴۱ف	۲		۴	۲	۸
۱۳۴۲ف	۰	۰	۱	۳	۴

---

[1] اس سال پلیگ کی وجہ سے شرح اموات میں اضافہ ہوا۔ [2] یہ اعداد و شمار دفتر دیہی سے حاصل کئے گئے ہیں۔

۱۳۴۳ف	۱	۳	۱۵	۱۳	۳۲
۱۳۴۴ف	۲	۱	۱	۶	۱۰
۱۳۴۵ف	۲	۰	۱۰	۱۱	۲۳
۱۳۴۶ف	۲	۰	۱۳	۶	۲۱
			اموات		
۱۳۴۱ف	۲	۰	۱۱	۸	۲۱
۱۳۴۲ف	۲	۰	۴	۸	۱۴
۱۳۴۳ف	۴	۲	۱۵	۸	۲۹
۱۳۴۴ف	۲	۱	۴	۳	۱۰
۱۳۴۵ف	۰	۰	۴	۴	۸
۱۳۴۶ف	۰	۰	۳	۴	۷

چھ سال کے عرصہ میں مردوں کی پیدایش (۵۳) اور عورتوں کی پیدایش (۵۴) رہی۔ اور اموات علی الترتیب (۵۱) اور (۲۸) واقع ہوئیں۔ گویا مردوں اور عورتوں کی پیدایش میں خاصہ فرق ہے۔

اضافہ آبادی ۱۳۴۰ف میں موضع کی کل آبادی سرکاری مردم شماری کی رو سے (۱۱۹۵) تھی۔ اب سات سال بعد آبادی (۱۳۳۶) ہوگئی ہے۔ گویا اس عرصہ میں (۱۴۱) نفوس یا (۱۱۷،۹۹) فی ہزار کا اضافہ ہوا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ اضافہ موضع کے موجودہ معاشی حالات کے مد نظر مناسب ہے؟ اہل دیہی کے ذرائع معاش پر آئندہ صفحات میں تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موضع کی عام معاشی حالت پست ہے۔ ایسی صورت میں آبادی میں یہ اضافہ معاشی نقطہ نظر سے کسی طرح بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اگر موضع کے قدرتی وسائل سے پورے طور پر استفادہ کیا جائے تو اس قدر کثیر آبادی کی پرورش ناممکن ہے۔ موضع میں (۱۲۳،۵) افراد فی مربع میل بستے ہیں۔ حالانکہ ماہرین[۵] کی رائے کے مطابق " اگر

[۵] معاشیات ہند مصنفہ جتنا و بیری۔

آبادی اپنے قدرتی وسائل سے پوری طرح استفادہ کرے تو (۲۵۰) نفوس فی مربع میل پرورش پاسکتے ہیں۔"
دوسرے لفظوں میں قدرتی وسائل کے مدِنظر تو نہیں البتہ موضع کی موجودہ معاشی پسماندگی کے پیش نظر آبادی میں اضافہ مناسب نہیں ہے۔

ذرائع معاش

زراعت زراعت پیشہ آبادی کل (۱۱۳۶) گویا (۸۵،۰۳) فی صد آبادی کی زندگی کا دارومدار زراعت پر ہے اس لحاظ سے زراعت موضع کا نہایت ہی اہم پیشہ ہے۔ ذیل کی جدول میں زراعت سے معاش حاصل کرنے والی آبادی کی مختلف حیثیتوں کو واضح کیا گیا ہے۔

جدول زراعت پیشہ آبادی کی تقسیم

تعداد پیشہ	تفصیل پیشہ	خاندان	تعداد نفوس	فیصد بلحاظ مجموعی آبادی
۱	اصل پیشہ زراعت۔ ذیلی طور پر دیگر پیشہ	۱۷	۱۰۴	۷،۷۸
۲	اصل پیشہ مزدوری وغیرہ۔ " " زراعت	۲۹	۵۵	۱۱،۳
۳	صرف زراعت	۸۱	۴۸۱	۳۶،۰۰۲
۴	خالص مزدور	۶۶	۳۹۶	۲۹،۶۴
	جملہ	۱۹۲	۱۱۳۶	۸۵،۰۳

آئندہ صفحات میں مزارعین کی معاشی حالت کا مطالعہ کرنے کی غرض سے زمین۔ آلات۔ زراعت آبپاشی مویشی۔ کھاد۔ تخم۔ فروخت پیداوار اور زرعی مقروضیت کی حالت پر ہم تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

زمین زمین کی تقسیم:۔ مزروعہ زمین (۳۴۳۸) یکر (۲) گنٹہ غیر مزروعہ تقریباً (۳۳۰) یکر (۱۶) گنٹہ ہے۔ ناقابل کاشت زمین (۱۸۵) یکر (۱۵) گنٹہ مزروعہ زمین زیر باغات زمینات کا رقبہ کل (۲۲۳) یکر (۸) گنٹہ اور خشکی زمینات (۳۲۱۴) یکر (۳۴) گنٹہ ہے۔

نوٹ۔ انعامی زمینات کا رقبہ (۱۱۸) یکر (۲۰) گنٹہ ہے۔

اس موضع کے دسکھیہ صاحب کی "سیری" ہے جس کا رقبہ (۳۴) یکر (۲۰) گنٹہ ہے۔

زمین کے اقسام تین قسم کی زمینات پائی جاتی ہیں۔

(۱) ریگڑ۔ ان زمینات کا رقبہ تقریباً (۲۰۰۰) یکر ہے۔ یہ زمین کالی ہوتی ہے۔ ان زمینات پر اگر بارش اوسطاً ہو تو اچھی کاشت ہوتی ہے بہت زیادہ بارش ہو تو فصل خریف میں کاشت مشکل سے ہوسکتی ہے۔

(۲) دبہ — اس کا رقبہ تقریباً (۱۰۰۰) یکر ہے۔ بارش اچھی طرح ہو تو ہر دو فصل میں کاشت ہوسکتی ہے۔

(۳) لال — یہ زمین کچھ زیادہ رقبہ پر حاوی نہیں ہے۔

زرخیزی متعدد تجربہ کار اور بوڑھے کاشت کاروں سے دریافت کرنے کے بعد اس امر کا پتہ چلا کہ یہاں کی زرخیزی میں پہلے کی بہ نسبت کمی واقع ہو رہی ہے۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ جس کھیت میں آج سے تقریباً دس سال پہلے ایک کھنڈی پیداوار ہوتی تھی اس پر آج دس بارہ من پیداوار ہو رہی ہے۔ لیکن اس بیان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہاں زمینات زرخیز نہیں ہیں بلکہ صرف یہ واضح کرنا ہے کہ زمینات اتنی زرخیز نہیں ہیں جتنی کہ آج سے دس سال پہلے تھیں۔

تقسیم و انتشار اراضی ۱۳۲۰ف میں کل پٹہ دار و شکمی دار (۱۴۵) تھے اور آج ان کی تعداد (۲۵۱) ہے۔ گویا (۱۰۶) کا اضافہ یعنی (۷۳ء۱) فیصد کا اضافہ ہوا اور اسی تناسب سے اراضی میں تقسیم ہوئی۔ واضح رہے کہ اس اثناء میں مزروعہ زمینات کے رقبہ میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوا۔

اگر تولداروں کو بھی شامل کر دیا جائے تو پھر تقسیم اراضی میں اور شدت واقع ہوتی ہے۔ اس بیان سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ تقسیم و انتشار اراضی میں اضافہ کا رجحان ہے۔

تقسیم انتشار اراضی کی موجودہ حالت تحقیق سے یہ پتہ چلا ہے کہ خشکی کے چھوٹے سے چھوٹے کھیت کا رقبہ (۱) گنٹہ اور بڑے سے بڑے کھیت کا رقبہ (۳) یکر ہے اور زمینات زیر باغات میں چھوٹے سے چھوٹے کھیت کا رقبہ (۲۵) گنٹہ اور بڑے سے بڑے کھیت کا (۴) یکر ہے

تقسیم اراضی کی شدت کا اندازہ حسب ذیل جدول سے ہوگا۔

	ایک ایکڑ سے کم کھیت	۱ تا ۲½ ایکڑ کے کھیت	۲½ تا ۵ ایکڑ کے کھیت	۵ تا ۷½ ایکڑ کے کھیت	۷½ تا ۱۰ ایکڑ کے کھیت	۱۰ تا ۱۵ ایکڑ کے کھیت	۱۵ تا ۲۰ ایکڑ کے کھیت	۲۰ تا ۲۵ ایکڑ کے کھیت	۲۵ تا ۳۰ ایکڑ کے کھیت
باغات	۳۷	۹۹	۲۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
خشکی	۴۰	۸۷	۹۴	۵۷	۴۰	۸۳	۴۳	۳	۱
جملہ	۸۵	۱۸۶	۱۱۴	۵۷	۴۰	۸۳	۴۳	۳	۱

تقسیم اراضی کی مزید توضیح مندرجۂ ذیل اعداد و شمار سے بھی ہو جاتی ہے۔

(۱) ایسے کاشت کاروں کی تعداد جن کے پاس ایک ایکڑ سے کم اراضی ہے۔ ۲۷

(۲) 〃 〃 〃 〃 ایک تا ڈھائی ایکڑ 〃 〃 ۶۵

(۳) 〃 〃 〃 〃 ڈھائی تا پانچ ایکڑ 〃 〃 ۵۸

(۴) 〃 〃 〃 پانچ تا ساڑھے سات ایکڑ 〃 〃 ۳۹

(۵) 〃 〃 〃 〃 ساڑھے سات تا دس ایکڑ 〃 〃 ۳۰

(۶) 〃 〃 〃 〃 ۱۰ تا ۱۵ ایکڑ اراضی ہے ۵۰

(۷) 〃 〃 〃 〃 ۱۵ تا ۲۰ ایکڑ 〃 〃 ۲۵

(۸) 〃 〃 〃 〃 ۲۰ تا ۲۵ ایکڑ 〃 〃 ۳

(۹) 〃 〃 〃 〃 ۲۵ تا ۳۰ ایکڑ 〃 〃 ۱

انتشار اراضی کی حالت کا اندازہ حسب ذیل اعداد و شمار سے ہو جائے گا۔

۱ شخص کی اراضی　۱۴　مختلف جگہ

۱۰ اشخاص کی اراضی　۱۳　〃 〃

۱۰	اشخاص کی اراضی		۱۲	مختلف جگہ	
۱۲	″	″	۱۱	″	″
۱۵	″	″	۱۰	″	″
۱۵	″	″	۹	″	″
۲۰	″	″	۸	″	″
۳	″	″	۷	″	″
۳	″	″	۶	″	″
۶	″	″	۵	″	″
۲	″	″	۳	″	″
۳	″	″	۲	″	″

نوٹ :- تقسیم اراضی کی صورت میں ہم نے ایک اور واقعہ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یعنی یہ کہ خانگی طور پر بھی پٹوں کی تقسیم ہوتی ہے۔ اور خانگی طور پر شکمی داری کا سلسلہ بھی چلتا ہے۔ بعض کاشت کار اپنی اراضی کے ایک حصہ پر خود کاشت کرتے ہیں اور بقیہ حصہ دوسروں کو بٹائی پر دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ لازماً تقسیم اراضی میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس طرح خانگی تقسیم کا اندازہ لگانا دشوار ہے بہرحال یہ بیان صحیح ہے کہ اس موضع میں تقسیم و انتشار اراضی کی شدت ہے۔ کیونکہ ایک ایکڑ سے کم کے کھیت ۸۵ ہیں اور ۲۵ تا ۳۰ ایکڑ کا کھیت صرف ایک اور ایسے کاشت کاروں کی تعداد جن کے پاس ایک تا ڈھائی ایکڑ اراضی ہے ۶۵ ہے اور ۲۵ تا ۳۰ ایکڑ اراضی رکھنے والا صرف ایک کاشت کار ہے۔ ان اعداد و شمار سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ موضع ہذا میں غیر معاشی کھیت کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔

تقسیم و انتشار اراضی کے وجوہات

اضافہ آبادی و وراثت :- سوائے (چند) مثالوں کے تقسیم و انتشار اراضی کی اصل وجہ وراثت اور اضافہ آبادی ہے۔ ہم نے اس سے پہلے ذکر کر دیا ہے کہ موضع کی آبادی میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے۔ اس اضافہ کے ساتھ مالکان اراضیات

یعنی پٹہ داروں اور شکمی داروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا جس کا لازمی نتیجہ ہوا کہ اراضی میں تقسیم و انتشار کا عمل ہونے لگا۔ موضع میں وراثت کی وجہ سے تقسیم اراضی کی بعض عجیب و غریب مثالیں ملتی ہیں۔ ایک شخص راموں نامی کی ۲۰ ایکر اراضی تھی۔ لیکن اُس کے مرنے کے بعد یہ اراضی ۲۰ حصوں میں منقسم ہوگئی۔ ایک اور شخص اکتانامی کی (۱۴) ایکر اراضی (۲۰) حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ انتیگا کی ۱۵ ایکر اراضی ۶ اشخاص کے حصہ میں بٹ گئی۔

آلات زراعت موضع پھول ماملڑی میں جو آلات زرعی کاروبار کے لئے استعمال ہوتے ہیں وہ قدیم وضع کے ہیں (ان آلات کو مقامی طور پر بھی تیار کرلیا جاتا ہے) نئے قسم کے ترقی یافتہ آلات کو استعمال کرنا تو کجا ان کو یہاں رائج کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی۔ بلکہ ۵۰ فیصد کاشت کار ایسے ہیں جنھوں نے نئے اصلاح یافتہ آلات کا نام بھی نہیں سنا ہے۔ یہاں ان مستعملہ آلات کی تفصیل نامناسب نہ ہوگی

(۱) ناگر —— (یہ آلہ زمین کو تخم ریزی کے قابل بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے) یہاں ناگر ایک ہی قسم کے مروج ہیں۔ یعنی صرف بڑے ناگر ہوتے ہیں اس لئے ہر ناگر کو چار بیل باندھے جاتے ہیں۔ یہ ایک فٹ عریض حصہ کو گہرا کھودتا ہے۔ ایک ناگر سے علی العموم ۲۰ ایکر زمین ہموار ہوتی ہے۔

(۲) بکھر —— اس آلہ کو کاشت کے قبل گھانس پھونس کی صفائی کے لئے اور زمین کو ہموار کرنے کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۳) تپھن —— یہ تخم ریزی کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے اس کو دو بیل لگائے جاتے ہیں۔

(۴) دنتی —— کلچائی کے بعد اس کو چلایا جاتا ہے۔ جس سے پوری گھانس نکل آتی ہے۔ کلچائی کے لئے درانتی اور اسی قسم کے مقامی معمولی آلات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان آلات کو مقامی لوہار اور بڑھئی تیار کرتے ہیں۔ ان کی ادائی اجرت کا طریقہ قدیم اور رسم و رواج کے تحت مقررہ ہے۔ ناگر کے لئے بڑھئی سوامن اناج (جس کی فصل کاشت کار کے کھیت میں تیار ہو) اور لوہار کو بارہ پائلی اناج دیا جاتا ہے۔ ناگر کے لئے کاشت کار کو خود اپنے کھیت سے ببول کی لکڑی مفت مل جاتی ہے (واضح رہے کہ اس موضع میں ببول کے درخت تقریباً ہر کھیت میں ہیں) دنتی اور تپھن کے لئے البتہ لکڑی خریدی جاتی ہے۔ لوہا تیار

اور وقار آباد کے بازار سے خریدا جاتا ہے۔ ایک ناگر کے لئے جس قدر لوہے کی ضرورت ہوتی ہے اس کی قیمت ۲/۱ بکھر کے لوہے کی ایک روپیہ اور دنتی کے لوہے کی ۶/ ہوتی ہے۔ ناگر کو ہر سال تیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور بکھر اور تھپن کو علی العموم چار سال میں ایک مرتبہ تیار کرنا پڑتا ہے۔

آبپاشی

ذرایع آبپاشی :— موضع ہذا میں ذرایع آبپاشی دو ہیں۔ ایک باؤلیات دوسرے نالہ۔ کل باؤلیاں ۲۲ ہیں لیکن ان میں سے ۱۶ باؤلیوں سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے۔ اور بقیہ چھ باؤلیاں آبادی میں ہیں جن سے نوشیدنی آب کا کام لیا جاتا ہے۔ چاہی آبپاشی سے کل ۴۰ ایکڑ ۶ گنٹہ رقبہ سیراب ہوتا ہے۔ دوسرا ذریعہ آبپاشی نالہ ہے موضع کے شرقی اور غربی جانب دو نالے ہیں۔ شرقی نالہ آبادی سے متصل ہے اور غربی دور۔ نالہ کو موجودہ زمانہ میں ذریعہ آبپاشی قرار دینا غلطی ہے۔ اس وجہ سے کہ عملاً اب اس نالہ سے آبپاشی نہیں ہو رہی ہے۔ البتہ بارہ سال پہلے یعنی ۳۵ف تک یہ آبپاشی کا نہایت اہم وسیلہ رہا ہے۔ ۳۵ف تک اس سے ۱۴۹ ایکڑ رقبہ سیراب ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں کاشت کار اپنے خرچہ سے کتوے ڈالکر والے کے پانی کو روک لیا کرتے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا ہے کہ اس طرح سے ایک "کتوا" بناکر پانی روکنے کے اخراجات پندرہ سے بیس روپئے تک ہوا کرتے تھے کل سات کتوے باندھے جاتے تھے گویا اوسطاً ۱۰۵ روپیہ سے ۱۴۰ روپیہ تک اخراجات لاحق ہوتے تھے۔ ۳۵ف کے بعد سے نالہ ذریعہ آبپاشی نہیں رہا۔ چونکہ اس زمانہ سے نالہ گہرا ہوتا جارہا ہے اور اسی مناسبت سے زمینات نالے کی سطح سے بلند ہوگئیں' اب اس طرح عارضی طور پر "کتوے" بناکر اس سے آبپاشی کا کام لینا ممکن نہیں ہے۔ علاوہ ازیں گرما کے زمانہ میں پانی بہت کم آنے لگا ہے۔ نالے سے آبپاشی نہ ہونے کی وجہ سے ان زمینات کی پیداوار یقینی طور پر گھٹ گئی ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر حکومت نے سالانہ (۱۸۱۶) روپیہ ۴/ کی معافی دیدی ہے۔ آبپاشی کے تفصیلی بیان سے واضح ہوتا ہے کہ آبپاشی کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے (۳۴۳۸) ایکڑ ۲ گنٹہ کل مزروعہ اراضی میں سے صرف ۴۷ ایکڑ ۶ گنٹہ اراضی پر آبپاشی ہوتی ہے۔ گویا تقریباً (۳۲۶۳) ایکڑ ۳۶ گنٹہ اراضی پر جو پیداوار ہوتی ہے۔ اس کا انحصار قدرت پر ہے۔ بالفاظ دیگر تقریباً (۲،۱۵) فیصد اراضی زیر آبپاشی ہے۔ اور (۹۷،۸۵) فیصد اراضی کی پیداوار کا کلیتۃً بارش پر دارومدار ہے۔ اس قدر کثیر رقبہ کی پیداوار کا تمام تر بارش پر انحصار زرعی ترقی کے لئے کوئی

امید افزا حالت نہیں ہے۔

مویشی موضع میں زرعی اغراض کے لئے جن مویشیوں سے کام لیا جاتا ہے وہ صرف دو قسم کے ہیں یعنی بیل اور کھلگے جن کی تعداد علی الترتیب ۳۳۰ اور ۱۱ ہے۔ اس طرح جملہ مویشی جو زرعی کاروبار انجام دیتے ہیں ۳۴۱ ہیں گویا اوسطاً ۱۰ء۴ ایکر اراضی میں ایک بیل یا کھلگا پایا جاتا ہے ہمہ اقسام کے جملہ مویشیوں کی تعداد ہیں ۲۰۰۱ ہے ان مویشیوں کا اگر اوسط نکالا جائے تو ۱ء۷ ایکر اراضی میں ایک مویشی پایا جاتا ہے اگر جملہ مویشیوں کا اوسط نکالا جائے تو تقریباً ہر سو رقبہ اراضی میں ۵۳ مویشی پائے جاتے ہیں اگر صرف ان مویشیوں کا لحاظ کیا جائے جو زرعی کاروبار انجام دیتے ہیں تو ان کی کثرت نہیں ہے کیونکہ اوسطاً ہر سو ایکر اراضی میں صرف دس بیل یا کھلگے پائے جاتے ہیں۔ موضع کے جملہ مویشیوں اور ان کے مختلف اقسام کا اندازہ حسب ذیل جدول سے ہوسکتا ہے۔

زرعی						دودھ دینے والے						متفرق و لدو				
بیل			کھلگے			گائے			بھینس			گھوڑے			بکریاں و مینڈھے	گدھے
جوان	بچے	بوڑھے	جوان	بچے	بوڑھے	جوان	بچے	بوڑھے	جوان	بچے	بوڑھے	جوان	بچے	بوڑھے		
۳۱۸	۸	۴	۱۰	۱	۰	۱۴۵	۷۱	۱۲	۷۱	۳۱	۲	۱۲	۰	۴	۱۲۱۱	۲۲
۳۳۰			۱۱			۲۲۸			۱۰۴			۱۶				

نوٹ: بہائم شماری بذات خود کی گئی ہے۔

مندرجۂ بالا اعداد و شمار سے واضح ہو رہا ہے کہ زرعی کاروبار انجام دینے والے مویشیوں میں بیلوں کی جملہ تعداد ۳۳۰ اور کھلگے کل ۱۱ ہیں جن کے منجملہ بوڑھے یا ناکارہ بیل صرف چار ہیں اس طرح گاؤں کی جملہ تعداد ۲۲۸ ہے۔ اور بھینسوں کی تعداد ۱۰۴ ہے ان میں بوڑھے یا ناکارہ مویشیوں کی تعداد علی الترتیب ۱۲

اور ۲ ہے بالفاظ دیگر دودھ دینے والے مویشیوں میں صرف چار فیصد مویشی ناکارہ ہیں۔ پورے موضع میں جملہ ناکارہ مویشیوں کی تعداد صرف ۱۰ ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر ناکارہ مویشیوں کی کثرت کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد یقیناً کم تر ہے۔ ناکارہ مویشیوں کی تعداد میں کمی کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے کاشت کار ناکارہ مویشیوں کو علی العموم موضع ہی میں قصاب کے ہاتھوں یا وقار آباد او ر نار سنگی میں بیچ دیتے ہیں

مویشیوں کے اقسام ۹۰ فیصد بیل دیونی نسل کے ہیں لیکن گائیوں کی کثیر تعداد مقامی نسل کی ہے دیونی نسل کے بیلوں کو یہاں کے کاشت کار وقار آباد اور دیونی سے خرید کر لاتے ہیں۔ بیلوں سے علی العموم ۱۲ یا ۱۵ سال تک کام لیا جاتا ہے۔

اوسطاً ایک بھینس ۳ سیر اور گائے ۱ سیر دودھ دیتی ہے لیکن اس موضع کی یہ عجیب و غریب خصوصیت ہے کہ یہاں گائیوں کا دودھ نچوڑا نہیں جاتا مبادا کہ ان کے بچھڑے لاغر نہ ہو جائیں ان حالات کے مدنظر یہ معلوم کر کے تعجب نہ ہوگا کہ موضع میں دودھ کا روزانہ خرچ صرف ۵ سیر ہے۔ اور صرف ۱۰ خاندان دودھ کا استعمال کرتے ہیں اس طرح اوسطاً فی خاندان دودھ کا روزانہ خرچ صرف آدھ سیر ہے۔ جو دودھ بچ جاتا ہے اُس کا گھی بنالیا جاتا ہے جو اطراف کے بازاروں میں فروخت کیا جاتا ہے۔ کاشت کار اس کام کو ذیلی پیشہ کے طور پر انجام دیتے ہیں۔

مویشیوں کی رہائش مویشیوں کی رہائش کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ اکثر کاشت کار مویشیوں کو اپنے مکانوں میں باندھتے ہیں اور جس جگہ ان کو باندھا جاتا ہے اُس مقام پر صفائی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان مویشیوں کو زیر سایہ باندھا جاتا ہے۔

مویشیوں کی غذا عام طور پر مویشیوں کی غذا اکڑبی ۸ رگھانس اور بھوسہ ہے چند ایسے کاشتکار ہیں جن کے پاس اچھی زمینات ہیں جو زیر آبپاشی ہیں وہ اپنے مویشیوں کو سبز چارہ دیتے ہیں۔ بعض خوشحال مزارعین اپنے مویشیوں کو موسم گرما میں کھلی بھی کھلاتے ہیں موضع کا کوئی کاشت کار چارہ کی فصلیں نہیں اگاتا بلکہ در وفصل کے بور چارہ کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔

چارہ کو محفوظ کرنے کا طریقہ عام طور پر یہ ہے کہ گریاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ گریاں کھیت کے پاس لگائی جاتی ہیں۔ اور ان کے اطراف کانٹی لگا کر جانوروں سے چارہ کو محفوظ کرلیا جاتا ہے۔ گھانس کو محفوظ کرنے کے دیگر طریقوں مثلاً سلیج سے یہ لوگ واقف نہیں ہیں۔

۱۳۴۶ف میں موضع میں کل ۸۰ کھنڈی جوار ۱۰۰ کھنڈی کنگنی اور ۵۰ کھنڈی لچھنا اگایا گیا تھا۔ مزارعین کا بیان ہے کہ ایک کھنڈی جوار میں چار بنڈی کڑبی اور ایک کھنڈی کنگنی میں دو بنڈی اور ایک کھنڈی لچھنا میں چار بنڈی گھانس نکلتی ہے۔ اس حساب سے سال گوشتہ ۳۲۰ بنڈی کڑبی اور ۴۰۰ بنڈی گھانس اگایا گیا کسانوں کا بیان ہے کہ ایک بنڈی میں ۳۵۰ پولے کڑبی کے اور ۴۰۰ پولے گھانس کے سماتے ہیں۔ اس لحاظ سے ۱۱۲۰۰۰ پولے کڑبی اور ۱۶۰۰۰۰ پولے گھانس اگائی گئی۔ سرکاری کنچہ میں ۲۵۰۶۷۰ پولے گھانس اوگی اس طرح جملہ چارہ کی مقدار ۵۲۲۶۷۰ پولے رہی۔ اب جن مویشیوں کو چارہ دیا جاتا ہے اُن کی تعداد ۶۸۹ ہے۔ اس لحاظ سے روزانہ فی مویشی ۲ پولے اوسط پڑتا ہے۔ باوجودیکہ ہم نے اس چارہ کا اندازہ بھی لگایا ہے جو ذخیرہ کرنے میں اور سڑ گل کر ضایع ہوجاتا ہے۔ لیکن پھر بھی مندرجہ بالا بیان سے واضح ہو رہا ہے کہ یہاں چارہ کی قلت ہے۔ علی العموم اوسطاً فی مویشی روزانہ ۵ پولے چارہ کے دیے جاتے ہیں۔ لیکن موضع میں فی مویشی صرف دو پولے دستیاب ہوتے ہیں۔ اسی لئے باہر سے چارہ منگوایا جاتا ہے یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ مویشیوں کی تعداد قلیل ہونے کے باوجود چارہ کی قلت محسوس کی جاتی ہے۔

قلت چارہ کے اسباب

(۱) چارہ کی قلت کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ چارہ کی فصلیں کاشت نہیں کیجاتی ہیں۔ زمینات عام طور سے زرخیز ہیں اس لئے کاشتکار اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ اس لئے چارہ کی فصلیں کاشت کرنے کی بہ نسبت دیگر پیداوار اگانا وہ اپنے لئے مفید خیال کرتا ہے۔

(۲) قلت چارہ کا ایک اور دوسرا سبب یہ ہے کہ موضع میں حقیقی معنی میں کوئی گائران نہیں ہے۔ ممالک محروسہ میں معمول ہے کہ ہر سو ایکر اراضی میں ۵ ایکر اراضی بطور گائران چھوڑ دی جاتی ہے۔ اس گائران کا رقبہ ۲ ایکر ہے جو موضع کے لحاظ سے بہت مختصر ہے۔ علاوہ بریں یہ گائران برائے نام ہے۔ یہ اصل میں پتھریلی زمین ہے۔

اور یہاں کسی قسم کی گھانس نہیں اُگتی یوں تو عام طور پر روغنی تخم کی پیدا وار موضع میں کافی ہوتی ہے
بیان کیا گیا ہے صرف چند خوشحال کاشت کار اپنے مویشیوں کو کھلی کھلاتے ہیں۔ ورنہ علی العموم
کو برآمد کر دیا جاتا ہے۔ یا تیل نکالا جاتا ہے۔ تیل نکالنے کی صورت میں کھلی کو تیل نکالنے کی اجرت
میں دیدیا جاتا ہے۔ البتہ چند کسان تیل نکالنے کی اجرت زر کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔

مویشیوں کے امراض دریافت سے معلوم ہوا ہے کہ مویشی عام طور پر بہت کم بیمار
جن بیماریوں کے وہ شکار ہوتے ہیں اُن کے مقامی نام اور تفصیل

(۱) بکّا ردگم ــــ اس بیماری سے مویشی کے کلیجے اور آنتوں پر آبلے آجاتے ہیں۔ مز
بیماری کا کوئی علاج نہیں جانتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس سے اکثر جانور مرجاتے ہیں۔

(۲) کوٹہ ــــ مویشی کا سُم اور ٹخنہ سوجھ جاتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ مویشی کو داغ
لیکن بہت کم مویشی اس مرض سے جانبر ہوتے ہیں۔

(۳) بھاڑے ورپ ــــ جو جانور اس مرض میں گرفتار ہوتا ہے۔ اُس کے جسم کا ایک حصہ
ہے۔ اُس کا بھی کوئی علاج نہیں کیا جاتا ہے۔

(۴) بدا روگم ــــ یہ ایک وبائی مرض ہے اس کے مریض کو خون کے پاخانے آتے
علاج سے بھی کاشت کار بے بہرہ ہیں۔

(۵) دوتا ردگم ــــ جو مویشی اس مرض میں مبتلا ہوتا ہے اس کے اعضاء میں تشنج پیدا ہوجاتا
علاج بھی معلوم نہیں ہے۔ مویشیوں کے امراض کے علاج کے متعلق سرکار کی جانب سے کوئی
نہیں ہے۔

کھاد عمدہ فصلوں کی کاشت کے لئے کھاد کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔ موضع زیر
صرف دو اقسام کی کھاد یعنی گھریلو کھاد (کوڑا کرکٹ وغیرہ) اور گوبری کھاد استع
ہے۔ اس کے علاوہ مندہ بھی بٹھایا جاتا ہے۔ انسانی فضلا، پھلی دار فصلیں ہڈی کی کھاد اور دو
کھادوں کا استعمال تو کجا ان میں سے اکثر و بیشتر کا تو انھوں نے نام بھی نہیں سنا۔ چنانچہ جب

یہ کہا گیا کہ مویشیوں کے پیشاب کو جمع کر کے بطور کھاد استعمال کیا جا سکتا ہے تو انہیں کسی طرح یقین نہیں آتا تھا۔
چونکہ مویشیوں کو عام طور پر گھر میں باندھا جاتا ہے اور علی العموم کسان اپنے گھر کے سامنے یا قریب ہی گڑھے میں گوبر اور کوڑا کرکٹ جمع کرتے ہیں۔ اس کی حفاظت اور دھوپ سے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ نقصان دہ ہے۔ اس لئے کہ تمازت آفتاب کی وجہ سے گوبر کے تعفن اور اجزا جو زمین کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ گل جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خود کسان کی صحت کے نقطہ نظر سے بھی اس طرح گھر کے قریب کوڑا کرکٹ اور گوبر کا انبار لگا رہنا درست نہیں ہے۔ الغرض کسان اس طرح ان کو جمع کر کے کھاد بناتا اور حسب ضرورت استعمال کرتا ہے۔ کھاد کی فراہمی اور استعمال کا طریقہ یہ ہے اور ایک دوسرا طریقہ مندہ بٹھانا ہے۔ مویشیوں کے سلسلہ میں ہم نے بتایا ہے کہ بکریوں اور مینڈوں کی تعداد ۱۲۱۱ ہے۔ لہٰذا ان سے بھی بہرحال کافی مقدار میں کھاد حاصل ہوتی ہے۔ کسان کو مندہ بٹھانے کی اجرت ادا کرنی پڑتی ہے۔ ادائی اجرت کا ایک طریقہ یہ ہے۔ کہ کسان ۲ ایکر تخم ریزی کر کے دھنگر کو دیدیتا ہے۔ مالگزاری بھی کسان ہی ادا کرتا ہے۔ لاگوڑ وغیرہ کے اخراجات البتہ دھنگر ادا کرتا ہے۔ دوسرا طریقہ نقد ادائی کا ہے یعنی مندہ بٹھانے کے بعد کسان دھنگر کو ۳۵ روپیہ دیتا ہے۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ آیا کھاد کی جو مقدار موضع میں دستیاب ہوتی ہے وہ کافی ہے یا نہیں۔ یہ ایک بالکل واضح بات ہے کہ موضع میں اور مواضعات کی بہ نسبت چونکہ مویشیوں کی قلت ہے اس لئے لازمی طور پر کھاد کی بھی قلت ہوگی۔ لیکن کھاد کی حقیقی قلت معلوم کرنے کے لئے اس کی رسد اور طلب پر نظر ڈالنی ہوگی۔ اس سلسلہ میں مزارعین سے مختلف سوالات کئے گئے جن سے پتہ چلا کہ ایک سال میں ایک مویشی سے ۶ بنڈی گوبری حاصل ہوتی ہے۔ موضع میں کل مویشی جن سے گوبری حاصل ہوتی ہے ۶۸۹ ہیں۔ اس لحاظ سے سالانہ گوبر کی پیداوار ۴۱۳۴ بنڈی ہے۔ ایک ایکر سے اچھی پیداوار حاصل کرنے کے لئے کسانوں کے بیان کے موجب پندرہ بنڈی گوبر کی ضرورت ہے۔ موضع میں مزروعہ زمینات کا رقبہ ۱۰۳۷ ایکر ہے۔ گویا مزروعہ زمینات سے اچھی پیداوار حاصل کرنے کے لئے ۱۵۵۵۵ بنڈی گوبر کی ضرورت ہے۔ بالفاظ دیگر گوبر کی طلب ۱۵۵۵۵ بنڈی ہے۔ حالانکہ اس کی رسد ۴۱۳۴ بنڈی ہے۔ لیکن یہ رسد بھی حقیقی نہیں ہے کیونکہ اس کا

ایک حصہ بطور ایندھن جلا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حساب لگایا گیا ہے کہ تقریباً ۱۱۳۰ بنڈی گوبر جلا دیا جاتا ہے۔ گوبر کی جو مقدار جلائی جاتی ہے اُس کا اندازہ حسب ذیل طریقہ سے لگایا گیا ہے۔

مزارعین کے بیان کے مطابق ایک بنڈی میں ۵۰۰ اُپلیاں رکھی جاتی ہیں (اُپلیاں کافی بڑی ہوتی ہیں) اور ایک خاندان جو وسطاً پانچ افراد پر مشتمل ہو۔ سالانہ پانچ بنڈی اُپلیاں جلاتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر ۲۵۰۰ اُپلیاں ایک خاندان سالانہ جلاتا ہے۔ موضع میں کل ۲۲۶ خاندان ہیں۔ گویا موضع میں سالانہ ۲۵۰۰×۲۲۶ اپلیوں کا خرچ ہے۔ اندازاً ۵۰۰ اُپلیاں ایک بنڈی گوبر سے تیار کی جاتی ہیں۔ کل موضع میں جس قدر اُپلیاں جلائی جاتی ہیں وہ ۱۱۳۰ بنڈی گوبر سے بنائی جاتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں منجملہ ۴۱۳۴ بنڈی گوبر کے ۱۱۳۰ بنڈی گوبر جلایا جاتا ہے۔ گویا گوبر جو بطور کھاد استعمال کیا جاتا ہے اُس کی مقدار ۳۰۰۴ بنڈی ہے۔ اگر اس میں سے گوبر کی اس مقدار کو نکال دیا جائے جو اِدھر اُدھر گر کر ضائع ہوتا ہے تو گوبری کھاد کی حقیقی رسد ۳۰۰۰ بنڈی رہ جاتی ہے۔ حالانکہ اُس کی طلب ۵۵۰۹ بنڈی ہے۔ گوبر کی اس طلب کی صحت کے لئے ایک اور واقعہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ مندہ بٹھانے کا طریقہ ہے۔ ایک مندہ تقریباً ۱۵ بکریوں و مینڈوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ موضع میں کل بکریوں اور مینڈوں کا لحاظ کرتے ہوئے ۸ مندے پائے جاتے ہیں۔ مزارعین کا بیان ہے کہ ایک مندہ کی کھاد ۵ یکر اراضی کے لئے کفایت کرتی ہے۔ اس حساب سے ۸ مندوں کی کھاد ۴۰ یکر اراضی کے لئے کافی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں چونکہ ۴۰ یکر اراضی کے لئے مندہ بٹھانے سے کھاد حاصل ہوجاتی ہے اس لئے اس اراضی کے لئے گوبری کھاد کی ضرورت نہیں اسلئے گوبری کھاد کی حقیقی طلب دریافت کرنے کی غرض سے مزروعہ زمینات ۸۴۳ یکر میں سے ۴۰ یکر کو منہا کردینا ہوگا۔ یعنی ۲۳۹۸ یکر اراضی کے لئے کل ۵۵۰۹ بنڈی گوبری کھاد کی ضرورت ہے اور یہی گوبری کھاد کی حقیقی طلب ہے۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا ہے گوبری کھاد کی حقیقی رسد ۳۰۰۰ بنڈی ہے۔ یعنی ۲،۹۵۵ بنڈی کھاد کی قلت ہے۔

قلت کھاد کے اسباب

(۱) قلت کھاد کا پہلا سبب بالکل واضح ہے۔ یعنی موضع میں نسبتاً مویشیوں کی قلت ہے۔ اس لئے لازمی طور پر کھاد بھی کم حاصل ہوتی ہے

(۲) کھاد کی قلت کم محسوس ہوتی۔ اگر موضع کے کسان انسانی فضلے اور مویشیوں کے پیشاب کو بطور کھاد استعمال کرتے۔

(۳) گوبر کے جلانے سے کھاد کی قلت میں اور اضافہ ہو رہا ہے۔

(۴) کھاد کے استعمال کی کمی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہاں ذرایع آبپاشی ناقص ہیں۔ اس لئے مزارعین کو اس امر کا اندیشہ ہے کہ اگر دوسری کھادیں استعمال کی جائیں تو ان کی فصلیں جل جائیں گی۔

تخم اصلاح یافتہ تخم کا استعمال نہیں ہوتا ہے بلکہ اب بھی وہی تخم استعمال ہو رہے ہیں جو زمانہ قدیم سے موضع میں کاشت کئے جاتے رہے ہیں۔ اصلاح یافتہ تخم کی ترویج حکومت یا کسی ادارہ کی جانب سے اب تک نہیں کی گئی۔

فراہمی تخم کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کاشت کار دروفصل کے بعد جب کھلہ لگایا جاتا ہے تو اُن میں سے تخم نکال لیتا ہے اور اُن کو آئندہ فصل میں استعمال کرتا ہے۔ کسی کسان کے پاس تخم موجود نہ ہوں تو ایسی صورت میں وہ کسی دوسرے کسان سے تخم قرض لیتا ہے اور اُس کے معاوضہ میں کاشت کے بعد ڈیڑھ گنا تخم ادا کرتا ہے۔ یہ طریقہ عام طور پر مروج ہے۔ تخم کو راکھ اور نیم کا پتہ ملا کر گمبوں (...) میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔ مزارعین کا تجربہ ہے کہ راکھ اور نیم کے پتہ سے تخم کو کیڑہ نہیں لگتا۔ موضع کی اہم پیداوار میں ولایتی مونگ۔ مرچ۔ لچھنا۔ مسور۔ توَر۔ اڑد۔ تل ارنڈی۔ السی۔ کرڑ۔ بٹانا۔ چنا۔ تمباکو۔ پیاز اور لہسن ہیں۔

حفاظت فصل فصول کو سب سے زیادہ نقصان ٹڈیوں سے پہنچتا ہے۔ استادہ فصول پر ٹڈیاں گرتی ہیں اور آن واحد میں اُن کا ستیاناس کر دیتی ہیں۔

تقسیم و انتشار اراضی کے باعث کھیتوں کے اطراف باڑہ لگانا نہ صرف وقت طلب ہے بلکہ بیش قیمت بھی۔ اس لئے اکثر کھیتوں کو باڑھ نہیں ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنگلی جانوروں۔ جنگلی چوہوں اور موضع کے مویشیوں سے فصلوں کو نقصان پہنچتا ہے اس کے علاوہ مختلف امراض کے باعث فصلیں خراب ہوتی ہیں۔ ان امراض کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) جگی روگم ــــ یہ بیماری عام ہے۔ جوار کی تیار فصل کے وقت اگر مطلع ابر آلود ہو تو بھٹوں پہ ایک سُرخ مادہ جس کا مزہ میٹھا ہوتا ہے جم جاتا ہے۔ اس سے فصل کو قابل لحاظ نقصان پہنچتا ہے۔ اگر بارش ہو تو اس کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

(۲) "گارا" ــــ یہ بیماری صرف جوار کے لئے مخصوص ہے اس سے کڑبی کی پتی سوکھ جاتی ہے یا بعض صورتوں میں سفید و لال ہو جاتی ہے۔ کسان اس بیماری کا علاج نہیں جانتے۔

(۳) "تمڑی" ــــ اس بیماری کا اثر گیہوں پر ہوتا ہے اگر مطلع ابر آلود ہو تو پتا سرخ ہو جاتا ہے او اُس پر صندل کے مانند ایک قسم کا مادہ جمع ہو جاتا ہے۔ اس سے فصل کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ کاشت کار اس کے علاج سے بھی ناواقف ہیں۔

(۴) "تمباکو پر جاڑا" ــــ تمباکو جب پختہ ہو جائے تو رات کو جاڑے کے اثرات سے خشک ہو جاتا ہے اس کو عرف عام میں "تمباکو پر جاڑا پڑا" کہتے ہیں۔

(۵) "گلہ روگم" ــــ یہ مرض مرچ کی فصل کو ہوتا ہے۔ مرچ کے پتے اِس کی وجہ سے مڑ جاتے ہیں۔ اور فصل خراب ہو جاتی ہے۔

(۶) "پیسو روگم" ــــ ولایتی مونگ پر ایک سیاہ دھبہ آجاتا ہے جس سے یہ فصل بالکل خراب ہو جاتی ہے۔ مقامی زبان میں اس کو پیسو روگم کہا جاتا ہے اس کے علاج سے بھی کوئی واقف نہیں ہے۔

فروخت پیداوار

تقسیم و انتشار اراضی ناکافی ذرائع آبپاشی قلت کھاد کے باعث یوں تو کسان کو خاطر خواہ پیداوار حاصل نہیں ہوتی اس پر کسان کی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ اُس کو اپنی پیداوار کی جو مناسب قیمت ملنی چاہیئے اس سے بھی وہ محروم رہتا ہے۔

فروخت پیداوار کے طریقے

سوائے چند کسانوں کے بقیہ تمام مزارعین اپنی پیداوار کو مقامی ساہوکاروں اور بنیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ اس کی اصلی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی پیداوار کو ان کے ہاتھ بیچنے کے نقصانات سے واقف نہیں ہیں بلکہ ایسا کرنے پر یہ لوگ گوناگوں وجوہات کے باعث مجبور بھی ہیں۔ اول تو یہ کہ ان کی عظیم اکثریت ساہوکار کے دام فریب میں

گرفتار ہے۔ اس لئے وہ مجبور ہیں کہ اپنی پیداوار کو گزشتہ قرضہ کے ایک حصہ کی ادائی میں یا محض سود کی ادائی میں یا صرف ساہوکار سے تعلقات برقرار رکھنے کی خاطر ساہوکار کے ہاتھ فروخت کریں دوسرے یہ کہ اُن کے پاس گودام نہیں ہیں تاکہ وہ اپنی پیداوار کو معقول قیمت ملنے تک روک رکھیں۔ اس لئے بھی اور اپنی وقتی ضروریات سے مجبور ہو کر کسان اونے پونے مقامی بنیوں کو فروخت کر دیتا ہے۔ بازارات کے لین دین اور نرخوں سے عدم واقفیت بھی کسانوں کے اس طرز عمل کی ذمہ دار ہے۔ بعض صورتوں میں تو کاشت کار زمین کو ہموار کرتا اور تخم ریزی کرتا ہے اور جب فصل استادہ ہو جاتی ہے تو ساہوکار آ کر اُس پر قبضہ کر لیتا ہے اور لاگوڑ کی رقم بھی کاشت کار کے حساب میں درج کر دیتا ہے۔ علی العموم فصل درو ہونے کے بعد کسان ساہوکار کو موضع کے بازاری نرخ سے بھی فی من ایک روپیہ کم کے بھاؤ سے فروخت کر دیتا ہے۔ اگر کسان کو اپنی پیداوار فروخت کرنے کے کچھ ماہ بعد اناج کی ضرورت ہو تو اُس کو ڈیوڑھی رقم دینی پڑتی ہے۔ یہ تو مقامی طور پر فروخت پیداوار کا حال ہوا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے صرف چھ کسان اور مقامی ساہوکار اطراف و اکناف کے بازارات میں مقامی پیداوار فروخت کرتے ہیں۔ بازارات جہاں موضع ہذا کی پیداوار فروخت ہوتی ہے اور اُن کا موضع زیر بحث سے فاصلہ درج ذیل ہے۔

وقار آباد ۸ میل — شنکر پلی ۱۰ میل — نواب پیٹھ ۲ میل — نارسنگھی ۴ میل — سدا سیو پیٹھ ۱۶ میل — سردار نگر ۸ میل — حیدر آباد ۳۶ میل —

ان مقامات پر باستثنائے بلدہ حیدر آباد مختلف ایام میں ہفتہ میں ایک مرتبہ بازارات لگتے ہیں۔ قریب کے بازارات میں پیداوار بنڈیوں اور گدھوں کے ذریعہ روانہ کی جاتی ہے۔ اور جو بازارات دور ہیں وہاں بذریعہ ریل پہنچائی جاتی ہے۔ موضع سے قریب ترین اسٹیشن دو ہیں۔ ایک چیت گڈھ جو ایک میل اور گولہ گوڑہ جو تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ اب ان بازارات میں فروخت کا حال سنیئے۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ ساہوکار موضع کے کسان سے بازاری نرخ سے فی من ایک روپیہ کم کے بھاؤ پر اور اگر کوئی کسان اُس کا قرضدار ہو تو سوا روپیہ فی من کم کے بھاؤ پر پیداوار خرید لیتا ہے اور جب بازار کا نرخ چڑھ جائے تو ان بازارات میں مال بھیجتا ہے

اور آڑتی کے ذریعہ فروخت کراتا ہے۔ آڑتی فی من ۲ ر آڑھت یا کمیشن وصول کرتے ہیں اس کے علاوہ مختلف بازاروں میں مختلف مدات کے نام سے کچھ رقم وصول کی جاتی ہے۔ عام طور پر ہر بازار میں دھرما خرچ کے نام سے آدھا آنہ فی من لیا جاتا ہے۔ مال فروخت کرنے کے بعد آڑتی اپنے کھاتہ دار کو اطلاع دیتا ہے۔ لیکن علی العموم مال بھیجنے والے وہاں موجود رہتے ہیں۔ اگر کسی دن بازار کا نرخ گر جائے تو آڑتی پیداوار کو فروخت نہیں کرتا۔ بلکہ اُس کو دوسرے بازار تک اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے اور اس طرح محفوظ رکھنے کی کوئی اجرت نہیں لیتا۔ اس طریقہ پر عمل کرنے سے پیداوار بھیجنے والے کا فائدہ تو ہے لیکن آڑتی کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے کہ خواہ مال کم نرخ پر فروخت ہو یا زیادہ نرخ پر آڑتی کی کمیشن پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ اس کی کمیشن مقدار جنس کے لحاظ سے مقرر ہے محض عمل درآمد اور رواج کی بناء پر آڑتی یہ رعایت کرتا ہے۔

عدم یکسانیت اوزان وپیمانہ جات

پھول ماملی اور ان مختلف بازاروں کے اوزان وپیمانہ جات میں کافی اختلاف موجود ہے۔ پہلا اور اہم فرق تو یہ ہے کہ بلدہ حیدرآباد میں پیداوار عموماً تول کر فروخت کی جاتی ہے۔ لیکن یہاں ناپ کر بیچی جاتی ہے۔ اس وجہ سے موضع میں ہر جنس کا وزن جداگانہ ہوتا ہے اور بلدہ حیدرآباد میں جداگانہ۔ مندرجہ ذیل جدول سے حیدرآباد اور پھل ماملی کے اوزان وپیمانہ جات کی عدم یکسانیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

جنس	پھل ماملی	بلدہ حیدرآباد
پچھنا	۱ سیر	۱ ¼ سیر
جوار	۱ ”	۱ ” ڈیڑھ پاؤ
تور	۱ ”	۱ ¼ ”
امباڑا	۱ ”	۱ ” ڈیڑھ پاؤ
چنا	۱ ”	۱ ” ”
ولایتی مونگ	۱ ”	۱ ” ادھ پاؤ

پھل ماملی کی مانند وقار آباد اور شنکر پلی وغیرہ میں اجناس ناپ کر بیچی جاتی ہیں۔ لیکن اس ناپ میں بھی

یکسانیت نہیں ہے۔ چنانچہ پھل مامڑی میں ایک پائلی چار سیر کے مساوی ہے۔ پیاز۔ لہسن۔ مرچ۔ تمباکو۔ املی اور ہلدی تول کر بیچی جاتی ہیں۔ لیکن یہاں تیرہ سیر کا من ہوتا ہے۔ اور شنکر پلی و وقار آباد وغیرہ میں بارہ سیر کا۔ اول تو ساہوکار کے ہاتھوں پیداوار فروخت کرنے سے کسان کو خاطر خواہ قیمت وصول نہیں ہوتی دوسرے عدم یکسانیت اوزان و پیمانہ جات کے باعث بھی وہ گھاٹے میں رہتا ہے۔

زرعی مقروضیت موضع کی مقروضیت کا اندازہ مندرجۂ ذیل جدول سے بخوبی ہوجائے گا۔

پیشہ	جملہ خاندان	مقروض خاندان	مجموعی قرضہ	اوسط قرضہ فی مقروض خاندان
۱۔ خالص زراعت پیشہ	۸۱	۷۵	۵۰۸۵۰ روپیہ	۶۷۸
۲۔ زراعت معہ دیگر پیشوں کے	۴۶	۳۶	۹۳۲۵ "	۲۵۹
۳۔ خالص زرعی مزدور	۶۶	۶۵	۷۶۵۶ "	۱۱۸
۴۔ خالص صنعت پیشہ	۶	۴	۳۰۲ "	۷۵
جملہ		۱۷۰	۶۸۱۳۳	

ان اعداد و شمار سے واضح ہو رہا ہے کہ موضع کا جملہ قرضہ ۶۸۱۳۳ روپیہ ہے۔ اور قرضہ کا سب سے زیادہ بار زراعت پیشہ اشخاص پر پڑ رہا ہے۔ منجملہ ۸۱ خاندانوں کے ۷۵ خاندان مقروض ہیں۔ یعنی صرف چھ خاندان قرض کے بار سے بری ہیں۔ ان کا اوسط قرض فی خاندان بھی نسبتاً زیادہ ہے۔ زراعت کے ساتھ ساتھ دیگر پیشوں کو انجام دینے والے خاندانوں پر بھی قرضہ کا بار نسبتہً زیادہ ہے۔ چنانچہ ان کے جملہ خاندان ۴۶ ہیں اور مقروض خاندان ۳۶۔ گویا صرف ۱۰ خاندان ساہوکار کے چنگل سے بچے ہوئے ہیں۔ ان دو طبقوں پر قرضہ کے اس قدر بار کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ ان کے قبضہ میں زمینات ہیں۔ اس لئے ساہوکار کے نزدیک ان کا اعتبار بڑھا ہوا ہے اور وہ ان کو دل کھول کر قرض دیتا اور من مانے سود وصول کرتا ہے۔

موضع میں ساہوکاروں کی جملہ تعداد ۸ ہے۔ ان کے علاوہ دو دھنگر اور چار کسان بھی سودی لین دین کرتے ہیں۔ عام طور پر ساہوکار کسانوں کو شخصی واقفیت اور اعتبار کی بناء پر قرض دیتے ہیں اور خانگی

طور پر ان سے دستاویز لکھائی جاتی ہے۔ دستاویز کے مضمون سے کسان عموماً ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کے بعد سے کسان اور ساہوکار کے مابین جو رقمی لین دین ہوتا ہے اس سے کسان واقف نہیں ہوتا۔ اس تمام لین دین کا حساب ساہوکار اپنے من مانے کرتا ہے۔ اور کسان اپنی ناواقفیت اور کمزور حیثیت کے سبب ساہوکار کے حساب کو مصدقہ سمجھتا ہے۔ مقروض جو رقم ادا کرتا ہے اس کی کوئی رسید نہیں دی جاتی ہے۔ کسان قرضہ کی ادائی میں عموماً اپنی پیداوار ساہوکار کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ اگر کسان قرض ادا کرنے میں سہل انگاری سے کام لے تو اول تو ساہوکار اُس پر مختلف طریقوں سے اپنا اثر ڈالتا ہے اور اگر اس پر بھی وہ ادا نہ کرے تو اس کا تصفیہ پنچوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ پنچوں کا فیصلہ زیادہ تر ساہوکار کے موافق اور کسان کے خلاف ہوتا ہے۔ چونکہ پنچوں (ثالث) میں موضع کے ساہوکار اور ایک یا دو موضع کے بااثر اشخاص ہوتے ہیں۔ قرضہ کے سلسلہ میں بہت کم دعویٰ عدالتوں میں دائر کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ بیس سال کے عرصہ میں صرف دو دیوانی دعوے دائر کئے گئے تھے۔ لیکن بالآخر ان کا تصفیہ بھی پنچوں کے ذریعہ کرالیا گیا۔ اور دعوے واپس لے لئے گئے۔ مزارعین اس چیز کو اپنی انتہائی اہانت تصور کرتے ہیں کہ اُن کے نام پر عدالت میں دعویٰ کیا جائے۔ چنانچہ مزارعین کی اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ساہوکار دعویٰ کرنے کی دھمکی دیتا ہے اور اپنے حسب مرضی پنچوں سے تصفیہ کراتا ہے۔ سودی لین دین کے جو مختلف طریقے موضع میں مروج ہیں اُن کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) "آسامی کھاتہ" اس طریقہ میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو سو روپیہ بطور قرض دیے جائیں تو قرض گیرندہ ساہوکار سے اس قسم کا معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اپنی زمین کی پوری پیداوار ساہو کو دیدے گا۔ ساہو کا صرف لاگوڑا ادا کرتا ہے۔ لیکن اس رقم کو بھی کسان کے کھاتہ میں شامل کرکے اس پر سود وصول کرتا ہے۔

(۲) "ناگ" اگر کوئی کسان ایک من غلہ قرض لے تو دوسری فصل کی تخم ریزی سے قبل ڈیڑھ من ادا کرتا ہے۔ اس طریقہ کو ناگ کہا جاتا ہے۔

(۳) "لاڈنی ناگ" تخم ریزی کے زمانہ میں اگر ایک من امباڑا۔ چنا۔ ٹانا۔ تور۔ لاک۔ تل۔ ولایتی مونگ۔ اُڑد۔ یا جو ساہو سے بطور قرض لیجائے تو ادا کرتے وقت ہی اجناس ڈیڑھ من دینی پڑتی ہیں۔ اور اگر ایک من چنا۔ جوار۔ گیہوں۔ کنگنی۔ میتھی۔ السی۔ کودھرو۔ میٹھا سن۔ سفید جوار یا لہسن۔ بطور قرض حاصل کیا جائے تو اُن کے

معاوضہ میں دو من دینا پڑتا ہے۔ مقامی زبان میں اس طریقہ کو لاڈنی ناگ کہتے ہیں۔

(۴) "سوائی" اس طریقہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کلچائی کے وقت جو قرضہ حاصل کیا جاتا ہے اس کے معاوضہ میں فصل تیار ہونے کے بعد سوائی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ سودی لین دین کے مندرجۂ بالا طریقوں سے واضح ہو رہا ہے کہ ساہوکار طرح طرح سے ناجائز فائدے اُٹھا رہے ہیں۔ ساہوکاروں کی ظلم و زیادتی کی تشریح مندرجۂ ذیل چند واقعات سے ہوسکتی ہے۔

(۱) سردار علی نامی ایک کسان نے سنہ ۱۳۴۲ف میں سو روپیہ قرضہ شادی کے لئے حاصل کیا۔ شرح سود ڈیڑھ روپیہ ماہانہ طے پائی۔ اور یہ قرار پایا کہ قرض گیرندہ کے چار ایکڑ اراضی پر جس قدر کاشت ہو وہ ساہوکار کو قرض کی ادائی میں دیدی جائے۔ چنانچہ سنہ ۱۳۴۳ف میں تین کھنڈی مرچ ایک کھنڈی تمباکو کی کاشت ہوئی۔ ان کا نرخ اس سال ۴۰ روپیہ اور ۷۰ روپیہ فی کھنڈی علی الترتیب تھا۔ گویا اس سال ساہوکار کو ۱۱۰ روپیہ وصول ہوئے۔ اگر کسان ۱۱۰ روپیہ نقد ادا کر دیتا تو اُس کے ذمہ صرف آٹھ روپیہ واجب الادا رہتے۔ لیکن حساب اس سال نہیں کیا گیا۔ دوسرے سال یعنی سنہ ۱۳۴۴ف میں اس اراضی پر ۳ پلے مرچ ۱۰ من تمباکو ایک کھنڈی ولایتی مونگ کی کاشت ہوئی۔ گویا اس سال کے نرخ کے حساب سے ۲۰ روپیہ کی مرچ ۵۰ روپیہ کی ولایتی مونگ اور ۵۰ روپیہ کا تمباکو پیدا ہوا۔ بالفاظ دیگر ساہوکار کو اس سال ۱۲۰ روپیہ وصول ہوئے لیکن اسی سال کسان نے ۷۰ روپیہ محاصل کی ادائی کے لئے اور ۱۰ روپیہ لاگوڑ کے لئے قرض لئے۔ سنہ ۱۳۴۴ف میں کسان مذکور ساہوکار کے صرف ۱۰ روپیہ مع سود باقی تھا۔ اور سنہ ۱۳۴۴ف میں پیداوار کی فروخت سے ۱۳۰ روپیہ وصول ہوئے۔ دوسرے لفظوں میں ساہوکار کا کل قرض ادا ہونے کے بعد (۹۰ — ۱۳۰) یعنی ۴۰ روپیہ ساہوکار سے کسان کو ملنے چاہئیں۔ حالانکہ کسان نے اس سے صرف ۹۰ روپیہ لئے۔ لیکن ساہوکار ستم ظریفی دیکھئے کہ روپیہ دینا تو کجا اُلٹے اُس نے ۹۰ روپیہ کسان کے حساب میں بطور قرض لکھدیے۔ چوتھے سال سنہ ۱۳۴۵ف میں پھر کاشت ہوتی ہے اور ۵۰ روپیہ مرچ کے ۵۰ روپیہ تمباکو کے اور ۶۵ روپیہ ولایتی مونگ کے اور ۲۴ روپیہ جو کے گویا کل ۱۸۹ روپیہ ساہوکار کو ملتے ہیں۔ کاشتکار نے اس سال بھی اس سے ۹۰ روپیہ حاصل کئے۔ سنہ ۱۳۴۶ف میں ۳ کھنڈی مرچ ۵ امن تمباکو ۱۹ من ولایتی مونگ اور ۱۰ امن جو کی کاشت ہوئی۔

مرچ کا نرخ اس زمانہ میں ۴۰ روپیہ فی کھنڈی اور تمباکو کا ۷۰ روپیہ فی کھنڈی ولایتی مونگ کا ۵۰ روپیہ فی کھنڈی اور جو کا ۴ روپیہ فی من تھا۔ اس حساب سے ساہوکار کو اس سال ۴۲۳ روپیہ وصول ہوئے اس سال بھی کاشتکار نے ۹۰ روپیہ ساہوکار سے حاصل کئے۔ ۱۳۴۳ف کے اوائل میں ایک کھنڈی مرچ کی کاشت ہوئی۔ جس کی قیمت ۵۰ روپیہ ساہو نے حاصل کی۔ ازروئے حساب ساہو کو قرض بے باق ہونے کے بعد (۴۰ + ۹۹ + ۱۴۴ + ۵۰) ۳۳۳ روپیہ زائد وصول ہوئے لیکن ساہوکار کی ظلم و زیادتی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ۲۷۰۵ روپیہ ۱۳۴۴ف کے اوائل میں کسان کے ذمہ واجب الادا ٹھہراتا ہے۔ گویا کسان ۱۰۰ روپیہ قرض لینے کے بعد ۷۰۵ روپیہ ادا کرتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں شرح سود ۱۳۰ روپیہ فیصد سالانہ ہے۔

(۲) اینکا کاشت کار نے ایک ساہو سے ۶۰ روپیہ لئے اس سال کے بعد ۲۶ روپیہ ادا ہوئے اس کے بعد سے کسی قسم کی ادائی عمل میں نہیں آئی۔ چھ سال کے بعد جب حساب کیا گیا تو اس کے ذمہ ۲۰۱ روپیہ واجب الادا نکلے۔ حساب کرنے سے معلوم ہوگا کہ ۴۲ روپیہ فیصد سالانہ سود لگایا گیا ہے۔

(۳) دان ریڈی کسان نے آنارپ نیکنا ساہو سے اواخر ۱۳۳۷ف میں ۵۰۰ روپیہ شادی کی غرض سے بطور قرض بقرارداد سود ڈیڑھ روپیہ فیصد ماہانہ لئے اور ۱۳۴۴ف کے اواخر تک ہر سال برابر ۵۰ روپیہ ادا کرتا رہا۔ ۱۳۴۵ف میں جب ساہو سے حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ سود در سود لگانے کے بعد ۱۵۰۰ روپیہ مقروض کے ذمہ واجب الادا ہیں پنچوں نے تصفیہ کیا کہ سالانہ ۱۵۰ روپیہ اقساط کے لحاظ سے دس سال میں یہ رقم ادا کر دی جائے۔

(۴) شیخ ننھے صاحب نے بسپا ساہو سے ۱۳۴۲ف میں ۷۰ روپیہ بشرح سود ۲ فیصد ماہانہ حاصل کئے۔ ڈیڑھ سال کے بعد کاشت کار نے قرض کی ادائی میں ۳۰ روپیہ کی مرچ اور ۳۰ روپیہ کی جو ساہوکار مذکور کے حوالہ کر کے لاگوڑا اور ادائی مالگزاری کے لئے ۲۲ روپیہ حاصل کئے۔ حساب کرنے کے بعد ساہوکار نے کسان کے ذمہ ۲۰۰ روپیہ نکالے۔ ۷۰ روپیہ کا سود ڈیڑھ سال کے لئے تقریباً ۲۵ روپیہ ہوتا ہے۔ ڈیڑھ سال کے اختتام پر قرض مع سود ۹۵ روپیہ ہوتا ہے۔ کاشت کار ۲۸ روپیہ ادا کرتا ہے۔ ازروئے حساب ۶۷ روپیہ کسان کے ذمہ رہتے چاہئیں۔ لیکن ساہوکار کا حساب اتنا سیدھا کہاں؟ حساب کیا جائے تو معلوم ہوگا

کہ ساہو نے ۲ فیصد ماہانہ سود نہیں لگایا ہے بلکہ ۱۶۰ روپیہ فیصد سالانہ سود لیا گیا ہے۔

(۵) ۱۳۴۳ف میں بیرپلی سنگیا ساہوکار سے بکا ہنگا کسان نے ۳۴ روپیہ لئے۔ ۱۳۴۵ف کے اواخر میں حساب کیا گیا تو کسان کے ذمہ ۱۰۰ روپیہ نکلے۔ جس کی ادائی کے لئے یہ قرار پایا کہ کاشت کار اپنی ڈیڑھ ایکر اراضی پر کاشت کرکے اُس کی کل پیداوار ساہو کو دیدے۔ ساہوکار نے ایک سال میں ۴ من ولایتی مونگ اور ایک من دس پائلی چنے۔ اور چھ پائلی مونگ۔ گویا تقریباً ۴۰ روپیہ کی پیداوار حاصل کی۔ اس کے بعد ساہوکار نے پیداوار حاصل کرنے سے انکار کردیا۔ اور مطالبہ کیا کہ مابقی دوسالہ اقساط نقد ادا کئے جائیں۔

مندرجۂ بالا مثالوں سے یہ واضح ہورہا ہے کہ یوں تو عموماً زیادہ سے زیادہ شرح سود ۲۴ فیصد سالانہ ہے لیکن حقیقتاً اگر مہاجنی لین دین کے گوناگوں پیچیدہ طریقوں اور ساہوکاروں کی چالاکی کو پیش نظر رکھا جائے تو شرح سود کم سے کم ۴۰ روپیہ فیصد سالانہ اور زیادہ سے زیادہ ۱۶۰ روپیہ فیصد سالانہ ہے۔

ساہوکار کے آہنی پنجہ میں پھنس کر بعض کسانوں نے اپنی زمینات ساہوکاروں کو بیع اور رہن کردی ہیں۔ ۱۳۴۰ف سے قبل جو زمینات بعوض ادائی قرضہ ساہوکاروں کو بیع کی گئی ہیں اُن کا رقبہ ۴۳ ایکر ہے۔ ۱۳۴۵ف کے بعد سے جو زمینات بعوض ادائی قرضہ بیع کی گئی ہیں اُن کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔ ایسی زمینات کا کل رقبہ ۴ ایکر ۲۴ گنٹہ ہے۔

(۱) پرمٹ سنگا ریڈی پٹہ دار نے بیرپلی بسپا ساہو سے ۱۳۳۶ف میں ۵۰ روپیہ حاصل کئے تھے جس کی شرح سود ڈیڑھ روپیہ فیصد ماہانہ تھی۔ ۱۳۴۵ف میں حساب کیا گیا تو ۲۰۵ روپیہ بذمہ پٹہ دار برآمد ہوے حالانکہ پٹہ دار مذکور ۱۳۴۵ف تک ہر سال ۲۵ روپیہ ادا کرتا رہا۔ ساہوکار کی حسب خواہش پٹہ دار نے اپنا ایک کھیت جس کا رقبہ ۲ ایکر ہے ساہوکار کے نام بیع کرکے قرضہ بے باق کردیا۔

(۲) جنگم اڈویا پٹہ دار نے بیرپلی سنگیا ساہو سے ۱۳۴۲ف میں ۸۰ روپیہ بشرح سود ڈیڑھ روپیہ فیصد ماہانہ حاصل کئے۔ ۱۳۴۷ف میں پٹہ دار نے اپنا ایک کھیت جس کا رقبہ ۲۹ گنٹہ ہے۔ بعوض ادائی قرضہ ساہو مذکور کے نام بیع کردیا۔

(۳) اناریپ ینکنا ساہو سے جنگم اڑوپا پٹہ دار نے خانگی ضروریات کے لئے ۱۳۳۷ف میں یک صدر روپیہ بشرح سود ڈیڑھ روپیہ فیصد ماہانہ حاصل کیا اور ۱۳۴۷ف تک سالانہ ۱۰ روپیہ ادا کرتا رہا ساہو کے حساب سے ۱۳۴۷ف میں ۳۰۰ روپیہ پٹہ دار کے ذمہ باقی رہے۔ پٹہ دار نادار تھا اس لئے اُس نے ساہو کی خواہش کے مطابق اپنی ۳ ایکر ۳ گنٹہ اراضی ساہو کو بعوض ادائی قرضہ فروخت کردی اب پٹہ دار مذکور کے پاس کوئی اراضی نہیں ہے۔

(۴) جنگم اتما کو نے کرنم بچیا ساہو سے ۵۰ روپیہ ۱۳۳۲ف میں حاصل کئے۔ شرح سود ڈیڑھ روپیہ روپیہ فیصد ماہانہ قرار پائی۔ ۱۳۴۷ف تک مقروض نے رقم ادا نہیں کی۔ اس لئے سود در سود لگانے کے بعد اس کے ذمہ میں ۳۵۰ روپیہ باقی نکلے۔ لیکن پنچوں نے ۱۲۵ روپیہ پر تصفیہ کیا۔ پٹہ دار مذکور کے پاس ان روپیوں کی ادائی کی کوئی صورت نہیں تھی اس لئے اُس نے اپنی ایک ایکر اراضی دوسرے ساہو کو ۲۰۰ روپیہ میں فروخت کرکے ۱۲۵ روپیہ کرنم بچیا ساہو کو دیئے۔

(۵) مرپلی بالیا پٹہ دار اپنی اراضی کے محاصل مبلغ (۱۳) روپیہ بنگیا ساہو سے قرض لیکر ادا کرتا رہا ۱۳۴۷ف میں ادائی قرضہ کے عوض ساہو مذکور کے نام اپنی اراضی جس کا رقبہ ۸ ایکر ۲۹ گنٹہ ہے بیع کردی۔

بعوض ادائی قرضہ جو زمینات گزشتہ سات سال کے عرصہ میں رہن کی گئی ہیں اُن کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

(۱) یلمانے ۱۳۴۷ف میں اپنی ۲ ایکر اراضی سوملو سوم رڈی کے پاس پانچ سال کے لئے رہن رکھا کر ۱۴۵ روپیہ بغرض بیاہ حاصل کئے۔ مالگزاری کی ادائی یلما کے ذمہ ہے۔

(۲) ۱۳۴۱ف میں پرماکا دلکیانے اپنی شادی کے لئے مبلغ ۷۰ روپیہ حاصل کئے اور اپنی چار ایکر اراضی ساہوکار کے نام دس سال کے لئے بطریق رہن لکھوا دی۔ محاصل مالگزاری کی ادائی مقروض کے ذمہ ہے۔ زمین اتنی زرخیز ہے کہ ایک ہی سال میں ساہوکار کو اپنی رقم حاصل ہوگئی۔

(۳) ۱۳۴۴ف میں سوملو ونیکٹ رڈی کے پاس دیوناگا نے ۲ ایکر اراضی رہن رکھائی ہے۔

(۴) یبنکانے بغرض ادائی قرض ہمنت گاری اننت ریڈی کے پاس ایک یکر زمین اور اسی طرح ایک اور کسان نے پون یکر زمین رہن کردی ہے۔

(۵) اننتا پٹہ دار نے ۱۳۴۳ف میں بیارب بیکنا ساہو سے ۱۴۵ روپیہ بشرح سود ڈیڑھ روپیہ فیصد ماہانہ بغرض خریدئی مویشی حاصل کئے۔ ۱۳۴۷ف تک پٹہ دار سالانہ برابر ۲۵ روپیہ ادا کرتا رہا۔ ۱۳۴۸ف میں جب حساب کیا گیا تو پٹہ دار کے ذمہ ۵۰۰ روپیہ واجب الوصول ٹھہرے۔ پٹہ دار نے مجبوراً ۲ ایکر ۲ اگنٹہ اراضی ساہو مذکور کے نام، سال کے لئے رہن کردی۔ محاصل کی ادائی تخم ریزی اور ناگرکشی وغیرہ کے اخراجات بھی پٹہ دار کے ذمہ قرار پائے۔

اس طرح گزشتہ سات سال کے عرصہ میں مقروضیت کے باعث ۱۶ ایکر ۲ اگنٹہ اراضی ساہوکاروں کے ہاں رہن رکھائی گئی ہے۔

پیداوار اور غیر پیداوار قرضے

۹۵ فیصد کاشت کار ایسے ہیں جنہوں نے شادی بیاہ مکان بنانے اور خانگی ضروریات کے لئے قرضہ لیا ہے۔ زرعی کاروبار میں بالخصوص مویشیوں کی خریدی اور لاگوڑ کے لئے قرضہ لیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا صحیح ہے کہ مزارعین کے قرضوں کی ایک قابل لحاظ مقدار غیر پیداوار رہے۔ مزدوروں کا تقریباً تمام تر قرضہ شادی۔ بیاہ اور دیگر ضروریات زندگی کے لئے لیا گیا ہے اس لئے وہ بھی غیر پیداوار ہے۔

قرضداری کے اسباب

زرعی مقروضیت کی تشریح کے سلسلہ میں ہم نے دیکھا کہ مزارعین ساہوکار کے آہنی پنجہ میں بُری طرح گرفتار ہیں۔ یوں تو عام طور پر مقروضیت کے جو اسباب ہیں وہ یہاں بھی کام کر رہے ہیں۔ لیکن ان کی مقروضیت کے بعض مقامی اسباب کی طرف توجہ دلانا غیر ضروری نہ ہوگا۔

(۱) سب سے اہم مقامی سبب مہاجنی لین دین کا طریقہ ہے۔ متعدد مثالوں میں ہم نے دیکھا کہ لین دین کے پیچیدہ اور گوناگوں طریقوں کے سبب جب کسان ایک دفعہ ساہوکار کے چنگل میں پھنس جاتا ہے، تو اس سے رہائی پانا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ سودی لین دین کے یہ طریقے ساہوکار کی چالاکی اور کسان کے

بھولے پن کی عمدہ مثالیں ہیں۔

(۲) کسانوں کی یہ ذہنیت کہ عدالت میں ان پر قرض کا دعویٰ کرنے سے اُن کی خاندانی شرافت میں بٹہ لگتا ہے قرض کے اس گراں بوجھ کی بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔

(۳) ثالثی (پنچ) کے فیصلوں کی وجہ سے یقیناً فریقین کا روپیہ مقدمہ بازی میں رائگاں نہیں جاتا لیکن ثالثی کے فیصلہ سے ساہوکار مزے میں رہتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اُس کو مقدمہ بازی کی زحمت اٹھانی نہیں پڑتی اور دوسرے ثالثی کے ذریعہ وہ اپنے حسب مرضی فیصلہ کراتا ہے۔

مزارعین کا اپنی ضروریات کے لئے قرض لینا کوئی نئی اور عجیب بات نہیں ہے۔ لیکن انہی مقامی اسباب کے باعث قرض کے بار میں ناقابل برداشت اضافہ ہو جاتا ہے۔

تقسیم و انتشار اراضی، ناقص ذرائع آبپاشی، قلت کھاد، اور قدیم آلات غیر اصلاح یافتہ تخم کا استعمال ان تمام اُمور کی وجہ سے کسان کو خاطر خواہ قیمت نہیں ملتی ہے۔ اس لئے اگر وہ قرض نہ لے تو زندہ رہنا مشکل ہے اور قرض لے تو زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔

ع

نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن

صنعت و حرفت زراعت کے بعد دوسرا پیشہ صنعت و حرفت ہے۔ یہاں قدیم زمانہ سے کوئی خاص صنعت موجود نہیں ہے۔ بلکہ صنعتوں کی نوعیت گھریلو اور دیہی ہے۔

۲۲ افراد یا ۶ خاندان پارچہ بافی میں مشغول ہیں۔ ان کا طریق پیدایش نہایت سیدھا سادہ ہے۔ وقارآباد اور سداسیو پیٹھ سے تاگا خریدتے ہیں اور اپنے کرگھے کے ذریعہ مختلف قسم کے کپڑے بنتے ہیں۔ اور مقامی طور پر خود ہی فروخت کرتے ہیں۔

دھنگروں کی تعداد ۲۸ ہے جو ۸ خاندانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بعض ذیلی طور پر زراعت بھی کرتے ہیں۔ لیکن تقریباً تمام دھنگروں کا اہم پیشہ بکریاں چرانا اور کمبل بننا ہے۔ ایک دھنگر اوسطاً ایک سال میں ۵ کمبل بنتا ہے۔ ایک کمبل کی قیمت موضع میں تقریباً ساڑھے تین روپیہ ہوتی ہے۔ کھیتوں میں مندہ بٹھا کر بھی یہ لوگ اپنی آمدنی میں اضافہ کرتے ہیں۔ موضع میں دو خاندان لوہار اور

دو خاندان نجار ہیں ان کے طریقہ پیدائش کا تذکرہ اس سے پہلے آچکا ہے ان کے علاوہ تین خاندان ظروف گلی سازی اور ۵ اشخاص چاری کا کام کرتے ہیں۔ ۱۱ خاندان قصاب ہیں۔ یہ اطراف واکناف کے مواضعات کے مویشیوں کو خریدتے ہیں اور ان کے گوشت کو دیگر مواضعات میں فروخت کرتے ہیں۔

متفرق پیشے ۱۲ اشخاص ملازم ہیں جن میں سے دو اشخاص مدرس ہیں۔ دو اشخاص دھوبی ہیں اور ۹ افراد تجارت پیشہ ہیں۔ ۲ اشخاص گداگر ہیں۔ ان اشخاص میں سے بھی جو مختلف پیشوں میں مشغول ہیں بعضوں کے پاس تھوڑی بہت زمین موجود ہے بالفاظ دیگر یہ لوگ بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ زراعت سے تعلق ضرور رکھتے ہیں۔

گزشتہ صفحات میں موضع کی معاشی حالت کا جو تجزیہ کیا گیا ہے اگر اس پر ایک نظر باز پسیں ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اہل دیہہ کی ایک عظیم اکثریت فلاکت و افلاس کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ان کا معیار زندگی نہایت ادنیٰ ہے۔ جہالت اور افلاس نے ان کی جان پر بنادی ہے۔ دن رات اپنا خون پانی ایک کرنے کے باوجود بھی وہ اطمینان کی زندگی بسر کرنے سے محروم ہیں۔ ایک ترکی شاعر نے ہمارے دیہات اور اس کے بسنے والوں کی حسب ذیل الفاظ میں کتنی اچھی تصویر کھینچی ہے وہ[۵] کہتا ہے "لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے مشرق میں کیا دیکھا۔ میں کیا بتاؤں کہ کیا دیکھا۔ میں نے اس سرے سے اُس سرے تک ویران بستیاں۔ ٹوٹے پھوٹے پُل۔ بند نہریں۔ سنسان سڑکیں دیکھیں۔ میں نے جھریاں پڑے ہوئے چہرے جھکی ہوئی کمریں۔ خالی دماغ۔ بے حس دل۔ اُلٹی عقلیں دیکھیں"۔

"میں نے ظلم۔ غلامی۔ پستہ حالی۔ ریاکاری۔ قابل نفرت برائیاں۔ طرح طرح کی بیماریاں۔ جلے ہوئے جنگل۔ ٹھنڈے چولھے۔ بنجر کھیت۔ میلی صورتیں۔ نکمّے ہاتھ پاؤں دیکھے۔ میں نے بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا۔ دن دیکھے جن کا کوئی مقصد نہیں۔ راتیں دیکھیں جن کی کوئی صبح نہیں"۔

۵۔ اقتباس "ترکی میں مشرق اور مغرب کی کشمکش" مصنفہ خالدہ ادیب خانم۔

اصلاحی تجاویز

عام تدابیر موضع کی معاشی پستی کا انسداد ایک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ مزارعین کے طریقہ پیدائش مختلف پہلوؤں کے متعلق مخصوص تدابیر پیش کرنے سے قبل مناسب معلوم ہے کہ دیہی اصلاح کی دو نہایت اہم اور بنیادی تدابیر کا تذکرہ کر دیا جائے۔

ہم کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ تعلیم کی عام اشاعت کے بغیر دیہی تنظیم کی کوئی تحریک کامیا نہیں ہو سکتی۔ تقسیم و انتشار اراضی کے نقصانات کھاد کی قلت قدیم آلات کا رواج ادنی قسم کے ت استعمال ناکافی ذرایع آبپاشی۔ فروخت پیداوار کے ناقص طریقے قرضہ کا بوجھ الغرض ان تمام امور کا ایک اور مشترکہ سبب علاوہ اور اسباب کے کسان کی جہالت اور نادانی ہے۔ ان تمام نقائص کو دور کرنے کے سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ کسان اُن کے نقصانات کا صحیح احساس کر سکیں۔ اور ان کا بوجھ اتنی پختہ ہو کہ جو اصلاحی تجاویز ان کے سامنے پیش کی جاتی ہیں اُن پر وہ پورے طور سے کر سکیں۔ غرض دیہی اٹھان کے سلسلہ میں تعلیم کی عام اشاعت پر جس قدر زور دیا جائے کم ہے زیر بحث میں اس وقت دو پاٹھ شالے موجود ہیں۔ جس میں ۲۰ لڑکے زیر تعلیم ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا کہ اہل دیہہ کا تعلیم کی طرف رجحان ہے۔ اگر تعلیم کا باضابطہ انتظام ہو تو بہت جلد ان کی تعلیمی حالت بد جائے گی۔ اس وقت بھی موضع کی آبادی کا ایک معقول حصہ جبری تعلیم کی اشاعت کا خیر مقدم کرنے کے تیار ہے۔ کیا اچھا ہو اگر جبری تعلیم کا مسودہ بہت جلد قانونی صورت اختیار کر لے۔ موجودہ صورت میں حکومت کے لئے موضع ہذا میں تعلیم کی اشاعت کا انتظام کرنا دشوار نہیں ہے۔ اس موضع سے سرکار سالانہ مبلغ ۹۲۵۵ روپیہ چار آنہ رقم مالگزاری وصول ہوتی ہے۔ اگر حکومت اس کثیر رقم کا ایک معمو موجودہ پاٹھ شالوں کی امداد اور اُن کی تنظیم کے لئے صرف کرے تو یہ مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے گا ہی ساتھ مدرسۂ شبینہ کا انتظام بھی کچھ دشوار نہیں ہے۔

تعلیم کی عام اشاعت کے علاوہ ایک اور چیز بھی دیہی اصلاح کے لئے ضروری ہے اور وہ موضع میں دیہی اصلاح کا مستقل پروپگنڈہ ہے اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جبکہ چند قابل ہمدرد اور محب وطن افراد موضع میں مستقل طور پر یا کم از کم ایک کافی مدت کے لئے بس جائیں۔ ہندوستان اور حیدرآباد میں تنظیم دیہی کی سست رفتاری کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وقتاً فوقتاً نمایشی طور پر مواضعات میں دیہی اصلاح کا پروپگنڈا کر دیا جاتا ہے اور بس۔ جب کبھی دیہات میں تنظیم دیہی کا پروپگنڈہ کیا جاتا ہے تو اہل دیہہ اپنے اور ان نام نہاد مصلحین میں ایک قسم کی مغائرت پاتے ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان "اصلاحات" کو زبردستی اُن کے گلے منڈھا جا رہا ہے لیکن جب وہ اپنے ہی میں سے کسی کو دیہی اصلاح کی تدابیر بتاتے اور اُن پر عمل کرتے دیکھیں گے تو وہ یہ محسوس کریں گے کہ اُس کا اور اُن کا مفاد الگ الگ نہیں ہے۔ جس قدر یہ احساس مغائرت کم ہوگا اسی قدر ان تدابیر کی کامیابی کا یقین ہوگا۔ اور اُسی مناسبت سے وہ اُن پر عمل پیرا بھی ہونگے اگر کسانوں کی فلاح و بہبود ہمارے مدنظر ہے تو یہ چیز ہم کو ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ دیہی اصلاح کے بلند آہنگ دعووں سے ہاتھ اُٹھا کر شہروں کی مصنوعی دلچسپی سے منہ موڑنا اور شہری زندگی کے بلند معیار سے کسانوں کی پست سطح زندگی پر اتر آنا پڑے گا۔ اگر کچھ نوجوان ایثار پیشہ اس خدمت کے لئے تیار ہو جائیں۔ تو جو کام آج صدیوں میں بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا وہ مہینوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے ایسے ہمدرد تعلیم یافتہ نوجوان اہل دیہہ کی قیادت کریں گے۔ پہلے تو وہ خود اُن کے لئے نمونہ بنیں گے۔ پھر اپنے اثرات سے کام لے کر انہیں مفید اصلاحی تدابیر پر عمل کرائیں گے۔ جب تک اہل دیہہ کو ایسے مخلص قائد اور رہنما دستیاب نہ ہوں گے دیہی اٹھان کا خیال ایک خواب ہے۔ جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا

مخصوص تدابیر

ان دو امور کے ساتھ ساتھ اہل دیہہ کی معاشی حالت کے مختلف پہلوؤں کو سدھارنے کی اگر مندرجہ ذیل تدابیر پر عمل کیا جائے تو اس موضع کی معاشی حالت درست ہو سکتی ہے۔

(۱) سب سے پہلی تدبیر یہ ہونی چاہئے کہ زراعت کے سوائے دیگر پیشوں کی طرف اہل موضع کی توجہ منعطف کرائی جائے ہم نے بیان کیا ہے کہ اہل دیہہ کی ۳۰۰۵ فیصد آبادی کا واحد ذریعہ معاش زراعت ہے

زراعت میں اس قدر زیادہ آبادی کا مشغول رہنا مفید نہیں ہے۔ موضع میں اور پیشے بھی رائج کئے جا سکتے ہیں۔ جن کو اختیار کر کے موضع کی اچھی خاصی آبادی آرام کے ساتھ زندگی بسر کر سکتی ہے۔ افزائش نسل مویشی کا پیشہ بحالات موجودہ بہت سارے افراد کے لئے روزی بہم پہنچانے کا اچھا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ دیگر گھریلو صنعتوں میں مرغبانی اور ڈیری فارمنگ کے کاروبار بھی کامیابی کے ساتھ انجام دیے جا سکتے ہیں۔ موضع بلدہ سے قریب ہے وقارآباد اور شنکرپلی کے بازاات قربت میں ہیں۔ پھر ایک چھوٹا ڈو اسٹیشن موجود ہیں۔ اس لئے اس قسم کے کاروبار کی کامیابی تقریباً یقینی ہے۔

(۲) تقسیم انتشار اراضی سے متعلق تدابیر —— اولاً کسانوں کو تقسیم وانتشار اراضی کے نقائص سے واقف کرانا ضروری ہے پھر ان کو " اتصال اراضیات " پر رضامند کرنا چاہئے۔ اراضی کا جبری انحصال اور حکومت کی جانب سے اُن کی تنظیم جدید سے خوف ہے کہ کہیں اہل دیہہ کا ایک بڑا گروہ بے روزگار نہ ہو جائے۔ اور پھر اراضی کی جدید تنظیم کو برقرار رکھنے کے لئے قانوناً اراضیات کو ناقابل تقسیم بنانا پڑیگا اس قسم کے قانون کو اہل دیہہ اپنے مذہبی حقوق میں مداخلت خیال کریں گے اور رائے عامہ مخالفت کریگی۔ اس کے علاوہ اس قسم کے قانون سے ساہوکار کے پاس کاشت کار کا اعتبار گھٹ جائے گا اور حصول قرضہ میں اس کو مختلف دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ صورت حال خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ مزارعین کی مالی مدد کے لئے موضع میں نہ انجمن امداد باہمی قائم ہے اور نہ "بنک رہن اراضیات" کا قیام ہی عمل میں آیا ہے، موضع کے لئے غیر مفید ہے اس لئے جو تدبیر موجودہ حالت میں قابل عمل نظر آتی ہے وہ یہی ہے کہ " انجمن ہائے اتصال اراضیات " کے ذریعہ جس طرح پنجاب اور صوبہ متوسط میں اس خرابی کو رفع کرنے کی ایک حد تک کامیاب کوشش کی گئی ہے یہاں بھی اس مضرت کو گھٹایا جائے۔ حکومت صوبہ متوسط اور پنجاب کی مانند قوانین اتصال اراضیات نافذ کرے تاکہ کسانوں کی باہمی رضامندی سے اس خرابی کو دور کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ مشترکہ کاشت کی طرف بھی ان کو توجہ دلانی چاہئے یعنی جن کاشت کاروں کی اراضی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہے وہ بجائے علیحدہ علیحدہ کاشت کرنے کے مل کر کاشت کریں سرکار عالی نے حال ہی میں انتقال جائداد اور قرضہ دہندگاں کے متعلق قوانین نافذ کئے ہیں توقع ہے کہ

ان قوانین سے یہاں کے مزارعین کو بھی فائدہ پہنچے گا اور انکی زمینات ساہوکاروں کے ہاتھوں میں جانے سے محفوظ رہیں گی۔

(۲) آبپاشی سے متعلق تدابیر — موضع کی آبپاشی کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ زمین گو زرخیز ہے لیکن ذرایع آبپاشی ناکافی ہونے کے باعث اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جارہا ہے۔ موضع کو نالے کے گہرا ہو جانے سے نقصان ہو رہا ہے۔ اب بھی نالے کے پانی سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اگر پختہ کتوے بنا کر پانی کو روکا جائے۔ ظاہر ہے کہ موضع کے مزارعین کی مالی حالت اس قابل نہیں ہے کہ وہ اپنے صرفہ سے اس کام کو انجام دیسکیں۔ اگر حکومت اس کام کو اپنے ذمہ لے تو نہ صرف رعایا و بلکہ خود اس کا بھی فائدہ ہے۔ نالے سے استفادہ نہ کرنے کی وجہ سے حکومت نے ۱۳۲۵ف سے ۱۶۱۸ روپیہ چار آنہ کی معافی دی ہے۔ گویا ۱۲ سال کے عرصہ میں حکومت کو ۲۱۷۶۵ روپیہ کا نقصان ہوا۔ اگر پختہ کتوے بنادیے جاتے تو نہ صرف رعایاو کا فائدہ ہوتا بلکہ حکومت کو بھی اس قدر نقصان اٹھانا نہ پڑتا۔ اگر اب بھی حکومت پختہ کتوے بنادے تو ایک طرف اہل موضع کو اپنی زرخیز زمینات سے عمدہ پیداوار اگانے کا موقع ملیگا اور دوسری طرف حکومت مالگزاری میں اضافہ کرکے اپنی آمدنی بڑھا سکتی ہے۔

موضع کا دوسرا ذریعۂ آبپاشی باؤلیاں ہیں۔ لیکن اُن کی تعداد ناکافی ہے۔ باؤلیوں کے بنانے میں چند دقتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ پانی بہت گہرائی میں دستیاب ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔ مزارعین کا بیان ہے کہ ایک کنوئیں کے کھدوانے سے اخراجات ۲۵۰ روپیہ ہوتے ہیں۔ کسانوں کی مالی حالت اس قابل نہیں ہے کہ وہ اپنے منتشر اور منقسم کھیتوں میں اس قدر کثیر مصارف برداشت کرکے کوئیں کھدوائیں۔ اس سلسلہ میں مناسب تدبیر یہ ہے کہ موضع میں حکومت کی جانب سے تقاوی تقسیم کئے جائیں۔ ایک اور تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ ایسے کاشت کار جنکی چھوٹی چھوٹی زمینات ایک دوسرے سے ملحق ہیں وہ باہمی رضامندی سے مالی اشتراک کریں اور کنوئیں کھدوائیں۔ اس ضمن میں "انجمن امداد باہمی برائے کندیدگی چاہ" کے قیام سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔

(۳) مویشیوں سے متعلق تدابیر — مویشیوں سے متعلق دو اہم مسائل ہیں۔ ایک تو چارہ کا انتظام

دوسرے نسل کشی۔ موضع میں جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ فی الحقیقت کوئی گائران نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ سرکاری کنچہ کو گائران کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دیدیجائے۔ مویشیوں کو جس طریقہ سے چارہ ڈالا جاتا ہے اس سے چارہ کی کافی مقدار ضائع ہوتی ہے۔ چارہ کو کتر کرڈالنے سے قلت چارہ کی ایک حد تک تلافی ہوسکتی ہے۔ کسانوں کو سبز چارہ کی فصلیں اگانے کی طرف توجہ دلائی جائے اور ان فصلوں پر محصول آبپاشی معاف کردیا جائے۔ چارہ کو محفوظ کرنے کے لئے سلج کا طریقہ رائج کیا جائے۔ روغنی تخم سے تیل نکالنے کے معاوضہ میں کھلی کو بطور اجرت دیدینے کا طریقہ مناسب نہیں ہے۔ اجرت نقد ادا کیجائے اور کھلی مویشیوں کو کھلائی جائے۔

افزائش نسل مویشی کی موضع میں ضرورت ہے اس کام کو چند افراد بطور مستقل پیشہ کے انجام دے کر موضع کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرسکتے ہیں۔

مویشیوں کی بیماری کے علاج کا مسئلہ اگرچہ اہم نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کی طرف توجہ کرنی ضروری ہے۔ گو مویشی کم مرتے ہیں لیکن پھر بھی ان کے امراض کا معقول علاج کوئی نہیں جانتا۔ کاشتکاروں کو ان امراض کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچائی جائے۔ محکمۂ علاج حیوانات کی جانب سے دورہ کنندہ ڈاکٹروں کی توجہ اس موضع کی طرف مبذول کرانی چاہیئے

(۴) قلت کھاد کی تلافی:۔ مضمون کے حصۂ اول میں وضاحت کے ساتھ یہ بتلایا گیا ہے کہ موضع ہذا میں کھاد کی بہت قلت ہے۔ گوبر کی کافی مقدار جلائی جاتی ہے لیکن کسان کو اس کے جلانے سے روکا نہیں جاسکتا کیونکہ اگر کسان اوپلیوں کے بجائے لکڑیوں کو بطور ایندھن استعمال کرے تو زیادہ مصارف لاحق ہوتے ہیں موضع کے قرب و جوار میں لکڑی دستیاب نہیں ہوتی ہے۔ ایک خاندان جو ۷ افراد پر مشتمل ہو۔ سالانہ ۳ بنڈی لکڑی جلاتا ہے۔ اگر باہر سے لکڑی منگائی جائے تو ایک بنڈی لکڑی کی قیمت ۴ روپیہ ہوتی ہے۔ اس طرح ایک خاندان کو ۱۲ روپیہ صرف کرنے پڑیں گے۔ یہی خاندان سالانہ پانچ بنڈی گوبر جلاتا ہے۔ ایک بنڈی گوبر کی قیمت ۱۲ آنہ ہے اور بعض صورتوں میں ایک بنڈی گوبر کی قیمت ایک روپیہ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے کسان ۳ روپیہ ۱۲ یا زیادہ سے زیادہ ۵ روپیہ کا گوبر جلاتا ہے۔ لہذا ان

کو گوبر جلانے سے احتراز کرنے کا مشورہ دینا درست نہیں۔قلت کھاد کی تلافی بڑی حد تک انسانی فضلے کو بطور کھاد استعمال کرنے سے ہوسکتی ہے۔اس کھاد کو جمع کرنے کا معقول انتظام کیا جائے اس کے علاوہ مویشیوں کے پیشاب کو جو رائیگاں جاتا ہے بطور کھاد استعمال کیا جا سکتا ہے ہڈی کی کھاد کا بھی موضع میں آسانی سے انتظام ہوسکتا ہے۔موضع میں مویشی کے کاٹنے کے بعد اس کی ہڈی ادھر اُدھر پھینک دی جاتی ہے۔اس ہڈی کو کھاد کے طور پر اپنے کھیتوں میں استعمال کر سکتے ہیں۔

(۵) فروخت پیداوار کے ناقص طریقوں کا سدباب:۔ فروخت پیداوار کی اصلاح کے لئے اولاً کسانوں کو ساہوکار کے آہنی پنجے سے نکالنا ضروری ہے۔اس لئے کہ قرض کے بار سے دب کر کسان اپنی پیداوار ساہوکار کے ہاتھ کم قیمت پر فروخت کر دیتا ہے۔جو تدابیر زرعی مقروضیت کے انسداد کے متعلق بیان کی جائیں گی۔ وہ بھی ایک لحاظ سے فروخت پیداوار کے اس ناقص طریقہ کا سدباب کریں گی۔

اوزان و پیمانہ جات میں یکسانیت پیدا کرنے سے فروخت پیداوار کی بڑی حد تک اصلاح ہوسکتی ہے۔

(۶) زرعی مقروضیت کا ارتفاع:۔ قرضہ کے بار کو ہلکا کرنے کے لئے کسانوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ غیر پیداوار کاروبار مثلاً شادی۔بیاہ۔رسومات کی پابندی وغیرہ میں زیادہ رقم صرف نہ کریں۔موضع زیر بحث میں ایک متوسط خاندان میں شادی کے اخراجات تقریباً ۵۰۰ روپیہ ہیں۔اور ادنیٰ خاندانوں میں ۲۰۰ روپیہ سے کم نہیں۔موضع کی معاشی پستی کے مدنظر یقیناً یہ اخراجات بہت زیادہ ہیں۔اس لئے اہل موضع کو ان اخراجات میں کمی کرنے کی طرف توجہ دلانی چاہئے۔

مہاجنی لین دین کا جو طریقہ موضع میں مروج ہے، اُس کا انسداد نہایت ضروری ہے۔"آسامی کھاتہ" کے طریقہ کو مسدود کر دیا جائے قانوناً شرح سود مقرر کر دی جائے۔ساہوکار جن پیچیدہ طریقوں سے رقم وصول کرتے ہیں اُس کو خلاف قانون قرار دیا جائے۔قرضوں کے تصفیہ کے لئے ثالثی کا جو طریقہ مروج ہے اُس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ثالثی جماعت (پنچ) میں ساہوکارانہ ادر سرمایہ دارانہ عنصر کی جو اس وقت زیادہ نظر آتا ہے، قانوناً تحدید کی جائے۔

موضع کے بعض افراد کی جانب سے انجمن امداد باہمی کے قیام کی کوشش بھی کی گئی لیکن محکمۂ

انجمن امداد باہمی نے نہ معلوم کیوں یہاں اپنی شاخ کھولنے سے انکار کیا۔ موضع کے بعض افراد کے اِس رجحان کو دیکھتے ہوئے انجمن امداد باہمی کی کامیابی پر شبہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ ضرورت ہے کہ موضع میں جلد سے جلد انجمن امداد باہمی کی ایک شاخ کھول دی جائے۔ حکومت کی جانب سے قلیل مدت کے لئے قرضہ دیے جانے کے انتظامات کئے جائیں۔ اِس مقصد کی تکمیل کے لئے "بنک رہن اراضیات" کا قیام جس قدر جلد عمل میں آسکے مناسب ہے۔

گزشتہ قرضوں کی بے باقی کے لئے مناسب ہے کہ حکومت ایک ثالثی جماعت مقرر کرے جو ان قرضوں کا مناسب تصفیہ کردے۔

الغرض اِن امور کی بجاآوری موضع کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ضروری ہے۔ فقط

احمد خاں۔ بی۔ اے (عثمانیہ)

سالانہ روئداد انجمن اتحاد طلباء

جامعہ عثمانیہ

بابتہ ۱۳۴۶-۴۷ف

جو جلسۂ کرسی نشینی میں سنائی گئی

بحمد اللہ ہم آج اس قابل ہوئے ہیں کہ اپنی سالانہ روئداد من وعن آپ کی خدمت میں پیش کریں اور اس انگریزی مثل کے بموجب اطمینان سے کہہ سکیں۔ (my account is clear before God and man) انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ طلباء برادری کا وہ مقدس ادارہ ہے، جو ان کی اجتماعی اخلاقی عملی اور علمی زندگی کو استوار کرتا، اور ان کی مناسب نمائندگی سے طلباء میں ارتباط اور اختلاط پیدا کرتا ہے۔ اس مسلک کے ساتھ ہم نے ۷ مہر ۱۳۴۷ف کو جائزہ حاصل کیا۔

ذمہ داریوں کے احساس اور سنگ راہ ہونے والی دشواریوں کے ہجوم میں جمہوریت کی برکات راستہ کو اور تاریک بناتی ہیں۔ لیکن ارادہ کی قوت دشتِ امکان کو بھی ایک نقش پا کے

برابر کردیتی ہے۔ یہی اطمینان قلب ہمارے لئے کافی ہے کہ ہم نے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور ہمارا انعام یہی ہے۔ یقیناً ہم اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوتے اگر برادران جامعہ کا خلوص، اعتماد، اور اشتراک ہمارے شامل حال نہ ہوتا۔

مباحثے ۔ حضرات انجمن اتحاد کا بنیادی مقصد طلباء میں مجلہ کے ذریعہ تحریری اور پلیٹ فارم کے ذریعہ تقریری ذوق پیدا کرنا ہے۔ ہمارے نزدیک اشیاء کی قدر کا صحیح اندازہ اُن کی گنتی سے نہیں بلکہ ان کے وزن سے کیا جاتا ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر ہم نے مباحثوں کی تعداد پر نہیں ان کی نوعیت پر زور دیا۔ اس سے قبل جلسوں کی تعداد ممکن ہے زیادہ ہوتی ہو لیکن شرکاء جلسہ کی افسوسناک حد تک کمی ایک دل سوز حقیقت تھی۔ لہذا سال گزشتہ معتمد صاحب کی مساعی اور ہمارے ہر دل عزیز ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب کی انجمن میں گہری دلچسپی اور بیش قیمت امداد سے انجمن کے مباحثوں کے اوقات میں تبدیلی عمل میں آئی اور بجائے ۲½ ساعت دن کے انجمن کا وقت ½۱۲ سے ۲ ساعت تک کردیا گیا۔

ہم جناب نائب معین امیر جامعہ کا خلوص دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس تبدیلی سے انہوں نے انجمن پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔ بلا خوف و تردید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے مباحثے شرکاء کی شرکت اور علمی دلچسپی کے لحاظ سے جتنے کامیاب ہوئے شائد ہی کسی سال ہوئے ہوں۔ اس سال معمولی جلسے دس اور غیر معمولی جلسے گیارہ منعقد ہوئے۔

اسی طرح بشمول جلسہ ہائے کاروباری جلسوں کی مجموعی تعداد (۲۸) رہی۔

حسب روایات انجمن اس سال تقاریر کا ایک نظام العمل تیار کیا گیا تھا۔ جس میں طلباء اور اساتذہ صاحبان نے ہر ایک میں حصہ لیا۔ ہم سب سے پہلے جناب والا کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے آپ نے انجمن کی طرف اس قدر توجہ کی۔ ہم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب جناب وہاج الدین صاحب شمیم، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پروفیسر ھارڈنگ پروفیسر کرشنن اور مسٹر سیاشین کے بھی ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ ہمارے ساتھ اشتراک عمل کیا۔

اور یہ ثابت کر دیا کہ پروفیسر ابتدءً طالب علم تھا اور آئندہ بھی طالب علم رہیگا۔ ان کے علاوہ ہم پروفیسر حسین علی خاں صاحب ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی پروفیسر مظہر الدین صاحب قریشی پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی پروفیسر حسام الدین صاحب فاضل پروفیسر صلاح الدین صاحب پروفیسر سراج الدین صاحب اور پروفیسر حسن علی مرزا صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے جلسوں میں شرکت فرمائی ہم جناب محمد تراب علی خاں صاحب کے بے حد ممنون ہیں کہ انھوں نے اکثر جلسوں کی صدارت کی۔ اس تبدیلی وقت کے سبب طلباء اور اساتذہ میں زیادہ اشتراک کا موقع بھی حاصل ہوا ہے۔ جو جامعہ کی اتحادی اور برادرانہ زندگی کو مضبوط کرنے کا نہایت مستحکم ذریعہ ہے۔

بیرونی مسابقت سال گذشتہ انجمن کی دو اُردو مباحثی جماعتوں نے سالار جنگ فی البدیہ تقریری مقابلہ میں جامعہ کی نمائندگی کی یہ جماعتیں احمد خاں صاحب محی الدین صاحب غازی اور تراب علی خاں صاحب و مختار الدین صاحب پر مشتمل تھیں۔ احمد خاں صاحب نے اپنے اول آنے کی روایت کو پھر دھرایا اور محی الدین صاحب غازی نے انعام دوم حاصل کیا۔ اس طرح یہ جماعت مجموعی اعتبار سے سالار جنگ کاسہ گرداں کی مستحق قرار پائی۔

مباحثی سیاحت مادر علمیہ کے نام کو روشن اور بلند کرنے کے لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ طلباء جامعہ کے ہر جہتی کارناموں سے غیروں کو روشناس کرایا جائے۔ اب تک کھیلوں کی جماعتیں باہر جاتی تھیں اس سال جامعہ کی زندگی میں دوسری بار مباحثی جماعتوں نے کل ہند بین الجامعاتی مقابلوں میں حصہ لیکر جامعہ عثمانیہ سے متعلق اس غلط پروپیگنڈے کا پول کھول دیا جو بیرون حیدر آباد عام طور پر پھیلایا جا چکا ہے۔ چنانچہ مباحثی سیاحت کے لئے اس سال پہلی بار یہ روایت ڈالی گئی کہ موازنہ میں ایک علٰحدہ مستقل فنڈ قائم رہے۔ اردو اور انگریزی کی دو جماعتیں محمد بن عمر صاحب ایم۔ اے سابق صدر انجمن اتحاد کی سرکردگی میں علیگڈھ روانہ کی گئی تھیں جو علی الترتیب محی الدین صاحب غازی۔ محمد عمر مہاجر صاحب۔ محمد بن عمر صاحب اور درویش عالم صاحب پر مشتمل تھیں۔

قابل مبارک باد ہیں ہماری جامعہ کے سپوت کہ اُنہوں نے اردو مقابلہ میں ہندوستان کی

دوسری جامعات کو نیچا دکھایا۔ محی الدین صاحب غازی نے انعام اول اور محمد عمر مہاجر صاحب نے انعام خصوصی اور عثمانی جماعت نے ٹرو فی حاصل کی۔ اس سلسلہ میں فرض ناشناسی ہوگی اگر محمد بن عمر صاحب کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے۔

غیر معمولی جلسے

اس سال ہمارے کل (۱۱) غیر معمولی جلسے ہوئے۔ برار کے وفد کو جو ہندوستان کی مشہور شخصیتوں پر مشتمل تھا جامعہ مدعو کیا گیا تاکہ حیدر آباد و برار کے باشندوں کے مابین، جو ایک بادشاہ کی رعایا ہیں، تعلقات مستحکم کئے جائیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کی ایک جماعت سے بھی، جو ہماری مہمان تھی، ایک مباحثہ منعقد کیا گیا تھا جس میں امیر جامعہ رائیٹ انریبل سر اکبر حیدری کی طرف سے اول آنے والوں کو انعامات عطا کئے گئے ڈھاکہ سے مسٹر مکرجی اور عثمانیہ سے محمد بن عمر صاحب انعامات کے اہل پائے گئے۔ ہم محمد بن عمر صاحب کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

مجلس انتظامی

یہ انجمن کے جملہ شعبوں میں نہایت ذمہ دار شعبہ ہے اس کی داخلی اور خارجی دشواریوں سے وہی واقف ہوتے ہیں جو اس کا تجربہ رکھتے ہیں لیکن ہم نے اتحاد عمل سے ساری مہمیں سرکیں اور مسائل کی طرف فوری توجہ کی مجلس کی کوششوں سے متعلق رپورٹ کے آخری حصہ میں کچھ بیان کرونگا۔

موازنہ

برادران جامعہ انجمن کا موازنہ ایک خار دار مسئلہ ہے لیکن جناب وحید الرحمٰن صاحب خازن اعزازی کی خوش معاملگی فرزانہ دیانت داری اور انہماک کے سبب یہ مسئلہ بہت سلجھا دیا گیا۔ ہم موصوف کا فی الحقیقت پورا پورا شکریہ ادا نہیں کرسکتے۔

گوشوارہ موازنہ

	منظورہ جلسہ عام			رقم صرف شدہ		
	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
شبیہہ مبارک	۵۰۰	.	.			
انتظام دفتر	۱۰۴۵	.	.			
متفرقات	۲۰۰	.	.	۱۸۱	۵	۸

	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
اخبارات وکتب	۶۰۰	۰	۰	۵۹۹	۲	۱۱
مد محفوظ	۴۱	۳	۷	محفوظ ہیں		
مطالبات سابقہ	۹۰	۷	۷	۹۰	۷	۰
اتفاقی	۵۰	۰	۰	۵۰	۰	۰
انعامات	۱۰۰	۰	۰	۱۰۰	۰	۰
تعلیمی تفریح	۲۰۰	۰	۰			
صادر وطباعت	۲۵۰	۰	۰	۲۵۰	۴	۵
کھیل	۲۰۰	۰	۰	۱۹۹	۱۴	۸
مباحثی سیاحت	۳۰۰	۰	۰	۳۰۰	۰	۰
جشن یوم جامعہ	۱۳۰۰	۰	۰	۱۶۸۳	۴	۹
جملہ متوقع آمدنی	۴۸۷۶	۱۰	۷	جملہ خرچ ۴۲۹۲	۶	۱
اصل آمدنی	۴۸۳۰	۱۰	۷			
لہذا حقیقی بچت	۵۲۸	۵	۱۱			

نوٹ:۔ اضافی رقم مبلغ ۳۸۳ روپیہ ۴ آنے ۹ پائی جناب نائب معین امیر جامعہ کے حکم سے مختلف مدات سے لیکر خرچ کی گئی۔

جشن یوم جامعہ

جماعتوں اور کتابوں کی زندگی بہت روکھی پھیکی ہوتی ہے۔ انتخابات کی سرگرمیاں اور جشن یوم جامعہ کی دلچسپیاں ہی طلباء کے لئے سال میں ایک بار چاشنی کا کام دیتی ہیں۔ جشن یوم جامعہ ہی وہ تقریب ہے جس میں طلباء ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے ہیں اور طلباء اور اساتذہ کے اشتراک سے جامعہ میں وہ برادرانہ ماحول پیدا ہوتا ہے جو جامعہ کی ترقی کا ضامن

ہے ہم خشک درسوں کو بھول جائینگے لیکن اظہار مسرت کے یہی وہ نقوش ہوتے ہیں جو زندگی بھر دل سے مٹا نہیں سکتے۔

ڈرامہ حضرات آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ یوم جامعہ باوجود گوناں گوں دقتوں کے ڈیڑھ ہفتہ کے اندر (خدا کے فضل سے) اعلیٰ پیمانہ پر تکمیل پایا۔ خصوصاً ڈرامہ کے لئے وقت کی تنگی بڑی پریشان کن تھی۔ اس سلسلہ میں جناب قادر علی خاں صاحب صدر بزم ڈرامہ۔ محمد افضل صاحب معتمد بزم ڈرامہ اور فیاض الحق صاحب خازن بزم ڈرامہ قابل مبارکباد ہیں۔ ہم غلام طیب صاحب لکچرار اورنگ آباد کالج کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنا ڈرامہ "تریا چرتر" اسٹیج کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

جناب نائب معین امیر جامعہ پروفیسر حسین علی خاں صاحب ہارون خاں شروانی صاحب محمد عبد القادر سروری صاحب عزیز احمد صاحب اور وھاج الدین صاحب نے کامیاب اداکاروں کو انعامات عطا کئے۔ معطیان اور جملہ اداکاروں اور معاونین کی خدمت میں ہم انجمن کی جانب سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

جلسہ موسیقی عبد الرؤف صاحب (عثمانیہ) کی پختہ مشق نغمہ سرائیوں اور منظور احمد صاحب کی نوعمر نغمہ سنجیوں نے اس سال جلسہ موسیقی کی محفل کو بیحد کامیاب بنایا اس کامیابی کا سہرا افضل الدین خاں صاحب معتمد جلسہ موسیقی کے سر ہے۔

مباحثہ جشن جامعہ اس سال حسب معمول بین الجامعاتی مباحثوں کے لئے ہندوستان کی تمام جامعات کو مدعو کیا گیا تھا لیکن ان کی عدم شرکت کے باعث مباحثے منعقد نہیں کئے جاسکے بین الکلیاتی تقریری مقابلوں میں کلیہ ورنگل اورنگ آباد اور بلدہ نے شرکت کی۔ ہم احمد محی الدین صاحب معتمد بین الکلیاتی تقریری مقالہ جات اور سید فتح الدین خاں صاحب معتمد استقبالیہ کمیٹی کے مشکور ہیں کہ انہوں نے مہمانوں کو ممکنہ سہولت بہم پہونچائی۔

اردو تقریری مقابلہ میں کلیہ بلدہ نے مسٹر محبوب علی کاسۂ گرداں حاصل کیا اور انگریزی میں کلیہ ورنگل نے انجمن اتحاد کی طرف سے مقرر کیا ہوا کاسۂ گرداں حاصل کیا۔ واضح ہو کہ اس سال

پہلی مرتبہ بین الکلیاتی انگریزی تقریری مقابلہ منعقد ہوا تھا۔

تحریری مقابلوں میں مجیب اللہ صاحب صدیقی نے انعام اول اور عبدالرشید صاحب قریشی نے انعام دوم حاصل کیا اور انگریزی میں نعیم الدین صاحب صدیقی نے پہلا اور باقر رضا صاحب واسطی دوسرا انعام حاصل کیا۔ اس سلسلہ میں ہم ایس۔ کے۔ سنہا صاحب معتمد انگریزی تحریری مقابلہ اور مظہر الدین صاحب صدیقی معتمد اردو تحریری مقابلہ کی خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

فی البدیہ تقریری مقابلہ اس سال اپنی نوعیت کے اعتبار سے دو جدید فی البدیہ تقریری مقابلے جس میں مختلف معمولی موضوعات قرعہ اندازی کے ذریعہ رکھے گئے تھے منعقد ہوئے۔ اردو میں تراب علی خاں صاحب اور انگریزی میں ای۔ ڈبلیو بٹ صاحب نے انعامات حاصل کئے۔ اُردو کے لئے صدر انجمن نے اور انگریزی کے لئے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے انعامات عطا کئے۔

مشاعرہ یوم جامعہ کی مختلف دلچسپ صحبتوں میں ایک صحبت یہ بھی تھی محمد علی صاحب نیر معتمد مشاعرہ کی مساعی جمیلہ نے مشاعرہ کو بے انتہا کامیاب بنایا۔ قادر حسین صاحب قریشی معتمد بزم آرائش کی حسن کاریوں نے دارالتقاریر کی زیب وزینت کو دوبالا کردیا۔ ہال روشنی سے بقعۂ نور بن گیا تھا۔ بیرونی شعرا میں حضرت احسان بن دانش اور جلیل قدوائی مدعو کئے گئے تھے۔ حضرت امجد حیدرآبادی خلیفہ عبدالحکیم صاحب نواب تراب یار جنگ بہادر سعید وصاج الدین صاحب شمیم اور تابش صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ صمد۔ مخدوم۔ سیکش اور شعیب نے عثمانیہ برادری کی نمائندگی کی اس سلسلہ میں ہم محکمۂ لاسلکی کے ممنون ہیں کہ انھوں نے مشاعرہ کو عوام کی خاطر نشر کیا۔ محمد علی صاحب نیر اور رشید احمد صاحب رشید کی نظمیں اول و دوم انعامات کی مستحق قرار دی گئیں۔

عصرانہ اور ڈنر فہیم الدین صاحب معتمد عصرانہ اور شمس الدین صاحب معتمد عشائیہ کی کوششوں سے اور جناب وحید الرحمٰن صاحب کے اشتراک اور رہنمائی کے باعث دونوں

تقریبیں احسن طور پر انجام پائیں۔

گھریلو کھیل اور اسپورٹس

خلیل اللہ صاحب کی کوششوں کی بدولت اسپورٹس کے مقابلے کامیابی کے ساتھ مقرر کئے گئے اور طلبا کے ساتھ ساتھ اساتذہ صاحبین نے بھی حصہ لیا۔ ہم ان تمام معاونین اور شرکار کار کا پھر شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مشورہ مناسب معلوم ہوتا ہے انڈور گیمس کے لئے انجمن اتحاد کے موازنہ پر بار ڈالنے کے بجائے بہت بہتر ہوگا کہ اس کو جامعہ کے کھیلوں کے فنڈ سے امداد حاصل کی جائے یہ صورت مناسب بھی ہے اور مفید بھی۔

کتب خانہ

اس سال (۳۶۰) اردو کتب اور (۱۱۹) انگریزی کتب کا اضافہ ہوا ہے اور تقریباً (۴۵۰) طلبائے ان سے استفادہ کیا ہے۔ کتب خانہ کو بعض طلباء اور اساتذہ صاحبین کی طرف سے بعض گراں بہا عطیے حاصل ہوئے ہیں جن کے لئے ہم ان سب معطیان کے شکور ہیں۔

کتب خانہ میں رہبر۔ پیام۔ ٹائیمس۔ ہندو۔ مدینہ۔ ساقی۔ جامعہ اور ماڈرن ریویو منگوائے جاتے رہے۔

اجازت دیجئے کہ ہم پھر اس سال انجمن کے لئے کسی مستقل وسیع عمارت نہ ہونے کی شکایت کریں اور ہماری شکایت اس لئے بھی بجا ہے کہ شکایت اسی سے ہوتی ہے جن سے عقیدت ہوتی ہے۔ انجمن کے بڑھتے ہوئے کام کے لئے موجودہ عمارت ناکافی ہے۔ ہمیں یقین ہے جناب والا اس کی طرف بھی توجہ فرمائیں گے۔

حضرات! ابھی میرا محاسبہ ختم نہیں ہوا مجھے نہ صرف یہ کہنا چاہئے کہ ہم نے کیا کیا مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ہم کیا کیا کرنا چاہتے تھے لیکن شومی قسمت سے نہ کرسکے۔ ابتدائے سال ہی سے ہماری کوشش تھی کہ دار التقاریر کی تمام ضروریات پوری کی جاسکیں الحمد اللہ کہ روشنی۔ پنکھوں اور جمالیاتی ضروریات کی حد تک دار التقاریر مکمل ہوگیا ہے لیکن دو ضرورتیں ہنوز پوری ہونی ہیں۔

ہماری تحریک تھی کہ حضرت سلطان العلوم اور دیگر تمام سلاطین آصفی کے عکس سے دار التقاریر کی

زینت کو دو بالا کیا جائے۔ اس سلسلے میں مختلف آرٹسٹ صاحبین سے مراسلت اب پوری ہو چکی ہے اور خود نائب معین امیر جامعہ کی طرف سے سلاطین آصفی کی تصویریں منگوائی جا چکی ہیں امید کہ نئی کابینہ فوری توجہ کر کے سال کی ابتدا انقاب کشائی کی مبارک رسم سے کریگی۔

دوسری اہم ضرورت دار التقاریر کے لئے ایک مستقل آلۂ نشر صوت کی فراہمی ہے۔ جناب نائب معین امیر جامعہ سے مراسلت کے بعد معلوم ہوا کہ مصارف تنصیب سے متعلق نرخ نامہ طلب کئے گئے ہیں اب تک وہ یقیناً مکمل ہو گئے ہونگے۔ جناب والا سے استدعا ہے کہ جلد انتظام فرمادیں۔ انجمن کی طرف سے میں نے یہ بھی تجویز کی ہے کہ محکمۂ لاسلکی سے اس کے متعلق مراسلت کر کے کسی دیر پا انتظام کی صورت پیدا کی جاتی تاکہ جامعہ کے اہم جلسوں کے وقت محکمۂ لاسلکی کو مستقلاً ریلے کرنے کا موقع ملے۔

یہ امر کہ ہم جامعہ کے علمی لباس یعنے طلیسان گون کے لئے الہ آباد کے ٹھیکہ داروں کے محتاج رہیں ہم سب کے لئے رنج کا باعث ہے۔ جناب والا سے اس کی بابت بھی ہماری یہ خواہش ہے کہ ہماری اس شکایت کو رفع فرما کر بالواسطہ ملک کے خیاطوں کی امداد اور حیدرآباد سلک فیا کٹری کی اعانت کی جائے۔

براوران جامعہ! آپ کے بڑے بھائی کی حیثیت سے میں آپ سے ایک خواہش کرنا چاہتا ہوں کہ یونیفارم کی جامعہ کے اندر تو آپ سختی سے پابندی کریں لیکن بیرون جامعہ اس جامعی اور علمی لباس کے پہننے سے احتراز فرمائیں۔ جو شخص بھی راستہ پر اودی شیروانی میں نظر آتا ہے عوام اس کو عثمانی تصور کرتے ہیں۔ اودی شیروانی والے کے سارے افعال کی ذمہ داری عثمانین کے سر تھوپی جاتی ہے۔ اور یوں بھی عثمانیہ اعدا کی نظر میں کھٹکتا ہے کیا میں اپنے عثمانیہ بھائیوں سے یہ خواہش کرسکتا ہوں کہ وہ اس پر سختی سے عمل کرینگے۔

میں اب ختم کر چکا لیکن مادر علمیہ کی اغوش سے رخصت ہوئے ہوئے جامعہ کے مفاد کے پیش نظر تمام طلبا کی اس دیرینہ خواہش کی از سر نو تجدید کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے سرپرست اعلحضرت سلطان العلوم کے

قدوم میمنت لزوم سے مشرف ہونے کی عزت جلد سے جلد عطا ہو۔

ہم براوران جامعہ کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمارا انتخاب فرما کر جامعہ کی خدمت کا موقعہ عطا فرمایا۔ اور جناب والا، اساتذہ صاحبین، اور برادران جامعہ کے ممنون ہیں کہ انہوں نے آج یہ طویل اور شاید غیر دلچسپ روئداد کی سننے کی زحمت گوارا کی۔

صدر انجمن اتحاد

کلیہ کی خبریں

کلیہ فنون کا افتتاح ۱۴ر ڈسمبر ۱۹۳۹ء کا دن جامعہ کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھا جائیگا کیونکہ اس دن کلیہ فنون کی نو تعمیر عمارت کا افتتاح اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خسرو دکن و برار خلد اللہ ملکہ، وسلطنتہ، نے بنفس نفیس فرمایا "اس پھول جیسی خوبصورت" عمارت کا سنگ بنیاد بھی ۴ر جولائی ۱۹۳۴ء کو دست ہمایونی ہی نے رکھا تھا۔ اور یہ عمارت نواب زین یار جنگ بہادر چیف آرکٹکٹ، مسٹر علی رضا اور مسٹر انوار اللہ انجینئر اور موسیو جاسپر کے زیر نگرانی پایہ تکمیل کو پہنچی، تقریباً ۵½ سال کے بعد وہ دن آیا جس کے لئے تمام عثمانئین چشم براہ تھے۔

کلیہ کے سامنے والا میدان نہایت خوبی سے سجایا گیا تھا۔ باب داخلہ کے سامنے شہ نشین تھی جس کے داہنے جانب مہمانوں اور مستورات کی نشستوں کے لئے انتظام تھا اور بائیں جانب طلبہ کی نشستیں تھیں۔ طلبہ کی نشستوں کے برابر ہی ایک خیمہ نصب کیا گیا تھا جس میں ذات شاہانہ کے لئے عصرانہ کا انتظام تھا۔ شہ نشین سے باب الداخلہ تک دو رویہ یونیورسٹی ٹرینگ کور استادہ تھی۔ علاوہ روساء، امراء اور معزز ارکان کونسل کے بہت سے بیرونی مہمان

مدعو تھے۔ ڈھائی بجے تک تمام طلبا جمع ہو گئے اور کڑی دھوپ کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے آمد شاہانہ کے منتظر تھے۔ ساڑھے تین بجے امیر جامعہ رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی تشریف فرما ہوئے۔ ارکان کونسل اور عہدہ داروں نے آپ کا استقبال کیا۔ آپ کے بعد ہی سواریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے حضرت والاشان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شہزادی حضرت نیلوفر فرحت بیگم صاحبہ کے ساتھ تشریف فرما ہوئے۔ آپ کے بعد شہزادہ برار حضرت والاشان نواب اعظم جاہ بہادر ولی عہد سلطنت آصفیہ مع شہزادی برار حضرت دردانہ بیگم صاحبہ و کرنل شہزادہ مکرم جاہ بہادر اور کرنل شہزادہ مفخم جاہ بہادر رونق افروز ہوئے جس وقت حضرت شہزادی دردانہ بیگم صاحبہ کرنل شہزادہ مکرم جاہ بہادر کے ساتھ گذر رہی تھیں تو طلبا نے تالیوں سے آپ کا خیر مقدم کیا اور شہزادہ مکرم جاہ بہادر نے سلام لیتے ہوئے خیر مقدم کا جواب دیا۔

۳ بجکر ۵۵ منٹ پر اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے نزول اجلال فرمایا۔ یونیورسٹی ملٹرینگ کور نے سلامی دی۔ تمام مہمان، اساتذہ اور طلبا استادہ ہو گئے۔ سارا میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔ حضرت ظل سبحانی بشکل جلوس شہ نشین تک تشریف لے گئے، اور شاہی نشست پر تشریف فرما ہوئے۔ ٹھیک ۴ بجے جناب نائب معین امیر جامعہ نے مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے بارگاہ خسروی میں سپاس نامہ پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔ طلبار کی جانب سے انجمن اتحاد کے خوش قسمت صدر ملک عبد العلی خاں صاحب نے پیش گاہ ہمایونی میں سپاسنامہ گذراننے کی سعادت حاصل کی اور طلبار کے جذبات وفاداری وعقیدت مندی کی ترجمانی کی۔ اس کے بعد حضرت ظل سبحانی نے پھر جوش تالیوں کے گونج میں سپاس ناموں کا جواب لطف فرمایا۔ حضرت جہاں پناہی نے کلیۂ فنون کی نو تعمیر عمارت پر اظہار خوشنودی فرماتے ہوئے اس کو سلطنت آبد مدت کی مختلف قوموں کے باہمی میل جول دوستانہ مراسم اور خوشگوار تعلقات کی ایک علامت قرار دیا۔ اور ارشاد ہمایونی ہوا کہ "جامعہ عثمانیہ جس کو ریاست حیدرآباد کی بہترین

روایات کا حامل اور یہاں کی اعلیٰ ثقافت کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ اسے لازم ہے کہ فراخدلی اور طلبار کی باہمی محبت اور اتحاد کو اپنا مطمح نظر قرار دے کہ اس میں ملک کی فلاح و بہبود مضمر ہے"۔ آخر میں طلبار کو مخاطب فرماتے ہوئے نصائح شاہانہ سے سرفراز فرمایا گیا اور شبیہ ہمایونی کو انجمن اتحاد میں آویزاں کرنے کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔ نطق ہمایونی کا ہر لفظ عثمانین کے دلوں میں گھر کر رہا تھا خصوصاً یہ ارشاد گرامی کہ "تم کو یہ بھی یاد رہے کہ ملک و مالک کی خدمت کرنا آسان نہیں ہے۔ لہذا اس کے لئے قابلیت اور عزم راسخ کی ضرورت ہے اس لئے تم اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کرو" ہر عثمانی کے دل پر منقوش ہوگیا۔ مخاطبت شاہانہ کے وقت بار بار صدائے تصفیق بلند ہورہی تھی۔ ارشاداتِ ہمایونی نے ہر شخص کے دل کو موہ لیا تھا۔ پوری محفل سراپا گوش اور مجسم ادب بنی ہوئی تھی۔ جلالت الملک کے یہ جواہر پارے ہر عثمانی کے لئے متاع گراں مایہ ہیں۔ ان لمحات زندگی کی خوشگوار اور مقدس یاد ہمارے ذہنوں میں ہمیشہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ ارشادات عالیہ کو سننے کے بعد ہر عثمانی یہ محسوس کر رہا تھا کہ "اس اقتدار و طاقت کی حفاظت میں ہمیشہ سرفروش رہنا جو سلطنت آصفیہ اور حضور کی شخصیت میں پیوست ہے" اس کا جزو ایمان ہے۔

سپاسناموں کا جواب مرحمت فرمانے کے بعد حضرت اقدس و اعلیٰ باب داخلہ کی طرف تشریف لے گئے۔ اور فلک بوس تالیوں کی گونج میں دست ہمایونی سے باب داخلہ کا طلائی قفل کھول کر کلیہ فنون کی نئی عمارت کا افتتاح فرمایا۔ کچھ دیر عمارت کا اندرونی حصہ ملاحظہ فرمایا گیا۔ یہاں بارگاہ ہمایونی میں مجلہ عثمانیہ کا کیاسکٹ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد ذات شاہانہ اس خیمہ میں نہضت افروز ہوئی جہاں شبیہ ہمایونی رکھی ہوئی تھی اس شبیہ پر حضرت اقدس نے اپنے دست مبارک سے "خادم قوم و ملت" کے الفاظ تحریر فرمائے۔ خیمہ میں علاوہ خانوادہ شاہی معزز ارکان کونسل و دیگر امرار کے کابینہ انجمن اتحاد کے اراکین اور مدیرین مجلہ عثمانیہ کو بھی شرف باریابی بخشا گیا تھا۔ چار نو بجے کے بعد سواری شاہانہ ۵-۱/۲ بجے مراجعت فرما ہوئی اور آپ کے بعد

خانوادۂ شاہی کے ارکان و دیگر امراء و عہدہ داران واپس تشریف لے گئے۔

شب میں کلیہ فنون بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ یہ عمارت حقیقتاً دورِ عثمانی کی ایک تاریخی یادگار اور ہندوستانی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ جامعہ کی تاریخ میں اس واقعہ سے ایک جدید دور کا آغاز ہوتا ہے کلیہ فنون عارضی عمارتوں سے اب نئی عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔ کلیہ فنون میں درسوں کے آغاز سے قبل نائب معین امیر جامعہ نے طلبا اور اساتذہ کو مخاطب فرمایا اور عمارت کی صفائی اور اس کے انتظامات سے متعلق ہدایت فرمائی۔ کلیہ فنون کی صفائی اور دیگر انتظامات سے متعلقہ امور پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب کے سپرد کیے گئے ہیں۔

پرنس آف برار کلیہ فنون میں بتاریخ　　　　میجر جنرل والا شان ہز ہائینس پرنس آف برار و سپہ سالار عساکر آصفی نے کلیہ فنون کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ یو۔ ٹی۔ سی نے گارڈ آف آنر ترتیب دیا تھا۔ حضرت والا شان نے یو۔ ٹی۔ سی کا معائنہ فرما کر خوشنودی کا اظہار فرمایا سید احمد صاحب قادری کی قیادت میں یو۔ ٹی۔ سی آئے دن ترقی کر رہی ہے۔ سید احمد صاحب قادری کو لفٹنٹ اعزازی کا رینک ملا ہے۔

انجمن اتحاد

گذشتہ دو تین سال سے انجمن اتحاد کے انتخابات میں روایتی سرگرمی نہیں پائی جا رہی ہے۔ اس سال بھی انجمن اتحاد کے انتخابات نہایت سنجیدگی سے انجام پائے۔ عہدہ صدارت کے لئے دو امیدواروں کی تحریکات تھیں لیکن مسٹر محمد عمر مہاجر نے عین وقت پر اپنی تحریک واپس لے لی۔ البتہ معتمدی کا انتخاب بہت دلچسپ تھا۔ چار امیدوار قسمت آزما تھے اور چاروں کے چاروں نہایت مستعد اور فرض شناس۔ عہدہ کتب خانہ داری کے لئے بھی تین امیدوار تھے۔

نتائج انتخابات حسب ذیل رہے:

عہدہ داراں

صدر۔　　ملک عبدالعلی خاں صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)　　بلا اختلاف آراء

نائب صدر۔　محمد تراب علی خاں صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)　　〃　　〃

معتمد۔ سید امجد علی خاں صاحب بی۔ ایس۔ سی (عثمانیہ)
کتب خانہ دار۔ منظہر الدین صاحب صدیقی بی۔ اے (آخری)

اراکین

شعبہ دینیات۔ قاضی عبدالرحمن صاحب بی۔ اے (آخری)
شعبہ فنون ۔ میر قادر علی خاں صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)
سید عباس حسین صاحب رضوی بی۔ اے (عثمانیہ)
سالمین بن عمر صاحب بی۔ اے (ابتدائی)
شعبہ سائنس۔ ملک شبیر حسین صاحب بی۔ یس۔ سی (عثمانیہ)
غلام غوث خاں صاحب بی۔ یس۔ سی۔ (عثمانیہ)
سلطان احمد صاحب سال دوم
شعبہ قانون۔ شمس الدین صاحب فاروقی اِل اِل۔ بی (ابتدائی)
شعبہ انجینرنگ۔ علی احمد جمال الدین صاحب بی۔ اِل (آخری)
مصلح الدین صاحب سب آرڈی نیٹ

جلسہ کرسی نشینی بتاریخ ۲۴ مہر ۴۲ ف جناب نائب معین امیر جامعہ کی صدارت میں جلسہ کرسی نشینی منعقد ہوا۔ احمد خاں صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) معتمد نے نئی کابینہ کا خیر مقدم کیا اور اس سے بہترین توقعات وابستہ کیں میر عباس علی خاں صاحب سابق صدر انجمن نے سالانہ روداد سنائی ملک عبدالعلی خاں صاحب صدر منتخب نے خطبہ صدارت پڑھا۔ اسی دن رات میں نئی کابینہ کی جانب سے "معاشرتی جلسہ" منعقد کیا گیا تھا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے کامیاب رہا۔

انجمن اتحاد کے جلسے حسب سال ہائے گذشتہ اس سال بھی انجمن اتحاد کا مباحثی نظام العمل مرتب کیا گیا تھا لیکن یہ نظام العمل نسبتاً کچھ دیر سے شائع ہوا آغاز سال میں مسٹر محمد علی جناح صدر کل ہند

مسلم لیگ نے انجمن اتحاد کے زیر سرپرستی ایک نہایت ہی مفید معلومات آفریں تقریر

"The Democratic Parliamentary System of Govrnment

is not suited to the genius of the Indian people."

پر فرمائی۔

ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی صدر شعبہ معاشیات نے "My experince in America"

پر اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پروفیسر شعبہ تاریخ نے "ہندوستان کے سیاسی مستقبل" پر نہایت دلچسپ تقریریں کیں حسب ذیل عنوانات پر بعض دلچسپ مباحثے بھی منعقد ہوئے۔

(۱) افراد و اقوام کی اخلاقی ترقی و تربیت کے لئے جنگ صلح سے بہتر ہے۔

(۲) The future of the states lies in the Federation alone

(۳) Armaments are better guarmtee for peace than treaties

(۴) ہندوستان کی موجودہ تعلیم کا لحاظ کرتے ہوئے واردھا اسکیم نہایت موزون ہے۔

(۵) وطنیت ایک بت ہے جس کی قربان گاہ پر انسانیت کا خون ہو رہا ہے۔

(۶) ہندوستان میں ضبط تولید صحت عامہ کی بقاء اور عام معاشی پستی کے لئے از بس ضروری ہے۔

ان مباحثوں میں طلباء کے علاوہ حضرات اساتذہ نے بھی حصہ لیا ابتداءً انجمن اتحاد کے جلسے نہایت کامیابی کے ساتھ منعقد ہوتے رہے لیکن رفتہ رفتہ یہ دلچسپی کم ہوتی گئی شاید اس کا سبب انجمن اتحاد طلبہ جامعہ عثمانیہ کے ذمہ دار عہدہ داراں کی بے توجہی ہو۔ انجمن اتحاد کے جلسوں کے لئے گذشتہ سال سے نظام الاوقات میں تبدیلی کی گئی ہے اور مباحثوں کا وقت صبح میں رکھا گیا ہے۔ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ انجمن اتحاد کے جلسے پابندی کے ساتھ منعقد ہوتے رہیں تاکہ انجمن اتحاد کا مقصد پورا ہو۔

کل ہند تقریری مقابلہ میں جامعہ کی کامیابی۔

اس سال کل ہند تقریری مقابلہ منعقدہ جامعہ اسلامیہ علی گڑھ میں شرکت کی غرض سے انجمن اتحاد نے دو مباحثی جماعتیں روانہ کیں

سال گذشتہ کی طرح اس سال بھی اُردو تقریری مقابلہ میں مسٹر محی الدین غازی متعلم بی۔ اے (آخری) نے پہلا انعام حاصل کیا اور عثمانی جماعت نے ٹرونی حاصل کی۔ ہم مسٹر غازی کو ان کی اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ ان متواتر کامیابیوں کے بعد اس غلط پروپگنڈہ کا پول کھل گیا ہوگا جو بیرون حیدرآباد جامعہ عثمانیہ کے متعلق پھیلایا جاتا ہے۔

جشن یوم جامعہ حسب روایات قدیم اس سال بھی جشن یوم جامعہ منایا گیا اس تقریب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اسی کے ساتھ رسم افتتاح کلیہ فنون ادا کی گئی۔ اس تقریب میں مختلف مشاغل شامل تھے۔ بین الکلیاتی اردو اور انگریزی تقریری مقابلہ منعقد ہوئے۔ انگریزی تقریری مقابلہ میں کلیہ بلدہ نے اور اردو تقریری مقابلہ میں کلیہ گلبرگہ نے ٹرونی حاصل کی۔ اُردو انگریزی تحریری مقابلہ بھی منعقد ہوئے۔ بتاریخ ۲۵ بہمن ۱۳۴۹ف رات میں طلبا، قدیم و جدید کے مابین ایک نہایت دلچسپ مباحثہ منعقد کیا گیا جس میں طلبا، قدیم کی جانب سے سید محمد اکبر وفا قانی صاحب، سید محمد عبدالروف صاحب عبدالرحمن صاحب رئیس محمد داؤد حسین صاحب، اقبال علی صاحب اور عبدالحق صاحب نے حصہ لیا۔ مسٹر غازی مسٹر تراب علی خاں، مسٹر احمد خاں اور مسٹر احمد محی الدین نے طلبا، جدید کی نمائندگی کی۔ اختتام مباحثہ پر ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب سابق پروفیسر انگریزی نے طلبا، کو مخاطب فرمایا اور رات کو ایک بجے یہ تقریب نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔

بتاریخ ۲۸ بہمن ۱۳۴۹ف عشائیہ کا انتظام کیا گیا۔ اس میں رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم و امیر جامعہ نواب مہدی یار جنگ بہادر معین امیر جامعہ و مسٹر رنگنادھن معین امیر جامعہ مدراس شریک تھے اختتام عشائیہ پر رائٹ آنریبل نے جلالت الملک اعلیحضرت بندگان عالی کا جام صحت نوش فرمایا۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر نے مادر جامعہ کا جام صحت تجویز کیا۔ مسٹر رنگنادھن، قاضی محمد حسین صاحب نائب معین امیر جامعہ، ملک عبدالعلی خاں صاحب صدر انجمن اتحاد مسٹر تراب علی خاں صاحب نائب صدر انجمن اتحاد اور سید محمد اکبر وفا قانی صاحب نے بھی تقریریں کیں۔ عشائیہ کا نہایت اعلیٰ پیمانہ پر انتظام کیا گیا تھا اس تقریب کی کامیابی کا سہرا مسٹر

مظہر الدین صدیقی معتمد عثمانیہ کے سر ہے جن کی انتظامی قابلیت کا ایک سے زائد مرتبہ مظاہرہ ہو چکا ہے

بین الکلیاتی کانفرنس اس سال دوسری مرتبہ بین الکلیاتی طلبا، کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا جناب نائب معین امیر جامعہ نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا۔ اس کانفرنس میں طلبا، کی فلاح و بہبود سے متعلق تحریکیں منظور کی گئیں۔ محمد احمد صاحب سبزواری ام۔ اے (عثمانیہ) نے عثمانیین کی "عمرانی خدمات" پر اور احمد خاں صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) نے "سرمایہ داری کے مستقبل" پر مبسوط مقالے پڑھے، محمد عمر مہاجر صاحب نے "ادب اور زندگی" پر تقریر کی۔ مخدوم محی الدین صاحب ایم۔ اے عثمانیہ نے وجد آفریں نظم سنائی۔

مشاعرہ بتاریخ ۲۹ دے ۱۳۴۹ف کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا جامعہ کے ایک ہونہار شاعر عبدالرحمن صاحب جامی اس کے معتمد تھے۔ یہ مشاعرہ جامعہ عثمانیہ کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس کی صدارت حضرت والا شان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجیع نے ازراہ مکرمت قبول فرمائی تھی۔ ایڈریس ہال میں مشاعرہ کا اعلیٰ پیمانہ پر انتظام کیا گیا تھا درمیان میں محترم صدر کے لئے مسند بچھائی گئی تھی۔ پورا ہال طلبا، سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شہزادہ ممدوح کی تشریف آوری کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ بیرونی شعراء میں جناب سیماب اکبرآبادی جناب منظور حسین منظور اور شرف الدین صاحب شرف مدعو تھے۔ طلبا، قدیم میں سے وجد، مخدوم، نے نظمیں سنائیں۔ اساتذہ میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب وہاج الدین احمد صاحب شمیم اور عبدالقیوم خاں صاحب باقی لکچرار اردو نے اپنا کلام سنایا، نواب ناصر نواز الدولہ اور نواب تراب یار جنگ بہادر اور حضرت فانی نے اپنا کلام سنا کر خراج تحسین حاصل کیا۔ جامی۔ علی۔ اسیر۔ خسرو ماجد۔ طلبائے حال نے بھی نظمیں پڑھیں۔ آخر میں شہزادہ ممدوح الشان کے کلام سننے کی محفل نے عزت حاصل کی۔ ہر شعر پر اہل محفل جھوم رہے تھے۔ خصوصاً یہ شعر

دیکھئے دل سے کیا جواب آئے
نام لے کر ترا پکارا ہے

مدتوں یاد رہے گا۔ قریب بارہ بجے یہ محفل برخواست ہوئی۔ ہم اس تقریب کی کامیابی پر

جامی صاحب کو مبارک باد دیتے ہیں۔

جشن یوم جامعہ کے سلسلہ میں ڈرامہ اسپورٹس عصرانہ اور جلسہ موسیقی کا بھی انتظام کیا گیا تھا اور یہ سب تقریبیں ذمہ دار عہدہ داران انجمن کی اپنی مصروفیتوں کے باوجود کامیاب رہیں جشن یوم جامعہ کی کامیابی کا سہرہ جناب محمد تراب علی خان صاحب بی۔اے (عثمانیہ) نائب صدر انجمن اتحاد اور جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی کتب خانہ دار انجمن اتحاد اور ان کے ہم کاروں کے سر ہے۔

برادران جامعہ حلقہ اساتذہ میں بڑی مسرت کا مقام ہے کہ جناب محمد ناصر علی صاحب ام۔اے (عثمانیہ) کا جونیر لکچراری شعبہ معاشیات پر جناب محمد بن عمر صاحب ام۔اے (عثمانیہ) وسابق صدر انجمن اتحاد کا جونیر لکچراری کلیہ گلبرگہ پر اور جناب محمد محمود حسین صاحب ام۔اے (عثمانیہ) کا جونیر لکچراری کلیہ ورنگل پر تقرر عمل میں آیا ہے۔ ہم ان تینوں برادران جامعہ کی خدمت میں پرجوش دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

سول سروس اس سال سول سروس کے امتحان مقابلہ میں ہماری جامعہ کے پانچ ہونہار طالب علم منتخب ہوئے۔ یہ نتائج نہایت امید افزا ہیں۔ ہم سید درویش عالم صاحب بی۔اے عبدالغفور صاحب بی۔ایس سی، مختار احمد صاحب ام۔اے، خورشید علی خاں صاحب بی۔ایس۔سی اور خواجہ معین الدین صاحب بی۔اے کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔ اس سال سے سول سروس کے امتحان کی تیاری کے لئے جناب نائب معین امیر جامعہ نے ایک بورڈ قائم فرمایا ہے۔ اس بورڈ کے معتمد ہماری جامعہ کے قابل احترام پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب مقرر ہوئے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ مجید صدیقی صاحب کی ہمدردانہ کوششیں ہمارے لئے ہمیشہ اسی طرح امید افزا ثابت ہوتی رہیں گی۔

کھیل

موجودہ نظام تعلیم میں کھیلوں کو نصاب تعلیم کا جز لاینفک خیال کیا جاتا ہے۔ جامعہ کی اڈکمیسٹ میں منتقلی کے بعد سے غیر مقیم طلبہ کو تو کھیلوں میں حصہ لینے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ہم ارباب

جامعہ سے متوقع ہے کہ غیر مقیم طلبار کے لئے کھیلوں کا کچھ نہ کچھ انتظام فرمایا جائے گا مقیم طلبار بھی کھیلوں میں کم دلچسپی لینے لگے ہیں۔ اگر طلبار کی کافی ہمت افزائی کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری جامعہ میں بھی کھیلوں کا بہت اچھا معیار قائم ہو جائے۔

ٹینس کلب صدر ڈاکٹر عبدالحق صاحب معتمد مسٹر اشرف تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے طلبار کے معاملات میں مختلف مواقع پر اپنی گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ مختلف مقابلوں میں کلب شریک ہوا۔ کلب کا سالانہ ٹورنامنٹ اس سال نہیں ہوا۔ دوسرے کلبوں کے بہ نسبت ٹینس کلب بہت پیچھے ہے ضرورت ہے کہ اس کا معیار اعلیٰ سے اعلیٰ تر کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ انہوں نے وال پریکٹس کے لئے دیوار تعمیر کرادی ہے۔ مسٹر اشرف نے معتمدی کے فرائض بہت اچھی طرح انجام دئے۔

فٹ بال پروفیسر پی۔ کے۔ گھوش نے کلب میں کافی دلچسپی لی کھیل کے معیار میں نمایاں ترقی کی۔ مسٹر کریم نے کپتانی مسٹر خلیل نے معتمدی کے فرائض بہت اچھی طرح انجام دئے سال کے دوران میں مختلف ٹیموں سے مقابلے ہوئے۔ اجتماعی طور پر کریم، شاہ خاں، سعادت، افتخار اور بدر کا کھیل بہت اچھا رہا۔ بدر گو کالج کے نئے کھلاڑی ہیں لیکن ان کا مستقبل شاندار ہے۔ مسٹر افتخار مسٹر سعادت اور مسٹر شاہ خاں کو ان کے معیاری کھیل کے مدنظر کلر دیا گیا ہے ادارہ ان کو مبارکباد دیتا ہے۔

ہاکی کلب کلب کے صدر جناب برکت اللہ صاحب ہیں۔ برکت صاحب ایک زمانہ میں علی گڑھ میں ہاکی کے بہترین کھلاڑی رہ چکے ہیں آپ کلب کی مصروفیتوں میں بہت سا وقت صرف کرتے ہیں۔ اس سال کی ٹیم گذشتہ سالوں کے مقابلہ میں بہتر تھی۔ مسٹر ضیاء الحق کپتان، مسٹر عبدالوہاب معتمد تھے مسٹر وہاب اچھے کھلاڑی ہیں اس سال کلب کی باگ ڈور ایسے طلبہ کے ہاتھ میں آگئی تھی جن کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جامعہ کے بہترین کھلاڑی تھے اور نتیجتہً اس سال بین الکلیاتی ٹورنمنٹ کے فائنل میں ہماری جیتی ہوئی ٹیم جاگیردار کالج سے آخری پانچ منٹ میں ہار گئی اگر صحیح طور پر رہنمائی کی جاتی تو غالباً ہماری ٹیم کو ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ شاہ خاں مجتبیٰ، اقبال اور رشید

اس سال کے ہاکی کے بہترین کھلاڑی تھے۔ رشید ہمارے ہاں کے بہترین لفٹ اِن تھے رشید اپنے پیچھے ایک ایسا نام چھوڑ گئے ہیں جو ہمیشہ ان کی یاد تازہ کرتے رہے گا۔ اقبال گو کم عمر ہیں لیکن بحیثیت فل بیک بہت اچھے کھلاڑی ہیں امید ہے کہ اقبال ہمیشہ ترقی کرتے جائیں گے اور ایک کامیاب کھلاڑی ثابت ہوں گے۔ رشید اور اقبال کو ان کی کامیابیوں کے صلے میں کلر دیئے گئے ہم ان دونوں نوجوانوں کو دلی مبارکباد دیتے ہیں مسٹر سیف اچھے گول کیپر ثابت ہو رہے ہیں۔

شمالی ہند کا سفر اس سال فٹ بال ہاکی اور ٹینس کی ٹیموں کو جامعہ کی طرف سے شمالی ہند کے سفر پر بھیجا گیا تھا۔ گو سفر زیادہ کامیاب نہیں رہا لیکن پھر بھی فٹ بال ٹیم نے اشک شوئی کر دی۔ ہماری ٹیموں نے آگرہ، علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ نیز الہ آباد کا سفر کیا۔ علی گڑھ میں ہماری ٹیموں کی روایتی مہمان نوازی کی گئی جس کی علیگ برادراں سے اُمید تھی۔ سفر کے سلسلہ میں طلبائے قدیم کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا نہ معلوم اس کے کیا وجوہ تھے۔ طلبائے قدیم ہماری جامعہ کی دولت ہیں۔ اگر آج ہم انھیں بھلا دیں تو کل ہمیں بھی بھلا دیا جائے گا۔

اقامت خانے اقامت خانوں کے انتظامات بہتر حالت میں ہیں مقیمین اپنی علمی، سماجی، معاشرتی دلچسپیوں میں نت نئی جدتیں پیدا کرتے جا رہے ہیں۔ اوائل سال میں اقامت خانہ ب کی جانب سے ایک ڈرامہ پیش کیا گیا تھا۔ اقامت خانہ الف کی جانب سے ایک کارنول ترتیب دیا گیا تھا یہ دونوں تقاریب بہت کامیاب رہیں۔ اس سال سے مددگار مودب صاحبان کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ خواجہ نصر اللہ صاحب اقامت خانہ ب کے محمد احمد سبزہ واری صاحب اقامت خانہ عارضی کے سید احمد صدیقی صاحب اقامت خانہ الف کے مددگار مودب مقرر ہوئے ہیں۔ ہم ان تینوں بھائیوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔

پروسٹ طلباء کی مشکلات کو رفع کرنے کے لئے پروسٹ کا نیا عہدہ قائم کیا گیا ہے پروفیسر حسین علی خاں صاحب یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر حسین علی خاں صاحب کا طلبہ کے ساتھ ہمدردانہ سلوک محتاجِ بیان نہیں ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ طلبہ پروسٹ صاحب سے کافی مدد اور رہنمائی حاصل کریں گے۔ فقط

سید حسین رضوی بی۔ اے (عثمانیہ) شریک مدیر

Mr. Mohammed Turab Ali Khan B.A. (Osmania),
Vice-President of the Students Union.
He is one of the best speakers of the University, and has won several prizes in various competitive debates.

viction that if we students try "to understand the peasant", in the words of Sir Malcolm Darling, the genuine supporter of the rural cause in India, wonders can be wrought. If we would have progress, if India, our beloved land, desires to become rich, prosperous, healthy and happy, it is to the village we must devote our attention. Leave off those German-styled buildings; go to the huts it is here the heart of India throbs! The villages are calling aloud for help and assistance, and awaiting you impatiently to be inhabited and to be trodden by you. If you fail to respond to this clarion call, your future is indeed gloomy.

MIR QADIR ALI KHAN
M. A. Final (Econ)

Only recently have academic minds applied themselves to the rural problem; the provincial governments, with the exception of one or two, have conveniently forgotten their election pledges. This is indeed an unfortunate truth.

Sir Jagdish Purshad aptly remarked the other day that "The peasant is now a voter and politicians angling for his vote may do greater harm than good." Since the awakening of the academic minds, Indians have begun to believe that the greater the fillip given to the agrarian reconstruction, the better for all the interests in the country. Every man in the Indian street has regarded it is as his prerogative to contribute something towards the amelioration of the lot of thepeasant community. This was certainly a prelude to greater and more substantial work in the future. But the lack of concerted and collective effort made the situation more confused and difficult to tackle. None of these endeavours lightened the peasant's weighty and onerous burden. Mr. H. L. Puxley has recently written: "Though rural uplift is now a fashionable craze in India, and the atmosphere hums with the phrase, it still remains a hum only." The Royal Commission on Agriculture says, "What is required is an organised and sustained effort by all those deparments whose activities touch the lives and the surroundings of the rural population." This is what I regard as the beginning of our movement. Had Indians realised earlier that a scheme for rural development cannot make any headway unless it is pursued through non-official agencies guided and co-ordinated by the State, the agrarian problem would not have risen to such a height. With the co-operation of individual philanthropists, the State can make this programme workable for the practical utility of the peasantry.

In the end, I earnestly appeal to the young minds to realise their duties in this direction. It is my firm con-

the villages with the deceptive excuse of lack of money. I dare say that if the state had spent half of the money on rural reconstruction which it derived from the villages, then this problem would have been of quite a different nature and relatively easy to tackle.

Now I should like to invite your attention to the main purpose of rural reconstruction. In my opinion the principal aim of rural reconstruction is to bring about a complete upward development towards a more abundant life for rural people spiritual, mental, physical, social and economic. I mean by this a complete happy and new order. A great many persons make the sad mistake of confining their energies and activities to bee-keeping, poultry-farming or cottage industries or a few stray lectures. This is not reconstruction; it is tampering with the problem. What I wish to lay stress upon is that our programme should embrace every department of village activity and should touch the life of every villager from the cradle to the grave. Unless the advance is made on the whole front, victory is not likely to be achieved by any partial activity. The ills which like a canker, are eating into and enfeebling the vitals of village life, need to be attacked from all sides at the same time. A well thought-out and comprehensive programme, therefore, is of primary importance.

The report of the Royal Commission on Agriculture, the appointment as Viceroy of the high minded statesman who presided over the commission and the pressing needs of political parties have combined to invest the Indian peasant and his problem with considerable importance. The state has too often in the past figured only as the harsh tax-gatherer and too often both officials and non-officials have been content to regard the peasant as a picturesque figure on the landscape who bore his misfortunes with patience and equanimity.

RURAL RECONSTRUCTION IN INDIA

It is but a commonplace maxim of Indian economics that India lives in the villages. It is partly due to our ideas of economic progress and development which are tinged with the urban conditions of the West. I was surprised to hear some pseudo-politico-economists speaking as though villages are an anachronism in modern India. Those who say so betray their ignorance of Indian village life. For ages past these villages have nourished the sacred culture and genius of this great and ancient country of ours, From time immemorial, agriculture has been the main occupation of the bulk of our countrymen, and it will remain so for many years to come. Therefore it is more correct to say that towns are an ancharonism in India. I have sufficient temerity to challenge those who espouse the cause of the towns. Whatever money and effort is spent on the towns and whatever success is achieved in that direction, it is only beating the air if the villages are thrown into the limbo of oblivion It is undoubtedly a lamentable fact that colossal and huge expenditure is incurred on the equipment of towns with the latest facilities and amenities at the expense of the villages and of the poor villagers who are left unprotected and unprovided for. The excuse which seeks to justify this fallacy is very interesting. Those who offer this excuse dwell upon the point that lack of money and resources is the fundamental obstacle in their way. Now let me ask them from where do they get money for urban work? Money is certainly earned from the villages. Every State subsists upon the income derived from its villages. Nearly forty per cent of our country's income is extracted from the remote, untouched and despised villages. So it is not fair to arrest the progress of

Herodotus is followed step by step and there is an abundance of mythological reminiscences. The method of treatment is that of the authors of the miracle plays. The plot is complicated and the characters lack unity. Allegorical and historical characters are mingled in order to bring out the moral. Ambidexter is the important abstraction who closely corresponds to Iago and Gloucester (Richard III), and Praxaspe, in his death scene, anticipates the child Arthur in Shakespeare's "King John". The plot is elucidated in a spectacular way. The murders are not, like "Gorboduc", recounted, but are staged in full. The play contains romantic, melodramatic and comic episodes to relieve the tragedy, but the buffoonery is not skilfully connected with the main tragedy. The language is ridiculously bombastic, the fourteen syllabled rhymed lines are stiff and dull, and genius and style are absent.

Whetstone's "Promos and Cassandra" is chiefly interesting on account of the criticism of contemporary drama contained in its Dedication and its provision of material for Shakespeare's "Measure for Measure".

In fine, in the fields of prose, poetry and drama, there were signs of activity which was intensified during the flowering time of the Renascence and brought about a revolutionary change over English literature and laid the foundation of its splendid edifice as we see it now to-day.

S. M. TAQI HASHMI, M. A. (OSMAN),
Editor.

drama which burst forth during the flowering time of the English Renaissance.

These English plays had still the elements of the moralities; contained more or less the scenes of a romantic or historical episode; possessed comic scenes to relieve tragedy or romance which were related to the main plot—a tradition which was left by the miracle plays.

The plays of special interest among them are R. B's "Appius and Virginia", Richard Edwards's "Damon and Pythia", "Horestes", "Tancred and Gismond", Thomas Preston's "Cambyses", Whetstone's "Promos and Cassandra".

The former three plays mingle abstractions and real characters. The tragedy of "Appius and Virginia" has a single theme which elevates the main figures and intensifies the catastrophe; but the language is ridiculously emphatic and was put into the mouth of Pistol by Shakespeare. The comic plot goes hand in hand with the tragic one and the earlier dramatic and classical elements are curiously blended.

Richards's "Damon and Pythias" is "an example of native tragedy influenced but not subjugated by classical models"; a tragi-comedy which gave its form to the Shakesperean tragedy. The author's use of stichomythia and his preference for a Grecian story indicate his acquaintance with the classical drama and the fact that the play is devoid of Dumb Shows, Chorus, Ghost, formal acts and scenes and contains light humorous elements, a Vice (without his Devil), the Clown and Herod, indicates his obvious tendency towards the Romantic Drama.

Thomas Preston's "Cambyses" has all the qualities of an imperfect Interlude. It breathes humanism for

Stevenson's "Gammar Gurton's Needle" is completely English and rustic in subject and characters and classical only in construction.

The first English tragedy on the Senecan model was "Gorboduc, or Ferrex and Porrex" written by Thomas Sackville and Thomas Norton. The play is uninterruptedly serious, the style noble and the character of the scenes almost abstract which is evidently an indication of Seneca's influence. The play lacks dramatic qualities. The didactic sense and the symmetrical plan of the scenes are inspired by the moralities rather than by Seneca. Each act opens with a symbolic pantomime or Dumb Show', which, externally considered, without infringing the classical law, fulfilled the taste of the English play-goers for real deeds and melodramatic spectacles—thus sowing the germ of dissension which was, later on, developed and matured in the Romantic Drama.

The play was not a mere academic tragedy. "It brought the idea of fatality on the English stage", established a high artistic standard, and was the first play in which the blank verse of the antiquity was used.

After this epoch-making tragedy, many plays, which were adaptations of the foreign dramas, appeared which may be grouped under the title, "Prodigal Son Series," such as John Palsgrave's translation of "Acolastus", Thomas Richards's "Misogonus", "Nice Wanton" (a morality), Gascoigne's "Glass of Government," his prose translation of a comedy by Ariosto entitled "The Supposes" and his tragedy "Jocasta", and "The Bugbears" written by an unknown author in which the Italian influence is more apparent.

These adaptations blazed the track to the English national drama which paved the way for the romantic

duces a burst of patriotism and the latter is pervaded by strong rationalist conviction.

Lydsay's "Satire of the three Estaitis," is a Protestant morality which attacks the nobility, the merchants and particularly the clergy.

Bale introduces historical elements in his morality plays. His famous dramatic essay, "King Jehan" is "The half-open chrysalis, the morality play whence the historical drama is about to emerge." Its features are the intermixture of real and allgorical characters, change of abstractions into living beings and a travesty of history which was to leave its mark on Shakespeare's "King John".

Heywoods' interludes are mere comic dialogues, having no purpose but to amuse. They have no taint of religious controversies. There is drollery which recalls Chaucer.

"Calisto and Meliboea" is an adoptation of the famous Spanish play "Celestina," in which the didactic instinct cuts short a romantic drama.

But from 1550 on wards the progress of the theatre is marked. Since this date professional players appeared and the first theatre was established in Shoreditch. The choristers or children of the Chapel Royal were patronised by Queen Elizabeth.

The first English comedy of the classical school was Nicholas Udall's "Ralph Roister Doister," in five acts. It was a plautine comedy. The characters are partly borrowed from the ancients and partly from English life. Its chief aim was to cause innocent laughter.

Thomas Sackville deserves the glory of having helped to revive English poetry. His "Induction" which is written in seven-line stanzas, is marked with gloom and excess of misery which create novelty. He "used an English which had contracted its grammar and dropped its terminations, and he re-established alternating accents more regularly than even Wyatt and Surrey". He was faithful to scansion and he deserves to be called the connecting link between Chaucer and Spenser.

George Gascoigne deserves a cursory notice "who essayed to grope his way along all the new paths opened by the Renascence, although he made no great advance on any of them". His best known work is "Steele Glass", a satire in blank verse in which he denounces the profanity and luxury of modern manners, thus repudiating Italianism. In his treatise on English prosody, "Notes", he advocated that the vocabulary should be reduced to monosyllables of pure English origin. "He is renowned for having written the first prose story, taken from real life, the first prose comedy, the first tragedy translated from Italian, the first masque, the first regular satire, and the first treatise on English prosody."

The Renaissance and the Reformation began to influence the theatre from 1520 to 1578. The Reformation changed the form of the miracle-plays; but both the humanist and the Protestant tendencies arose in the moralities.

John Skeltons' morality "Magnificence" is the first specimen of a laicised morality, while "The Four Elements" and Redfords' "Play of Wyt and Science" are inspired by their love of knowledge and ardour to instruct. The former has a geography lesson which pro-

Wyatt's efforts to bring back to English poetry the nobility, grace and harmony which it had lost, were attended with success, but in regard to metre he was a failure. "His rhymes manifestly fall on unaccented syllables", Apart from love poems, he also wrote satires which are imitated from classical models Some of his poems are true songs in which his impassioned language is noteworthy, because before him it was entirely unknown.

Surreys' sonnets are artistic, grand, regular and harmonious. Their subject matter is imaginative love, love for nature and the poets of antiquity. He was fully conscious of the needs of English poetry at that time; so he used the less elaborate and easier form than that applied by Wyatt for the sonnet, which was after wards adopted by Shakespeare. But his reputation mainly hinges upon the introduction of blank verse into English when he translated the second and fourth books of Virgil's "Æneid", This innovation is in consonance with the spirit of the Renaissance. His blank verse is of classical origin and, therefore, learned and unpopular; it is simply the decasyllabic or heroic metre shorn of its rhymes. He failed in his attempts to avoid its defects of wearisome monotony and lack of rhyme. But the metre, after its perfection, became the metre of the drama and the epic.

Wyatt and Surrey were much in advance of their time. Their lead was early and was followed only after a whole generation had passed. Yet they had not stood against the national tradition, because Wyatt was a great admirer and student of Chaucer.

Lyndsay, Buchanan and Knoxe were the Scottish writers of the Reformation period. Lyndsay's work consists of a series of virulent satires, at first predominantly social, but afterwards more and more Protestant. His famous poems are 'Dreme' and 'Monarchie'. His octosyllabic lines recall Skelton because they are very virulent.

George Buchanan, the celebrated humanist who wrote almost wholly in Latin, represents the alliance between the Renascence and the Reformation. He was the first Latinist of his time and, apart from his Latin poems, he is also famous for his tragedies on the classical model.

John Knox is the first great Scottish prose-writer. He was the Calvin of Scotland and the Reformation incarnate. In his famous "History of the Reformation", he avoids the dialect peculiarities of English. He rendered a great service to English prose by adopting it as his medium while it was so much disdained by the humanists.

So far about the prose-writers of the early Renaissance. It is in poetry that the Renaissance influence is more marked, for the Reformation did not touch it owing to its secularity and frivolousness. The poets after Chaucer and particularly Stephen Hawes and Skelton had made it dull and wanting in artistic qulities. It was Wyatt and Surrey who were responsible for its renewal and remodelling. They are particularly famous for introducing the Petrarchian sonnet and lyrical poetry into England. But their immature death deprived English poetry of their immense contributions.

text adequately. In his "Book of Common Prayer" the Anglo-Saxon and French elements of the English language are perfectly mingled and the cadences are melodious.

The dissolution of religious houses from 1535 to 1539 in the reign of Henry VIII., bringing an enormous destruction of books in its train which emptied the religious colleges of Oxford and Cambridge, gave a serious set-back to the progress of classical learning; but the compilation of Lelands' "Itinerary" aroused the great ardour for antiquities and after some years the classical learning was, once again, firmly rooted in the English soil. It also created patriotic zeal and consequently many chronicles, Protestant in spirit, appeared in the latter half of the 16th and the early 17th century, such as Halls' "Chronicle", Holinshed's "Chronicle", Stowe's "Summarie of English Chronicles", John Speed's "Historie of Great Britaine", and William Camden's History of the Reign of Elizabeth, written in Latin but translated into French and from French into English in 1625. They were not authentic histories but were meant for the glorification of England.

Latimer was both against Catholicism and the laxity of the Protestant clergy under Edward VI. His sermons were full of the phrases which were terse, simple, beautiful and symmetrically balanced, which make him one of the pioneers among prose-writers. His knowledge of Greek was highly esteemed by Erasmus.

Foxe's martyrology, "Acts and Monuments" was originally written in Latin, but was translated by the author himself into an unadorned English or the English of an official report.

possible be to the mass of the people who had no acquaintance with the languages of antiquity."

Wilson, the English Quintilian, was solely concerned with the style of the English language in his "Art of Rhetorique", and recommended purity and simplicity. He condemned the use of French and Italian phrases and idioms and the abuse of archaism. He did much to fire the patriotism of his country men. It is said that Shakespeare himself studied Wilson and profited by his book.

Cheke was concerned with form and matter in his "Heart of Sedition."

To Roger Ascham, who is one of the earliest classical English prose writers, goes the honour of establishing the teaching of the classics at Cambridge. His "Toxophilus or Schole of Shooting" was written "in the English tongue for Englishmen" and his more famous educational treatise "The Schoolmaster" contains advice to masters on the teaching of Latin and rendering Latin passages into English. He vigorously attacked the Italianism of the English aristocracy.

The Renaissance brought the Reformation in its wake, and Tindale, Latimer, Foxe, Lyndsay, Buchanan and Knoxe are regarded as the Reformation prose-writers.

Tindale's version of the "New Testament" was based upon Luthers' translation of and Erasmus's commentaries on the Greek and Latin texts. It was completed by Miles Coverdale, and later on it provided the basis for the famous Authorised Version of 1611. Its prose appealed to all classes and had incomparable influence, asserting that English was capable of rendering the original

William Lyly to write and Erasmus to revise a Latin grammar which was so highly valued that its use was made compulsory throughout England and in the 18th century, after some emendation, it became the 'Eton Latin Grammar'.

Thomas Linacre and William Grocy were responsible for the establishment of the teaching of Greek on sound principles at Oxford.

More's fame mainly rests upon his "Utopia", written in Latin, which is thought to be the masterpiece of English humanism and the true prologue of the Renaissance. It presents an ideal society, for the description of which he owes mainly to Plato's "Republic", and when he opposes all the conceptions of the past, he seems to have been inspired by the exploration stories of Amerigo Vespucci. The book stands alone as representing England's literary contribution to pure humanism, for at that time it took the world by storm, was translated into most European languages, its author being hailed as a member of the wide republic of letters, and now it has become one of the world's classics.

Elyot, Wilson, Cheke and Ascham are regarded as educationists, because they did much to reform and exalt the English language which was, at that time, suffering from certain draw backs, and what is more important, from the feeling of inferiority of the British scholars. These educationists wrote their best work in English.

Elyot's treatise on moral philosophy and education entitled "The Boke of the Governour" is full of Greek and Latin reminiscences. "If Erasmus popularised the classical renaissance for scholars, Elyot rendered it

Renaissance—the main streams of which reached England contemporaneously—but, to a great extent, the earliest pioneers of the classical renaissance in England were Robert Flemming, William Grey, John Gunthorpe and William Telly of Selling or Celling, who had gone to Italy either on business connected with the Holy See or to perfect themselves in canon law at the famous University of Bologna and had studied Latin or even Greek by the way.

But the English humanists, worthy of that title, who played a very important part in introducing humanism into England were Erasmus, John Colet, Linacre, Grocyn, More, Elyot, Wilson, Cheke, Ascham, Tindale, Latimer, Lyndsay, Buchanan, Knox, Wyatt, Surrey, Sackville, Gascoigne, Udall and Norton. Many of them had crossed the Alps to see the manuscripts of the fugitive Greeks and learn Greek at Florence, Bologna, Padua, Venice and Rome.

Erasmus "appealed to the practical side of the English people in a way more directly than did any other humanist." He was a classical specialist who gathered the wisdom of the past to enrich and enlighten the present. He was under Colets' influence, so he devoted himself for a time to the reform of Christianity.

John Colet received his inspiration from Savonarola, Fincino and Pico di Mirandolo, while he was in Italy, which gave him the notion of an enlightened and purified Christianity. He preached it in London and Oxford and was the first toi ntroduce the historical method of interpreting the Scriptures. He laid the foundation of a renewed study of the text of the New Testament and a historical examination of St. Paul's mission. In 1504, he founded St. Paul's School where boys could enjoy the privilege of an education in Latin and Greek. He caused

THE FORERUNNERS OF THE ENGLISH RENAISSANCE.

Renaissance or rebirth is a comprehensive name for the great intellectual movement which marks the transition from the middle ages to the modern world. It is a movement which includes a very marked change in outlook on life, philosophy, art, literary criticism, political and religious thought.

Italy was the nursing mother of the Renaissance, where it originated towards the end of the 14th century by virtue of the immigration of Greek scholars, caused by the capture of Constantinople in 1453 by the Ottoman Turks. These scholars brought with them the knowledge of the Greek language and gave a strong impetus to the new learning. In the earlier half of the 16th century, the Renaissance spread itself throughout the whole of the rest of Europe, particularly France, Germany and England.

Broadly speaking, two leading inspirations can be distinguished in the spirit of the English Renaissance—firstly, the intellectual impulse resulting from the study of the classics, and, secondly, the imaginative impulse given to men's minds by the geographical discoveries. The incursion of this Renaissance spirit into England was tardy, but it was keenly felt at the close of the 15th century.

Wycliff and Chaucer may be, to some extent, regarded as the forerunners of the Reformation and the

few poems have. The breath of solemnity which hovers round the music attaches us to the writer. Every line, here, as elsewhere in Milton, excites the idea of indefinite power. The songs are most enchanting."

Sir Henry Wotton's estimate is that 'Comus' is "a dainty piece of entertainment, where-in I should much commend the tragical part, if the lyrical did not ravish me with a certain Doric delicacy in your songs and order, where unto I must plainly confess to have seen nothing parallel in our language". Saintsbury says "as for its beauty in parts......it is impossible to single out passages, for the whole is golden."

MOHAMMED MAHMOOD HUSSAIN,
M. A., (OSMAN)
Lecturer, Warangal College.

---

right. The philosophy of the brothers may be summed up thus :— " Subdue passion, love God ".

There is a second allegory within the first, and Comus and his crew represent Laud and his party, " who held the enchanting cup of Rome and threatened by force and guile, by fine and imprisonment to paralyse in stony fetters the Lady of the Church ".

In Dowden's opinion " there is much in the lady which resembles the youthful Milton himself, and we may all believe that the great debate concerning temperance was not altogether dramatic, but was in part a record of passages in poet's own spiritual history. Milton admired the lady as he admired the ideal which he projected before him of himself."

In 'Comus' we have many instances of erudition and scholarly study of the classics. The Quarterly Review says: " It would not be too much to say that the literature of antiquity was to Milton's genius what soil and light are to a plant. It nourished, it coloured, it developed it."

It has been pointed out that in 'Comus' Milton reaches a poetic level which he could never attain twice. There is in 'Comus a certain stateliness, an elevation of sentiment, a sort of scriptural solemnity and a vivid descriptive quality. There are Latin words and Latin constructions, but they mar neither its poetry nor its beauty but rather enhance it. The chief merit of the poem lies in its style. Bagehot says " Its power is in its style. A grave and firm music pervades it; it is soft without a thought of weakness; harmonious and yet strong; impressive, as few such poems are, yet covered with a bloom of beauty and a complexity of charm that

feelings of the spectators, and the thought of the story in their minds to which the mask spoke; and this was work of which Johnson at least seems incapable."

Milton made his masque what it ought to be—essentially lyrical and dramatic only in semblance. It was reserved to Milton to equal the great poets who preceded him in the elegance and refinement which characterise this kind of half-dramatic, half-lyrical composition, while he far surpassed them in loftiness and purity of sentiment. Milton gave to what was originally a mere vehicle for elegant adulation, a pure and lofty ethical tone. The dialogues are noble, not however as dialogues, for they must be regarded rather as "a series of exquisite soliloquies setting forth in pure and musical eloquence the loftiest abstractions of love and virtue." If we want to appreciate 'Comus', we must forget altogether that it is any kind of drama.

The main theme of Milton's works is the temptation, resulting in the victory of virtue over vice, as the main theme of Shakespeare's great tragedies is revenge.

In Comus there is allegory, rather, a double one. Milton was the poetic son of Spenser, and in 'Comus' we see some reminiscence of the Faerie Queene when a chaste lady is tempted by an immoral rogue. About the allegory in 'Comus', Stopford Brooke thinks that it is intended to bring out the contrast between the wild license of the court party and the strict life of the Puritans. "The unchastity, the glaring lies, the glistering apparel that hid moral deformity, the sloth and drunkenness, the light fantastic round of the enchanter's character and court are Milton's allegory of the Court society of his time. The two brothers may stand for those who regarded purity as of the greatest efficacy in setting affairs of state

it is so, because Johnson has criticised it as a drama, which Milton had never designed it to be.

Wharton regards Comus as "a suite of speeches, where the dramatic element was not so much in requisition as fanciful imagery in the richest vein." He answers Johnson's criticism in detail ".........Dr. Johnson thinks that in all the moral dialogue, although the language is poetical something is still wanting to allure attention. But surely in such passages sentiments so generous and language so poetical are sufficient to rouse all our feelings. For this reason I cannot admit that Comus is a drama tediously instructive.........The action is said to be improbable............But here is no desertion or neglect of the lady......", and so on. He has tried to answer every objection raised by Dr. Johnson and by reading it, one feels that either his mind is too much saturated with the admiration of Milton in which he can not allow even reasonable criticism, or he has not understood Johnson. However it is true that Johnson cannot be taken as right when he speaks of the harsh diction and the unmusical numbers in Milton, and in condemning it as a drama he is carried beyond his good sense to lose sight of its beauty as a poem. 'Comus' is by no means a regular drama. It is a masque, and a masque observes laws distinct from those of a regular drama.

The success of a masque depends on the poetry and chiefly on the occasion. Its success also depends on decoration, and music, and as they depend on the occasion, they must suit the occasion. A masque might have been splendid when staged at its proper occasion and may not be even tolerable afterwards. "No one can judge how far Comus contradicts Johnson's judgment of its want of interest, unless he can recreate in his mind not only the scene and the occasion and all its interests but also the

Puritanism had eclipsed his paganism to a certain extent. Thus we see that there are many sides of his masque 'Comus', which have been taken separately by several critics for discussion. Few poems have been so variously interpreted and criticised as 'Comus'. Milton designated it a masque, but others have criticised it as a lyrical drama, 'a drama in the epic style', a philosophical poem, a suite of speeches and a didactic poem. Such a variety of estimates is due to the "complex charm and many sided interest and partly to the desire to describe it from that point of view which should best reconcile its literary form with what we know of the genius and power of the author."

Johnson criticises it as a drama and finds fault with its language and songs. He says "as a drama it is deficient. The action is not probable. A masque, in those parts where supernatural intervention is admitted, must indeed be given up to all the freaks of imagination; but, so far as the action is merely human, it ought to be reasonable, which can hardly be said of the conduct of the two brothers..." The patient moralising of the two brothers when they ought to be searching vigorously for their sister, is no doubt a dramatic blemish.

About the songs in 'Comus' and its language, he says, "The songs are vigorous and full of imagery; but they are harsh in their diction and not very musical in their numbers." "In all these parts the language is poetical and sentiments are generous; but there is something wanting to allure attention." In conclusion he says "It is a drama in the epic style, inelegantly splendid and tediously instructive."

This criticism of Johnson is due to the difference of tendencies in the author and the critic. Besides this,

It was Ben Jonson who established the English masque. He made his masks a vehicle less for the display of painting and carpentry than for the expression of the intellectual and social life of his time. There were many other writers who wrote some very fine masques, but the prohibitive cost of the performance led to the decay of masques. The puritan element which was gradually dominating every aspect of social life also hastened the decay of the masque. But there was a temporary revival during 1633--34 and at that time in 'Comus', the masque reached its highest level.

About the sources of 'Comus', Stopford Brooke writes, "Critics have sought for its sources and have found them in Peele's 'Old Wive's Tale', in Fletcher's 'Faithful Shepherdess', in Ben Jonson's masque 'Pleasure Reconciled to Virtue', in a Latin extravaganza called 'Comus' by Hendrik van der Patten and in the Odyssey; but it little matters where this and that come from, the poem, as we have it, is Milton's in every line, in thought, in style, in build, in imaginative and moral power."

Comus was written in 1634 to be presented at Ludlow castle before the Earl of Bridgewater on his becoming the Lord President of Wales, chief among the performers being the Lord President's two sons and a daughter, Lady Alice Egerton. It is the product of his stay at Horton. Milton had called it only 'A Mask', but the name Comus was given to it after his death.

Milton was a great poet and his greatness lies in blending the conflicting aspects of his poetry. "Like Spenser he was the monument of conflicting principles in life and art." These conflicting aspects can be seen in him from the very beginning, but as is quite natural, they underwent a gradual change. In his later years his

Masques were generally prepared for some remarkable occasion such as a coronation, the birth of a prince or a noble, a peer's marriage, or the visit of some royal personage of foreign countries, and they usually took place in the palace hall. Allegory and mythology seemed to be the essentials. Gods and goddesses and personified qualities such as Love, Virtue etc, became the rule. Still the reference to the occasion which had called it forth was as direct as it could well be. The subject or allegory of the masque varied to suit the requirements. Thus in a wedding masque, Juno or Hymen occupied an important part.

The Masque reached its climax in the reign of James I. Even the queen, the princess and nobles and ladies of highest rank took part in them, and they engaged the genius of a man like Jonson. Jonson himself composed twenty-three masques; and Dekker, Middleton and others, Shakespeare alone excepted, were glad to contribute in this manner to the pleasures of a court from which they derived their best patronage and support. However it is obvious that there is an element of masque in Shakespeare's 'Romeo and Juliet',- Romeo meets Juliet in a mask ball—and in the Tempest, which was written or at least staged on the occasion of the marriage of James's daughter.

According to Mr. Evans, the masque was not imported from Italy and has nothing to do with the Italian 'mascherata.' It is quite an English form, simple and native, and it was spelt as 'Mask': even Milton spelt it so. Ben Jonson was the first man who spelt it as 'masque' owing to the effect of French influence. 'Masque' took the place of 'mask' later and at present means the special kind of entertainment, but 'mask' means a 'visor' or a hiding.

THE MASQUE IN ELIZABETHAN TIMI WITH SPECIAL REFERENCE TO 'COMU

THE Courts of Elizabeth and James were long enliver by the peculiar theatrical entertainment called t Mask —a combination of scenery, music and poetry. T origin of the Masque is to be looked for in the revels a shows which during the fourteenth,fifteenth and s teenth centuries were presented on high festive occasic at Court, in the inns of lawyers and at the Universiti In its early form it resembled a court pageant in whi lords and ladies appeared wearing masks, formed a p cession and ended with dancing. Sometimes the perf mers rode to the Court on horse-back, in order entertain the royal personages with dumb-shows a dancing. "In 1377 on the Sunday before Candlemas 1 citizens rode from Newgate to Kensington with torcl and music for the disport of the young prince Richa son to the blacke prince." The rich costumes that we displayed seem to have been the only pleasure deriv from it. By about 1500, the Masque ceases to be a pa tomine. Henry VIII in his earlier and better days h frequent entertainment, consisting of a set of mask and gaily dressed characters. Till then there was nothi but scenery and pantomine. By and by poetical dialog songs and music were added. The maskers had now speak and sing and when high-placed actors (lords a ladies) failed to come up to the level, even professio actors were allowed, but these latter were more oft employed in an anti-masque, a grotesque sample of whi we have in Bottom and his crew in A Midsummer Nigh Dream.

many places in which the disjointedness of Oriental thought is disconcerting to European minds."

Whatever may be the effects of the Bible on English literature it cannot be denied that it has not only increased the vocabulary of the English language, given phrases, idioms and expressions to it, created a taste for simple yet dignified and graceful speech, provided a number of profitable themes, but also contributed a good deal towards the creation of a deep and rousing interest in moral, spiritual and religious problems of life, which can be traced through the whole course of English literature and civilization.

MOHAMMED BIN OMER,
M. A. (ENGLISH).

---

of pottage"; "One who strikes with the sword shall perish by the sword," are common instances of its popularity.

Many Biblical phrases have become part and parcel of the English language; but few people know them to belong to the Bible. Phrases like highways and hedges,' 'clear as crystal', 'lick the dust', 'a thorn in the flesh', 'broken reed', 'root of all evil', 'the nether millstone,' 'sweat of his brow', 'a law unto themselves', are the inalienable heritage of English literature.

In the 18th century the influence of the Bible on English literature was not so marked as in the 17th century. But in the 19th century, it recovered the lost ground. Lincoln admitted that he built up his reading on the study of the Bible; Walt Whitman acknowledged that his model was essentially the melodious pattern of the Holy Book; and Coleridge affirmed that continuous study of the Bible would impart grace, nicety and polish to the style of any writer of English.

It should not be assumed that the effect of the Bible on English literature is wholly benificent. It has had a bad effect also. It has kept alive obscure, crude and enigmatic words and expressions. Hebraisms and archaisms are not wanting in it. Words and phrases have been undoubtedly added to the English language but not a few of them at the expense of "'intellectual clarity.'" "Together with its admirable qualities," writes an unimpassioned critic, "the Bible of 1611 had enormous defects which did not fail to retain a long hold on the minds and therefore on the prose of many Englishmen. Partly because of the obscurity of the original texts, and partly because of many mistranslations of sense, the Authorised Version contains numerous quite unintelligible passages, verses and expressions, not to speak of the

beautiful ever written." Carlyle said, "In the poorest cottage......is one Book, wherein for several thousands of years the spirit of man has found light and nourishment, and an interpreting response to whatever is deepest in him." Macaulay thought of the Bible as "A book which, if everything else in our language should perish, would alone suffice to show the whole extent of its beauty and power." Froude eulogises its "mingled tenderness and majesty, the Saxon simplicity, the preternatural grandeur". Coleridge was so much affected by it that he declared "After reading Isaiah, or St. Paul's Epistle to the Hebrews, Homer and Virgil are disgustingly tame to me, and Milton himself barely tolerable." Huxley opines "Consider the great historical fact that for three centuries, this book has been woven into the life of all that is best and noblest in English history; that it has become the national epic of Britain."

It is difficult to distinguish between the influence of the earlier versions of the Bible and the Authorised Version on English literature. We find an echo of the scriptural themes and language of these versions even in modern sermons, psalms, devotional essays and religious narratives. The Pilgrim's Progress and The Book of Mormon are two examples of this influence out of many. Writers actuated by the highest motives of reform and elevation of society often have recourse to Biblical sayings which they insert in their writing with little or no change, for emphasis, effect and authority.

There are few books in the English language which do not contain modified quotations or allusions from the Bible. Sometimes headlines of newspapers, magazines, books and even articles begin with some Biblical reference, allusion or quotation. "They have fallen among thieves"; "They sold their birthright for a mess

The Bible is marked with loftiness of theme, grandeur of diction and beauty of tone. Its themes cover innumerable aspects of life and experiences of soul. They show comprehensiveness, and form a permanent source of hope, joy and help. "There is" writes a scholar, "no straining for effect, no obtrusive ornament, no complacent parading of the devices of art. Great matters are presented with warmth of sentiment, in a simple style; and nothing is more likely to render literature enduring." Conciseness of detail, economy of words, vigour of style are the qualities which have endeared the Bible to the English people. A wealth of meaning is compressed in a line :—

"And God said, Let there be light, and there was light."

The poets and the prose writers of England, studied the Bible not only with religious denotion but with an eye open to its literary merits of simplicity, beauty and lucidity. Their style and mode of expression were naturally affected by Biblical expressions. This is the reason why the Bible has become an English classic.

The dominant influence of the Bible on English literature can be ascertained from the fact that poets, essayists, critics, scientists and philosophers have unequivocally admitted their indebtedness to the Holy Book. Milton affirms that "There are no songs to be compared with the songs of Zion, no orations equal to those of the prophets." Ruskin considers his taste in literature to originate from the study of the Bible. "I count it very confidently the most precious, and, on the whole, the one essential part of all my education." Newman considered the scriptures to be "Compositions, which even humanly considered, are among the most sublime and

reading and repetition of these admirable chapters. The most literate were preserved from affection and pedantry; the philosopher acquired an alternative to dry and disfiguring abstractness; the ignorant received an ideal which lifted their speech above the level of the rude and the vulgar. A wandering tinker like Bunyan was able, with no model but the Bible, to become a great English prose-writer." Hallam admits that the style of the Authorised Version is "the perfection of our English language." The Authorised Version posseses an interest and appeal even for the ordinary people because of the fact that ninty-three per cent of the words, including the repetitions, are native English.

The Bible may be divided into three species of literature the narrative, lyrical poetry and prophecy. The narrative portion deals with the earliest history of man and the Hebrew race. History is represented in the form of biography. The incidents relating to the career of the people described therein constitute the most interesting and the most enthralling of their kind.

Sincerity, passion and fervour are the conspicuous characteristics of its lyrical portions. Some of the psalms are based upon the wonderful incidents and circumstances of national religion and national history and are described with a wealth of beauty in a charming manner.

The first requisite of great literature is a unity of purpose that gives coherence to varied details. "By this test" says a critic, "the Bible is great literature. One increasing purpose runs through the whole, and is reflected in the widening and deepening thought of the writers; yet it is a purpose which exists germinally at the beginning, and unfolds like a bud."

influence of the Bible on English Literature. Tindale translated the New Testament into English and published it in 1525. His version of the new Testament was based on the texts of Greek and Latin editions and Luther's translations of the Bible. His version was for all, great and small, educated or illiterate; and his humility made it all the more interesting. Coverdale is responsible for completing Tindale's translation of the Bible and the insertion of words of a feminine cast and musical rhythm. The versions of Rheims and Douay are slightly Latinised. It was Tindale who for the first time justified the translation of the Bible into English, defended the English language as entirely capable of imparting Biblical teaching, and ushered in vigorous prose.

All these translations have left in inffaceable marks upon middle English literature, They also helped a good deal in the writing of the Authorised Version of 1611. The Authorised version of the Bible was compiled by forty-seven scholars, appointed by king James I., under the presidentship of Bishop Lancelot Andrews. It was to be read in churches. Even the Puritans preferred it to the versions of Rheims and Douay. The Authorised Version was read by the people with great reverence, facility and ease. Its popularity and constant reading have left a permanent mark on English language and literature. It has made English literature richer and more perfect. More than a hundred years after the publication of the Authorised Version, Swift pays the compliment to the translators of the Bible. "The Translators of our Bible were masters of an English style much fitter for that work than any which we see in our present writing, which I take to be owing to the simplicity that runs though the whole." The opinion is supported and elaborated by a critic who writes, "It is impossible to exaggerate the benefit wrought to literature by the reverent

...OF THE BIBLE

...ATURE.

...elements of universality which ... the head of English iterature. It clearly and coherently gives the details f the origin of man and the world, emphasises the otherhood of nations, and presents the happiness of lividuals and the glory of the Creator in such a simple y that the reader is abundantly interested in it. The aissance of the Hebrew race and the hope of a Deli- r who would bind the people closer to God are the r interesting and hopeful features of this 'Book of s.'

The earliest translators of the Bible considered it visable to render it into English, because of its univer- l appeal, exquisite concreteness and picturequeness f language, charming simplicty of structure and diction nd the sweet beauty of rhythm.

Jerome is generally considered as the first translator hough he considers himself, modestly enough, the reviser of the Latin Vulgate. Bede made a translation of the Gospel of St. John in the eighth century. His Eccelesiasti- al History of the English people seemed to be influenced y Biblical diction. Ormulun and Piers Plowman show the nfluence of the Bible between 1000 and 1400 A.D. Between he age of Aelfric and Wyclif, the influence of the Holy Book was unmistakably prominent in Old and Middle Eng- ish Literature. Caxton inserted the Gospels and portions f the Pentateuch in his Golden Legend. The introduction f the Biblical element in prose is another instance of the

of different notes carol in concert. The soft [illegible] to whisper with the waving forest-boughs as if [illegible]cating some divine message to them, and the Spi[illegible] Pleasure seems to dance up and down the plain. [illegible] morning breeze exchanges carresses with the calm azure sea which seems to have lulled all tempests and storms to sleep.

Oh dull and indifferent man, do not loll in the lap of indolence! Rise early to have a glimpse of the inspiring scenary of dawn.

A Tear. Oh warm drop of water, you came out of your place with a sigh cold as death and long as hope! what have you found out here? You did not bear a trifling pain. You lost your patience, made me lose mine and finally lost your name.

The most delicate part of a gentle heart is your place of birth. Then, why did your temper become so hot and hasty? What sight painful to the eye made you melt away with grief. Oh. Tyrant! you took away the very sap of my heart. Had you made up your mind to *make my eye lose its sparkle?*

Stay, Oh sparkling tear-drop, stay! let my hearts' desire be fulfilled and my object be achieved; then go out from my eyes and even take away my eye-sight with you, for at that time I should have no wish to see any thing more. But alas! you did not hear my supplication and jumped out of my eye on to earth.

You were pleasant like the memory of my love whose spirit has quitted its earthly habitation, innocent like the dimpling smile of child and wild like a sea-storm.

S. M. TAQI HASHIMI, M.A. (OSMAN),

Editor, English Section.

THE INFLUENCE OF THE BIBLE ON ENGLISH LITERATURE.

THE Bible possesses certain elements of universality which have placed it at the head of English Literature. It clearly and coherently gives the details of the origin of man and the world, emphasises the brotherhood of nations, and presents the happiness of individuals and the glory of the Creator in such a simple way that the reader is abundantly interested in it. The renaissance of the Hebrew race and the hope of a Deliverer who would bind the people closer to God are the other interesting and hopeful features of this 'Book of Books.'

The earliest trans'ators of the Bible considered it advisable to render it into English, because of its universal appeal, exquisite concreteness and picturequeness of language, charming simplicty of structure and diction and the sweet beauty of rhythm.

Jerome is generally considered as the first translator though he considers himself, modestly enough, the reviser of the Latin Vulgate. Bede made a translation of the Gospel of St. John in the eighth century. His Eccelesiastical History of the English people seemed to be influenced by Biblical diction. Ormulun and Piers Plowman show the influence of the Bible between 1000 and 1400 A.D. Between the age of Aelfric and Wyclif, the influence of the Holy Book was unmistakably prominent in Old and Middle English Literature. Caxton inserted the Gospels and portions of the Pentateuch in his Golden Legend. The introduction of the Biblical element in prose is another instance of the

of different notes carol in concert. The soft winds seem to whisper with the waving forest-boughs as if communicating some divine message to them, and the Spirit of Pleasure seems to dance up and down the plain. The morning breeze exchanges carresses with the calm azure sea which seems to have lulled all tempests and storms to sleep.

Oh dull and indifferent man, do not loll in the lap of indolence! Rise early to have a glimpse of the inspiring scenary of dawn.

A Tear. Oh warm drop of water, you came out of your place with a sigh cold as death and long as hope! what have you found out here? You did not bear a trifling pain. You lost your patience, made me lose mine and finally lost your name.

The most delicate part of a gentle heart is your place of birth. Then, why did your temper become so hot and hasty? What sight painful to the eye made you melt away with grief. Oh. Tyrant! you took away the very sap of my heart. Had you made up your mind to make my eye lose its sparkle?

Stay, Oh sparkling tear-drop, stay! let my hearts' desire be fulfilled and my object be achieved; then go out from my eyes and even take away my eye-sight with you, for at that time I should have no wish to see any thing more. But alas! you did not hear my supplication and jumped out of my eye on to earth.

You were pleasant like the memory of my love whose spirit has quitted its earthly habitation, innocent like the dimpling smile of child and wild like a sea-storm.

S. M. TAQI HASHIMI, M.A. (OSMAN),

Editor, English Section.

throwing away the delicate petals of beautiful flowers. Their selfishness, wickedness and barbarism is deplorable.

Their hearts become so invincibly hard that the sight of every delicate and beautiful thing tempts them to annihilate it. If they see anything graceful and in a flourishing state, their hearts begin to burn in the fire of enmity and jealousy and they exhaust all their energies in making attempts for its extirpation. If their efforts do not fructify, they burn and exterminate their very beings in the fire kindled by themselves.

Dreamland. It is said that the nature of dreamland is like that of a Utopia, mirage or fancy and that, truly speaking, it has no existence. But for me it is gayer and more attractive than the world of wake fulness. My love, whom I cannot hope to see any more appears, like some angel, on the coloured horizon of my dream, and encompasses my whole existence and illumines my soul.

Once I had a dream. In the white light of the moon, a golden chariot was rolling in heaven and my love, wearing a golden crown, was seated in it. I asked: "Whither, my soul?" He smiled and instantaneously a splendour enveloped the whole universe. My eyes were dazzled and I awoke from sleep.

Dawn. Dawn is the fountain-head of rosy hope and charming love. It sees Nature yawning after waking from her sweet and balmy slumber. Night showers pearls of dew on the path to trodden by dawn. Flowers bloom to adorn Nature and to be viewed amorously by Phoebus, her lover, on his journey to the West in his golden chariot. The dead silence of night, that had wrought talismanic effects upon the universe, is broken, and enchanting music is diffused in the atmosphere. The sky-lark warbles high at the gates of heaven, and birds

bances and turmoil of life, indulges in the sound and sleep of death.

It had been my conviction that I was learning ways of life; but now this realisation has dawned upon me that I had been learning ways of death. Rust eats into iron and stagnant water is rotten and frozen in winter. In the same way, sloth and indolance absorb all the forces stored in man.

Cruelty to Flowers. This world produces multi-coloured and multi-formed flowers. Some flowers are so fragrant and attractive that they involuntarily and spontaneously engross the attention of the passers-by, at least for a short duration of time. Some pluck them to make bouquets, to grace their drawing-room tables, which, apart from lending beauty and charm to the place, feast their eyes and noses with their hue and perfume.

As flowers are of different colour and smell, so there is variety in human disposition. Some persons shatter all hopes and crush all desires of flowers by separating them from their stalks for their own enjoyment and entertainment. Buds, being overjoyed to hear the melodious warble of the nightingale in the garden, open out, and flowers toss about in ecstasy and merriment. As soon as they, puffed up with the pride of their transient life, rear their heads to have a glimpse of the bewitching scenery of spring, the cruel gardeners, like some unforseen calamities, all of a sudden pounce upon them and trample down their long-cherished ambitions and desires—— a fact most harrowing to individuals having sensitive temperaments and love of nature.

In brief, these men have so much obduracy that they feel genuine satisfaction and pleasure in pinching and

Timei s, in reality, a nonentity, a whim and an image.

Destiny. From time immemorial, it has been again and again told by ordinary mortals that destiny, too, is a dormant power. Human thoughts, emotions, mind and wisdom have no part to play in human occurrences. Human existence is completely at the mercy of fate. Fate bears the torch for man in the dreary gloom of calamities. The flight of human comprehension is only confined to the surface of ordinary events and their depth is inacessible to it. All incidents of life are only governed by destiny. Justice and fair play have no place in the world of man, All occurrences are pre-destined.

But, on the contrary, the wise think that fate is a nonentity. It is merely the profile of the picture of human superstitions, It is simply a collection of words and a complexity of ways of expression. We follow the sayings of the aged; the dictates of the wise and the thoughts of our predecessors so far as they benefit us, are valued up to the time they continue to cause happiness, pleasure and comfort ;and if the same bring about troubles and pains, the responsibility is thrown upon fate. If we are successful in reaching our goal, we account for this success by our day-and-night labour, and in case of failure, we blame our fate.

Life and Death. O slumberer! are you aware what slumber is? Slumber is a picture of death; it is a shadow of mortality. Oh! why do you not perform such deeds as to make life a picture and shadow of eternity.

Vice leaves impressions of grief and affliction upon the mind. Our memory does always vivify these impressions, but death annihilates memory.

As an individual enjoys sound and balmy sleep after getting tired of daily toil, so a man, weary of the distur-

what poetry is. Poetry is a reflection of the image of beauty. It lends vivacity and grace to amorous writing. It is a drop of the heart's blood and a store of effects and impressions. It is a plant of forsaken love and a commentary of pleasure which a lover feels in waiting for his beloved, It is poetry which works as an effective remedy for degradation and, like a Messiah, infuses life and animation into dead and degenerate nations.

Time. Our ancestors used to say that time is eternity, and that the people who waste time are in reality losing eternity. There is no such thing in the world as virtue ; the right application of time is itself virtue.

What does this word time, signify? Time is an infinite sea, a boundless void in which a multitude of words move and which envelopes mysteries of existence and mortality. " Men may come and men may go ", but time goes on for ever.

Whatever we have done is called past; whatever is going on is designated present; whatever we would do or intend to do is named future.

But all these periods are within, not without, our existence, The past is preserved in our memory ; the present is the focus of our attention ; and our ambitions and desires are reflected in the mirror of future.

Our life is tantamount to a continuity of expectations. In other words, life is another designation for expectation and hope.

Sometimes the fulfilment of our desires hinges upon time and sometimes time itself seems to depend upon our ambitions. We divide time into days, months, years. centuries and epochs, and are glad of this insignificant division. We think that we have measured time by so doing a notion which is highly fallacious.

REFLECTIONS.

Literature is the essence of life and the heart of the universe. It is an ethereal bird which soars up to dizzy heights with the wings of woe and happiness. It is a mirror which reflects all human dreams and aspirations. Man kneels down before the awe-inspiring majesty and the blazing beauty of Nature and trembles with fear when he peers with microscopic gaze into its horrifying and curious penetralia. All these emotions s em to flash about the pages of literature.

The human heart throbs with love of knowledge and this uneasy feeling, too, finds its way into literary productions. Literature is an eye of the universe which pierces the perpetual depths of nature.

Literary productions should be enumerated among the wonders of world. A man of letters, thousands of miles away, after collecting and collating certain words, produces a thing which can be compared with magic. The people who are wholly unacquainted with the author, can make an accurate estimate of his personality after a study of this collection of words.

Poetry. This life, this beautiful life, must amount to death, if it does not relish poetry. Poetry awakens the feelings that are in slumberland, and resuscitates the dead sentiments. It holds up a mirror to the concealed beauty of nature and the poet is its confident. It is a repository of the events of eternity and a gallery of the pictures of human thoughts. It gives us everlasting spring and periods of uninterupted pleasure and enjoyment, and transports us to the world of joy and bliss and immortal beauty. Ask any one, given to infatuation,

the loss of the morning lectures. Another bus has been called, but I am not very optimistic about its coming. Meanwhile the motionless bus has become an object of general curiosity. People come and people go, but it stands still. And we too stand still. It is now half-past ten. But the melodious sound of the expected bus is nowhere audible. Another ten minutes pass. My friend Z grows very impatient. His vexation at last bursts forth in these spontaneous denunciations:

Ruin seize thee, ruthless bus!
Thou dost not come, I cannot wait.
My wrath I never shall suppress;
I'll knock the driver on his pate.

But hark! the rumble of a storm is growing audible. The bus seems to come. Yes, it is coming. It comes. The driver looks very cheerful. The boys rush together, jostling and pushing each other. But nobody knocks him on the pate. The conductor is a peculiar mixture of black and white. Nobody seems to be angry with him for this delay. His general appearance is welcome to all of us—with a heroic smile he signals to the driver to start. At last we proceed with regal solemnity And the heavenly airs of Adikmet make us forget all our sorrows and sufferings.

M. NAIMUDDIN SIDDIQI,
4th Year B. A. Class.

Even its owner has seen better days. I must admire the chauffeur's skill in wielding such a machine. But behold! all eyes turn in one direction. What is the object of their gaze? Why here comes 'Miss 177' sweeping like a whirlwind in her car! Glancing fitfully at her ardent admirers, she passes by: —masculine at the steering wheel, but ever conscious of her femininity. The charm of this golden dream is broken. Thundering from the Bijli Mahal comes that magnificent bus, that proudest achievement of science! what a melodious sound it has —what a glamorous colour—what a fascinating roominess—what a... .....

But how powerless is human will against predestination! Alas! poor thing! One of its tyres has burst with the noise of a cannon shot and there rests the magnificent bus, reclining with a resigned look in a corner of the road. O! what a fall was there, mighty 'Albion'!

I begin to wait anew. I try to be interested in the passers-by, with eager expectancy, I gaze at the approaching cars. Very soon I begin to realize that the possession of a car turns men into gods. They do not condescend to stop. They do not worry about us—and why should they? What right we have—in the humble capacity of students—to stop them and waste their time, though they may be bound to the same destination? But some of us have the curiosity to experience the sensation of sitting in other's cars. They are eagerly watching the procession of cars. A venerable gentleman passes by, with a profound solemnity in his looks, and a celestial fire in his eyes; reading—or pretending to read—a book. Another comes, and under the apalling sense of the heavy responsibility of picking up a few boys, turns his face in another direction. A third approaches; looks with some curiosity at the bus and at the confused mass of boys; but his car is going too fast to be stopped. And then a fourth, a fifth, and a sixth. I begin to despair. I brood over

ON CATCHING THE BUS

I usually wake up early in the morning. But I am obliged neither to the alarum nor to the shrill voices of the housemaids for this early awakening. Thō haunting thought of home work and tutorial work is enough to keep me awake even for a whole night. To be short, I wake up. I look at the clock. It strikes only six. I begin to think that still a lot of time is at my disposal. In the next moment I am again found back in my bed ....Some body knocks at the door. It is father perhaps. I immediately get up, take hold of a bulky book, and shut it as noisily as I can. I open the door. I stand with a martyr's look beside him. "Oh, I see," he exclaims regretfully, "You have been reading for a long time, But do you see that now it is about nine o' clock?"

I breathlessly look at the clock. It is fast perhaps. No, it is not. I begin to blame its accuracy and my indolence. I hasten to perform all those processes which nature and custom have imposed upon me. I breakfast without knowing what I am eating. I take my books. I shut the room. I walk briskly. I come to the bus stand.

My eyesight is powerful enough, but the bus is nowhere to be seen. The "blue chaps" are all assembled, chattering and laughing; passing hurried comments on fleeting beauties.

Quarter to ten, and still no bus. I begin to grow impatient. I am interested in the passers-by. Vehicles of all sorts and descriptions are rolling on the road. Tottering ahead and braying like a donkey comes a car, whose appearance shows that it has seen better days.

people of various provinces, and will thus bridge the gulf of differences in culture and standards of living, which are essential aspects of the communal problem.

To conclude, then. The use of a common language, the popularization of education, and the development in economic life, coupled with a consciousness among the people, are the contributory factors towards the establishment of communal harmony. India is one country, and its inhabitants must necessarily be one type of people. To differentiate the stándard of living, to use different languages, and most of all, to stimulate the narrow prejudices of the masses, are the most pernicious efforts which an Indian can indulge in. And yet India has, among its leaders, many such people who work under these impulses.

M. NAIMUDDIN SIDDIQI,
4th. Year B. A. Class

---

expectations, all opportunities for the establishment of communal harmony, afforded by the government, have been disregarded by our leaders. They still persist in their negative attitude ; their enmities are still irreconcilable ; their feelings are still swayed by narrow prejudices. The time has come when they must realize that circumstances are favourable and they have to utilize them; and that so long as our internal disruptions exist, we have no right to scream for independence.

Some people desire to see a revolutionary change in India's social life. They suggest various remedies for the solution of the communal problem, which are neither effective nor practicable. Neglecting all such suggestions, let us consider some practicable remedies which may, without bringing about a chaos in social life, contribute to the establishment of permanent communal harmony.

The first step towards the development of India's national life, and consequently, towards affording opportunities for unity in ideals and interests, is the popularization of education. It will not only widen the vision of the average man, but will also uproot the implacable prejudices which ignorance has fostered in him. If a common language is used throughout all the provinces as a medium of instruction, it will materially influence people's attitude, of mind and create a uniformity of a ideals and aspirations, among the educated classes.

The attainment of economic independence is also an important factor in the creation of a general atmosphere of unity and harmony. Adversity, discontent and resentment at circumstances tend to stimulate moroseness of temper and pugnacity of nature. Being industrially developed, India will become one country in the true sense of the word, and its extensive means of communication will afford opportunities for the contact of

does not mean that I am advocating shallow and unseasonable optimism. But being myself an optimist, I have a profound faith in the endeavours of my countrymen, in the sublimity of their ideals, and in the chances of success.

Suggestions for the solution of this problem will necessarily involve an examination of those causes which contributed to its establishment as an outstanding feature of our national life. It is evident that the cultures of the various communities are so entirely different from each other, that harmony is difficult to imagine. Nothing is common among them, except, to a certain measure, a language which came into being by the contact of the two major communities of India. I mean the Urdu language; and it would scarcely be an exaggeration to say that this language will exercise a paramount influence on the national life of India. I must stress the necessity of popularizing this language throughout India, for it is one of the determining factors in the establishment of communal harmony. We can bridge the widening differences between communities, by using a language which is the proudest heritage of our ancestors. It intensifies our feeling of national unity, and contributes to our endeavours at its attainment.

Apart from the acceptance of a common language, we have to bring about a fundamental change in our attitude towards international affairs and their relation to our own national life. I had expected that the outbreak of war would materially change the attitude of the Indian people, that a sense of the impending calamity would create a harmonizing influence over their hitherto prejudiced minds, and that a catastrophic international conflict would awaken a consciousness of our own deficiencies. But it is deplorable that, quite contrary to my

THE COMMUNAL PROBLEM OF INDIA.

PEOPLE who cling to an ancient past have a pride in the antiquity of their accumulations. We have a strong faith in the achievements of our ancestors, and our hearts are imbued with a sense of superiority when we cast a restrospective glance upon our national history. But all this pride shrinks into shame and mortification, when we compare these glorious epochs with our own degenerate times. We have many difficulties to overcome, many dangers to defy, and many painful realities to face, and none of them is so conspicuously overwhelming as the communal problem.

This problem has now assumed such alarming dimensions that it is impossible to grapple with the deficiencies in our social and economic life without devoting attention to the communal disruption. It is difficult to trace its early manifestations, but it cannot be denied that it gained in intersity along with the diminishing power of the Moghul Emperors. Then a fundamental change was brought about in India's national life, and consequently, in the attitude of the people. Suppressed resentment at the domination of an alien power stimulated the pugnacity of the Indian people, which manifested itself in an interminable succession of communal riots and disruptions. It is uncharitable to say that a foreign government is responsible fot this evil which is exclusively the outcome of our own perversity.

But let not the complexities of the existing situation shock our sanguine expectations of a brilliant future. It

Fortune smiled and then gave a loud laugh, "Oh Youth! go back quickly and bring also with you purses of gold without which success is impossible".

MOHD. MUKHTAR AHMED,
B.A., (Osman)

WEALTH IS THE STEPPING STONE OF SUCCESS.

FORTUNE caught the hand of a young man laughingly and brought him to a lonely corner.

"My beloved! do you want success?" said Fortune to the young man. The youth with lustful eyes nodded his head in gratitude.

"If so, then come tomorrow outside the world of troubles and anxieties and see me at the gate of Chance", said Fortune looking into his eyes. The next day Fortune seizing the hand of the youth was going. "Have you got some provision for this journey?" after proceeding a little said Fortune, turning towards him.

"Indeed", said the youth and laid down a bag from his back. He presented proudly the contents of it separately bofore her, "See, this is truth, this honesty, this is labour and this is ability". "Are these things insufficent to pass over the difficult stages of this journey?" said the youth. The brow of Fortune was clouded and she turned her face away. "Are these talents not hopeful for success?" said the youth again. "Success, Oh simpleton! this is the twentieth century in which ability, truth, honesty and even labour cannot help a man to achieve success. All these things are insufficient unless........." "Unless?" the youth interrupted, suddenly looking at her with wonder and fear.

sleepy and silent, the Japanese would have never reached the pinacle of success.

The stagnant nations were awakened and brought to the path of progress when their depressed condition was placed before them in poetry. They realised their condition and tried hard to improve it. Their poets always revived the feelings of depressed nations and accelerated the progress of already advanced nations.

In India, the Hindus are very much indebted to Kalidas and other poets who created among them national feelings and caused them to flourish as a nation. The loss of their poets was a disastrous blow to the Hindus. When the Muslims were conquered in India, their condition was deplorable, but their poets, like Sir Syed and Hali, awakened them through their nationalistic poetry. Hali composed a long poem *The Ebb and Tide of Islam*, dealing with the past glory and present position of the Muslims in a simple and dignified style. It was this that revived the national feelings of the Muslims of India. Iqbal also did the same work with great success. Josh is a great personality among Muslims who is trying his best to rouse the people.

In brief, national poets supply motive-power to nations for their forward march and national poetry, in the main, galvanises the world into activity on which hinges the civilisation and betterment of humanity.

MD. MUKHTAR AHMED,
B.A., (Osman)

THE PLACE OF POETS IN NATIONAL LIFE.

POETRY expresses the real feelings and thoughts of a person in suitable and impressive words, arranged in a metrical order. Sincere poetry has great power which produces great results. Generally, poetry written in a simple but dignified style is very effective. Common experience shows that nothing helps substantially in building up a nation so much as poetry. Poetry not only creates feelings and a sense of judgment but also elevates our outlook. There is something in poetry which leads a man to another world, where it moves the hopes, fears and doubts that are hidden in the bottom of the heart, in such a way that he becomes impatient. This condition mingles with the struggle which is necessary in our life. To create sympathy among men and to tie them into the chain of brotherhood, is a great human achievement. The political leaders undertake this object but they can not achieve great success because they have not the lofty imagination which is essential in a poet. Real feeling and emotion is not created among men unless their imaginations are inspired.

The spread of civilisation and development of national feelings were largely due to the great thinkers and poets of the world. We find a number of poets in Greece and Rome who effectively organised their nations. England is very proud of her national poets who played a great part in building up and in advancing their nation. National feelings and the desire for betterment and uplift, were roused by the poets in Japan. Had the poets been

ır movements are already afoot; and it is not un- ʳ that in course of time, laws penalizing habitual ing and the importation and manufacture of liquors ɔe imposed

SYED ALI MOHOMAD MOOSAVI,
IVth Year B. A.. Class.

---

naturally leads to frightful physical disorders, the ultimate being delerium tremens in which the toper's hands tremble, his eyes wander, his pulse becomes feeble, he has no appetite, and he cannot sleep. Nor is this all: very often, he becomes subject to imaginary fears; and, in cases where the delirium is succeeded by insensibility, death invariably follows.

The use of alcoholic liquors begets yet more painfull results: the drunkard's conditions is marked by listlessness, indecision of character, and loss of mental and moral power; his stomach and liver are incurably affected, his brain is softened and he grows silly, and in course of time is wholly or partially paralysed!

While medical science has given the civilized world the indulgence of drinking mild liquors in moderate quantities at prescribed times, the great advocates of moral advancement in Europe and America have not been blind to the pernicious effects of habitual drinking and have not been slow in creating Temperance Societies to discourage tippling as a moral vice. As early as 1825, Temperance Societies were started in America; where Temperance propaganda was highly successful. England followed suit in 1831; and there, the work done by the Church of England Temperance Society, and the British Women's Temperance Association has been commendable. These movements though not successful in securing legal reforms, may yet claim to have reduced drunkenness very considerably. The Indian National Congress deserves praise for creating Temperance Societies in every province. During the last one and half years, these societies have tried to uproot this injurious and harmful habit of drinking. In Hyderabad

TEMPERANCE.

A good habit is universally recognized as a virtue. As there are good habits of doing certain acts, so there are good habits of refraining from certain others; and these two classes of habits respectively constitute what may be called "positive" virtues. Now the habitual use of liquors as beverages is, for obvious reasons, a bad habit, and therefore, a positive vice; and abstinence from such use is a good habit and therefore, a negative virtue, which goes by the name of Temperance.

Temperance is valuable in several ways. As a moral discipline, it protects men from dissipation and ruin; as a physical safeguard, it ensures the healthy working of their bodies; and as a social institution, it leads to the general refinement of the community, For these reasons it was that Islam, more than any other religious system, enjoined total abstinence from intoxicating liquors; and, according to the Quran, drinking is a sin which, since the time of the Prophet and his successors, has been punishable as a heinous effence. The influence of western civilization removed the ban, causing some of the followers of Islam to indulge themselves.

From a medical point of view, the evils of drinking call for serious consideration; for the harm done to the drunkard's body is naturally more immediate, more pain-full, and more destructive than the injury done to his morals. No doubt, drinking within moderate bounds and with certain restrictions is some cases medically recommended as wholesome; but the prescribed bounds may soon be broken and the restrictions entirely ignored, and indulgence in excess be freely practised. This

either the Greeks or Hindus. Mohammed-Bin-Musa translated "Siddhanta." At the same time the Hindu Table with notes and observations. The reign of Mansur was fertile for the production of great astronomers like Yehaya-bin-Ali, Mansur and Khalid-bin-Abdulmulik. Their observations concerning the Equinst the appearance of comets cannot be forgotten. The name of Al-Batani (?-929) stands first and foremost for his astronomical table which affected the world in a marked fashion and it was later on translated into Latin. "Zijul-Akbural-Hakim" was decidedly the greatest achievement of Ibn-Younus, which not only displaced the ancient theories of the Greek astronomers but was produced and reproduced (1079) by the Persian poet-mathematician Omer Khayyom, by the Greeks in the Syntax, among the Mongols by Naseruddin-Tusi.

The Arabs were capable of marking out heavenly bodies and they originated the terms "zenith, azimuth, nader" which are still used even to this day. They were the Arabs who built Tower of Seville for observation of the heavens and it was built at Basra in 1119 by Abu-Al-Hasan, It was he who explained the apparent increase of heavenly bodies at sunset which helped Kepler in his theory of refraction.

Things often in this world have been wrongly associated with the names which are not, after all, those of the real discoverers, and this is true of mathematics in this particular. But as long as the work of the Arabs exists their contribution will be remembered and we can not but agree with the fact asserted by Hoyland :- 'In Philosopy, in History, in Mathematics, in Science, in Poetry and above all in Medicine, the world owes much to the Arabs.'

S. NASEERUDDIN AHMED
IV. Year B.A. Class.

tions are his main achievements. His general tables are the finest specimens of accurate observation.

The gradual development of pure mathematics led them to concentrate their minds on the practical application of those rules and problems which they had previously sought. The name of Al-Bagdadi requires a passing mention here, not only because he wrote treatises on Trigonometry for land surveying but also because of his work on spherical Trigometry which forms the very basis of higher Astronomy.

The genius of the Arabs particularly for mathematics was proverbial and they had such an enormous influence over the Western countries that the scholars from abroad would visit the Arabs to learn the principles taught by them. An Englishman Aderald (11th cent.) of Bath, Daniel Morely of Norfolk, and students of Oxford and Paris universities went to Spain where they learnt mathematics, physics, and Arabic and having returned to their countries, taught the very principles learnt from the Arabs.

We must keep in mind the fact that in the reign of Henry I, geometry and algebra were taught by the Arabs and it was through the medium of the Arabic language that the elements of Euclid were first introduced into Europe.

Astronomy was a favourite subject of the Arabs. The Arab astronomers therefore, composed tables and wrote treaties on the measurement of time. Mashalla who flourished under Mansur was an intelligent astronomer who studied the nature and movement of celestial bodies. Ahmad-Ibn-Mohammed (who also lived in the reign of Mansur) wrote from his own observations an Astronomical Table, known as "Al-Mustamal" which is a master-piece and superior in conception to that of

THE CONTRIBUTION OF THE ARABS TO THE MARCH OF MATHEMATICAL RESEARCHES.

WE have full evidence that the ingenious people of Arabia had an ardent love of art and science, at a time when all Europe was envelopod in the total darkness of ingorance and when Newton, Galileo and Darwin were not born, which enabled them to reveal the mysteries of heaven and earth. We even believe that the Arabs were wise enough to preserve much of Greek learning.

It is impossible for us to dogmatise about the actual beginning of mathematics but let us consider the part played by Arabs in the field of mathematics and their contribution to the civilisation of the world.

The Arabs were great mathematicians. The "Cipher", one of the vital elements of the science of numbers is from "Ciphra" (which means zero, blank, or nothing,) forms the basis of the decimal system. Geber was the founder of Algebra, the science of numbers which is still called after his name. Abu-Musa, an accomplished mathematician of the ninth century, substituted science for chords in Trigonometry. He not only applied mathematics to Astronomy, but also invented a common method for solving quadratic equations. Ibn-Korrah discovered a new science which is known today as analytical geometry, by the combination of Algebra and Geometry. Abul-Wafa (937-997) a native of Khorasan was a well-equipped geometer. The use of the Secant and Tangent in Trigonometry and astronomical observa-

woman pitied him and promised to help. She then turned him into an ant and told him to hide himself in her cloak. Presently night set in and the giant returned home. He laid his head on her lap and fell asleep. As soon as he began to snore, she pulled out three golden hairs, This made the giant growl with anger and asked explanation. She replied him that she had an horrible dream which had frightened her out of wits and that she had unknowingly pulled his hairs.

Early in the morning the giant rose and went out The old woman turned the ant into a young man again and gave the three golden hairs. He joyfully went to the palace and gave it to king. The king became indignant and enquired of him as to the place from which he had got these hairs. The greedy king went in search of it, but was never heard of again. Probably he was devoured by the terrible giant.

S. VENKAT RAO,
JUNIOR INTERMEDIATE.

---

message to the queen and in return he would give him two pieces of gold. The king wrote a letter to the queen instructing her to put an end to his life immediately. The innocent youth set out with the letter but missed his way and in the evening he came to a dark wood. There he found and old woman sitting in a small cottage. She enquired of him his mission and advised him to take to his heels as this place was inhabited by robbers. But the young man pleaded with her to give him a night's rest. The old woman pitied him. The young man laid the letter on the table and feel asleep.

The robbers came home and were informed that she had given him a night's rest. The leader of the robbers took up the letter and read its contents. He destroyed it and wrote a fresh one desiring the queen to marry the bearer to the princess as soon as he arrived. When morning dawned, they showed him the right way to the palace. As soon as the queen received the letter, she made all the preparations for the wedding.

After a while the king returned and when he saw the prediction fulfilled, he asked the queen what his orders were and what she had done. The queen showed him the letter. The king at the very sight of the letter grew furious and asked his son-in-law what he had done with the letter he had given him. The young man replied that he had taken shelter in a robber's hut for one night and had left the letter on the table. The king angrily ordered that until he brought three golden hairs from a giant, he would not have the princess. The young man was perelexed but took courage and departed.

In his wanderings he came to river, He crossed it and reached the other side. He entered a big cave and was amazed to see an old woman sitting on a chair. He told her humbly the tasks set by the king. The old

LUCKY STAR.

IN days of old, when you and I were not born, there lived a poor man with an only son, who was fortunate enough always to be under the influence of a star. Many fortune-tellers predicted that he would, in his eighteenth year, marry their king's daughter. This news reached the ears of the king. So he passed through the villages in disguise and questioned the passers by as to whether there was any news. They replied that a poor man's son was expected to marry the king's daughter in his eighteenth year. This displeased the king very much. So he went to the parents of the child and asked them whether they would sell their son, but he received a negative reply. The stranger begged very hard and offered a great deal of money. They had scarcely bread to eat, so at last they consented with a heavy sigh.

The king took the child, put him into a box and rode away. But when he came to a deep stream he threw the box into the current. The box however floated down the stream and some kind spirit watched over it and at last it stopped at dam of a mill. The miller saw it, drew it towards the shore and opened it. To his utter surprise he found a pretty little child. The miller and his wife had no son. Soon they rejoiced to see the prize as though it had been sent by heaven.

Seventeen years had passed away when the king by accident came the mill and asked the miller if that boy was his son. The miller replied that the found him in a box some seventeen years ago. The king guessed that this was the child whom he had thrown into the water. So he asked the miller whether he would spare him to carry a

egoism. Iqbal showed that the secret of life is revealed not by the negation of self, but by its assertion. The universo is the expression of self. "Foster and develop the self for it will lead you into a higher and larger self that transcends our individualities and you will emerge from petty individualism into a sense of real kinship with all existence".

Iqbal himself passed through all these stages. He started his poetic career under the baleful influence of self-abnegation and pantheism, then the secrets of self and the unity of existence were revealed to him, and fiinally he passed into a transcendent selflessness.

It is a striking proof of the greatness of Iqbal, that he had a host of followers in each successive stage of his spiritual development. When he was singing the songs jo self abnegation, every one else was harping on the same tune. When he sounded the clarion of self-assertion every lyre sent forth the same music and now his nationalistic song has become a nation-wide chorus. Muslim culture and politics to day are deeply indebted to Iqbal.

Like a caravan that had lost its way, the Muslims were wandering aimlessly in a political wilderness. But this great seer, with his rare insight into life and religion showed them the way which is rapidly being recognised as right.

There is no poet living or dead, in India and Persia, in England and America, who has been imitated to such a degree; whose voice has found such an echo in the hearts of millions Iqbol is so closely copied by his contemporary poets, that the style, language, subjects, even the metre and also the way of reciting poems is the self-same which was Iqbal's.

RIASUT ALI MIRZA,
B. A. (Osman) L.L.B. Prievous.

THE TEACHINGS OF IQBAL

EIGHTY years ago a voice was heard in Islamic circles in India which filled the earth and the sky. It came from Aligarh

So loud was Sir Syed's clarion call that, while awakening Muslims from their deep slumber, it echoed through the length and breadth of the country, and stormed the whole Muslim world in India. The Muslims' past and present made Sir Syed weep and the future remaing ever before his eye he gave advice, warnings and counsel in a stateman-like way through his speeches and writings. The first man to carry Sir Syed's message through the vehicle of poetry was Hali. A sketch of the past and present was so skilfully drawn, and so pathetically was this story told that no finer example of such poetry can be found in the history of verse. Hali was acknowledged as the greatest national poet of Islamby his friends and foes alike. Still Sir Syed's message was a bare outline—what he did was to make the nation understand itself, comprehend others, and also to determine its future. This very future was still to be explained in detail.

Iqbal did this, and he also turned the attention of Muslims from the past to the future. He depicted this thought through the medium of poetry and literature so passionately and with such ecstasy and rapture that it became his own. Hali was the poet of our present; Iqbal of the future.

The teachings of Hinduism, Buddhism and Christianity, all stressing the negation of self, were wide spread among the Muslims. Mysticism and monasticism paralysed their physique, self-effacement resulted in individual

child direct to sunlight. The effect of this irradiation is found to be the production of Vitamin D. This varies according to season and countries, on account of intensity of irradiation.

Often the diet of children is over-rich in starch and carbohydrates and the obvious results are rickets and irregular growth of teeth, so the supplementation of Vitamin D as an essential factor in the diet is urgently required, for while the milk teeth are in use, the second set of permanent teeth is always in the sockets. So for the growth of these permanent teeth, the supply of this Vitamin is invitable. Deficiency of Vitamin E chiefly contributes to sterility. Its absence in male or female causes sexual weakness. It is found in vegetable tissues; its richest sources are wheat, cream, lettuce leaves and to some extent it is found in muscle fats, egg-yolk and milk.

To avoid these various diseases and weaknesses, Vitamins are indispensible in diet. They remove weaknesses and it is possible that the so-called 'deficiency' diseases can be easily cured by the adequate regulation of diet. Especially during gestation and lactation, the off spring's development wholly and solely by depends upon the mother's diet and if the supply of these vital factors is inadequate, many diseases develop spontaneously such as beri-beri, pellagra, xenopthalmia, scurvy, irregular development of bones and organs, while among adults diseases of the abinentary canal such as indigestion develop, and often the nervous system is seriously harmed.

GULAM GOUSE KHAN,
M.S.C. PREVIOUS.
Joint-Editor, English Section.

yet been determined. Their mode of action too has not yet come into light but in effect their constant supply is analogous to harmones. They are normally present as an accessory factor in certain foodstuffs in very small quantities. They are divided into two separate categories, the water soluble Vitamins B 1, and the fat soluble Vitamins B 2, for they are chiefly associated with fatty food stuffs. As a result of the further advancement of vitaminology they aresubdivided into C, A, D and E.

Vitamin B 1, is very important for the cure of 'beri-beri' in man and lack of B2 causes Pellagra. It generally exists in yeast, milk, egg, wheat germs, tomato juice, Vitamin. C, if it is not taken in the required quantity causes scurvy. It is found in the green leaves of cabbage, juices of lemons, oranges, grapes, tomatoes, and in small amounts in potatoes, meat and milk. Deficiency of Vitamin B also badly affects nerves, muscles and skin.

Vitamins A, D; and E are fat-soluble Vitamins and their supplementation with diet is essential, otherwise growth and weight is restricted and in their absence it is also found that animals die. They are found in cod-liver oils, fish, egg-yolk, milk, butter, cereal seeds, embryos and in other body fats of animals. Vitamin A is most important for the improvement of health and exerts effective influence upon cells, lining the alimentary and air passages and upon epithelial layers; it strengthens and enables them to prevent infection; moreover it cures rickets and xeropthalmia (blindness usually in animals in the night). Its natural sources are liver fats of many mammals and fishes. Its most important associate is Vitamin D, which calcifies the bones and prevents rickets in the children. It is abundantly present in cod liver oil. But in 1919 Hulds chin sky discovered that rickets can also be cured by ultra-violent irradiation of the mercury vapour lamp or by exposing the body of the

VITAMINS AND THEIR VITALITY.

IN the days of Lebeg and Bunj it was assumed that fats, carbohydrates, proteins and salts are sufficient for the maintenance of life, but with the opening of this ceutury more attention was devoted to the problem of nutrition and growth, resulting in discoveries of Vitamins, which added a new chapter to the research history of nutrition.

Lunin, a French scientist, first seriously dealt with the question of diet in 1881, and reached the conclusion that fats, carbohydrates, proteins and salts, the essential elements for health, required supplementary elements for the maintenance of growth, the lack of which leads to a well-defined morbid state. The realisation of these supplementary factors of diet induced the biochemist to detailed laboratory study. In 1912 Professor Gowland Hopkins published his six years' startling research on rat feeding, which aroused the profound interest of the world's biochemists, concerned with the problem of nutrition. Steph in 1909-12 in Germany reached the similar conclusion that a pure diet of fats, carbohydrates, proteins and salts is not sufficient for health deficiencies. Experiments were also performed in America and other countries to find out the obscure reasons of the deficiency of diet. It was also discovered that 'beri-beri' is developed by the exclusive and constant use of polished rice and then it was definitely found that pericarp of rice contains vital materials, the absence of which results in this disease. Funk in 1912, considering these materials as amino-derivatives, suggested the name of Vitamins.

These vitamins are substances of unknown composition, their chemical formulae and constituents have not

between the devil and the deep sea. The allies by diplomacy are coaxing the neutrals to join their side. On the other hand Germany is trying its best to use the neutrals for its own purposes. In the mean while President Roosevelt's latest move for peace among the warring nations has created a ray of hope in the gloom of Europe. As events move, the horizon seems to be too dark for such a hopeful dawn.

Every day things are going from bad to worse. A deadly struggle may commence the moment spring dawns on unfortunate Europe. To-day every heart in Europe throbs with fear and sorrow as to the future of mankind in this war of atrocity and destruction. Providence alone can save humanity.

GULAM DASTAGIR,
4th. Year B. A., Class.

---

by Japan against China for the province of Manchukuo, the Abyssinian War, the Spanish Civil War and the rape of Austria and Czechoslovakia have brought to light the fact that the League was but an impotent institution. The Dictators by their diplomacy, cunning and arms have sounded the death knell of both the Treaty of Versailles and of the League. Unfortunately for the world, the great nations on whom the civilization and progress of mankind much depend are divided into two hostile camps —a Totalitarian Bloc and a Democratic Bloc.

The cause of the present conflagration in Europe is much disputed. Germany professes that it is waging war not for any aggressive motive but purely for economic redress. The German leader, Adolf Hitler, supports the claim that his country was right in fighting against Democracy for "*Lebensraum,*" and for the trade of the World.

He reproaches the Democratic Bloc for their monopoly of the vast resources of the world. He does not believe in the offer of England and France that the economic problems of Germany or Europe or the World can be settled at a Round Table.

Italy, too, wishes to snatch their trade and colonies, from England and France, for Italy too faces like Germany the problem of over-population. One cannot as yet say on what principle Russia had created trouble in Finland. Opinions are divided regarding her motives. One school of thought observes that Russia's fight against Finland was ideological; whereas it is the opinion of the other that the fear of German domination in Europe has driven Russia to safeguard it boundaries by violating the neutrality of the Baltic States.

Adding to it troubles, Europe has to face the thorny problem of the neutrals. The neutral countries are

THE PRESENT CHAOS.

THE War of 1914-18 brought about great changes in Europe. The treaty of Versailles not only crushed the might of Germany, but also put an end to the House of Hohenzollern. With the abdication of the Kaiser, all the nations heaved a sigh of relief, as they felt there would be an end of the bellicose spirit of Germany.

President Wilson, glad of his great adventure and success in Europe and its affairs, inaugurated the League of Nations which he thought would be a safe and lasting guarantee of a new world order and permanent peace.

The German nation, crushed politically and economically by the Treaty of Versailles, was forced to remain silent for some time, but not for long. They regarded the treaty as an insult and never ceased to protest against it.

The post-war period was one of great and speedy changes, unprecedented in the annals of European politics. To be brief, it was an age of great dictators. The lives of millions depend on the word of Hitler, Mussolini and Stalin. The rise of National Socialism in Germany. of Fascism in Italy and of Communism in Russia completely changed the outlook of European politics. Once again nations began to apprehend that one day or other Europe and the world would be wrapped in gloom and destruction.

Let us examine the causes leading Europe and the World into the great conflagration which is going to be a unique feature of World History. The provocative war

Our Arts College and the Hostels were a source of great trouble to some of the delegates, the causes of which will be evident from the following incidents:-

The floor of the entrance hall of our Arts College was a very difficult place to negotiate for the delegates. After a disastrous experience many of the delegates realised that 'walking is a difficult art.'

During the session, one morning, as some of the volunteers were passing by the bath rooms of the B-hostel, they heard a sudden cry from one of the bath-rooms. When the gentleman within came to know about the presence of the volunteers outside, inquired. "Do the boarders bathe in water at boiling point?" The delicate adjustment of hot and cold water pipes was then explained to him.

A party of four or five delegates wished to see the Arts College and so went upstairs alone, as there were no volunteers present at the moment. They had to read a paper in the sectional meeting very soon after. After half an hour they came down and apologised to the President for their dilatoriness, their excuse being that they could not find the way down.

One morning a delegate asked me a very complicated question about our B-Hostel. He said, "Will you please explain to me, whether this building is square from outside and a triangle from in-side." I replied, "Sir, it is a triangle in a triangle."

M. YAHYA KHAN,
Junior B. A., Class.

modernness of the Hostels. A delegate exclaimed, "Fortunate are those who live in this paradise." Another delegate, if I am not wrong, Dr. Jamuna Parshad, corrected his friends' remark and said, "Fortunate are those who even visit this paradise." Prof: Humayun Kabir was ready to start his student life once again only for the sake of the luxurious and comfortable hostels. A delegate, while inspecting the lecture theatres of Arts College remarked, "It is an inspiration to study."

The stately arches, the magnificent theatres with beautiful polished floors, the comfortable furniture, the dining halls and the beautiful situation of the University, are some of the blessings which Osmania University alone enjoys in these days of depression and unemployment.

On account of their short stay, the delegates were not able to see much of our beautiful city and its famous historical places. On two evening, excursions were made to Osman Sagar, Himayat-Sagar, Golconda Fort. tombs and other places.

After the termination of the Congress, a party of delegates set out for the Ajanta and Ellora caves.

The At Home given to the delegates was remarkable in many respects. It was arranged in the Botanical Garden and the delegates of both the Philosophical and Mathematical Congresses and other distinguished guests were invited. I think, the number of the tables arranged was inversely proportional to the square of the number of the delegates. Sir Akbar Hydari very kindly attended the At Home.

At night a musical programme was arranged in which Mr. Abdul Ra'oof, an old student of our College, and Mr. Manzur Ahmed, gave a much appreciated entertainment to the delegates.

ISLAMIC PHILOSOPHY.

Dr. Sharif of Alligarh presided over the session on Islamic Philosophy. Dr. Khalifa Abdul Hakim, while explaining the concept of love in Rumi and Iqbal, said, "Both believe in freedom of will, both consider the intention of life as inexpressible by the logic of identity, and both believe feeling and will to be nearer reality than the intellect: and both believe Love to be free and immortal." Concluding his paper Dr. Khalifa pointed out that, according to Rumi and Iqbal, the life of desire and the love of power are genuine expressions of the cosmic urge of love if rightly directed.

Dr. Mir Valiuddin of our university read an exhaussive paper on "Self-Determination in Islamic Mysticism;" and showed how we are responsible for our actions, and being responsible, we are rewarded or punished.

* * * * *

Undoubtedly the success of a gathering like this depends much upon the activity, agility and nimbleness of the volunteers. I myself feel very proud while writing these words that we tried our best to make the session of the Congress a success. Letters have been pouring in from members of the Congress saying how very grateful they are to the volunteers for having made their short stay so pleasant and comfortable.

Our work was made easier by the kind co-operation of many students of history, economics and science. We, the students of philosophy, thank them for their valuable services. I may be allowed to say here that had our U.T.C. friends taken an interest in our efforts, the task would have been easier.

The delegates of the Congress were much impressed by the architecture of the Arts College and the

been the problem of Life attuned to Reality. Excepting the system of the Carvaka, the only materialistic system of India, all other thought systems are agreed that life is not a truncated cone ; it is not to be viewed in cross-sections, nor in isolation from reality. Explaining the conception of value in Indian thought, he further added that there is immanental interpenetration of the ultimate spiritual reality into every part of existence. It is this aspect of the spiritual reality with which life is progressively brought into perfect tune, that we understand by God of Religion. Knowledge, Goodness and Beauty are considered the values in an absolute sense, but the learned speaker explained that at a higher stage they become one.

4. *Psychology:—*

Prof: Jamuna Parshad, the Sectional President, in his scholarly address, dealt with many important aspects of social psychology. He succeeded in throwing valuable light on some of the psychological forces that are at work during communal riots. As the paper was exhaustive and the time was short, he could read only parts of it. The parts however were not isolated bits, but had a certain unity, progressively leading to certain definite conclusions regarding the nature of communalistic mentality.

Dr. Indra-sen read a remarkable paper on Freud. He gave a brilliant resume of the main principles of Psychotanalysis. His paper was of special interest as he proved, giving chapter and verse, that Freud was slowly but surely moving towards an idealistic position. The audience expressed scepticism, which soon gave place to a lively interest and as Dr. Sen adduced passages from the later wrtings of Freud in support of his view, 'they felt convinced that his thesis was substantially right.

systems of Indian Philosophy. His books are considered to be authoritative on Indian Philosophy.

The following are brief reports of the sectional meetings:—

1. Logic and Metaphytics:—

Prof: G. R. Malkani, presided over the sectional meeting. Prof: S. C. Chaterjee of Calcutta University, in his paper very carefully distinguished the relation between the Knower and Known. He gave a critical analysis of (1) the American Neo-realistic view (2) Critical realistic view, and (3) British New-realism as represented by Alexander. What we call an object or a thing is ultimately a construction of the mind conditioned by certain impressions of sense.

Prof: Rasvihary Das, spoke on the meaning and possibility of knowledge. He said that knowledge properly is not an act, yet it is certainly possible and is taken to be actual also. The famous problem, "What a thing is in itself" was discussed by Prof: K. R. S. Iyengar.

2. Ethics and Religion:—

Prof: N. C. Mukerjee was in the chair at this session. He was also the General Secretary of the Congress. He is a speaker of the first rank with a very engaging personality. Dr. S. K. Das read an exhaustive paper on, 'Religion and religious approximations'. Dr. E. Ahmed Shah, in his paper showed how naturatism maintains the immortality of the finite in the infinite plenitude of the impersonal being.

3. Indian Philosophy:—

Prof: Bhatta in his presidential address said, "The problem of value to the Indian mind may be said to have

that imaginative faculty in every human being which, despite Aristotle's appellation of him as a political animal, makes him more suited to be called a philosophical being. To put it at its lowest, so long as imagination remains a human faculty, philosophy in its largest sense will remain of human interest."

The Honourable Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, in his Address of welcome said, "The presence of eminent philosophers from different parts of India assumes a higher significance when we see what the world is passing through. When chaos reigns in the realm of thought or action, it is the proud function of the philosopher to bring about order. There are people who say that philosophy has no practical relation to life or reality and call it, the mere fantasy of a dreamer'. The misconception of the highest intellectual activity of man is as fallacious as it is harmful. When all the world is suffering from confusion, the philosopher alone aims at well-ordered discipline of thought and action. The highest function of a University is not served by the production of degree holders in as great a number as possible. A University should rather be a centre and nucleus of the highest thought and intellectual activity . ...We are painfully aware of the religious and sectarian strife and conflict by which our country is torn. This turmoil would end if only self-interest were subordinated to the interests of the country as a whole. To my mind, philosophy is one of the best antidotes to the narrow-minded communalism of our day."

Professor Hariyanna was the general President of the Congress. He is a great scholar of Indian Philosophy, and has devoted all his life and time in research on his subject. After retiring from Mysore University, he is taking great pains in collating the lost thoughts and

Sir Akbar Hydari, while delivering the inaugural address, welcomed the delegates and drew attention to the practical value of Philosophy in the following words:-

"In the world of today, so inclined towards immediate results, the profession of Philosophy is apt to be regarded as an occupation tending to un-reality. Some accuse it—drawing support from history—of creating ferment and un-settlement of ideas, of demolishing old Gods while not replacing them with new ones, of shaking the fabric of human belief on which rests much of the hope of mankind, without presenting to the mind the comfort it needs amid the spiritual and material concerns of an increasingly complicated existence."

"I am not one of those who believe, like Keats, that all charms fly at the touch of cold philosophy. Plato called philosophy the highest music and there is, in reality, much of true inspiration in these flights into realms of pure thought which distinguish the work of the great philosophers. Above all, the devotional aspect of such thought, manifesting itself in the mysticism of some at least of the great philosophers brings to us indeed the breath of true poetry and to our minds the comfort of true inspiration."

"To me mysticism has always appeared as 'Vital' philosophy. It has a corner in every heart and appeals to every mind, for there is none among us who, at one time in his life or the other, has not, in the course of his mental or spiritual adventures, experienced its charms. There is a realm beyond the reach of our five senses, and whether you reach it through the faith of the Sufis or through pure reason, the joy in the attainment is the same. Shakespeare was not joking when he asked "Hast thou any philosophy in thee, shepherd," for there exists

THE PHILOSOPHICAL CONGRESS.

URING the last four or five years Hyderabad has often been the venue of scientific and literary conferen-s: and our University has proved itself remarkably itable for such gatherings.

The fifteenth session of the All-India Philosophical ngress was held from the 19th to the 21st of December 39, at the Arts College. Sectional meetings of 1. etaphysics and Logic 2. Psychology 3. Ethics & ligion 4. Indian Philosophy 5. Islamic Philosophy, re held in the Lecture Halls of the Economics, History d Philosophy Departments.

His Exalted Highness the Nizam of Hyderabad and rar most graciously sent a message to the Philosophi- Congress, which was read by Sir Akbar Hydari, the esident of the Council. The message runs as follows:-

"I have great pleasure in sending this message to the iolars of philosophy who have gathered here to ex-ange their thoughts and ideas, and to examine afresh heritage of ages past about the vital and the funda-ntal problems of existence. I consider it auspicious at the devotees of the Mother of Arts and Science ould meet in these premises, almost within a fortnight the opening ceremony of this building. India has en a cradle of philosophy and the Deccan has had the tinction of producing thinkers of the first rank. I pe that the renaissance of learning and the revival of dia's best thought will be greatly furthered by such therings, and that the interplay of thought will clarify portant problems and be a source of the enrichment of ellectual life in its various aspects."

Welfare Centres. Besides these engrossing activities, she presided over the Hyderabad State Women's Conference in 1937 and her inspiring words on that occasion will be long remembered.

With the outbreak of the war, although her health was then frail, she became President of the Hyderabad Ladies' War Committee and up to the time of her last illness she remained the centre and the inspiration of its activities.

Never did she fail to respond to the appeal for help for the sick, poor and suffering. When Hyderabad was over-whelmed with the tragedy of the Musi in 1908, and thousands of people were rendered homeless and destitute on account of the flood, Lady Hydari was indefatigable in her efforts to alleviate their sufferings, giving them food, clothing and every other possible help from her home. In recognition of all these services, she was awarded the Kaiser-i-Hind gold medal. Again at the time of the great earthquakes in Bihar and Quetta in 1934 and 1935, *she presided over endless Committees and* orgainised collections for the Viceroy's Relief Funds. Till the end her uppermost thought was for those in distress. Her last appeal to the public was made from her sick bed in 1939 when she took up the cause of the Hyderabad Famine Relief Fund. And it was owing to her magnetic charm, her vivid personality and her rich enthusiasm that everyone showed such readiness to co-operate with her in all her schemes for aiding and elevating humanity. It is hard to believe that her place can ever be filled.

---

blished customs and traditions. To her, the determining factor seems to have been the education fitness for the shouldering of responsibilities attendant on the giving up of pardah. Besides having travelled much in India, she accompaied Sir Akbar no less than five times on his journeys to Europe and was with him when he attended the Round Table Conferences. Thus she came into contact with many distinguished people both in India and the western world and was in touch with the different movements and idieas of modern times. In Hyderabad State it seemed as though all classes and communities were able to make contact with her and she remained to the end a sympathetic friend to all who sought her advice, rich or poor, high or low. There was never a woman of her position in India who had developed such a deep understanding of human nature and who was quicker to detect insincerity of purpose. The very variety of her friends and admirers taught her to appreciate the subtle shades of character so often overlooked by the average great lady of society. She dedicated her own life and inspired others to dedicate theirs to social service and especially to such service as encouraged the social, educational and economic advancement of Indian women. She has left a lasting tribute of her devotion to their cause in the Hyderabad Ladies' Association Club of which she was the Founder and President. There she provided every facility for the recreation of young and old, in an artistic setting. She was the founder and patron of the Women's Association for Educational and Social Advancement, the founder of the Mahbubia Girls' School, and President of the Board of Secondary Education for girls. She took a deep interest in the Girls Guides Local Association of which she was President, and in the Child

LADY HYDARI

The passing away of a dearly loved women has cast a gloom over the whole of Hyderabad. An outstanding figure in Hyderabad society for the past thirty years, Lady Hydari's name has been a watchword amongst women for education and progress and as such it will ever be remembered.

Lady Hydari's father, Mr. Najmuddin Tyabji was a member of the well-known Tyabji family of Bombay. Her mother was of Arab descent from whom she inherited her clear-cut features and dignified bearing. Since her father was one of the few Muslim men of his generation to believe in the education of woman, the little girl Amina Tyabji received part of her education in a convent where she learned English, while private tutors completed the oriental side of her education in Arabic, Persian and Urdu. The liberal education she received in her father's house may have been to a large extent the reason for her life-long to the cause of women's education. In 1893, she was married to (Sir) Akbar Hydari and then began her unexampled life as wife and mother.

Lady Hydari holds the interesting distinction of being the first Muslim woman in Bombay to emerge from the shadows of pardah into the strong light of public life. She was one of the four Indian women chosen to welcome Princess Mary when she visited India. In passing, it may be added that though she had relinquished pardah, she was no advocate of a violent upheaval of long-esta-

We congratulate Mr. Naimuddin Siddiqi, B.A. (Osman), on his winning the first prize in the essay-writing competition held under the auspices of the University Union this year. The subject for the competition was "The Communal Problem in India" and the essay is published in this issue.

We regret to announce that the number of articles we have received this term is not encouraging. We hope our friends will contribute more articles to the next issue in which a section will be devoted to articles upon the late Maharajah's life and work and a section will be reserved for general articles. We request that the members of the University College for Women will turn their attention to the English Section which has, hitherto, not received many contributions from them.

We thank all the contributors to this issue for their co-operation.

EDITOR.

one hand to the British Empire how India is solidly behind the Empire and, on the other hand to show to the rest of India that Hyderadad has always led." We feel that money cannot be spent in a better cause than to help in the defeat of one who threatens to destroy the whole social fabric of the world and so to ruin the civilization which has been built up with such labour throughout the ages.

We publish in this issue an article by Mr. Ghulam Dastagir, B.A., (Senior), upon "The present Chaos."

We offer our congratulations to Dr. Syed Husain, on his appointment as Registrar of the University. This affords peculiar satisfaction in that Dr. Syed Husain was among the first to take a degree from this University. Our congratulations are also due to Messrs Mohd Nasir Ali, M.A. (Osman), Mohamed Bin Omer, M.A. (Osman) and Mahmood Husain, M.A.(Osman) on their appointments as lecturers in Economics and English Literature at the University, the Gulbarga and Warangal Intermediate Colleges rspectively.

It is gratifying to note that of the eight candidates who were successful in the Hyderabad Civil Service competitive examination this year, five were Osmania graduates, and to them we offer our hearty congratulations. As Civil Servants in Sir Akbar Hydari's words, form "the back bone of the country," it is fitting that such a great educational institution in the State as our University should contribute a majority to the service. To achieve this end, the re-organisation of the existing Civil Service coaching classes on sound lines is of paramount importance. We trust the authorities will turn their attention to this matter.

We record with sorrow the death of Lady Hydari whose name will go down in the social and educational annals of Hyderabad. She devoted her life to the uplift of women in the State, and was a strong supporter of the University. Her distinguished and unstinted services in the tragic Musi floods of 1908 and the influenza epidemic ravages of 1918, have placed Hyderabad under a great debt to her. She did not confine her active social work to the Nizam's Dominions, but gave her name, her support and her abundant energy to good causes throughout India. She was one of the apostles of communal amity and to quote her words, she believed that " we can create an atmosphere of unity and harmony by showing tolerance and courtesy towards those of other faiths, even while adhering strictly to the tenets of our own." We feel deep sympathy with the Rt. Hon. Sir Akbar Hydari, and the family in their sad bereavement.

We feel great pleasure and pride in the fact that the public of Hyderabad has responded so enthusiastically to the appeal by the government to furnish a squadron of Hurricane fighters for the British government. The personal donation of £50,000 and Rs. 5,00,000 from the Sarfikhas Estate by His Exalted Highness for this purpose, in addition to his previous munificent gifts to the British Air Ministry at the outbreak of the war as well as the contributions of the general public, demonstrate the friendly loyalty to Great Britain and the deep sympathy for the Allied cause which is felt by His Exalted Highness and all his subjects. We appeal to the members of the University to contribute generously to the fund and to collect subscriptions from the public, so that as Sir Akbar hopes, they may be able "to show on the

EDITORIAL

THE current year has been both auspicious and memorable for Osmania University, because our Ruler, His Exalted Highness, inaugurated in person the magnificent building of the Arts College, the architecture of which represents "a balancing of the Hindu and Muslim styles." Thus the building is a history, a tradition and an ideal in granite—a history of the communal harmony which has existed for centuries in the State, a tradition of toleration of the Asaf Jah dynasty, and an ideal of Hindu - Muslim unity. The observations made by His Exalted Highness on the occasion concerning the advantages of a residential university should serve as a guide for every student and every citizen.

We are deeply grieved at the death of our Ex-Chancellor Maharajah Sir Kishan Pershad, who was so long associated with the University. He was a model of liberality and wide culture. Though a Hindu, he was well-versed in Islamic culture, greatly attracted by Sufism, a staunch advocate of Hindu-Muslim unity, and, above all, one of the most loyal subjects of the Asaf Jah dynasty, His generosity, like that of his maternal grand-father, was proverbial. His Exalted Highness paid a deserving tribute to his long and devoted services in a "firman" issued two days after his death. A really great man has passed away and all our sympathies are with the bereaved family. Articles upon the various aspects of the Maharajah's interesting life will be published in our next issue.

MR. S. M. TAQI HASHIMI, M.A., (Osman),
the ex-President of the University Economics Association,
Editor, English Section.

IN MEMORIAM

We regret to record the death of Lady Hydari on Friday June 14th after a long illness.

The late Lady Hydari played a very important part in the social life of Hyderabad for many years, and in every walk of life, her beneficent influence will be greatly missed. She was instrumental in founding many of the institutions which exist here for the enlightenment and education of women, and right up to the end of her life she continued to take an interest in them. She was also deeply interested in the welfare and progress of the University and one of her last public appearances was at the opening of the Arts College. Those of us who saw how frail she looked on that occasion knew the great effort which that attendance must involve, but all were glad to think that one who had, in an unostentatious way, done so much for the University, was able to see the completion of its most glorious building.

Those who knew Lady Hydari on public and official occasions, saw only a very small aspect of the real person, for it was in her home and among her own people that her real greatness of character became apparent. The world occasionally sees great women who are capable not only of the ordinary work which belongs to them, but also of being leaders and counsellors. In her own quiet way, Lady Hydari was undoubtedly one of these, and our sympathy goes out to Sir Akbar Hydari who has lost so much more than is the common lot of humanity to lose.

called the "last of the Moguls," for he combined in himself the finest qualities of Hindu and Muslim culture. He was a man who knew well the real meaning of *noblesse oblige:* the poor and the needy have lost in him their greatest friend. His generosity was as unstinting as it was catholic: it was not concerned with the recipient's cast or creed; it did not even inquire whether the recipient deserved it or no. He dispensed his charity unostentatiously and with such tact that the recipient was made to feel that he had laid the giver under an obligation by seeking his help. Indeed, it was a pleasure to him to give and he gave with both hands. His modesty and fine manners always put you at your ease; he made you feel that you were in the presence not only of a nobleman but of a noble man.

REQUIESCAT IN PACE.

IN MEMORIAM

The death of Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur, which occured on the 13th. of May, leaves a void in the literary and social life of Hyderabad that will be impossible to fill.

The scion of a great house, the Maharaja Bahadur was not only an experienced and able administrator but a great literary and social figure, a scholar of Persian and Urdu and a poet who wrote in both the languages.

For a number of years he was the Chancellor of the University and always took a keen interest in its progress and was proud of its achievements. He not only presided at formal Convocations but, sometimes at great inconvinience to himself, he presided over mushairas on the University Day.

His personal qualities had made him revered and loved by all classes of people in Hyderabad. His consideration for others, his unfailing tact, his sympathy for people in distress, his great courtesy and fine manners, his noble bearing and courtly dignity were qualities which marked him out as a great gentleman. He has been aptly

CONTENTS

Vol. XIII

Annual Subscription.

		Rs.
From Government	... ...	12
,, Universities, other Institutions and State Officials	...	8
,, General Subscribers	... ...	6
,, Old Boys, Aided Societies and Reading Rooms	...	5
,, Present Students, Osmania University	... ...	4
,, Abroad	...	Fifteen Shillings.
,, Old Students, Abroad	... ...	Ten Shillings.
,, Single Copy	... ...	Two Rupees.

Note —Registrations and V. P. P Charges Extra.

Can be had of.

OSMANIA MAGAZINE OFFICE

OSMANIA UNIVERSITY

HYDERABAD-DECCAN.

The Osmania Magazine

Vol. XIII Nos. 1 & 2

ADVISORY BROARD

President
Qazi Mohammed Husain, Esq., M.A., LL.B., (Cantab.) Pro-Vice-Chancellor.

Advisor, English Section:
Prof. F. J. A. Harding, M.A. (Oxon.)

Advisor Urdu Section
Dr. Syed Mohiuddin Qadri Zore, M.A., Ph. D. (London).

Honorary Treasurer
Prof. Wahidur Rahman, B. Sc.

MANAGING COMMITTEE
1348 -49 F.

President
Qazi Mohammed Husain, Esq., M A, LL.B. (Cantab.), Pro Vice-Chancellor

Advisor, English Section:
Prof. F. J. A. Harding, M.A. (Oxon.)

Advisor Urdu Section.
Dr. Syed Mohiuddin Qadri Zore, M.A., Ph., D. (London).

Honorary Treasurer
Prof. Wahidur Rahman, B. Sc.

Secretary
Ahmed Khan. B.A. (Osman.)

Managing Editor & Editor, Urdu Section.
Syed Mohammed Taqi Hashmi M.A. (Osman.)

Malik Abdul Ali Khan.
President, Students' Union.

Editor, English Section.
Ghulam Ghous Khan B. Sc.

Syed Husain Razvi
Asst. Editor, Urdu Section.

Ghulam Ghous Khan B. Sc. is listed above;

Asst. Editor, English Section.

THE

OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

of

The Osmania University

HYDERABAD-DN.

MANAGING EDITOR:
AHMED KHAN B.A., (Osmania)

EDITOR:
SYED MOHAMMED TAQI HASHMI M.A.,

JOINT EDITOR:
GHULAM GHOUS KHAN B. Sc.,

Vol. XIII 1940 Nos. 1 & 2

Printed at
THE AZAM STEAM PRESS,
HYDERABAD-DN

Printed at the Azam Steam Press.

13 (3)
مجلّہ
عثمانیہ
مدیر
احمد خاں بی۔ اے (عثمانیہ)
شریک مدیر
سید حسین رضوی بی۔ اے (عثمانیہ)

طلبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا ماہی رسالہ

مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو

احمد خاں

بی اے (عثمانیہ)

شریک مدیر

سیّد حسین رضوی

بی۔اے (عثمانیہ)

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن فون نمبر ۳۲۰

چندہ سالانہ پیشگی

(۱)	سرکار آصفیہ و برطانیہ	۱۲ روپے
(۲)	ارباب جامعۂ اصحاب مقتدر اور اداروں سے	۸ ,,
(۳)	عام خریداروں سے	۶ ,,
(۴)	طلبائے قدیم رفاہیہ انجمنوں اور دارالمطالعوں سے	۵ ,,
(۵)	طلبائے جامعہ عثمانیہ سے	۴ ,,
(۶)	ممالک بیرون ہند سے	۱۵ شلنگ
(۷)	بلاد یورپ کے طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ سے	۱۰ ,,
(۸)	فی رسالہ	عہ روپیے

ملنے کا پتہ

دفتر "مجلہ عثمانیہ" جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین مجلۂ عثمانیہ

جلد (۱۳) شمارہ (۳)

اداریہ

یہ ہماری انتہائی خوش بختی ہے کہ جنرل ہز ہائی نس حضرت والا شان نواب اعظم جاہ بہادر پرنس آف برار وولی عہد دولت آصفیہ کے اسم سامی سے ہماری اعزازی فہرست طیلسان مزین ہوئی یوں تو ظل اللہ ہمیشہ ہماری اجتماعی زندگی کا محور رہا ہے لیکن جامعہ عثمانیہ کی تعمیر اور اس کی اساس میں شروع سے آخر تک یہی ایک روح کار فرما رہی ہے۔ اس جامعہ کے بہت سے امتیازات ہیں۔ اس نوخیز پودے نے بڑے بڑے تناور درختوں کو نیچا دکھایا ہے۔ اس نے کئی میدانوں میں حریفوں کو پسپا کیا ہے لیکن اس کا اگر کوئی حقیقی امتیاز ہے تو یہی کہ اس کو نسبت شہریاری حاصل ہے اسی نسبت سے اس کی عظمت ہے اور جس قدر اس تعلق میں گہرائی پیدا ہوگی اسی قدر اس کی عظمت میں اضافہ ہوگا یہی اس جامعہ کی روح حیات ہے۔ حضرت والا شان کی خدمت میں اعزازی ڈگری کی پیش کشی نے اسی روح حیات کی بالیدگی کا ایک موقع بہم پہنچایا۔ عثمانین کے قلوب مسرتوں سے معمور ہیں اور ان کے سر فخر و مباہات سے اونچے ہوئے جاتے ہیں۔

کلاہِ گوشۂ "ملت" بہ آفتاب رسید
کہ سایہ بر سرش انداخت چوں تو سلطانے

ہم بکمال ادب حضرت والا شان کی خدمت میں پرخلوص ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

ایک لمحۂ فکر عثمانین کی عزت نفس کا سوال در اصل اسی نسبت شہریاری کے وقار کی حفاظت کا سوال ہے جامعہ کے اندر اور جامعہ کے باہر ہم نے ہر میدان میں اور ہر موقع پر سفر اور حضر میں اسی کو سب سے زیادہ پیش نظر رکھا۔ اور اسی تعلق کی برتری اور عظمت کو برقرار رکھنے اور دوسروں سے خواہ وہ اپنے ہوں یا بیگانے، اس کا احترام کروانے کی خاطر ہی ہم جی رہے ہیں یہی ہمارا نصب العین ہے اور یہی ہمارا مقصد حیات !!

سنجیدہ تفکر اور استقامت کردار عثمانین کی امتیازی خصوصیات رہی ہیں۔ مادری زبان میں تعلیم دینے کا مقصد سہولت تفہیم ہی نہیں بلکہ صحیح تفکر کی عادت پیدا کرنا تھا اور ہے۔ ظاہری شور و غوغے اور اندرونی و بیرونی اثرات کے مقابلہ میں ہمارے پائے استقامت کو کبھی لغزش نہیں ہوئی اور سنجیدہ تفکر کا دامن کبھی ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹا ہمیں پوری توقع ہے کہ ہمارے چھوٹے بھائی ان حقائق کو خواہ ہمارے اندرونی ہنگاموں کا زمانہ ہو یا بیرونی مقابلوں کا موقع، ہمیشہ پیش نظر رکھیں گے۔

اعتذار

گذشتہ شمارہ میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ آیندہ نمبر ہمارے سابق امیر جامعہ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی یادگار میں شائع کیا جائے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ وعدہ شرمندہ تکمیل نہ ہو سکا۔ مہاراجہ نمبر کے لئے مضامین کی فراہمی میں انتہائی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اس دوڑ دھوپ کے بعد اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ مہاراجہ نمبر حسب وعدہ اور حسب اہتمام کے ساتھ ہم چاہتے تھے آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا۔ اس لئے شمارہ ۳ و ۴ مشترکہ شائع کرنے کی بجائے شمارہ ۳ کی علحدہ اشاعت عمل میں آرہی ہے۔ یہ شمارہ بہت پہلے شائع ہو جاتا اگر حصہ انگریزی کا کام جلد تکمیل پاتا۔ شمارہ ۴ مہاراجہ نمبر رہے گا۔ اور بہت جلد زیور طبع سے آراستہ ہو کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا۔ اس میں طلباء کے علاوہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب، نواب بہادر یار جنگ بہادر، حضرت خواجہ حسن نظامی، مولانا عبدالماجد دریابادی، نواب مہدی نواز جنگ بہادر، ڈاکٹر زور، حضرت فانی، ماہر اور دیگر مشہور اہل قلم حضرات کے مضامین شائع کئے جا رہے ہیں۔

احمد خاں

اڈیٹر

ہز ہائنس شہزادۂ برار!

ہز ہائنس جنرل حضرت والاشان شہزادۂ برار ولی عہد دولت آصفیہ کے حضور میں ال ال ڈی کی ڈگری کی پیشکشی پر ایک فی البدیہ نظم

ہو مبارک تجھ کو اے شہزادۂ با عز و شان
جامعۂ عثمانیہ کا امتیازی طیلسان
اے درخشاں آفتابِ دُودمانِ آصفی
ہو جہانِ علم کی تجھ کو مبارک سروری
اے رفیع المرتبت شہزادۂ ملکِ برار
تیری سیرت سیرتِ عثمان خلد اللہ ملکہٗ کی ہے آئینہ دار
اے کہ تو ہے اک مجسم رحمتِ پروردگار
تیرا رتبہ روز افزوں ہو بہ فیضِ کردگار
ملتِ بیضا کے اے روشن چراغِ آرزو
قوم کی امید کا ملجا ہے تو ہادی ہے تو
اک اشارہ پر ترے شہزادۂ گردوں وقار
ہم لٹا دیں گے متاعِ زندگی مردانہ وار
تجھ کو دیتا ہے دعا یہ نیرؔ آتش بیاں
شاد رکھے تجھ کو ہر دم خالقِ کون و مکاں

محمد علی نیرؔ بی اے (ابتدائی)

ہزہائی نس جنرل ڈاکٹر والاشان نواب اعظم جاہ بہادر
پرنس آف برار و ولی عہد دولت آصفیہ

شہر حیدرآباد میں گوشت کی سربراہی[۱]

پیدا کنندوں اور صارفون کے مابین چند درمیانی اشخاص کی ضرورت

موجودہ زمانے میں طریق تقسیم عمل نے اس قدر ترقی کرلی ہے کہ موجودہ نظام معاشیات میں کوئی شئے پیدا کنندوں کے ہاتھ سے صارفوں کے پاس اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ درمیان میں چار پانچ اشخاص کا توسط نہ ہو۔ مثال کے طور پر زراعت کو لیجئے کسان کھیتی باڑی کر کے غلہ اُگاتا ہے لیکن اُس کے لئے یہ امر بہت دقت طلب ہے کہ فروخت کے لئے مال بھی خود ہی شہروں تک لے جائے لہذا وہ پیداوار کو مقامی ساہوکاروں یا دیگر سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور یہ لوگ اسکو اضلاع کی مارکٹوں میں فروخت کر کے تھوڑا بہت منافع کما لیتے ہیں۔ پیداوار کو اضلاع کی مارکٹوں سے شہر تک لانے والے دوسرے ہی لوگ ہوتے ہیں لیکن شہر آنے کے بعد وہ غلہ یکدم صارفوں تک نہیں پہنچتا بلکہ تھوک فروشوں کے ہاتھ میں جاتا ہے جن سے چلر فروش خرید کر صارفوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ یہی حال مصنوعات کا ہے۔ کارخانہ سے نکل کر صارفوں تک پہنچنے میں پانچ چھ بلکہ اُس سے بھی زیادہ اشخاص کا توسط درکار ہوتا ہے۔ یہی حال گوشت کی سربراہی کا بھی ہے یہاں بھی چند درمیانی اشخاص ہوتے ہیں جنھیں دو طرح پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو بالواسطہ ہماری ضرورت پوری کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو براہ راست ہماری احتیاج رفع کرتے ہیں۔ پہلے زمرہ میں پیشہ ور دھنگر ـــ جو بھیڑوں کی پرورش کرتے ہیں ـــ درمیانی اشخاص ـــ جو بھیڑوں کو دیہات سے شہروں تک لاتے ہیں ـــ مونڈے دار ـــ جس کے توسط سے شہر میں بھیڑیں قصابوں کے ہاتھ فروخت ہوتی ہیں ـــ شامل ہیں اور دوسرے میں

---

[۱] یہ مضمون بزم معاشیات کے ایک جلسہ میں (۱۳۴۶ف) پڑھا گیا تھا۔

قصاب، جن سے ہم گوشت خرید کر اپنی احتیاج رفع کرتے ہیں۔ ان اشخاص کے وجود سے نہ صرف صارفوں بلکہ پیدا کرنے والوں کو بھی بڑی سہولت ہو جاتی ہے اور ہر ایک کا مقصد گھر بیٹھے پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن بعض کاروبار مثلاً پیداوار خام کی خرید و فروخت میں یہ لوگ کسان کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھا کر بہت زیادہ منافع وصول کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے حقدار اپنے واجبی حق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں ہم یہی معلوم کریں گے کہ گوشت کی سربراہی میں درمیانی اشخاص کی آمدنی کا کیا حال ہے ان میں سے ہر شخص کس قدر منافع کما رہا ہے

دیہات میں بھیڑوں کی خریدی کے طریقے

قوم دھنگر میں چند افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو بھیڑوں کی پرورش نہیں کرتے بلکہ انھیں خرید کر شہر لاتے ہیں اور کچھ منافع سے بیچ دیتے ہیں۔ ان دھنگروں کے علاوہ دیہات کے سرمایہ دار قصاب بھی اس کام کو انجام دیتے ہیں۔ بعض مرتبہ خود شہر کے مونڈے دار بھی اس غرض کے لئے جاتے ہیں یا تجربہ کار دھنگروں کو کچھ رقم دیدیتے ہیں تاکہ کاروبار کریں لیکن بھیڑوں کی فروخت کے بعد یہ لوگ نہ صرف اپنا حق فروخت (جس کو "اڑتی" کہا جاتا ہے) بلکہ دی ہوئی رقم کا سود بھی منہا کر لیتے ہیں اس کے بعد جو کچھ منافع بچ رہے دھنگر کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو انکی محنت کا معاوضہ ہے۔ جن دھنگروں کے ہاں تجارت کے لئے رقم نہیں ہوتی وہ یا تو شہر کے مونڈے داروں سے قرض لیتے ہیں یا مقامی ساہوکاروں سے۔ مال فروخت ہو جانیکے بعد اصل معہ سود واپس کر دیا جاتا ہے جس کی شرح دو سے تین روپیہ فی صد تک ہوا کرتی ہے۔ بھیڑوں کی خریدی کا یہ طریقہ ہے کہ خریدار پیشہ ور دھنگر سے یہ خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ اُنھیں اتنے کھنڈی[1] کی ضرورت ہے اس بنا پر دھنگر اپنے حسب منشا بھیڑ جمع کر لاتا ہے اور آجکل کھنڈی کا نرخ حسب ذیل ہے :-

مینڈھی ساڑھے سات سیر، نو اور دس سیر (۵) روپیہ کھنڈی

لال پوٹلے ساڑھے سات، دس اور ساڑھے بارہ سیر (۶۲) روپیہ کھنڈی

چھیلے اور چھیلیاں نو، بارہ اور پندرہ سیر (۶۵) روپیہ کھنڈی

[1] بیس بھیڑ = ایک کھنڈی۔ ایک کھنڈی میں مختلف وزن کے بھیڑ ہوتے ہیں۔

موسم باراں میں بھیڑ زیادہ فربہ نہیں ہوتے البتہ سرما اور گرمیوں کے شروع میں یہ نہایت تازہ اور فربہ ہوا کرتے ہیں چنانچہ اُس زمانے میں ایک کھنڈی (ضہ) سے (ما عـہ [۱۲۰]) تک فروخت ہوتی ہے۔

جب خریدی ہوجاتی ہے تو دھنگر "انبل" کے نام سے ایک بکرا مفت دیتا ہے اور خریدار "کھندلے" کے نام سے بھی ایک آدھ بچہ مانگ لیتا ہے۔ بعض مرتبہ دیہات کے سرمایہ دار قصاب ان پیشہ ور دھنگروں کو مال لینے سے ایک سال قبل' رقم دے دیتے ہیں لیکن وہ بھی اپنے محسن کے احسان کو بھولتے نہیں بلکہ بوقت خریدی قیمت مقررہ سے دس روپیہ فی کھنڈی کم لیتے ہیں یعنی یہ کہ نقد خریدار ایک کھنڈی کی قیمت (ضہ) روپیہ آسکتے ہیں تو ان سے صرف (للغـہ) روپیہ لیتے ہیں علاوہ ازیں بجائے ایک کے دو "انبل" بھی دیئے جاتے ہیں اس طرح پیشگی دی ہوئی رقم کا سود وصول ہوجاتا ہے۔

شہر میں بھیڑوں کی درآمد اور انکی فروخت کے طریقے

بھیڑوں کی درآمد اطراف و اکناف کے دیہات و اضلاع سے ہوتی ہے جو تین [۳] چالیس [۴۰] کوس کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ شہر میں اُنکی فروخت و ذبح کے لئے باضابطہ مقامات مقرر ہیں "جو مسلخ" یا کمیلہ کہلاتے ہیں۔ بلدہ میں جملہ گیارہ مسلخ ہیں جس میں آٹھ بھیڑوں اور تین بیلوں اور گائیوں کے ہیں۔ ان کے متعلق مختلف قوانین نافذ ہیں جس میں سے ایک کی رو سے کوئی شخص احاطہ مسلخ میں اُس وقت تک تجارت نہیں کرسکتا جب تک کہ اُس کے ہاں سرکاری لائسنس نہ ہو۔ ہر مسلخ میں چند اشخاص کے پاس لائیسنس ہوتے ہیں اور یہی لوگ مونڈے دار کہلاتے ہیں۔ دیہات سے بھیڑ لانے والوں کے ہاں چونکہ لائیسنس نہیں ہوتے لہذا اپنے بھیڑوں کی فروخت کے لئے وہ ہر کسی ایسے شخص کا توسط ڈھونڈنے پر مجبور ہیں جسکہ حق فروخت حاصل ہو۔ دیہاتی اپنے بھیڑ مونڈے داروں کے حوالہ کردیتے ہیں جنہیں کامل اختیار حاصل رہتا ہے کہ جس قیمت پر چاہیں فروخت کریں لیکن وہ ہمیشہ اپنے آسامی کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ مال فروخت ہوجانے کے بعد مونڈے دار اپنی محنت کے صلے میں "آڑتی" وصول کرتے ہیں جو تین روپیہ سیکڑا یا کھنڈی ہوا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں چندے اور حقِ محاسب کے نام سے بھی کچھ وصول کیا جاتا ہے لیکن

اس کی تعداد مختلف مسلخوں میں مختلف ہوتی ہے مثلاً بیگم بازار کے مسلخ میں تیرہ آنے لئے جاتے ہیں اور مسلخ لال دروازہ میں ایک روپیہ آٹھ آنے۔ چندہ کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ اس کو برادری کے بیواؤں کی امداد اور مذہبی کاموں میں صرف کیا جاتا ہے لیکن حق محاسب کے متعلق اسکا کچھ ٹھیک پتہ نہ چل سکا کہ آیا اُسکو محاسب صاحب ہی لیتے ہیں یا خود مونڈسے دار۔ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حق محاسب کی جس قدر بھی رقم جمع ہو مونڈسے دار اُس میں اور رقم شریک کرکے محاسب کی تنخواہ ادا کرتا ہوگا۔ واضح رہے کہ چندہ اور حقِ محاسب فی صد یا کھنڈی نہیں لیا جاتا بلکہ جملہ مال کے فروخت ہو جانے کے بعد صرف ایک مرتبہ وصول کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مونڈسے دار اگر رحمدل ہو تو دھنگر (جو بھیڑ فروخت کرنیکے لئے لایا تھا) کو ریل کا کرایہ دیتا ہے تاکہ وہ بجائے پیدل جانیکے آرام سے چلا جائے۔

قیمت کے متعلق بعض کمیلوں مثلاً "کاچی گوڑہ" "چنچل گوڑہ" مشیرآباد وغیرہ میں حالی کا چلن ہے لیکن بیگم بازار اور لال دروازہ کے مسلخوں میں "چلنی" کا رواج ہے۔ حالی سو روپیہ کے نو دچلنی ہوتے ہیں یا حالی ایک روپیہ مساوی ہے (۱۵ ار ۱/۵) چلنی کے۔ شہر میں فروخت کے مختلف طریقے ہیں بعض مرتبہ کھنڈی کے حساب سے فروخت کیا جاتا ہے تو بعض مرتبہ چیدہ چیدہ اور اکثر وقت "جٹی" کے حساب سے یعنے بھیڑ فروخت تو کئے جاتے ہیں لیکن بلا چمڑا۔ اس طریقے میں خریدار کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ بھیڑ ذبح ہونے کے بعد گوشت مع سامانِ شکم لے لے اور چمڑا فروشندے کو واپس کردے۔ یہ چمڑے دیگر افراد کے ہاتھ فروخت کئے جاتے ہیں جو "لبّے" کہلاتے ہیں، تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ دیہات سے مال لانے والے دھنگروں کو عموماً فی بکرا چمڑے کی کفایت ہوتی ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے آٹھ آنے تا ایک روپیہ آٹھ آنے تک فروخت ہوتا ہے لیکن صرف "پالوں" (وزن دار چھیلے پالوے کہلاتے ہیں) کا چمڑا جو وزن میں ۲۰ بیس سے ۲۵ پچیس سیر تک رہتا ہے ایک روپیہ آٹھ آنے میں فروخت ہوتا ہے ورنہ عام طور پر چمڑوں کی قیمت آٹھ سے چودہ آنے ہوا کرتی ہے۔ فروشندہ کھنڈی کے حساب سے اُس وقت فروخت کرتا ہے جب کہ بھیڑ قریب قریب ایک ہی

وزن کے ہوں لیکن اگر وہ بلحاظ اوزان ایک دوسرے سے بہت بڑھے ہوئے ہیں تو انہیں علیحدہ علیحدہ فروخت کیا جاتا ہے تاکہ زیادہ وزن والے بکرے کی زیادہ قیمت آسکے اس طرح اُس کے مجموعی منافع میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر وزن کے لحاظ سے جدا جدا بیچا جائے تو قیمت عموماً حسب ذیل رہا کرتی ہے۔

	وزن	قیمت	
مینڈھی	ساڑھے سات سیر	عہ ۸ ر	بغیر چمڑا
	نو سیر	سے	
	دس سیر	سے ۵ ر ۶ ہر	
پوٹلے	ساڑھے سات سیر	سے	بغیر چمڑا
	دس سیر	للعہ	
	ساڑھے بارہ سیر	صہ	
چھیلے چھیلیاں	نو سیر	سے	بغیر چمڑا
	بارہ سیر	للعہ	
	پندرہ سیر	صہ	

قصاب مونڈھے داروں سے مندرجہ بالا نرخوں پر خریدتے ہیں اور حارفوں کو بھی اُسی نرخ پر فروخت کر دیتے ہیں مثلاً اگر کوئی قصاب ساڑھے سات سیر کی مینڈھی بغیر چمڑا دو روپیہ آٹھ آنے میں خریدے تو وہ مجبور ہے کہ بحساب فی روپیہ تین سیر فروخت کرے کیونکہ بازار میں مقابلہ بہت شدید ہے۔ اُس کے ساتھی پکار پکار کر آٹھ گنڈے سیر کے حساب سے فروخت کر دیتے ہیں اگر وہ کفایت کرنا چاہے تو اُس کا گوشت یونہی پڑا رہے گا بہت ممکن ہے کہ سرِ شام اُس کو چار سیر فروخت کرنا پڑے کیونکہ دوسرے دن اگر بلدیہ کے کارکن باسی گوشت دیکھ پائیں گے تو جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ اُس کو منافع کیا ملتا ہے۔ تین سیر خریدتا ہے اور تین سیر ہی فروخت کر دیتا ہے۔ قصابوں کے منافع کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ انہیں صرف سامان شکم (کلیجی، بوٹی اور سراپا) کی کفایت ہوتی ہے

سامان کی بکری آٹھ آنے سے چودہ آنے تک ہوا کرتی ہے۔ آئندہ عنوان کے تحت
کریں گے کہ بکرے کی ابتدائی قیمت خرید کیا ہے اور وہ مختلف اشخاص کے ہاتھوں سے
کو کس قیمت پر پڑتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم کریں گے کہ پیشہ ور دھنگر (یعنی بھیڑوں کو دیہات
لانے والوں) مونڈسے دار اور قصابوں کے منافعوں کا اوسط کیا رہتا ہے۔

پیشہ ور دھنگر، درمیانی اشخاص، مونڈسے دار اور قصابوں کی آمدنیوں کا اوسط

(۱) پیشہ ور دھنگروں کی آمدنی کا اسی وقت اندازہ لگایا جا سکتا
یہ معلوم ہو کہ اس نے سال میں کسقدر بھیڑ، کتنی مرتبہ اور کس
کیا ہے۔ اُسکی آمدنی کا اوسط نکالنے میں دوسر
پیش آتی ہے کہ آمدنی کا واحد ذریعہ بھیڑوں کی فروخت ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ تین او
(۱) پہلا یہ کہ وہ سال میں دو مرتبہ بھیڑوں کا اون کاٹتا ہے اور کمبل تیار کرتا ہے جو اپنی
سے تین روپیہ سے پانچ روپیہ تک فروخت ہوتے ہیں۔
(۲) فصل بونے سے قبل کسان اپنے کھیتوں میں مندسے بٹھاتے ہیں تاکہ کھاد جمع ہو
معاوضہ میں اُنہیں روز آنہ مقررہ پیمانے سے دھان یا اُسکی قیمت مل جایا کرتی ہے۔
(۳) دیہات کے جاگیردار و قاضی وغیرہ اپنے کچھ بھیڑ ان کے ہاں چھوڑ دیتے ہیں اور حقِ حفاظت
صلے میں ماہانہ ایک دو آنے فی بھیڑ یا فصل پر کچھ غلہ دیدیا جاتا ہے۔ غرض کہ جب تک ہمیں
ہو کہ اُس کو ان تمام ذرایع سے کیا ملتا ہے، ہم ٹھیک طور پر اُسکی آمدنی کا ماہانہ یا سالانہ ا
لگا سکتے۔ البتہ قیاس سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُسکی ماہانہ آمدنی کا اوسط پچیس (۲۵) سے تیس رو
ہوگا جسمیں سے بہت تھوڑا وہ غذا پر صرف کرتا ہے جو نہایت سادہ ہوتی ہے اور باقی
چنانچہ اس بنا پر دیہات میں اُس کو مالدار تصور کیا جاتا ہے حالانکہ یہ پونجی بہت ہی قلیل

(۲) درمیانی اشخاص کی آمدنی کا تخمینہ

	بھیڑ کی قسم	تعداد	وزن	قیمت خرید مع چمڑا	قیمت فروخت بغیر چمڑا	قیمت فروخت فی چمڑا	منافع
قیمت خرید فی کھنڈی (۵۰ روپیہ)	مینڈی	۱۱	ساڑھے سات سیر	عـــہ ۸ر	عـــہ ۸ر	۸ر	($\frac{۵}{۱۶}$ × ۱)
	″	۶	نو سیر	″	ـــہ	۸ر	(۱ × ۲)
	″	۳	دس سیر	″	ـــہ ۵ر۴ر	۸ر	($\frac{۴}{۴}$ × ۳)
قیمت خرید فی کھنڈی (ـــہ ۱۲/۸)	لال پوٹلہ	۱۵	ساڑھے سات سیر	ـــہ ۲ر	ـــہ	۱۰ر	($\frac{۵}{۱۶}$ × ۱۵)
		۳	دس سیر	″	للعہ	۱۰ر	($\frac{۳}{۴}$ × ۳)
	″	۲	ساڑھے بارہ سیر	.	صہ	۱۰ر	($\frac{۵}{۴}$ × ۲)
قیمت خرید فی کھنڈی (۶۵ ـــہ)	چھیلے چھیلیاں	۱۵	نو سیر	ـــہ ۴ر	ـــہ	۱۲ر	($\frac{۵}{۱۶}$ × ۱۵)
	″	۳	بارہ سیر	″	للعہ	۱۲ر	(۱$\frac{۱}{۴}$ × ۳)
	″	۲	پندرہ سیر	″	صہ	۱۲ر	($\frac{۵}{۴}$ × ۳)

فرض کیجئے کہ کوئی شخص ایک کھنڈی مینڈیاں بحساب (۵۰ ـــہ) روپیہ خریدتا ہے جس میں ساڑھے سات، نو اور دس سیر کی مینڈیاں ۱۱ : ۶ : ۳ کے تناسب میں ہیں۔ شخص مذکور ان بھیڑوں کو اگر شہر لاکر بحساب "جٹی" (بغیر چمڑہ) فروخت کرے تو اس کو گیارہ منڈیوں پر آٹھ آنے فی بھیڑ کی شرح سے منافع ملے گا دو سیر والی چھ مینڈیوں پر ایک روپیہ فی مینڈی کے حساب سے اور دس سیر والی پر (عـــہ ۵ر۴ر) فی بھیڑ منافع ہوگا۔ اس طرح جملہ منافع (ـــہ ۱۵/۸ر) ہوتا ہے لیکن اس میں اُس بکرے کی قیمت بھی جمع کرنا ہوگا جو کہ "انبل" کے نام سے مفت ملا تھا۔ فرض کیجئے کہ اُس کی

قیمت (ے) روپیہ ہے اب منافع (۱۸ہ ۸ر) ہوگیا اس میں سے " اڑتی " بحساب تین روپیہ سیکڑا اور چندہ وحق محاسب جانے کے بعد جو کچھ بچ رہے وہ منافع خالص ہوگا۔

جملہ قیمت خرید	جملہ قیمت فروخت	اڑتی تین روپیہ سیکڑا	چندہ وحق محاسب	منافع خالص
(۵۰ہ)	(۶۸ہ ۱۲ر۴ہر)	عہ ۱۰ر	۱۳ر	(صہ ۱۰ر۲ہر)
(ہ ۸ر)	(۸۴ہ)	عہ ۸ر۳ہر	″	(ہ ۹ہر)
(۶۵ہ)	۸۶ہ ۸ر	عہ ۱ر۴ہر	″	(۱۷ہ ۱ر۸ہر)

پہلی حالت میں قیمت فروخت میں سے قیمت خرید مع " اڑتی " و چندہ اور حق محاسب منہا کرنے کے بعد دھنگر کو پندرہ روپیہ دس آنے دو پائی کا منافع ملتا ہے دوسری اور تیسری صورت میں منافع کی مقدار بالترتیب اٹھارہ روپیہ نو پائی و سترہ روپیہ ایک آنہ آٹھ پائی رہتی ہے۔
مندرجہ بالا مثالیں محض سہولت تفہیم کی خاطر لی گئی ہیں ورنہ یہ کاروبار ایسے ہیں کہ ان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا بہت ہی دشوار ہے۔ سوائے دھنگر کے منافع کی صحیح مقدار سے دوسرے لوگ بہت کم واقف رہتے ہیں۔ یہ سنا جاتا ہے کہ دھنگر کو عموماً پندرہ سے بیس روپیہ فی کھنڈی منافع ملتا ہے۔ بعض مرتبہ انھیں بجائے فائدہ کے نقصان ہو جاتا ہے (وہ اس طرح کہ) دھنگر منافع کی اُمید میں مال خرید کرلاتا ہے لیکن شہر آنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بھیڑوں کی طلب کم ہو جانے سے بازار سرد ہے اور قیمتیں خاطر خواہ نہیں وصول ہو رہی ہیں لہذا وہ اس امید میں کہ طلب پھر بڑھ جائیگی کچھ عرصہ توقف کرتا ہے لیکن اس اثنا میں چارہ وغیرہ کے نہ ملنے کی وجہ سے جانور لاغر ہو جاتے ہیں۔ اب تو قیمت اور بھی گر جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ چار و ناچار کم قیمت پر فروخت کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

(۳) قصابوں کے منافع کا اوسط

مینڈھی	وزن	قیمت خرید مع سامان شکم بغیر چمڑا	قیمت فروخت بلا سامان شکم و چمڑا	فروخت سامان	منافع
"	ساڑھے سات سیر	عصہ ۸ر	عصہ ۸ر	۸ر	۸ر
"	نو سیر	سے	سے	۸ر	۸ر
"	دس سیر	سے ۵ر۴ہر	سے ۵ر۴ہر	۹ر	۹ر
لال پوٹلہ	ساڑھے سات سیر	سے	سے	۸ر	۸ر
"	دس سیر	للعہ	للعہ	۹ر	۹ر
"	ساڑھے بارہ سیر	صہ	صہ	۱۰ر	۱۰ر
چھیلے چھیلیاں	نو سیر	سے	سے	۸ر	۸ر
"	بارہ سیر	للعہ	للعہ	۱۰ر	۱۰ر
"	پندرہ سیر	صہ	صہ	۱۲ر	۱۲ر

قصابوں کو عموماً سامان شکم (کلیجی، بوٹی اور سراپائے) بطور منافع مل جایا کرتا ہے جس کی قیمت آٹھ سے بارہ آنے ہوا کرتی ہے۔ خریدی کے وقت قصاب بکرے پر ہاتھ رکھ کر یا اُس کو اُٹھا کر اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کتنے سیر کا ہوگا۔ اُن کا تخمینہ اکثر و بیشتر صحیح ہوتا ہے اگر فرق ہو تو صرف سیر آدھ سیر ہی کا ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کوئی قصاب کسی مینڈھی کو ساڑھے سات سیر کی خیال کر کے خریدتا ہے اب اگر وہ مینڈھی اندازہ سے ایک سیر زائد ہو جائے تو قصاب کو علاوہ سامان شکم کی قیمت کے ایک سیر گوشت کی قیمت بھی بطور منافع مل جاتی ہے لیکن مینڈھی بجائے ایک سیر زیادہ ہونے کے ایک سیر کم ہو جائے تو قصاب کو بقدر ایک سیر گوشت کی قیمت کم منافع ملے گا یعنی یہ کہ اس

گوشت کی قیمت سامان شکم کی قیمت میں سے منہا ہو جائے گی۔ قصابوں کی آمدنی کا اوسط نکالنا کچھ زیادہ مشکل نہیں اگر کوئی قصاب روزآنہ ایک بکرا فروخت کرتا ہے تو اس کو ماہانہ پندرہ سے بائیس روپیہ تک منافع ملتا ہے اب بعض قصاب روزآنہ ایک بکرا فروخت کرتے ہیں بعض دو اور بعض تین اسی لحاظ سے ان کی ماہانہ آمدنیاں بھی کم اور زیادہ رہتی ہیں۔

(۴) معاوضہ موزڈے داران

	تعداد	نام مسلخ	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
مسلخ گوسفندان	۱	بیگم بازار	×	۶۰۰	۱۲	۱۸۰۰	۵۴
	۲	لال دروازہ	×	۲۵۰	۳	۷۵۰	۲۲ ۱/۲
	۳	سلطان باغ	×	۳۰	۱	۹۰	۲ ۷/۱۰
	۴	کاچی گوڑہ	×	۱۵۰	۶	۴۵۰	۱۸ ۱/۲
	۵	مشیر آباد	×	۲۲	×	۶۶	۱ ۲۹/۵۰
	۶	دومل گوڑہ	×	۴۰	۳	۱۲۰	۳ ۳/۵
	۷	رنگیلی کھڑکی	×	۲۰	۱	۶۰	۱ ۲/۵
	۸	چنچل گوڑہ	۱۰	۱۵۰	۵	۴۵۰	۱۸ ۱/۲
مسلخ گاؤ	۹	دودھ باؤلی	۲۰	×	مسلخ گاؤ میں موزڈے دار نہیں ہوتے	—	—
	۱۰	جہاں نما	۳	×	×	—	—
	جملہ	۱۰	۳۳	۱۲۶۲	۳۱	۳۷۸۶	۱۱۳ ۲۹/۵۰

فی موزڈے دار ’’ آمدنی ‘‘ کا اوسط روزانہ

۱۰ روپے سے زائد

مثل بھیڑوں کے خاص گوشت حاصل کرنے کے لئے گائیوں یا بیلوں کی پرورش نہیں کی جاتی۔ ذبح کے لئے عموماً وہی جانور آتے ہیں جو از کار رفتہ تصور کئے جاتے ہیں۔ گائے جب بوڑھی ہو جاتی ہے یا

بیل ناکارہ ہوجاتے ہیں تو انہیں قصابوں کے ہاتھ فروخت کردیا جاتا ہے۔ مسلخ گاوان میں نہ تو اڑتی گیر ہوتے ہیں اور نہ درمیانی اشخاص بلکہ خود قصاب قرب وجوار کے دیہاتوں یا بازار نارسنگی سے مویشی خرید لاتے ہیں اور روزانہ ایک ایک دو دو کرکے ذبح کردیتے ہیں۔ گائے چونکہ بڑی ہوتی ہے اس لئے قصاب اُس کے حصے کرلیتے ہیں اور اگلے اور پچھلے حصے کی قیمت ۱:۲ کے تناسب سے رہا کرتی ہے۔ بعض پچھلی دو رانوں کی اگر چھ روپیہ قیمت ہے تو سامنے کے چھپنوں کی تین روپیہ ہوگی۔ اس طرح تقسیم کرلینے کے بعد گوشت صارفوں کو عام طور پر بحساب فی روپیہ چار سیر فروخت کیا جاتا ہے۔ مندرجہ بالا جدول سے ظاہر ہو رہا ہے کہ بلدہ میں بمقابل گائے کے گوشت کے بکری کے گوشت کا بہت زیادہ صرفہ ہے لیکن دیہاتوں میں حالت بالکل برعکس رہا کرتی ہے۔ گائیوں کے متعلق اس کا کچھ ٹھیک پتہ نہ چل سکا کہ قصاب کتنے وزن کی گائے کس قیمت پر خریدتے ہیں ورنہ اُن کے منافع کا تخمینہ بھی بہ آسانی کرلیا جاتا۔

جدول نمبر ۴ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ جملہ رقم "اڑتی" یعنی (۲۹/۳۲ ۱۱۳) روپیہ کو مجموعی تعداد مونڈے داران یعنی (۳۱) پر تقسیم کرنے سے ہر مونڈے دار کی روزانہ آمدنی کا اوسط تین روپیہ دس آنے سے بھی زائد پڑتا ہے گویا مونڈے دار کی ماہانہ آمدنی ایک سو آٹھ روپیہ سے بھی کچھ زائد ہی رہتی ہے حالانکہ بلحاظِ محنت اُس کا نمبر سب سے آخر رہتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ مونڈے دار اپنی محنت سے کہیں زیادہ معاوضہ وصول کر رہے ہیں جس کی وجہ سے غریب دیہاتیوں کا حق مارا جاتا ہے جو محض پندرہ روپیے کی خاطر بھیڑ فراہم کرنے کے لئے دیہات دیہات پھرتے ہیں اور بعد ازاں تیس ۳۰ چالیس ۴۰ کوس پیدل چل کر انہیں شہر لاتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ ان کے بکنے تک یہیں ٹھیرے رہتے ہیں جس میں اس کے پندرہ ایک دن صرف ہوجاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُن کے منافع کا روزانہ (یہاں پر ہم یہ فرض کرلیتے ہیں کہ بھیڑوں کو دیہات سے شہر لاکر فروخت کرنے میں پندرہ دن صرف ہوتے ہیں اور عموماً اتنا ہی عرصہ لگا کرتا ہے) اوسط ایک روپیہ سے زائد نہیں ہوتا برخلاف اس کے مونڈے دار ایک ہی مقام پر بیٹھے ہوئے روزانہ قریب چار روپیہ کے

کما لیتا ہے۔

یہ اعتراض بالکل درست ہے لیکن اس کاروبار کی وجہ سے مونڈے داروں کی رقمیں اکثر مرتبہ تلف بھی ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ مونڈے داروں اور قصابوں کے مابین جس قدر بھی لین دین ہوتا ہے "آج اُدھار اور کل نقد" کے اصول پر جاری رہتا ہے۔ فرض کیجئے مونڈے دار کے پاس فروخت کے لئے ایک کھنڈی آتی ہے اور اتفاق سے ایک قصاب جس کو کسی شادی کی تقریب میں دو سیلے گوشت دینا ہے، پوری کھنڈی خرید لیتا ہے لیکن وہ مونڈے دار کو اُسی وقت قیمت نہیں دیتا بلکہ اُس کی ادائی گوشت کے فروخت ہو جانے کے بعد (صارف کے ہاتھ) دوسرے دن کی جاتی ہے۔ اب دوسرے دن وہ پوری رقم نہیں دیتا بلکہ کچھ باقی رہ جاتی ہے اور اسی طرح متعدد قصاب جو روزمرہ اُس کے ہاں سے مال خریدتے ہیں، تھوڑی بہت رقموں کے قرض دار رہتے ہیں اور ان پراگندہ قرضوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے اور ادائی کا ٹھکانا نہیں ہوتا۔ بعض قصاب، جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ قرض کی مقدار بہت بڑھ گئی ہے تو اُس مسلخ ہی کو جانا ترک کر دیتے ہیں اور دوسرے مسلخ میں ایک نئے مونڈے دار سے مال لینا شروع کر دیتے ہیں۔ سابقہ مونڈے دار کے ہاں چونکہ کسی قسم کا کاغذ وغیرہ نہیں ہوتا لہذا وہ اپنے ملازم کو روزآنہ ان رقموں کی وصولی کے لئے بھیجتا ہے لیکن مدتیں گذر جاتی ہیں اور رقم کی ادائی کی صورت نظر نہیں آتی حتیٰ کہ بعض مرتبہ یہ ڈوب بھی جاتی ہے۔ اگر ان تلف شدہ رقموں کو اصل آمدنی میں سے منہا بھی کر دیں تو پھر بھی مونڈے دار کی آمدنی ساٹھ ایک روپیہ سے تو کم نہیں رہتی اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ معاوضہ بھی بمقابل اُس کی محنت کے کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

مونڈے دار اکثر دولتمند ہوتے ہیں لیکن ان کی دولتمندی کا انحصار صرف مونڈے دار ہونے پر نہیں ہے بلکہ اس کے چند اور اسباب ہیں جو مختصراً درج ذیل ہیں۔

(۱) مونڈے داری ان کا آبائی پیشہ ہے۔ یہ تمام دولت اُن کی کمائی ہوتی نہیں ہے بلکہ ہر فردِ نسل نے اُس میں تھوڑا بہت اضافہ کیا ہے۔

(۲) بمقابل اُن کی آمدنی کے اُن کا صرفہ نہایت قلیل ہوتا ہے جس کی بنار پر کافی رقم جمع ہوتی چلی جاتی ہے۔

(۳) یہ لوگ روپیہ کو محض جمع نہیں رکھتے بلکہ کاروبار میں مشغول رکھتے ہیں مثلاً سود پر چلانا موقع کے مکانات خرید کر اُن کا کرایہ حاصل کرنا، تجربہ کار اور با اعتماد اشخاص کو رقم دے کر بھیڑیں منگوانا اور منافع کو نصف نصف تقسیم کر لینا وغیرہ۔

(۴) سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ لوگ بیس ایک برس کی عمر سے اس قسم کا کاروبار شروع کر دیتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ پچاس ساٹھ برس کے ہوتے تک کئی ہزار کما لیتے ہیں۔

(۵) یہ لوگ نہ صرف مونڈے داری کرتے ہیں بلکہ مسلخ کی آمدنی کا ٹھیکہ بھی لیتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی آمدنی میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ غرض کہ یہی چند وجوہات ہیں جن کی بنار پر وہ دن بدن متمول بنتے جاتے ہیں۔ یہاں تک تو ہم نے گوشت کے کاروبار میں کام کرنے والے افراد کی آمدنیوں کا تخمینہ لگایا لیکن آئندہ عنوان میں ہم یہ معلوم کریں گے کہ پیشہ ور دھنگر کے ہاتھ سے صارف تک پہنچنے میں بھیڑوں کی قیمت فی کھنڈی کس قدر زائد ہو جاتی ہے

بھیڑوں کی ابتدائی اور آخری قیمتوں کا تفاوت پیچھے ہم یہ بتلا چکے ہیں کہ ساڑھے سات، نو اور دس سیر والی مینڈیوں کی کھنڈی جس میں اُن کا تناسب ۱۱ : ۶ : ۳ رہتا ہے، دیہات میں پچاس روپیہ کو ملتی ہے لہٰذا ہم اس کو لے کر یہ معلوم کریں گے کہ صارفوں کے ہاتھ تک پہنچنے میں اُنکی قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے

بھیڑوں کی تعداد اور وزن		بھیڑوں کو دیہات سے شہر لانے والے کی قیمت خرید و فروخت فی بھیڑ		شہر میں قصاب کی قیمت خرید و فروخت فی بھیڑ		صارف کی جملہ قیمت خرید
تعداد	وزن	قیمت خرید دھنگر سے	قیمت فروخت قصاب کے ہاتھ	قیمت خرید دیہاتی شخص سے	قیمت فروخت صارف کو	پائی - آنے - روپیہ - پائی - آنے - روپیہ
۱۱	ساڑھے سات سیر	عہ ۸ر	ہے	ہے	ہے ۱۰ر	۳۹ - ۱۴ = ۱۱ × ۳ - ۱۰ - . - .
۶	نو سیر	؍	ہے ۸ر	ہے ۸ر	للعہ ۲ر	۲۴ - ۱۲ = ۶ × ۴ - ۲ - . - .
۳	دس سیر	؍	ہے ۱۳ر ۴ہر	ہے ۱۳ر ۴ہر	للعہ ۸ر ۴ہر	۱۳ - ۹ = ۳ × ۴ - ۸ - ۴

[illegible]

اس سے قبل نقشہ نمبر ۲ و تین میں ہم معلوم کرآئے ہیں کہ درمیانی شخص قصاب کو چمڑے اور سامانِ شکم کا منافع ملتا ہے یعنی یہ کہ درمیانی شخص دہنگر سے بھیڑ مع چمڑا خریدتا ہے اور قصاب کے ہاتھ بغیر چمڑا فروخت کرتا ہے اس طرح قصاب درمیانی شخص سے بھیڑ بلا چمڑا مع سامان خرید کر صارف کو بغیر چمڑا و سامانِ شکم فروخت کرتا ہے بہ الفاظ دیگر درمیانی شخص کو بقدرِ قیمت چمڑا فی بھیڑ اور قصاب کو بقدر قیمت سامانِ شکم فی بھیڑ منافع ملتا ہے یعنی یہ کہ درمیانی شخص اور قصاب کی قیمت خرید و فروخت میں چمڑے اور سامان شکم کی قیمت کا فرق رہتا ہے۔ مذکورہ بالا مثال میں ساڑھے سات سیر وزن والی بھیڑ جسکی قیمت خرید دو روپیہ آٹھ آنے ہے، آٹھ آنے کے منافع (قیمت چمڑا) سے یعنی تین روپیہ کو فروخت کی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ درمیانی شخص چمڑے کی قیمت قصاب سے نہیں وصول کرتا بلکہ دوسرے شخص سے جس کو وہ چمڑوں کی "چٹھی" دیدیتا ہے۔

(اب تک اصلی قیمت خرید میں صرف آٹھ ہی آنے کا اضافہ ہوا ہے) قصاب دو روپیہ آٹھ آنے میں مع سامانِ شکم خرید کر اُسی قیمت پر بلا سامانِ شکم فروخت کرتا ہے اسطرح اُس کو سامانِ شکم کا جسکی قیمت آٹھ آنے ہوتی ہے منافع ہوتا ہے (اب مزید آٹھ آنے کا اضافہ ہوگیا اصلی قیمت ڈھائی روپیہ تھی قصاب کے ہاتھ فروخت ہونے میں تین ہوئی اور قصاب سے صارف تک جانے میں ساڑھے تین ہوگئی) یہاں پر ایک چیز جو قابل نوٹ ہے یہ کہ سامانِ شکم آٹھ آنے میں صارف کے ہاتھ نہیں فروخت ہوا ہے بلکہ اسکو ایک دوسرا درمیانی شخص (بوٹی فروش) خریدا ہے جو بقدر دو آنے منافع لیکر صارف کو فروخت کرتا ہے لہذا ساڑھے تین میں اور ۲ دو آنے کا اضافہ ہوتا ہے گویا اب قیمت تین روپیہ آٹھ آنے نہیں بلکہ تین روپیہ دس آنے ہوگئی اور یہی آخری قیمت ہے جس پر کہ صارفین پورے بھیڑ کو مع چمڑا سامانِ شکم اور گوشت خریدتے ہیں اس قسم کا اضافہ نو اور دس سیر والی مینڈیوں کی قیمت خرید میں ہوتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ درمیانی شخص کے منافع میں ساڑھے سات سیر سے جس قدر بھی زائد گوشت ہوگا اُسکی قیمت جمع ہوتی جائیگی کیونکہ اُسکو نو اور دس سیر وزن والی مینڈیاں بھی اُسی ساڑھے سات سیر وزن والی مینڈیوں کی قیمت (عہ) پر ملی ہیں۔

نقشہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تین روپیہ دس آنے پر گیارہ، چار روپیہ دو آنے پر چھ اور چار روپیہ آٹھ آنے چار پائی پر تین مینڈیاں خریدی گئی ہیں اسطرح جملہ ایک کھنڈی مینڈیوں کی قیمت خرید اٹھتر روپیہ تین آنے ہوتی ہے یعنی دیہات میں درمیانی شخص کی قیمت خرید (عہ روپیہ کھنڈی) ہے اور شہر میں صارف کی قیمت خرید اٹھتر روپیہ تین آنے ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ایک کھنڈی بھیڑوں کی ابتدائی اور آخری قیمتوں کا باہمی تفاوت اٹھائیس روپیہ تین آنے ہے۔

محمد ناصر علی ایم اے (عثمانیہ) لکچرار معاشیات

سوزِ تمام

مجھے خوں رُلا رہا ہے یہ غرورِ پاکبازی
تجھے کیا خبر غلامی، ہے تمام کفر سازی

مری عشرتوں کی جنت، تری آرزو کی کھیتی
یہی دہر بے حقیقت، یہی عالمِ مجازی

تو نیازمندیوں پر ابھی ناز کر رہا ہے
ابھی غزنوی نہیں ہے، تری فطرتِ ایازی

اُٹھے اور اُٹھ کے پھر سے رخِ زندگی بدل دے
کوئی اک جوان مجاہد، کوئی ایک مردِ غازی

تری عقل محوِ قرآں، مرا شوق غرقِ عرفاں
میں قتیلِ جذبِ بوذرؓ، تو شہیدِ فکرِ رازی

مرے دل کی دھڑکنوں سے وہ قریب ہو رہی ہیں
مرے شوق کو مبارک، شبِ ہجر کی درازی

ترا کام زہد و تقویٰ، مرا کام جذب و مستی
تو فقط رکوع و سجدہ میں تمام تر نمازی

میں حقیقتوں کا ماہر، میں فدائے پیرِ رومی
مرا درس جذب و مستی، مرا کام نے نوازی

ماہر القادری

موضع[1] چوسالہ (ضلع بیڑ) کی معاشی تحقیق

محل وقوع | موضع چوسالہ بالاگھاٹ پر تعلقہ بیڑ سے بجانب جنوب واقع ہے۔ جس کا فاصلہ تعلقہ و ضلع بیڑ سے بیس (۲۰) میل ہے۔ موضع ہذا کے شمال میں موضع دھوترا ایک میل، جنوب میں پارگاؤں ۲ میل، مشرق میں ہنگنی بزرگ ۲ میل، اور مغرب میں سلطان پور ڈیڑھ میل پر واقع ہے۔ موضع ہذا کا قریبی ریلوے اسٹیشن بارسی بجانب شمال مغرب چوبیس (۲۴) میل کے فاصلے پر ہے۔ موضع ہذا کے دو بڑے بازار بارسی اور بیڑ ہیں۔ یہ موضع بیڑ سے بارسی جانے والی سڑک کے بالکل بازو واقع ہے۔

موضع ہذا کے تقریباً درمیان سے ایک ندی گذرتی ہے جو موضع کے شمال مغرب سے قصبۂ بورکھیڑ (جو چوسالہ ۶ میل دور واقع ہے) سے نکلتی ہے۔ اور آگے جا کر ماجرا سے ملتی ہے۔ اس ندی میں سلطان پور (جو موضع کے مغرب میں واقع ہے) کارگاؤں (جو شمال مغرب میں واقع ہے) اور دھوترے (جو شمال میں واقع ہے) کے بڑے بڑے نالے ملتے ہیں۔

آبادی | سال حال بطور خود حاصل کردہ مردم شماری کی رو سے موضع کی جملہ آبادی (۱۹۰۹) نفوس پر مشتمل ہے۔ منجملہ ان کے (۵۳۱) مرد، (۵۸۸) عورتیں، (۴۵۱) لڑکے، اور (۳۳۹) لڑکیاں ہیں۔ جملہ (۳۵۸) خاندانوں میں اس آبادی کی تقسیم ہوئی ہے

جملہ آبادی میں ۶ء۴ ، ۱۳ فی صد مسلمان ہیں جو (۴۷) خاندانوں پر مشتمل ہیں۔ اور بہ استثنا اچھوتوں کے جملہ آبادی میں ہندوؤں کا فیصد (۴۱، ۶۸) ہے جن کے (۲۵۹) خاندان ہیں۔ اور اچھوتوں کا فیصد (۱۲ء ۱۸) ہے جن کے جملہ خاندان (۵۲) ہیں۔

---

[1] اس مضمون پر ۱۳۴۳ف میں میکنزی انعام دیا گیا تھا مضمون کے بعض اہم حصے شائع کئے جا رہے ہیں ۔ ع ، س

تختہ قوم واری تقسیم آبادی

نمبر	قوم	جملہ آبادی: جملہ نفوس	جملہ آبادی: تعداد خاندان	تفصیل ذکور و اناث: مرد	تفصیل ذکور و اناث: عورتیں	تفصیل ذکور و اناث: لڑکے	تفصیل ذکور و اناث: لڑکیاں	تعلیمیافتہ: مرد	تعلیمیافتہ: عورتیں	شادی شدہ: مرد	شادی شدہ: عورتیں	ناکتخدا: مرد	ناکتخدا: عورتیں	بیوائیں: ۱۶ تا ۴۰ سال	بیوائیں: ۴۰ سے زائد	بے زن مرد
۱	مرہٹے	۵۶۹	۱۱۹	۱۶۴	۱۹۵	۱۱۹	۹۱	۵۰	۸	۱۴۴	۱۴۹	۴۵	۳۸	۹	۳۰	۱۳
۲	مسلمان	۲۵۷	۴۷	۶۴	۷۲	۶۰	۶۱	۳۶	۵	۵۴	۵۷	۳۰	۳۲	۱	۱۵	۷
۳	برہمن	۱۱۹	۱۹	۳۳	۳۸	۲۷	۲۱	۳۵	۴	۲۶	۲۶	۱۲	۶	۳	۹	۴
۴	مارواڑی	۷۷	۱۷	۳۱	۲۰	۱۵	۱۱	۳۱	۱	۲۰	۱۷	۱۱	۹	.	۳	۳
۵	دھنگر	۵۱	۱۱	۱۴	۱۷	۹	۱۱	-	-	۱۳	۱۳	۳	۲	۵	۱	۲
۶	مالی	۵۲	۱۵	۲۶	۲۲	۲۰	۱۴	۵	۱	۲۳	۲۱	۱	۲	.	۱	۴
۷	لنگایت	۱۴۶	۲۶	۳۸	۴۲	۴۲	۲۴	۵	.	۳۳	۳۵	۴	۵	۱	۳	۳
۸	چمار	۴۵	۶	۱۱	۱۲	۱۰	۱۲	۲	.	۱۰	۱۱	۱	.	.	۱	۱
۹	لوہار	۳۸	۶	۱۰	۱۲	۱۲	۴	۳	.	۹	۱۰	۱	.	۱	۱	.
۱۰	کوشٹی	۲۷	۴	۸	۹	۲	۸	۱	.	۸	۸	.	.	.	۱	.
۱۱	بڑھائی	۲۷	۴	۷	۸	۸	۴	۴	.	۶	۶	.	۱	۲	۱	۱
۱۲	حجام	۲۰	۵	۶	۷	۶	۱	۲	.	۶	۶	۳	.	۱	.	.
۱۳	درزی	۱۹	۴	۴	۵	۶	۴	۳	.	۴	۴	.	.	.	۱	.
۱۴	بقال	۱۳	۳	۲	۵	۴	۲	۱	۱	۲	۴	۱	۱	.	۳	۱
۱۵	زرگر	۱۱	۳	۵	۲	۱	۳	.	.	۳	۲	.	۱	.	.	۳
۱۶	تیلی	۱۰	۲	۳	۵	۱	۱	۱	.	۲	۲	.	.	.	۳	۱
۱۷	کولی	۱۱	۳	۵	۴	۱	۱	.	.	۳	۴	.	.	.	.	۲
۱۸	فقیر	۱۲	۴	۴	۵	۲	۱	۲	.	۳	۴	۳	۱	.	۱	.
۱۹	بھوئی	۹	۲	.	۳	۵	۱	.	.	.	.	۲	۱	۱	۲	.
۲۰	دھوبی	۹	۲	۳	۴	۲	.	۱	.	۳	۳	۱	.	.	۱	.
۲۱	کسار	۵	۱	۱	۱	۲	۱	۳	.	۱	۱	۱	۱	.	.	.
۲۲	کمھار	۵	۲	۱	۴	.	.	.	.	۱	۲	.	.	.	۲	.
۲۳	راجپوت	۱	۱	.	۱	.	.	.	.	.	.	.	.	.	۱	.
۲۴	دھیڑ	۲۰۰	۲۷	۵۵	۵۴	۵۴	۳۷	.	.	۵۱	۵۴	۱۸	۹	.	۴	۴
۲۵	مانگ	۱۴۶	۲۵	۳۶	۴۱	۴۳	۲۶	۳	.	۳۵	۳۶	۱۱	۳	۲	۳	۱
	جملہ	۱۹۰۹	۳۵۸	۵۳۱	۵۸۸	۴۵۱	۳۳۹	۱۸۷	۲۰	۴۶۰	۴۷۵	۱۴۸	۱۱۲	۲۶	۸۷	۴۹

پیشہ ورانہ تقسیم آبادی

تختہ سنین ماضیہ میں پیشہ ورانہ تقسیم آبادی

سنہ فصلی	کاشتکاران	غیر کاشتکاران	جملہ
سنہ ۱۳۴۰	۷۵۹	۷۸۷	۱۵۴۶
سنہ ۱۳۴۵	۱۰۰۷	۷۲۳	۱۷۳۰
سنہ ۱۳۴۸	۱۲۷۳	۶۳۶	۱۹۰۹

پیشہ ورانہ تقسیم آبادی کا سنین ماضیہ میں کوئی مفصل خاکہ دستیاب نہ ہوسکا۔ غیر کاشتکاران کے تحت صنعت و حرفت تجارت و ملازمت وغیرہ شامل ہیں۔ تختہ بالا سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ کاشتکاروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور غیر کاشتکاروں میں کمی۔ اور اس کمی کا سبب یہ ہے کہ اب سے تقریباً دس پندرہ سال قبل یہاں صنعت پارچہ بافی' تیل نکالنے کے گھانے ' جوتے بنانے والوں وغیرہ کی کافی تعداد تھی۔ مگر ان کے کاروبار نہ چلنے کی وجہ سے یہ بھی زرعی مزدوری کرنے لگے۔ اور اس طرح غیر کاشتکاروں میں کمی واقع ہونی شروع ہوئی۔ پیشہ ورانہ آبادی کی تقسیم و اعداد شمار درج ذیل ہیں:-

پیشہ	کاشتکاران			غیر کاشتکاران							جملہ آبادی
				صنعت			تجارت و ملازمت				
	اصل زراعت	زرعی مزدور	جملہ	کاریگر	[illegible]	جملہ	تجارت	نجی ملازمت	[illegible]	جملہ	
سنہ ۱۳۴۸	۶۳۹	۶۳۴	۱۲۷۳	۷۸	۴۶	۱۲۴	۲۰۴	۲۳۸	۷۰	۵۱۲	۱۹۰۹

اصل زراعت کے تحت ایسے اشخاص کا شمار کیا گیا ہے جن کے پاس ذاتی زمین ہے۔ جو بٹائی یا قول پر زمین لے کر یا کاشتکاری سے متعلقہ کام انجام دیتے ہوں انہیں زرعی مزدوروں کے تحت لیا گیا ہے۔ جو اشخاص اپنے ذاتی آلات سے کام کرتے ہیں انہیں کاریگروں کے زمرے میں

شریک کرکے باقی اس طرح کے کام کرنے والوں کو مزدوروں کے تحت شمار کیا گیا ہے۔ اس تشریح کے بعد بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آبادی کا بڑا حصہ کاشتکاری میں لگا ہوا ہے۔ بہت سے خاندان اس میں ایسے بھی ہیں جو ۱۵، ۲۰ سال قبل کافی زمین کے مالک تھے مگر ان کی زمینات قرضے کی ادائی میں چلی گئیں اور وہ اب زرعی مزدوری کر رہے ہیں۔ دوسرا نمبر بلحاظ آبادی تجارت و ملازمت میں ہے۔ اس میں بھی دیہی خدام و خانگی ملازمین میں جو تعداد زیادہ معلوم ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خاندانوں کی شرح پیدائش بہت ہے بہرحال بہ حیثیت مجموعی کہا جاسکتا ہے کہ دیگر ذرائع معاش نہ ہونے کی وجہ سے زمینات پر بار کافی پڑ رہا ہے۔

رقبہ | موضع مذکور کا جملہ رقبہ ۳۲۵۲ یکر ۲۵ گنٹہ ہے۔ موضع کی اراضی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) ناقابل زراعت یا بلا محصولی زمین کا رقبہ، (۲) قابل زراعت یا محصولی زمین کا رقبہ۔ اراضی ناقابل زراعت کی تفصیل یہ ہے

نوعیت	رقبہ	
گاؤ ٹھان	۱۹ یکر ۲۵ گنٹہ	رقبہ آبادی مکانات۔
ندی و نالہ	۱۱ " ۳۶ "	
کچا راستہ	۲۰ " ۲۷ "	
پوٹ خراب	۶۳ " ۳۲ "	وہ رقبہ جو حدود بندی زمینات میں جاتا ہے
پرمپوک معافی	۲ " ۱۰ "	موضع کے مویشیوں کو چروائی کے لئے زمین مختص ہوتی ہے۔
سڑک پختہ	۱۱ " ۳۹ "	
مسافر بنگلہ	۰ ۱۵ "	
جملہ	۱۳۰ یکر ۲۴ گنٹہ	

اراضی قابل زراعت یا محصولی زمین کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

نوعیت	رقبہ
باغات	۲۲۸ یکر ۲۱ گنٹہ
خشکی	۲۷۷۷ " ۲۸ "
انعامی زمین	۱۱۶ " ۳۲ "
جملہ	۳۱۲۳ یکر ا گنٹہ

نوٹ۔ انعامی زمین میں باغات و خشکی دو طرح کا رقبہ شامل ہے

جملہ رقبہ موضع کا تقریباً ۳ء۹۶ فی صد رقبہ زیر کاشت ' اور ۳ء۹ فی صد رقبہ ناقابل کاشت

اقسام زمینات موضع مذکور میں تین قسم کے زمینات پائے جاتے ہیں۔ (۱) مری SOIL OF LIHT اس زمین کی خصوصیت یہ ہے کہ موسم بارش میں اگر کھاد ڈال کر مونگ پھلی' مسور' باجرا کی کاشت کی تو پیداوار اچھی رہتی ہے۔ اس زمین کو پیڑ بھی کہا جاتا ہے۔ (۲) اوسط کالی مٹی والی زمین۔ MEDIUM BLACK SOIL اس پر باغات کی کاشت مفید ہوتی ہے۔ ونیز کپاس بھی اگائی جاسکتی ہے۔ اگر اس پر کھاد ڈالی جائے تو پیداوار بہت بہتر ہوسکتی ہے۔ (۳) ریگڑ BLACK SOIL اس قسم کی زمین خصوصیت یہ ہے کہ اس پر تین سال میں بھی ایک مرتبہ کھاد ڈالی جائے تو اس کی زرخیزی میں فرق آتا۔ یہ زمین ربیع کی جوار' اکسی' گیہوں' اور کپاس کے لئے زیادہ موزوں ہوتی ہے۔

آبپاشی جملہ زیر کاشت اراضی کے ۶۳ء ۸۸ فی صد رقبہ کا انحصار بارش پر ہے۔ مصنوعی آبپاشی تین قسم کے ہیں :-

(۱) باؤلیات =(موٹ تہل) (۲) ندی =(پالنتہل) (۳) مشترکہ (باؤلیوں وندیوں سے سیرابی) اسی کے تحت جو جدول درج ہے اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دس سال کے عرصے میں کی تعداد میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔ حالانکہ بارش کی غیر یقینی حالت اس امر کی متقاضی ہے کہ

کے لئے باؤلیوں میں اضافہ کیا جائے۔ مگر اہل موضع کی کم استطاعتی اس امر میں مانع ہے۔ زرعی اغراض کی تیاری کا خرچ تقریباً ایک اور ڈیڑھ ہزار کے درمیان ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی کثیر رقم اگر صرف کرنے کی سکت اہالیان موضع کو ہوتی تو قدیم باؤلیاں ناکارہ نہ ہوتیں۔ اور اس کی صفائی وغیرہ کا ضرور انتظام کرتے رہتے۔ پانی عام طور پر ۲۰ - ۲۵ فٹ پر بآسانی حاصل ہو جاتا ہے۔

اگر بارش ۲۵' اور ۳۰' تک ہو تو موضع کی ندی پورے سال چلتی ہے۔ ورنہ علاوہ بارش کے دیگر موسموں میں زراعت کے لئے اس سے فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ معاشی اعتبار سے اہالیان موضع کے لئے یہ ندی نقصان رساں ثابت ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں نالے بھی نقصان کے درپے ہیں۔ کیونکہ ان کے گذرگاہ سے کئی کھیت کٹ گئے ہیں۔ کالو پٹہ دار کے کھیت میں سے ایک نالہ گذرتا ہے جس سے دوران دس سال تقریباً ۵ ایکڑ زمین کٹ گئی ہے۔ اور نہ صرف یہی بلکہ ہر سال یہہ نالہ اپنا رخ اس طرح بدل رہا ہے کہ تعجب نہیں کہ چند ہی سالوں میں اس کھیت کی پختہ باؤلی بھی منہدم ہو جائے۔ اب تک مسمی مذکور کے تین آم کے بڑے بڑے درختوں کو اس نالے نے گرا دیا ہے۔ مزید دو درخت بھی چند ہی دنوں کے مہمان معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تو صرف ایک کھیت کے نقصان کا اندازہ ہے۔ اسی طرح کے اور بھی کئی کھیت ہیں۔ یہی حال ندی کا بھی ہے۔ چنانچہ سیٹھے کا بیان ہے کہ تقریباً ۱/۲ ۴ ایکڑ زمین ندی نے تین سال میں اپنا رخ بدل کر کاٹ دیا ہے۔ اہلیان موضع بھی اس کے شاہد ہیں کہ واقعی مسمی مذکور کی زمین کافی زرخیز ہے مگر بارش کے زمانے میں ۵ ایکڑ زمین پر یہہ ندی اپنا قبضہ کر لیتی ہے۔ اور دلدل کی وجہ سے اُسے تخم ریزی کے قابل نہیں رکھتی۔ تعجب ہے کہ دو سال قبل اس طرح کہ نقصان کا تختہ دفتر تحصیل پر طلب کیا گیا تھا۔ مگر اب تک انسدادی تدابیر اختیار نہیں کئے گئے۔ اگر ان نالوں کے گذرگاہوں پر چھوٹے چھوٹے بندھ باندھے جائیں۔ تو اس کا امکان ہے کہ یہ نالے جو مٹی بہا کر لاتے ہیں وہ ان بندھوں یا کٹوں کی وجہ سے بجائے آگے بہہ کر جانے کے وہیں رک جائیں۔ اور زمینات کٹنے نہ پائیں۔ اس کے علاوہ ایک اور طریقہ سے بھی اس عمل کو روکا جا سکتا ہے۔ ایسے مقامات پر جنگلات کو فروغ دیا جائے مختلف قسم کے

درختوں کی تنصیب عمل میں آئے تو اس وقت بھی امکان ہے کہ نالے وغیرہ مٹی کو اپنے ساتھ بہا کر نہ لے جائیں گے۔ بہرحال ہر سال زمینات کے کٹنے کی وجہ سے نقصان ہو رہا ہے اس سے اہل موضع کو نجات دلانا ضروری ہے اور اس پر یہ طرّہ کہ پانی باوجود رحمت آلہی ہونے کے طوفان نوح بن کر نقصان پہنچا رہا ہے۔ مشترکہ طور پر جو زمینات سیراب ہوتی ہیں اس کی حالت بھی بارش کی غیر یقینی حالت ہونے کی وجہ سے کوئی فائدہ مند ثابت نہیں ہو رہی ہے۔ مالگزاری کے تحت اسکی مزید تشریح ہو جائے گی۔

سنین ماضیہ میں باؤلیوں کی تعداد

سنہ فصلی	آبادی میں تعداد باؤلیاں	عام زرعی باؤلیاں	بھڑکی	دھرن
۱۳۳۹	۱۲	۵۰	۱۰	۱
۱۳۴۰	۱۱	۵۰	۱۰	۱
۱۳۴۱	۱۱	۵۰	۱۰	۱
۱۳۴۲	۱۱	۵۰	۱۰	۱
۱۳۴۳	۱۱	۵۱	۱۰	۱
۱۳۴۴	۱۱	۵۱	۱۰	۱
۱۳۴۵	۱۱	۵۱	۱۰	۱
۱۳۴۶	۱۳	۵۲	۱۰	۱
۱۳۴۷	۱۳	۵۲	۱۰	۱
۱۳۴۸	۱۳	۵۲	۱۰	۱

نوٹ ۔ کچی باؤلیوں کی دو اقسام ہیں۔
۱۔ بھڑکی ۔ ندی کے پانی کو ایک گڑھے میں جمع کرکے ندی کے خشک ہونے پر اس سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ بالکل ندی کے بازو ہوتے ہیں۔
۲۔ دھرن ۔ ندی کے پانی کو راستہ بنا کر کھیت میں لیتے ہیں یہ پانی عام طور پر باغات کے لئے لیا جاتا ہے۔

ہم نے خشکی تحت جو رقبہ زمین اوپر بتلایا ہے اس کا انحصار بارش پر ہے باقی رقبہ جو

باؤلیوں، ندی، اور مشترکہ طور پر سیراب ہوتا ہے اس کی تفصیل جدول ذیل سے ظاہر ہوتی ہے۔

تفصیل قسم سیرابی	رقبہ	محاصل
رقبہ جو باؤلیوں سے سیراب ہوتا ہے	۱۷۰ ایکر ۲۵ گنٹہ	۶۴۱ روپیہ
٫٫ ٫٫ ندی ٫٫ ٫٫ ٫٫	۵۶ ٫٫ ۱۱ ٫٫	۲۶۲ ٫٫
٫٫ ٫٫ مشترکہ ٫٫ ٫٫	۱۲ ٫٫ ۱۸ ٫٫	۵۹ ٫٫
جملہ	۲۴۰ ایکر ۱۴ گنٹہ	۹۶۲ روپیہ

جملہ قابل کاشت اراضی پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قابل کاشت اراضی کا تیرھواں حصہ مختلف قسم کے ذرائع سے سیراب ہوتا ہے۔ اور باقی (۲۸۸۳) یکر رقبہ کا انحصار قدرتی بارش پر ہے۔ اگر ہم سرکاری محاصل کا بھی تقابل کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قسم کے ذرائع آبپاشی کے تحت سیرابی والے رقبہ پر اوسطاً سرکاری محاصل فی یکر تقریباً ۴ روپیہ وصول ہوتے ہیں۔ اور باقی پر تقریباً ۱۵ فی یکر وصول ہوتے ہیں۔ اگر یہاں ذرائع آبپاشی میں توسیع ہو جائے تو نہ صرف پیداوار میں اضافہ ہو کر معاشی خوشحالی عود کر آئے گی بلکہ سرکاری محاصل میں بھی اضافہ کا امکان ہے۔

کھاد پیداوار بہتر حاصل کرنے کے لئے کھاد کی جو اہمیت ہے وہ کسی طرح بھی مخفی نہیں۔ مگر کاشتکار قدرت پر اتنا بھروسہ کئے ہوئے ہیں کہ باوجود انہیں اس کا علم ہونے کے کہ دن بدن پیداوار میں کمی واقع ہو رہی ہے پھر بھی تقریباً ایک چوتھائی سے زائد کاشتکار کھاد کا استعمال نہیں کرتے۔ موضع میں ایسے بہت کم زراعت پیشہ اشخاص ہیں جو جانوروں کے گوبر کو جمع کر کے کھاد کے طور پر استعمال کرتے ہوں۔ ورنہ یہ زرخیزی کا اہم جز خاک بنا کر راستوں پر بکھیر دیا جاتا ہے۔ غیر زراعت پیشہ اشخاص کھاد جمع کرتے ہیں مگر وہ بھی چند ہی خاندان ہیں۔ جن اشخاص کے وسیع مکانات ہیں وہ اپنے مکانات کے ایک حصہ میں کوڑا کرکٹ کے ساتھ ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ ایسے مکانات میں ہمیشہ نمی رہتی ہے۔

تعفن کی یہ حالت رہتی ہے کہ اجنبی وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ جمع شدہ کھاد تقریباً ڈیڑھ دو روپیہ فی بنڈی کے حساب سے فروخت ہوتی ہے۔ کمل کی صنعت کا جب یہاں رواج تھا اُس وقت کئی دھنگروں کے پاس گوسفند زیادہ تعداد میں رہتے تھے۔ اور یہ معاوضہ بہ شکل جنس لے کر کھیتوں میں مندہ بٹھانے تھے۔ مگر اب تعداد میں کمی کی وجہ سے وہ بھی باقی نہیں۔ محکمہ زراعت کی کوشش سے چند کھاد کے گڑھے کھدوائے گئے ہیں ونیز وقتاً فوقتاً کاشتکاروں کو مفید معلومات بھی بہم پہنچائے جارہے ہیں۔ محکمہ ہذا ان گڑھوں کی تعداد میں اضافہ کرے تو بہت بہتر ہے۔ سب سے اہم مقامی کھاد مویشیوں کا گوبر ہی ہے۔ اگر اہل موضع کو کوڑا کرکٹ راکھ، جانوروں کے پیشاب کی مٹی وغیرہ کے ساتھ گڑھوں میں محفوظ کروانے کی طرف راغب کیا جائے تو کاشتکاروں کو بہتر کھاد حاصل ہوسکتی ہے۔ موضع میں گائیں ذبح ہوتی ہیں۔ ان کے خون سے بھی بہتر کھاد حاصل ہوسکتا ہے اگر ان کے کاٹنے کا ایک جگہ انتظام کرکے ان کے خون کو گڑھوں میں کوڑا کرکٹ کے ساتھ محفوظ کروانے کا انتظام کیا جائے اور ابتداءً مفت تقسیم کیا جائے تو ممکن ہے کہ آیندہ ترغیب و تحریص ہو۔ انسانی فضلہ کے لئے بھی کوشش ہورہی ہے کہ اس سے بھی کھاد کا کام لیا جائے۔ اس کا تفصیلی ذکر محکمہ زراعت کے کاروبار کے تحت مفید ہوگا۔ پھلی کی کاشت کو فروغ دیا جائے تو زرخیزی میں کمی واقع نہ ہوگی۔

آلات زراعت | زمینات خواہ کتنی ہی زرخیز ہوں مگر اُنھیں مُسطح نہ کیا جائے، اس طرح پلٹا نہ جائے کہ اس میں ہوا کا گذر ہو کر نائٹروجن کی کافی مقدار جمع رہ سکے۔ تو زرخیز ترین زمین بھی پیداوار کے اضافہ سے قاصر رہتی ہے۔ موضع میں مروجہ ہل نہایت ہی قدیم ہیں۔ مقامی لکڑی، اور مقامی بڑھائی کی مدد سے جو آلات تیار کئے جاتے ہیں وہی استعمال ہوتے ہیں موضع کی زمین زیادہ تر سخت اور کالی ہے۔ جس کے لئے بہتر طریقہ پر جوتنا ضروری ہے۔ دیہی رجسٹر میں اگر اندراج صحیح ہے تو چھوٹے بڑے لکڑی کے ہلوں کی تعداد (۹۲) ہے یہ تعداد زراعت پیشہ آبادی کی کثرت کا خیال کرتے ہوئے بہت ہی قلیل ہے اور اس سے زراعتی پستی اور کسانوں کی غربت کا پتہ چلتا ہے۔ موضع میں ہل کرایہ پر بھی دئے جاتے ہیں۔ اور اکثر کاشتکار اسی طرح پر کام نکالتے ہیں۔ یہہ

معلوم رہے کہ خاص طور پر ایسی کوئی دوکان فراہمی آلات کی نہیں بلکہ اگر کوئی کاشتکار اپنا کام قبل از وقت ختم کرلیتا ہے تو دوسرے کو ۲ ر یا ۳ ر فی یوم کے حساب سے دیتا ہے۔ بڑے بڑے مالکان اراضی کے پاس تو آلات موجود ہیں مگر کم رقبہ والے کھیتوں کے مالک دوسروں کے کچھ تو رحم وکرم پر اور کچھ اُجرت دے کر حاصل کر کے کام چلاتے ہیں۔ موضع میں لوہے کے (۱۱) ہل دو سال سے کام میں لائے جارہے ہیں۔ معلوم ہوا ہے محکمہ زراعت نے ابھی نئے آلات کے رائج کرنے کی کوشش نہیں کی۔ محکمہ زراعت کی کوشش ہونی چاہئے کہ نئے ترقی یافتہ آلات کو رائج کیا جائے جس کی وجہ سے کم وقت میں زیادہ کام ہو۔ چونکہ موضع میں تقسیم وانتشار اراضی کی شدت ہے اس لئے محکمہ مذکور شتہ کہ طور پر ایسے آلات کی خریداری کی طرف اہل موضع کو تیار کرے۔ اگر ممکن ہوسکے تو آلات کی قیمت اقساط سے وصول کی جائے۔ چونکہ موضع میں ایسے قطعات اراضی بہت ہیں جہاں بڑے بڑے آلات کا استعمال ناممکن ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مفید مطلب چھوٹے چھوٹے آلات بھی فراہم کئے جائیں۔ اور سب سے بہتر طریقہ تو یہی ہوگا کہ ابتداً نئے قسم کے آلات کی بغیر معاوضے کے اگر اُجرت لی بھی جائے تو بہت قلیل۔ تاکہ کاشتکار اس کے فوائد سے واقف ہو جائیں۔

تخم | کھاد اور آلات کے بعد تخم کی طرف توجہ ضروری ہے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ چند ہی کاشتکار فصل کاٹنے کے بعد عمدہ عمدہ بھٹے علیحدہ کر کے بھوسے کے ساتھ اپنے رہائشی مکان کے ایک حصہ میں ڈھیر کر دیتے ہیں یا کسی چیز میں نیم کا پتہ ملا کر محفوظ کر دیتے ہیں مگر زیادہ کاشتکاروں کی تعداد ایسی ہے جو فصل کے تیار ہوتے ہی اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل، سرکاری محاصل کی ادائی، یا قرض کے ادائی کی فکر میں تقریباً محاصل شدہ پیداوار کا (½) حصہ فروخت کر دیتے ہیں (اور باقی اپنی ضروریارت کی تکمیل کے لئے رکھ لیتے ہیں۔ حالانکہ تمام سال کے لئے یہ ناکافی ہوتا ہے۔ اور بعد میں ضروریات کے لئے خریدنے کی ضرورت ہوتی ہے) اور تخم ریزی کے وقت پھر تخم خریدتے ہیں۔ اس طرح کے عمل سے عمدہ تخم دستیاب نہیں ہوتا ہے کیونکہ بازار میں آمیزش کے بعد اجناس فروخت کرنے کا طریقہ ہے۔ دوسرے ایسے وقت قیمتیں بھی اعلیٰ ہوتی ہیں۔ مقامی ساھو، اور

خوش باش " سوائی " کے طریقے پر بھی تخم دیتے ہیں۔ محکمہ زراعت نے تین سال سے چند ترقی یافتہ تخموں کو یہاں مفت تقسیم کیا تھا۔ جس کا اثر اچھا رہا۔ اس کے تحت زیر کاشت رقبہ کی تفصیل آئندہ آئیگی۔ مگر یہ بتلانا ضروری ہے کہ اناج کے ترقی یافتہ تخموں کو رائج کرتے وقت اگر کاشتکاروں کو صرف اعلیٰ اقسام والے تخم کاشت کے لئے دئے جائیں جس سے کہ حاصل شدہ پیداوار کی قسم اعلیٰ ہونے کا امکان ہو تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اعلیٰ قسم کی قیمت اعلیٰ نہیں ملتی۔ بلکہ یہاں تو مقدار کی زیادتی کا سوال ہے۔ خواہ قسم اوسط ہی حاصل ہو مگر مقدار زیادہ رہے یعنی پیداوار فی ایکر زیادہ حاصل ہو تو قیمت بھی زیادہ ملنے کا امکان ہوتا ہے۔ اگر محکمہ امداد باہمی فروخت پیداوار کا انتظام کرے تو کاشتکاروں کا فائدہ بھی ہے۔ ورنہ کاشتکاروں کو اعلیٰ قسم سے غرض نہیں بلکہ مقدار کی زیادتی درکار ہے۔ بہرحال محکمہ زراعت کے وقتاً فوقتاً مشورے اس معاملے میں موضع والوں کے لئے نہایت ضروری ہیں

باڑ اندازی موضع میں کہیں بھی دائمی باڑ نظر نہیں آتی۔ ببول کی کانٹی کی باڑ چند کاشتکار لگاتے ہیں۔ باڑ نہ ہونے کی وجہ سے جب کہ فصل استادہ رہتی ہے تو موضع کے مویشی رات میں فصل کو کافی نقصان پہنچاتے ہیں۔ کانٹی قیمتاً دستیاب ہوتی ہے۔ عام طور سے اس کا نرخ دو روپیہ فی بنڈی ہے۔ اٹھل راؤ پٹیل اور سیٹھے جنہوں نے تقریباً (۵۰) (۶۰) ایکر والی زمین کانٹی لگائی ہے ان کے اخراجات (۴۰) (۴۵) روپئے ہوئے ہیں۔ چونکہ ہر سال اس قسم کی باڑ ناکارہ ہو جاتی ہے اس لئے کم و بیش سالانہ اس کے لئے ان کے یہی اخراجات ہونے کا پتہ چلا ہے۔ محکمہ زراعت یا محکمہ امداد باہمی باغات اور ایسے کھیت جہاں اعلیٰ قسم کی اجناس اگائی جاتی ہے باڑ لگائے اور اُس کی قیمت سالانہ اقساط پر وصول کرلے۔ اور اس سے زمینات کی حالت درست کرنے میں مدد مل سکے گی۔

مویشی

تختہ مندرجۂ ذیل سے گذشتہ تیرہ سال کے مویشیوں کی تعداد کا حال معلوم ہوتا ہے

سنہ فصلی	تعداد مویشی متعلقہ کاشتکاران وغیر کاشتکاران							
	گاؤ نر	جاموش نر	گاؤ مادہ	جاموش مادہ	بچے	اسپ	جملہ	[illegible]
سنہ ۱۳۳۵	۴۵۹	۲۰	۳۲۵	۷۳	۱۱۶	۴۶	۱۰۳۹	۲۳۰
سنہ ۱۳۴۰	۶۱۴	۱۸	۳۱۲	۱۲۴	۴۱۷	۷۰	۱۵۵۵	۳۰۷
سنہ ۱۳۴۵	۵۳۲	۲۳	۲۸۸	۱۵۳	۵۸۴	۵۱	۱۶۳۱	۲۶۶
سنہ ۱۳۴۸	۴۸۲	۲۴	۲۸۳	۱۴۷	۲۸۰	۴۳	۱۲۵۹	۲۴۱

مویشیوں کو ہندوستان میں جو اہمیت حاصل ہے وہ شاید ہی دنیا کے دیگر ممالک میں ہو۔ بغیر ان کی مدد کے نہ تو فصل تیار کی جاسکتی ہے اور نہ بازار تک لے جائی جاسکتی ہے۔ مویشی راست اور بالواسطہ دو طریقوں سے زراعت میں معاون ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان کی غذا کی طرف سے جو بے اعتنائی برتی جاتی ہے وہ افسوسناک ہے۔ موضع کے مویشیوں کے مالکوں کا قاعدہ ہے کہ جب تک مقامی چراگاہوں میں گھاس نہیں ہوتی اس وقت سوکھا گھاس، اور کڑبی کچھ کھلی اور بھوس زرعی اغراض میں کام دینے والے مویشیوں کو دیا جاتا ہے۔ مگر ان کا ذخیرہ ختم ہوا یا کچھ بارش کا سلسلہ شروع ہوا تو مویشیوں کو اپنے طور پر مقامی چراگاہوں سے غذا حاصل کرنی پڑتی ہے۔ کثرت آبادی فصلوں کے غیر یقینی حالت کی وجہ سے چارہ ضرورت کے موافق میسر نہیں آتا۔ فصل اچھی رہنے پر معلوم ہوا کہ (۲۰۰) کڑبی کے پولے ایک یکر میں تیار ہوسکتے ہیں۔ مگر فصل بہت کم اچھی رہتی ہے۔ کڑبی کے ذخیرے کو یا تو مکانات کی چھتوں پر یا مکانات کے صحنوں میں جما دیا جاتا ہے۔ جہاں بارش وغیرہ سے اس کا کچھ حصہ خراب ہوجاتا ہے۔ جب مویشیوں کے غذا کی یہ حالت ہو تو ان کے تنومند رہنے کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔ عام طور سے گھوڑوں، جاموش کی ناگفتہ بہ حالت ہے۔

یہ بہت لاغر ہوتے ہیں۔ آج سے تقریباً پندرہ بیس سال قبل موٹروں وغیرہ کا رواج نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے گھوڑوں پر آمدورفت ہوتی تھی اس لئے اس وقت ان کی نگہداشت بھی اچھی ہوتی تھی۔ جانوروں کے لئے تو مرہٹواڑی کی آب وہوا بھی موافق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہاں کی سخت زمین پر یہ کام بھی نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہہ ہلاک ہوجاتے ہیں۔ جسکی وجہ سے ان کی تعداد بھی کم ہے۔ ان کی غذا کا بھی یہہ حال ہوتا ہے کہ نرگاؤ، گاؤمیش سے بچی ہوئی کڑبی وغیرہ سے انہیں اپنا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔ نرگاؤ کی تعداد میں ابتدائی پانچ سالوں میں اضافہ کا پتہ چلتا ہے۔ مگر اس کے بعد ان کی تعداد کم ہونی شروع ہوتی ہے۔ آئے دن ان پر امراض کے حملے ہوئے اور فوری طبی امداد نہ پہنچنے کی وجہ سے یہہ ہلاک ہوگئے۔ اس پر طرفہ یہ کہ انسپکٹر علاج حیوانات کے دوروں کے وقت اہالیان موضع ٹیکہ اندازی کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ پولس پٹیل کے رجسٹر سے پتہ چلا کہ ۲۴ رفروری ۴۸ئ ف کو موضع میں (۸۸۰) مویشیوں کو ٹیکہ دیا گیا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ انتھک کوششوں کے بعد یہہ پہلا موقع تھا کہ مویشیوں کے مالک اس کے طریقہ داشت پر نسل کے اچھے اور برے ہونے کا انحصار ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہیں تذکرہ کیا گیا ہے کہ ان کی داشت کا طریقہ نہایت ہی ناقص ہے۔ زرعی کاروبار کے زمانے میں ان کی خاطر مدارات کی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں ان کو بھوسہ کھلی وغیرہ کھلائی جاتی ہے۔ اور جہاں کام نکل گیا تو ان کو خود کوشش کرکے اپنی غذا فراہم کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ بھی صرف نرگاؤ کے ساتھ سلوک ہے۔ مادہ گاؤ گاؤمیش کو دودھ دینے کے زمانے میں تولہ وغیرہ دیا جاتا ہے۔ اور جہاں دودھ میں کمی واقع ہوئی ان کے راتب میں کمی کردی جاتی ہے۔ اس طرح نسل مویشی کمزور ہوتی جارہی ہے۔ نسل کو بہتر بنانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ افسر زراعت بیڑ نے آذر ۴۸ئ ف میں اس موضع کے دودھ کا جو اندازہ اپنی رپورٹ میں لگایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ " روزانہ دوسو سیر دودھ پیدا ہوتا ہے۔ جس میں سے پچاس سیر خانگی استعمال میں صرف ہوتا ہے۔ پچیس سیر فروخت ہوتا ہے اور باقی (۱۲۵) سیر کا گھی بنایا جاتا ہے۔ اور ماہانہ (۱۶) ڈبہ گھی فروخت ہوتا ہے۔" یہہ گھی بیڑ یا بارسی لے جاکر فروخت کیا جاتا ہے۔

اگر محکمہ علاج حیوانات کے تحت دورہ کنان انسپکٹرون کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور ہر ضلع میں ایک انسپکٹر کا تقرر کیا جائے تو کم از کم امراض سے مویشی اتنے ہلاک نہ ہوں گے۔ کیونکہ ایک انسپکٹر چار، پانچ اضلاع کے مویشیوں کی نگہداشت بہ مشکل کرسکتا ہے۔ موضع سے مویشیوں کے وبائی امراض کی اطلاع بروقت نہ پہنچنے کی وجہ سے بھی مویشیوں کی ہلاکت عمل میں آتی ہے۔ اس کا بھی انتظام ہونا ضروری ہے کہ فوراً اس کی اطلاع ہو جائے۔

یہاں مویشیوں کی کوئی خاص نسل مشہور نہیں ہے۔ محکمہ زراعت کے لئے ضروری ہے کہ وہ افزائش نسل مویشیاں کی طرف جلد اپنی توجہ مبذول کرے۔

حقیت اراضی بلحاظ حقیت مرہٹواڑی میں مزارعین کے تین طبقے پائے جاتے ہیں۔ (۱) پٹہ دار جو مالک زمین ہوتے ہیں (۲) شکمیدار جو پٹہ داروں کے زمینوں میں بلحاظ وراثت حصہ پاتے ہیں۔ (۳) قولدار یا بٹائی دار جو پٹہ داروں یا شکمیداروں سے کاشت کے لئے زمین حاصل کرتے ہیں۔ اور بعوض کاشت، سالانہ معینہ رقم، یا اجناس دیتے ہیں۔ ابتدائی دو طبقوں کے حقوق وراثتاً منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ تختہ تعداد کاشتکاران میں ایک اور طبقہ حصہ داروں کا بھی تبلایا گیا ہے۔ یہ حصہ دار دراصل دو طبقوں کے زمینات میں حصہ پاتے ہیں۔ مگران کا حصہ شکمیداروں سے بہت کم ہوتا ہے۔ چونکہ رفتہ رفتہ خاندان مشترکہ کا طریقہ متروک ہوتا جارہا ہے۔ اس لئے زمینات میں بھی تقسیم ہوتی جارہی ہے۔ اور یہ تقسیم زراعت کے لئے نقصان رساں ثابت ہورہی ہے۔ ایسے پٹہ دار جن کا ذریعہ معاش تجارت ہے یا جو دیگر مقامات پر رہتے ہیں وہ اپنی زمینات کو قول پر دیتے ہیں۔

صنعتوں کے زوال کے بعد سے قولداروں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اور ہر شخص کی کوشش ہونے لگی کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے قول پر زمینات حاصل کرے۔ قانون طلب ورسد کے اثر سے قول کے نرخ میں اضافہ ہوگیا۔ مگر کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہ ہونے کی وجہ سے ایسے اشخاص مجبور ہوگئے کہ اضافہ پر بھی زمینات حاصل کریں۔ چونکہ ان کو زیادہ سے زیادہ دو یا تین سال کے لئے زمینات کاشت کے لئے دی جاتی ہیں اس لئے انہیں موقع نہیں ملتا کہ زمینات پر کھاد وغیرہ

اخراجات برداشت کرکے زیادہ پیداوار حاصل کریں ۔ اور نہ مالکان اراضی کو اس کا خیال ہے کہ بطور خود انہیں زمینات کی درستی کے لئے کچھ مدد دیں ۔ جس کی وجہ سے زرخیزی میں دن بدن کمی ہوتی جارہی ہے ۔ قولداروں کی بے اعتنائی زمینات کو کمزور کر رہی ہے ۔

تختہ تعداد کاشتکاران

سنہ فصلی	تعداد پٹہ دار	تعداد شکمیدار	تعداد حصہ دار	جملہ
سنہ ۱۳۴۰	۴۹	۸۱	۳۲۰	۴۵۰
سنہ ۱۳۴۵	۵۰	۹۲	۳۵۲	۴۹۴
سنہ ۱۳۴۶	۵۰	۸۸	۳۶۷	۵۰۵
سنہ ۱۳۴۷	۵۱	۹۰	۳۶۹	۵۱۰
سنہ ۱۳۴۸	۵۱	۹۱	۳۷۶	۵۱۸

تقسیم و انتشار اراضی

رقبہ زمین بلحاظ ملکیت	تعداد کاشتکاران	جملہ رقبہ مقبوضہ	اوسط رقبہ فی کاشتکار	مجموعی زیر کاشت رقبہ کا فیصد
۳۰ یکر سے زائد زمین جنکی ملکیت میں ہے	۱۱	۳۴۹ یکر	۳۷ ؍ ۳۱ یکر	۲ ؍ ۱۱
۲۰ 〃 〃 ۳۰ یکر 〃 〃 〃	۱۵	۳۴۶ 〃	۶ ؍ ۲۳ 〃	۴ ؍ ۱۱
۱۰ 〃 〃 ۲۰ 〃 〃	۶۶	۹۱۲ 〃	۶ ؍ ۱۳ 〃	۳ ؍ ۳۰
۵ 〃 〃 ۱۰ 〃 〃	۸۹	۶۷۸ 〃	۶۲ ؍ ۷ 〃	۴ ؍ ۳۲
۳ 〃 〃 ۵ 〃 〃	۱۰۷	۳۹۰ 〃	۶۴ ؍ ۳ 〃	۹ ؍ ۱۲
۲ 〃 〃 ۳ 〃 〃	۶۲	۱۳۹ 〃	۲۴ ؍ ۲ 〃	۶ ؍ ۴
۱ 〃 〃 ۲ 〃 〃	۱۱۰	۱۴۰ 〃	۲۷ ؍ ۱ 〃	۶ ؍ ۴
۳۰ گنٹہ سے ۴۰ گنٹہ 〃	۱۷	۱۳ 〃	۴۷ ؍ ۳۰ گنٹہ	۴ ؍
۲۰ 〃 〃 ۳۰ 〃 〃	۲۳	۱۸ 〃	۳۶ ؍ ۲۱ 〃	۵ ؍
۱۰ 〃 〃 ۲۰ 〃 〃	۶۵	۱۹ 〃	۷ ؍ ۱۱ 〃	۶ ؍
۵ 〃 〃 ۱۰ 〃 〃	۲۷	۴ 〃	۱۸ ؍ ۶ 〃	۱ ؍
۵ 〃 〃 کم 〃 〃	۱۳	۲۸ گنٹہ	۱۵ ؍ ۲ 〃	۲ ؍

تختہ بالا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تقسیم و انتشار اراضی کی شدت ہے صرف (۱۸۱) کاشتکار ایسے ہیں جو دس ایکر سے زائد زمین کے مالک ہیں۔ ہمیں جو چھوٹے چھوٹے قطعے ملتے ہیں اگر یہ زرخیز ہوتے تو ان پر اعلیٰ اقسام کی کاشت ممکن ہوتی تو یہ تقسیم نقصان رساں نہ تھی۔ مگر زرخیزی میں دن بدن کمی، اور اگر ان پر اعلیٰ اقسام کی کاشت کی بھی جائے تو ان کی طلب نہ ہونے کی وجہ سے یہ تقسیم بہت نقصان رساں ہوگئی ہے۔ اگر ذرائع آبپاشی مستقل ہوتے تو کاشت عمیق کا رواج دینا آسان ہوتا۔ اور یہ طریقہ نقصان کی تلافی کرسکتا۔ مگر یہہ بھی نہیں ہے۔ بہرحال اصل کی کمی، آبپاشی کی غیر مستقل حالت، قانون تقلیل حاصل کا زمینات پر اثر، صنعت وحرفت کا زوال۔ انفرادیت کا دور دورہ، آبادی میں اضافہ کے ساتھ زمینات پر زیادہ بار کا پڑنا ان تمام اسباب کی بنا پر تقسیم و انتشار اراضی میں اضافہ ہوا۔

مندرجہ ذیل مثالوں سے زمین کی ابتری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مسمی بیاجی سروے نمبران ۵۸، ۵۳، ۴۶، ۱۴۸، ۱۴۷، ۱۴۶، ۱۴۵ا، ۱۵۴، ۲ ـ ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۸، ۱۷۲، ۱۷۴، اور ۱۵۱ میں علی الترتیب ۳۱ گنٹہ۔ ۱۱ گنٹہ۔ ۶ یکر۔ ۲ یکر۔ ۱۷ گنٹہ، ۱۳ گنٹہ، ۱۸ گنٹہ، ۳ گنٹہ، ۲ یکر، ۱۰ گنٹہ، ۱۲ گنٹہ، ۸ یکر، ۹ یکر، ۸ یکر، ۹ یکر، ۸ یکر، اور ½ ایکر پر حق ملکیت رکھتا ہے۔ سروے نمبر (۹۸) کی مثال اس کے برعکس ہے۔ اس اراضی کا رقبہ (۷) گنٹہ ہے۔ جس میں پٹہ دار ½۱ گنٹہ شکمیدار (½۱) گنٹہ، اور تین حصہ دار (½۱) گنٹہ، (۱) گنٹہ اور ½۱ گنٹہ کے مالک ہیں۔ یہہ تمام کے تمام خود کاشتکار ہیں۔ اور اس اراضی پر جوار وغیرہ جیسی معمولی اجناس کی کاشت ہوتی ہے۔ اسی طرح سروے نمبر (۱۰۲) ۹ یکر کی اراضی ہے۔ جس پر (۱۲) اشخاص کا مالکانہ حق ہے۔ سروے نمبر (۱۰۴) صرف ایک یکر کی اراضی ہے جس کے تین ٹکڑے ہیں اور ہر ایک پر مالکان خود کاشت کرتے ہیں۔

پس متذکرہ بالا واقعات اس امر کی بین دلیل ہیں کہ یہاں زراعت کی پستی کا بڑا سبب تقسیم و انتشار اراضی ہے۔ کاشتکاروں کے کھیت جس قدر چھوٹے ہوتے جائیں گے اسی رفتار سے مصارف پیدائش میں

اضافہ اور پیداوار میں کمی ہوگی۔ ایسے چھوٹے ٹکڑوں پر ہر کاشتکار اپنی مرضی کے مطابق زیادہ فائدہ حاصل کرنے سے قاصر ہے۔ اگر وہ اعلیٰ قسم کی پیداوار حاصل کرنے کی کوشش کرے تو دیگر اشخاص کے مویشی اسے تباہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مختلف خطوں کی علٰحدہ علٰحدہ نگرانی میں زیادہ اخراجات ہو جاتے ہیں۔ مستقل ترقیات اراضی اور اعلیٰ قسم کے آلات کشاورزی سے استفادہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہر خطہ پر کنندیدگی باؤلیات ناممکن ہے۔

معاشی کھیت کی مختلف معاشین نے مختلف تعریف کی ہے۔ ایک کا خیال ہے کہ معاشی کھیت کا رقبہ اتنا ہونا چاہئے کہ مصارف کاشت جانے کے بعد آمدنی اتنی بچے کہ کاشتکار اعلیٰ قسم کا معیار رہائش برقرار رکھ سکے؛ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مصارف کاشت وضع کرنے کے بعد اس کے پاس اتنا سرمایہ ہو کہ اوسط معیار رہائش قائم رکھ سکے؛ تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ وہ خطہ اراضی جس پر ایک اوسط خاندان اپنے پاس کی محنت واصل کو مشغول کر کے بیشترین منافع حاصل کر سکے۔ اور ہمارے مفید مطلب بھی یہی تعریف ہے۔ کیونکہ معاشی کھیت کا رقبہ موقع ومحل وزمینات کی زرخیزی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شہر سے قربت نہیں کہ اعلیٰ قسم کی فصلیں اگا کر وہاں فروخت کے لئے بھیجی جائیں۔ اور نہ خود موضع میں طلب ہے۔ ذرائع حمل ونقل کی سہولتیں بھی نہیں کہ جہاں طلب ہو وہاں یہ اقسام روانہ کی جا سکیں۔ یہاں یہ بتلا دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ موضع مذکور سے (۳) میل کے فاصلے پر موضع لمبا گنیش واقع ہے۔ جہاں انگور کی کاشت ہوتی ہے۔ موضع میں تو معلوم نہیں مگر بیڑ میں دوران موسم ۴ سیر فی روپیہ تک انگور فروخت ہوتے ہیں۔ حالانکہ گلبرگہ شریف ورنگل وغیرہ بڑے مقامات ہیں مگر وہاں بھی ۲ سیر سے زائد دستیاب ہونا مشکل ہے۔ اگر ذرائع نقل وحمل کی سہولتیں ہوں اور محکمہ زراعت بھی اس قسم کے اعلیٰ پیداواروں کو طلب والے مقامات پر روانہ کرنے میں ان کی رہبری کرے تو زیادہ فائدہ کا امکان ہے۔ صرف اسی موضع ہی میں نہیں بلکہ اس کا امکان ہے کہ کل ہندوستان میں شاید ہی چند ایسے کاشتکار ہوں گے جو اپنے خاندان کے افراد کی محنت پر اجرت کا شمار، بیلوں کی داشت کے اخراجات کی فہرست، آلات کشاورزی وغیرہ پر

مطالبات فرسودگی وغیرہ کی تفصیل تبلائیں البتہ ہم نے حتی الامکان کوشش کے بعد صحیح معاشی کھیت کارقبہ معلوم کرنے کے لئے جملہ مدات زندگی و مدات اخراجات زرعی کا اندازہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں جس خاندان میں تین بڑے اشخاص اور تین بچے ہوں اور بشرطیکہ کھیت میں باؤلی ہو اور جملہ آلات کشاورزی اگر اعلیٰ نہیں تو درست حالت میں ضرور ہوں تو کم از کم ۶ ، یکر زمین اقل معیار رہائش فراہم کر سکتی ہے ۔ مگر جب ہم تختہ بالا پر نظر ڈالتے ہیں تو تقریباً نصف سے زائد کھیت اس معیار پر نہیں اترتے ۔

تقسیم انتشار اراضی کو روکنے کیلئے سرکاری طور سے کئی تدابیر اختیار کئے جاچکے ہیں اور کئے جارہے ہیں ۔ البتہ اتنا کہنا پڑتا ہے کہ جب تک اہل موضع کے لئے زراعت کے علاوہ دیگر ذرائع معاش سرکار اپنی کوشش سے فراہم نہ کردے یہ تقسیم برابر جاری رہے گی ۔ جس طرح قانون انتقال اراضی کے نفاذ کے بعد سے اراضیات غیر کاشتکار طبقہ کے پاس جانے سے رک گئی ہیں اگر اسی طرح سے ایک معینہ رقبہ کے بعد اراضیات کی آیندہ تقسیم ممنوع قرار دی جائے تو مفید ہوگا ۔ کاشت مشترک کے طریقے کے فوائد سے انجمن امداد باہمی کے ذریعہ کاشتکاروں کو واقف کرایا جائے ۔ یہ بھی فائدہ مند ہے ۔ انجمنہائے اتصال اراضی سے بہت کچھ نفع کی امید ہوسکتی ہے مگر اس میں حکومت کی کوشش درکار ہے ۔ اس لئے حکومت بھی کوشش کرے تو کاشتکاروں کی حالت سنبھل سکتی ہے ۔

مالگذاری

تختۂ وصولی مالگذاری سنین ماضیہ میں

سنہ فصلی	رقبہ و محاصل اراضیات مقبوضہ: رقبۂ مقبوضہ	رقبہ و محاصل اراضیات مقبوضہ: محاصل	معافی: سابقہ	معافی: سالانہ	معافی: جملہ	جملہ محاصل وصول طلب	رقبہ افتادہ	انعامی زمینات: رقبہ	انعامی زمینات: محاصل	انعامی زمینات: جوڑی و انعامی وغیرہ	جملہ و بقایا محاصل: جملہ وصول شدہ محاصل	جملہ و بقایا محاصل: بقایا آخر سال
سنہ ۱۳۳۹	ایکر گنٹہ ۳۰۰۲-۳۱	روپیہ ۳۸۶۸-۵ر۴ر	.	.	.	روپیہ ۳۸۶۸-۵ر۴ر	ایکر ۱۲۶-۹ گنٹہ	ایکر گنٹہ ۱۲۰-۲۵	روپیہ ۱۵۱-	۴ روپیہ	روپیہ ۳۸۷۲-۵ر۶ر	×
سنہ ۱۳۴۰	〃	〃	.	.	.	〃	〃	〃	〃	〃	〃	×
سنہ ۱۳۴۱	〃	روپیہ ۳۸۷۷-۱ر۹ر	.	.	.	روپیہ ۳۸۷۷-۱ر۹ر	〃	〃	〃	〃	روپیہ ۳۸۸۱-۱ر۹ر	×
سنہ ۱۳۴۲	〃	۳۸۸۵-۹ر۹ر	.	.	.	روپیہ ۳۸۸۵-۹ر۹ر	〃	〃	〃	〃	روپیہ ۳۸۸۹-۵ر۵ر	×
سنہ ۱۳۴۳	ایکر گنٹہ ۳۰۱۰-۹	روپیہ ۴۰۱۶-۸ر۱۰ر	۲ر	روپیہ ۲۰۹-۲ر۷ر	روپیہ ۲۰۹-۲ر۷ر	روپیہ ۳۸۰۸-۱۱ر	〃	〃	روپیہ ۱۴۲-۸ر	روپیہ ۱۱-۴ر۶ر	روپیہ ۳۸۱۹-۵ر۵ر	×
سنہ ۱۳۴۴	ایکر گنٹہ ۳۰۰۶-۹	روپیہ ۳۸۸۷-۱۴ر۹ر	۲ر	روپیہ ۲۰۲-۹ر۴ر	روپیہ ۲۰۲-۵ر۴ر	روپیہ ۳۶۷۶-۵ر۵ر	ایکر ۱۳۰-۱۴ گنٹہ	ایکر گنٹہ ۱۱۶-۲	〃	روپیہ ۲۳-۱۵ر۴ر	روپیہ ۳۷۰۰-۴ر۹ر	×
سنہ ۱۳۴۵	〃	روپیہ ۳۸۷۷-۹ر۹ر	.	.	.	روپیہ ۳۸۷۷-۹ر۹ر	〃	〃	〃	روپیہ ۲۰-۱۰ر۶ر	روپیہ ۳۸۹۸-۴ر۳ر	×
سنہ ۱۳۴۶	〃	〃	.	.	.	〃	〃	〃	〃	〃	〃	روپیہ ۱۶۵۱-۴ر
سنہ ۱۳۴۷	〃	روپیہ ۳۸۷۸-۴ر۹ر	.	روپیہ ۵۹-۲ر۵ر	روپیہ ۵۸-۵ر۱ر	روپیہ ۳۸۲۰-۹ر۷ر [۱]	〃	〃	〃	〃	روپیہ ۳۸۴۱-۴ر۱ر	
سنہ ۱۳۴۸	〃	روپیہ ۳۸۷۷-۳ر۹ر	.	روپیہ [۲] ۲۳۴-۳ر۱۲ر	روپیہ ۲۳۴-۳ر۱۲ر	روپیہ ۳۶۴۳-۳ر	ایکر ۱۳۰-۲۴ گنٹہ	ایکر ۱۱۲-۳۲ گنٹہ	روپیہ ۱۴۲-۳ر۶ر	روپیہ ۵-۱۰ر۶ر	۳۶۴۹-۷ر۶ر	۴۲۰ روپیہ

مالگذاری کی وصولی میں پٹواری کا زیادہ حصّہ ہے ۔ مالی پٹیل اور پولس پٹیل بھی وصولی مالگذاری مدد دیتے ہیں ۔ پٹواری کو (۱۳۴) روپیہ سالانہ ' اور پولس پٹیل ' و مالی پٹیل کو (۶۷) ' (۶۷) روپیہ سالانہ اس خدمت کے معاوضے میں ملتے ہیں ۔ پولس پٹیل کے ذمہ موضع کی نگہداشت بھی ہوتی ہے ۔ مالگذاری دو اقساط میں وصول کی جاتی ہے ۔ پہلی قسط اسفندار میں اور دوسری قسط کا خورداد تک تحصیل میں داخل ہونا ضروری ہے

---

[۱] یہ معافی دوفصلی والے کھیت کو دی گئی تھی کیونکہ پانی نہیں تھا ۔ [۲] بارش کی زیادتی کی وجہ سے باغات کی زمینات کو معافی دی گئی ۔

یہی وقت ایسا ہوتا ہے کہ یا تو کاشتکار قرض حاصل کرتا ہے یا اپنی پیداوار کو ادنیٰ قیمت پر ساہوکار کے حوالے کرتا ہے۔ تاکہ سرکاری محاصل ادا ہو جائے۔ تختہ بالا پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ دس سال میں دو مرتبہ جملہ محاصل پر ۲ ر فی روپیہ معافی اور دو مرتبہ بارش کی غیر یقینی حالت ہونے کی وجہ سے مشتبہ سیرابی والی زمینات پر معافی دی گئی دوسرے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انعامی زمینات کا رقبہ انعامداروں کے آپس کے نفاق کی وجہ سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ جو معافی گذشتہ سنین میں دی گئی، ذیل بقایا رکھا گیا اُس کے اثرات کاشتکاروں پر یہ ہوئے کہ وہ اُس سال ساہوکاروں کے مقروض نہ ہوئے۔ پٹواری کا بیان ہے کہ ہر سال کاشتکاروں سے وصولی محاصل کے وقت دقت ہوتی ہے۔ جب تک سختی نہ کی جائے اور اجناس کے ہراج کروانے کی دھمکی نہ دی جائے محاصل نہیں دیتے۔ بلکہ کبھی کبھار اجناس ہراج بھی کروانا پڑتی ہے۔

ممکن ہے کہ بندوبست کے وقت معاشی لگان کا صحیح اندازہ لگا کر اس کا کوئی حصہ وصول کیا جاتا ہو مگر اب جو محاصل کہ ادا کرنا ہوتے ہیں وہ بحیثیت مجموعی کاشتکاروں پر بار ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مالگذاری کا جب تعین ہو اس وقت اگر صحیح اندازہ مصارف کاشت کا کر کے قیمت پیداوار میں سے منہا کیا جائے اور حاصل شدہ رقم کا ۲۵ فی صد محصول مقرر کر دیا جائے تو آیندہ کی نسلیں کچھ خوشحال زندگی بسر کر سکتی ہیں۔ یہی رائے محصول کے تحقیق کرنے والے کمیشن کی بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک سرکاری محاصل میں کمی واقع ہو مگر رعایا کی خوشحالی بڑھ جائے تو زرعی آمدنیوں، مکانات وغیرہ پر بھی ٹکس عائد کر کے اس کی تلافی کی جا سکتی ہے۔

(باقی آیندہ)

غلام محمد متعلم بی۔ اے (آخری)

غزل

نظر آج ان سے رہ گئی مل کے آخری کچھ پیام تھے دل کے

تو نے دیکھے ہیں اے نسیم سحر کچھ فدائی تھے شمع محفل کے

خلشیں تھیں ہمارے دم کے ساتھ آج کانٹے نکل گئے دل کے

پھول کو پھول جاننے والے کل یہہ چھینٹے تھے خون بسمل کے

تیز تر جادۂ وفا سے گذر مٹ رہے ہیں نشان منزل کے

خاک ہے تو اُسی گلی کی خاک اللہ اللہ یہہ حوصلے دل کے

ان کی نظریں ہی کچھ کہیں تو کہیں ان کی نظروں نے کیا کیا ملکے

مرگِ فانیؔ میں اب تو دیر نہ کر

سہل فرمانے والے مشکل کے

فانیؔ بدایونی

شوپنہاور

اور

اُس کا فلسفہ

آرتھر شوپنہاور کی نسبت یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ وہ اپنی صدی کا سب سے بڑا صاحب فکر تھا اور اُس کا فلسفہ اس قدر مقبول ہر خاص و عام ہوا کہ لوگ اس کو بجائے فلسفی سمجھنے کے ادیب اور شاعر سمجھنے لگے اس میں شک نہیں کہ اس کے اسلوب بیان میں جو رنگینی اور دلربائی ہے وہ عموماً شاعروں کے ہی حصہ میں آتی ہے شوپنہاور کی یہ خصوصیت اس کو شاعر ماننے پر مجبور کرتی ہے لیکن اگر اس کے خیالات کی گہرائی اور ان کی قدر و قیمت کو مدنظر رکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ کانٹ (KANT) کے بعد بہ حیثیت فلسفی کے شوپنہاور کا ہمسر مشکل ہی سے نکلے گا۔ اس حیثیت سے وہ اپنے اُستاد کانٹ کا شاگرد رشید تھا فلسفیانہ نظم و ترتیب یا تبحر او رہمہ گیری میں ممکن ہے کہ کوئی اُس سے سبقت لیجائے لیکن فلسفہ کے اساسی اور بنیادی مسائل میں جو اس کو دسترس حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے کو حاصل نہ ہوسکی " نظریہ علم انسانی " " سر کائنات " اور " حسن و خیر کی ماہیت " کے متعلق جو اچھوتے خیالات وہ چھوڑ گیا ہے وہ اُس کی اپنی طباعی اور خلاقی کا نتیجہ ہیں اور اس کو غیر فانی بنانے کے لئے کافی ہیں اگرچہ اس کو کانٹ کے ساتھ بیحد عقیدت تھی اور اس کو اپنا استاد مانتا تھا لیکن خود اس کا فلسفہ اس قدر نرالا ہے کہ اس کو کسی کے خرمن کا خوشہ چیں سمجھنا اس کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔

نقادوں کی رائے ہے کہ شوپنہاور کے فلسفہ کا لب ولہجہ یورپ کے عام فلسفہ سے بالکل جُدا گانہ ہے اور یہ رائے ایک حدتک صحیح ہے اس لئے کہ اس کے فلسفہ پرشرقی فلسفہ بالخصوص " اپنشدھ " اور " بُدھ فلسفہ " کا رنگ زیادہ غالب ہے جس کو مجملاً " فلسفۂ نجات " کہا جاسکتا ہے۔

شوپنہاور کے سوانح حیات کافی سامان بصیرت اپنے اندر رکھتے ہیں طامس وٹیکر کی رائے میں اُس کی زندگی کے واقعات اور اس کا ماحول اس کی سوداویت اور قنوطیت کے مطلقاً ذمہ دار نہ تھے خود شوپنہاور تسلیم کرچکا ہے کہ وہ دنیا کے بڑے خوش حال اور فارغ البال لوگوں میں سے تھا لیکن میرے خیال میں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اتفاقات زمانہ نے اس کے دل ودماغ پر کافی اثر ڈالا اگرچہ وہ فطرتاً بھی کچھ کم سوداوی المزاج نہ تھا۔

شوپنہاور ۲۲ رفروری ۱۷۸۸ء کو جرمنی میں بمقام ڈانزگ پیدا ہوا جہاں اس کا باپ ہنرش غورش ایک متمول اور باوقار تاجر شمار کیا جاتا تھا شوپنہاور کے ماںباپ دونوں " ڈچ " نسل کے تھے اس کی ماں یوحنا شوپنہاور نے ایک ناول نویس کی حیثیت سے اُس زمانہ میں کافی شہرت حاصل کرلی تھی اس کی بہن آویلی بھی ادبی مذاق رکھتی تھی چنانچہ اپنی ذاتی مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے یہ کلیہ قائم کیا کہ لڑکے سیرت وکردار باپ کی طرف سے پاتے ہیں اور فہم وذکاوت ماں کی طرف سے۔

شوپنہاور کو اپنی ماں سے کوئی اُنس نہیں تھا جیسا کہ اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے باپ بیٹے کو تجارت میں لگانا چاہتا تھا چنانچہ اُس نے شوپنہاور کو تاجرانہ زندگی کے لئے تیار کرنا شروع کیا شوپنہاور کو فرانس بھیجا گیا جہاں وہ ۱۷۹۷ء سے ۱۷۹۹ء رہا اور فرانسیسی زبان سیکھتا رہا کہا جاتا ہے کہ جب وہ وطن آیا تو وہ جرمن زبان قریب قریب بھول گیا تھا فرانسیسی زبان اس کی مادری ہوکر رہ گئی تھی ۱۸۰۳ء سے ۱۸۰۴ء تک کا زمانہ اُس نے انگلستان۔ فرانس۔ سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا میں گزارا۔ اس دوران میں اس نے انگریزی پر پوری قدرت حاصل کرلی وہ انگریزوں کی ذہانت وفطانت اور

ان کی سیرت کا یہاں تک معترف ہوگیا تھا کہ اگر اس کو کوئی انگریز سمجھ لیتا تو وہ اسے اپنے لئے بڑے فخر کی بات تصور کرتا بایں ہمہ شوپنہاور اس عصبیت اور تنگ نظری کو قابل ملامت سمجھتا تھا جو انگلستان پر انقلاب فرانس کے بعد بطور رد عمل کے مسلط ہو چکی تھی مل کی تصنیف "حریت" اور ڈراون کی معرکتہ الآرا کتاب "اصل الانواع" اس کے مرنے کے کئی سال پہلے شائع ہوئیں اور شوپنہاور ان تصنیفات کا شائد کماحقہ مطالعہ نہ کرسکا جس سے انگلستان کی بابتہ جو رائے اس نے قائم کی تھی اس کو بدل سکتا۔

شوپنہاور کی زندگی میں پہلا ناخوشگوار واقعہ ۱۸۰۵ء میں رونما ہوا جبکہ وہ ہیمبرگ کے کسی تاجر کے دفتر میں بٹھلایا گیا کچھ عرصہ بعد اس کا باپ مرگیا باپ کی خواہش کا لحاظ کر کے شوپنہاور نے کچھ دنوں تک پوری کوشش کی کہ اس کو تجارتی زندگی سے دلچسپی پیدا ہو جائے لیکن ساری کوشش رائگاں ثابت ہوئی آخر کار اس نے ماں سے اجازت لے کر ۱۸۰۷ء میں تجارت کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدیا اور "دارالمصارعت" میں داخل ہوگیا۔ اس زمانہ میں اس کو "ادبیات قدیمہ" کے پڑھنے کا شوق ہوا جن سے ابتک وہ تقریباً بے بہرہ تھا ۱۸۰۹ء میں وہ "گٹنجن یونیورسٹی" میں ادویات کے مطالعہ کی غرض سے داخل ہوا لیکن مقصد مطب کھولکر بیٹھنا نہ تھا اس کو تو محض علم کا ذوق تھا۔

۱۸۱۰ء میں اس کا فلسفہ کی طرف رجحان ہوا اس میدان میں بھی وہ اپنی آزاد رائے اور بے لاگ تنقید کی بنا پر ممتاز رہا۔ "گٹنجن" میں اس کو شولزسا دقیق النظر اُستاد ملا جس نے اسے یہ مشورہ دیا کہ ارسطو اور اسپائنوزا سے پہلے اُسے افلاطون اور کانٹ کا مطالعہ کرنا چاہیے ۱۸۱۳ء میں اس کو فلسفہ میں ڈاکٹری کی ڈگری ملی یہ کانٹ کے مطالعہ کا پہلا نتیجہ تھا۔ اسی سال شوپنہاور کا تعارف جرمنی کے شاعر گوئٹے سے ہوا اس زمانہ میں وہ ویمر میں اپنی ماں اور بہن کے ساتھ قیام پذیر تھا اس ملاقات کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے گوئٹے کے "نظریہ لونیات" کو توضیح و تشریح کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کیا لیکن اس کا اچھوتا فلسفہ جو اس کے اندر ایک مدت سے نشو و نما پا رہا تھا ۱۸۱۸ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۱۹ء میں "کائنات بحیثیت مشیت و تصور" کی صورت میں شائع ہوگیا۔

اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ شوپنہاور کے دماغ کی نشو و نما وقت سے کس قدر پہلے ہوئی

تیس ۳۰ برس کی عمر سے پہلے اس نے اپنے نرالے فلسفہ کی بنیاد کو نہ صرف مستحکم کر لیا تھا بلکہ اس کی تعمیر کی بھی ایک حد تک تکمیل ہو چکی تھی بعد میں جو کچھ کیا وہ حذف و اضافہ سے زیادہ نہیں ۔

شوپنہاور نے اپنے دماغ کو کبھی بیکار نہیں رکھا غور و تامل کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہونے دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ادبی قوت روز افزوں ترقی کرتی گئی اپنی اس خاص کتاب کے چھپنے کے بعد اس نے کچھ نظمیں لکھیں جس میں پیشین گوئی کی گئی تھی کہ آئندہ آنے والی نسل اس کے لئے ایک یادگار قائم کریگی یہ پیشین گوئی سنہ ۱۸۹۵ء میں پوری ہوئی جس وقت " کائنات بحیثیت مشیت و تصور " چھپ کر مطبع سے نکلی تو کوئی اس کا پوچھنے والا نہ تھا شوپنہاور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ اکاڈمی کے علما جو عموماً " فلسفہ ہیگل " کے معتقد تھے مسیحی مذہب کی جھوٹی حمایت کر کے ممتاز خدمتوں پر اپنا حق جما لینا چاہتے تھے اس لئے جو کوئی راستبازی اور خلوص کے ساتھ حق کی تبلیغ کرنا چاہتا تھا یہ لوگ اس کی دشمنی پر آمادہ ہو جاتے تھے ۔

شوپنہاور کا دعویٰ تھا کہ ان اکابر اکاڈمی کی رجائیت سے کہیں زیادہ اس کی قنوطیت مسیحی مذہب سے قریب تھی اس لئے کہ مسیحیت کی روح برہمنیت اور بدھ مت ہے اور اس مذہب کو اگر کسی چیز نے خراب کیا ہے تو وہ یہودیت کا عنصر ہے شوپنہاور کو یہودیت اور اسلام سے اچھی خاصی نفرت تھی کیونکہ یہ مذاہب اسکی فطری سوداویت سے کوئی نسبت نہیں رکھتے ۔

شوپنہاور خود اپنے زمانہ میں قدر کی نگاہ سے کیوں نہیں دیکھا گیا ؟ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی نظام حکومت کا قائل نہ تھا وہ سرے سے ہی زندگی کو ایک روگ سمجھتا تھا تو پھر حکومت میں اس کے لئے کیا اہمیت ہو سکتی تھی ؟ برخلاف اس کے جرمنی اسوقت طرح طرح کے سیاسی خواب دیکھ رہا تھا اور اپنی بہبود کے لئے رجائیت کو ضروری سمجھتا تھا جس کا شوپنہاور دشمن تھا مگر بعد میں جو قدر اس کی ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ قوم کی آنکھوں سے سنہ ۱۸۴۸ء کی شورش کے بعد بہت جلد پردے ہٹ گئے خوش آئند مستقبل کا خواب جھوٹ نکلا وہ جوش و خروش بات کی بات میں جاتا رہا یاس و حرمان نے غلبہ کیا اور اسوقت شوپنہاور کے مطالعہ سے مایوس دلوں کو بہت کچھ تسکین ہوئی ۔

شوپنہاور کی زندگی کے باقی حالات مختصراً یہ ہیں :-

چند سال اطالیہ اور دوسرے ممالک کے سفر میں اور برلن میں ایک ناکام پروفیسر کی حیثیت سے گذارے سنہ ۱۸۳۱ء میں

وہ فرنکفورٹ میں چلا گیا اور ۱۸۳۳ء میں وہیں مستقلاً بود و باش اختیار کر لی ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء کو وہ اس دنیا سے چل بسا اس نے تمام عمر تجرد میں بسر کی۔

شوپنہاور سے تاریخ فلسفہ میں ایک نئی تحریک شروع ہوتی ہے ابتک فطرت کے نظام کو فلاسفہ حکمت و بصارت پر مبنی مانتے تھے کائنات نام تھا ایک معقول انضباط و ترتیب کا۔ قضا و قدر کی ہر بات میں ایک مصلحت تھی جو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی غرض سے تھی اس فلسفہ کا سب سے زبردست علمبردار جرمنی کا مشہور صاحب فکر ہیگل تھا جس نے کانٹ کے نامکمل فلسفہ کو حذف و اضافہ کے بعد درجۂ کمال تک پہونچانیکی پوری کوشش کی ہیگل اور اس کے ہمخیال فلاسفہ نے عقل یا قوت فکری کو نفس انسانی اور نفس کُل یا "تصور مطلق" یعنی خدا کی سب سے زبردست خصوصیت سمجھ رکھا تھا لیکن شوپنہاور اس گروہ کا سخت مخالف نکلا۔

شوپنہاور ایک لحاظ سے ارتقار کا قایل تھا اگرچہ وہ اپنے نظریہ ارتقار اور ارتقائین سے متفق نہ تھا شوپنہاور کا عقیدہ تھا کہ "مشیت" بالذات کوئی دانا یا ذی شعور خدا نہیں ہے بلکہ برعکس یہ ایک اندھی اور غیر شاعر قوت ہے جو ہستی کی طرف مایل ہے کچھ اس لئے نہیں کہ ہستی کو وہ کوئی اچھی چیز سمجھتی ہے بلکہ اس کے اندر ہست ہونے کی ایک غیر معقول خواہش موجود ہے۔ اس کے بعد سے شوپنہاور کا فلسفہ کچھ اُلجھا ہوا سا ہے "مشیت" کے متعلق بتا گیا ہے کہ اس کے اندر نہ تو زمان و مکاں موجود ہے اور نہ انفرادیت۔ وہ لا متنہا ہی ہے ایک ہے اور غیر منقسم ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر کائنات میں یہ تنوع اور تشخص کہاں سے آیا؟ اتنے اقسام اور افراد کیونکر پیدا ہو گئے؟ اس کثرت اور تعدد کی اصل کیا ہے؟ اس کا جواب شوپنہاور نے جو دیا ہے کسیقدر مبہم اور غیر واضح ہے اگر "مشیت" زماں و مکاں کے زیر اثر ظہور میں نہ آجاتی تو یہ تنوع اور تعدد ہی نہ ہوتا زماں و مکاں انفراد اور انفصال کی جڑ ہیں لیکن زماں و مکاں ہیں کیا؟ کیا وہ مشیت سے الگ اپنا ذاتی وجود رکھتے ہیں؟ شوپنہاور نے اس پر کوئی مفصل بحث نہیں کی ہے کانٹ نے زماں و مکاں کو ہیئات ذہنی بتایا تھا مگر وہ دوئی کا قایل تھا "شئے بالذات" جو قریب قریب مادّہ کا مرادف ہے اور ذہن جو مادہ کی ضد ہے چنانچہ کانٹ کے زماں و مکاں کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی لیکن شوپنہاور تمام موجودات کی اصل "مشیت" کو بتاتا ہے ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ مشیت ہی نے زماں و مکاں کو پیدا کیا ہوگا اور خود کو ان بندشوں میں جکڑا ہوگا۔

اس مسئلہ کو سمجھنے سے پہلے شوپنہاور نے افلاطون کے "نظریہ تصورات" کی جو تاویل کی ہے اس کو سمجھ لینا ضروری ہے افلاطون عالم مثال کا قایل تھا دنیائے محسوسات سے پرے ایک دنیا ہے جہاں مختلف تصورات یا ازلی نمونے موجود ہیں ہماری دنیا میں جتنے انواع مخلوقات ہیں وہ سب انھیں نمونوں کی نقلیں ہیں شوپنہاور کا خیال بھی یہی تھا وہ بھی ان تصورات کا قایل تھا مگر اُن کو "مشیت" کی نمود کے مختلف مدارج سمجھتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں "تصورات" "مشیت" اور اُس کے مظاہر کے درمیانی تعلقات ہیں بعض تصورات ادنی درجہ کے ہیں بعض اعلیٰ درجہ کے۔ شوپنہاور کے خیال کے مطابق ادنیٰ درجہ کے مخلوقات میں کوئی انفرادیت نہیں ہوتی۔

علم اور عقل کو شوپنہاور اسی "مشیت" کی ایک ارتقائی صورت سمجھتا ہے۔ اپنے کو عالم ہست و بود میں لانے کے لئے "مشیت" مختلف آلات پیدا کرتی رہتی ہے یہ خیال بھی مسئلہ ارتقا سے بہت قریب ہے اور شوپنہاور اس سے قطع نظر نہیں کر سکا۔

فی الحال ہم ایک نئے سوال کی جانب رجوع کرتے ہیں اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کا ایک نصب العین ہے خود شوپنہاور اس کو تسلیم کرتا ہے یعنی وہ "میکانیت" یا اضطراریت کا حامی نہیں ہے اور زندگی کو بیگانۂ مقصد نہیں سمجھتا۔ "مشیت" اپنے سامنے منتہائے کمالات رکھتی ہے یعنی ارتقائے شعور اور اس ارتقا کی آخری منزل بظاہر شعور انسانی معلوم ہوتی ہے اکثر ناقدین کی رائے میں شوپنہاور وحدۃ الوجود کا حامی تھا ایک اعتبار سے یہ رائے صحیح ہے شوپنہاور کے یہاں "مشیت" وہی درجہ رکھتی ہے جو اسپائنوزا اور دیگر موحدین کے یہاں خدا کا ہے لیکن شوپنہاور کی "مشیت" جیسا کہ بار بار بتایا جا چکا ہے اندھی ہے برخلاف اس کے اسپائنوزا وغیرہ کا خدا حکیم و بصیر ہے ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ کائنات خدا کی رحیمی اور کریمی کا ثبوت ہے شوپنہاور خلقت کو ایک روگ سمجھتا ہے زندگی کی بنیاد شر پر ہے جہاں تک ممکن ہو انسان کی زندگی اور "مشیت" کی بیڑیوں سے بھاگنا چاہئے۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟ اس کا جواب شوپنہاور کے جمالیات اور اخلاقیات سے مل سکتا ہے۔ انشاء اللہ شوپنہاور کے جمالیات اور اخلاقیات پر ہم آئندہ ایک بسیط مضمون تیار کر کے پیش کرنے کی کوشش کرینگے۔

شنکر موہن لعل ماتھر بی۔ اے (عثمانیہ)

جنگ

آ، مرے تاریک پہلو کی نگاہِ نکتہ چیں
اپنے قدموں پر جھکا دوں آج میں تیری جبیں

ذہن کیوں خائف غلاموں کے ہوں میرے نام سے
لرزہ براندام ہوں بزدل میرے انجام سے

سینکڑوں قومیں بنیں، اور ہوگئیں برباد بھی
ملتیں لاکھوں مٹیں، محکوم بھی آزاد بھی

میں سراپا نور ہوں ۔ گو نام ظلمت ہے مرا
زندگی کا ارتقا مرہون منت ہے مرا

میں خدائے اہرمن کے قہر کی آواز ہوں
موت کے ہاتھوں سے جو بجتا ہو میں وہ ساز ہوں

قتل اور غارتگری، میری خودی کا کام ہے
رحم و ہمدردی، شکستِ خودسری کا نام ہے

حکمرانی، شعلہ سامانی ۔ مجھے مطلوب ہے
خونِ انسانی کی ارزانی ۔ مجھے مطلوب ہے

سینۂ مزدور میں، بازوئے سلطانی میں ہوں !!

میں خمیرِ خونِ آدم ۔ علم یزدانی میں ہوں !!

میرے اغراض و مقاصد نے کیا رسوا مجھے
ورنہ اقوامِ جہاں نے کب نہیں چاہا مجھے

موت بزدل کی ہے، طاقتور جو ہے مامون ہے
بس یہی انصاف ہے میرا، یہی قانون ہے

خاک و خوں میں لوٹنے والے مرے محبوب ہیں
بزدلوں کی آہ اور نالے مجھے مرغوب ہیں

میں کبھی مکار سیاسوں کی پروردہ نہیں
عالم انسانیت کا جرم ناکردہ نہیں

طاقت و جبروت کی آغوش گہوارہ مرا
عزم و استقلال کا سینہ وطن پیارا مرا

صاف باطن فتحمندوں ہی نے ہے پالا مجھے
اور تہذیب و تمدن نے اچھالا ہے مجھے

پھونک دوں محفل کو اپنی گرمیٔ گفتار سے
قلب ہستی چیر دوں آوازِ شعلہ بار سے

بستیاں ویران کردوں، خنجرِ خونخوار سے
سنگ و آہن بھی پگھل جائیں مری للکار سے

لوٹ لوں اک ضرب سے ضبط و قرارِ زندگی!!
جھونکدوں دوزخ کے شعلوں میں بہارِ زندگی!!

میں بھی دیکھوں، مجھ کو بیواؤں کی آہیں روک لیں؟
روک لیں، ماؤں کے دل کی التجائیں روک لیں؟

روک لیں کمسن یتیموں کی دعائیں روک لیں؟
روک لیں، معصوم بچوں کی نگاہیں روک لیں؟

روک لے آتش زدہ شہروں کی ویرانی مجھے؟
روک لے فطرت کی ہر آزاد عریانی مجھے؟

میری سیرت بزدلوں پر جبر و استبداد ہے
میری فطرت نالہ و فریاد سے آزاد ہے

صمد رضوی ساز بی اے ال ال بی۔

جھینپ

ہمارے ایک دوست ہیں بہت شریف لیکن ان کو دعویٰ ہمہ دانی انتہا سے زیادہ ہے۔ سائنس کے مضامین سے کسی قدر واقف ہیں لیکن اپنے آپ کو متبحر بتلاتے اور سائنس جیسے خشک مضمون میں شاعری فرماتے ہیں۔ معاشیات سے قطعاً نابلد ہیں لیکن مداخلت بیجا کے ہر وقت مرتکب ہوتے ہیں اور اشعار پر نقد و تبصرہ فرمانا تو ان کا لازمی فریضہ ہے۔ بہرحال ہر محفل میں پیش پیش رہنے کی انہیں انتہا سے زیادہ خواہش ہے۔ لیکن ایک دن ایسا آیا جبکہ مباحثہ مقرر ہوا اور صاحب موصوف سے بھی تقریر کی خواہش کی گئی۔ بڑی رد و قدح کے بعد تیار ہوئے۔ ابتدا سے انتہا تک اگر ایک جملہ بھی صحیح کہا ہو تو قسم لیجئے ایسی حالت میں جب ہم لوگوں پر نظر پڑی تو بیچارے جھینپ سے گئے اور اس کے بعد تو کچھ کہہ ہی نہ سکے۔

اسی طرح ایک اور صاحب اخلاقی زندگی کے بہت سے تاریک پہلوؤں سے روشناس تھے۔ اُنھیں یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ پرانے حالات و واقعات کو دنیا نے فراموش کر دیا ہوگا اس لئے دوستوں میں وعظ فرما کر پاکبازی کا سکہ بٹھانا چاہتے تھے۔ اتفاقاً اُن کے ایک دوست نے جو ان کی زندگی سے بخوبی واقف تھے اُن پر فقرہ کسا جبکہ وہ خود اس دوست کی مذمت کر رہے تھے۔ رنگ اُڑ گیا اور وہ وہاں سے دم دبا کر نکل گئے۔

اسباب ان مثالوں میں دیکھنا یہ ہے کہ اُس حجاب کے اسباب کیا ہیں؟ اور ان اسباب کے معلوم کرنے کے بعد حجاب کا مٹایا جانا ممکن ہے یا نہیں اسباب کا پتہ چلنے پر مناسب صورت یہ ہے کہ اُن اسباب ہی کو روکا جائے۔ جن کی بدولت شرمندگی پیدا ہوتی ہے۔ جب عِلّت اور سبب ہی غائب ہو جائے تو پھر معلول یا نتیجہ کے پیدا ہونے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ اوپر کی بیان کی ہوئی

مثالوں میں غرور اور تعلی حجاب کے اسباب ہیں۔ تعلی اور غرور انسان کی پست ذہنیت اور کم ظرفی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے پرانے لوگوں کا مقولہ "غرور کا سر نیچا" غلط نہیں معلوم ہوتا۔ غرور کی صورت میں آدمی اپنے آپ کو بلاوجہ اہمیت دیتا ہے اور اس اہمیت کی بدولت اپنے کو ارفع و اعلیٰ تصور کرتا ہے لیکن ہم نشینوں کی محفل میں وہ اپنی اس بلندی سے اُتار کر مساویانہ درجہ پر لایا جاتا ہے اس سلسلہ میں بعض اوقات بہت مذموم طریقہ پر عمل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ جھینپ جاتا ہے۔

یہ وجہ خاص غور کی محتاج ہے کہ اکثر اشخاص اپنی پسپائی۔ سے اس قدر شرمندہ نہیں ہوتے جس قدر لوگوں کی رائے کے خیال سے ہوتے ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے ساہوکار جب دیوالیہ ہو جاتے ہیں تو خودکشی اسی وجہ سے کرتے ہیں کہ اب ہماری عزت لوگوں کے نظر میں نہ رہے گی۔ آزمانے کے لئے آپ اپنے کسی ایسے دوست کو جو دن رات اچھے کپڑے پہنے رہتا ہو خراب اور میلے کپڑے پہنا دیجئے اور بازار لے جانے کی کوشش کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کپڑے پہننے پر جتنا عذر تھا اس سے کئی گنا باہر نکلنے میں ہوگا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آدمی پر سماجی اثر بہت غالب رہتا ہے آپکا دوست اپنی ہیئت کذائی سے اتنا پریشان اور محجوب نہیں ہوتا جس قدر کہ لوگوں کے سامنے جانے اور ان کے تمسخر کے خیال سے۔ چنانچہ آج کل یونیورسٹیوں میں داڑھی والوں کی کمی اسی وجہ سے ہے یہ خیال بڑی حد تک غلط ہے کہ داڑھی والے حضرات کو بنایا جاتا ہے۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ ایک صاحب داڑھی کے ساتھ اقامت خانہ میں شریک ہوئے۔ اور پہلی میقات کے ختم پر وہ بلا داڑھی کے گھر تشریف لے گئے۔ اُن کے داڑھی منڈھوانے کا سبب یہ تھا کہ وہ داڑھی والے کہلانے سے ڈرتے تھے اور کسی کے اس نام سے پکارنے سے پہلے ہی انہوں نے اُس کی قطع و برید کی۔

جھینپ جانے کے بعد اس میں شدت اور غلط فہمیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب یہ خیال ہو کہ اس جھینپ کو لوگ تاڑ گئے ہیں۔ اگر کوئی دوست چور ہو اور آپ بلا کسی قصد و ارادہ کے کہدیں کہ "یار تو چور ہے" تو فوراً ہی جھینپ جاتا اور اپنی صفائی شروع کر دیتا ہے اور اس جھینپ کا آپ ظاہری اندازہ

بھی نہیں کرنے پاتے کہ کہہ دیتا ہے کہ " یار میں نے تو مذاق سے تمہاری کتاب اپنے پلنگ کے نیچے ڈالدی تھی محض یہ دیکھنے کے لئے کہ آپ کیسے پریشان ہوتے ہیں اگر اس کا نام چوری ہے تو بس خدا حافظ " یہ خدا حافظ بوکھلاہٹ میں نکل جاتا ہے۔ پولس وغیرہ کے محکموں میں ایسے جملوں سے مدد لی جاسکتی ہے۔

غرضکہ جھینپ ایک طرح کی بغاوت ہے جو آدمی میں اس کی اپنی ذات کے خلاف ہوتی ہے اور یہ بغاوت انسان کے اصلی کردار کو واضح کرتی ہے بشرطیکہ اس کا تجزیہ کرلیا جائے۔

اگر کسی صاحب کو اپنے متعلق پاکیزہ اور صاف رہنے کا مغالطہ ہو اور بدقسمتی سے اُن کو پائیوریا ہو اور بازو بیٹھنے والے صاحب ناک کو دستی لگالیں تو یہ جھینپ جاتے ہیں اور انتہائی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ماہران نفسیات نے اس کو بغاوت کہا ہے اور یہ کمزوری ہے۔ چنانچہ شعرا کے اشہب قلم اس کمزوری کی تفسیروں میں بہت تیز رو بے لگام دوڑتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک نوجوان کسی دوشیزہ سے محبت کرے اور محبت بھری نظروں سے اس کو دیکھ لے تو وہ شوخ وشنگ دوشیزہ اس نوجوان کی نظروں میں محبت پاتی ہے اور اپنی کمزوریوں کے احساس کی بدولت قدرتاً محجوب ہوجاتی ہے اس چیز کو ہماری جامعہ کے شاعر میکش نے یوں باندھا ہے

شعر۔ محشر خاموش بن کر رہ گئیں سب شوخیاں   شوق کے نظروں سے جب دیکھا حجاب آہی گیا

اور جگر مرادآبادی نے یوں کہا ہے کہ

شعر۔ خود نگاہ ناز ہی سے پوچھئے   اک اسیر شوق کی صیادیاں

یاد داغ کا شعر۔ ذکرِ مہر و فا تو ہم کرتے   پر تمھیں شرمسار کون کرے

غرضکہ اسی قسم کے بیسیوں اشعار ہمارے شعرا کے دیوانوں میں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ " ناز کی شانِ نیاز کا دوسرا نام حجاب ہے "

حجاب کے جنسی اسباب کے سلسلے میں ڈاکٹر بارنس (Dr. Bernes) نے ایک تجربہ بیان کیا ہے۔ جس بتایا گیا ہے کہ ایک ۲۲ سالہ عورت کے سامنے جب کبھی لفظ " مہینہ " استعمال کیا جاتا

وہ جھینپ جاتی۔ ایک عرصہ تک یہی حالت رہی۔ ماہر نفسیات نے اس کی اس جھینپ کو پہچان لیا اور تنہائی میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی ماہواری ایام اور حمل کے مہینوں کے ذکر کو خلاف تہذیب خیال کرتی تھی اور اس بنا پر لفظ "مہینہ" کا تلازم غلط طور پر قائم ہوگیا تھا۔ واقعہ دراصل یہ ہے کہ اُن گھرانوں کے افراد میں جہاں جنسی افعال فطری کو دبا دیا جاتا ہے اور ان کے بُرائیوں پر زور دیا جاتا ہے یہ عادت پیدا ہوجاتی ہے۔ ایسی جھینپ ایک معاشرتی کمزوری ہے جس کو "اجتماعی بدنظمی" (Social dis-order) کا نتیجہ خیال کرنا مناسب اور صحیح ہے۔

اسی سلسلہ میں " اخلاقی احمق " (Ethical ambicle) کا ذکر کرنا مناسب ہے۔ اخلاقی احمق ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو جا و بے جا محجوب ہوجاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک احمق کی ماں مرگئی۔ اس کی فوٹو کو دیکھ دیکھ کر وہ رو رہا ہے کہ دوست آجاتا ہے اور اس کو روتا دیکھتا ہے بس وہ شرما جاتا ہے۔ . . . . . . اسی طرح ایک مثال ملاحظہ ہو ایک صاحب فرمانے لگے کہ موجودہ زمانہ میں صداقت اور انصاف کا نام لے کر صداقت اور انصاف کا خون کیا جا رہا ہے۔ ایک طرف آپ یہ فرمار ہے ہیں اور دوسری طرف آپ کا چہرہ آپ کی جھینپ کو ظاہر کر رہا ہے۔ یہ درحقیقت جھینپ نہیں بلکہ احمق پن کی دلیل ہے۔ اگر ایسے اشخاص اپنی جھینپ کو روک دیں تو ان کے اعلیٰ خیالات اور صحیح تفکر بالعموم ان کے اعلیٰ مراتب ضامن ہیں۔ اور وہ مشاہیر عالم کی صف میں اپنے لیئے جگہ پیدا کر سکتے ہیں۔

حجاب کا ایک اور سبب رہ گیا ہے اور یہ سبب ہماری روزانہ زندگی میں بہت اثر انداز ہے۔ موجودہ دور میں اجتماعی مقابلہ (Social Competition) بہت زیادہ ہوگیا ہے ہم اپنی روزمرہ زندگی میں نقرے کسنے کے تقریباً عادی ہوچکے ہیں۔ حاضر جوابی اور برجستگی انفرادی اثرات کے پیدا کرنے میں بہت زیادہ ممد و معاون ہے۔ اسی کے ذریعہ ہم ایک دوسرے پر اثر قائم کرتے ہیں اور معاشی اقامتی زندگی میں اس سے بہت زیادہ مدد لی جاتی ہے۔ جب ایک شخص اپنے اس دوست سے ملتا ہے جس نے اس پر اپنا اثر قائم کیا ہے تو وہ خواہ مخواہ اوس کی ہاں میں ہاں ضرور ملا دیتا ہے

تاکہ اس کو خفیف ہونا نہ پڑے ۔ لیکن یہ احساس اگر جڑ پکڑے تو آدمی میں "ذہنی پستی" (Inferiority complex) پیدا ہو جاتی ہے جو طالب علم کی بڑھتی قوتوں کو بہت جلد ٹھٹھرا دیتی ہے ۔ ایسی صورتوں میں ماہر نفسیات سے مدد لینے کی سخت ضرورت ہے اور ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن کے ذریعہ احساس پستی رفع ہو جائے ۔

اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بعض اشخاص ذی مرتبت لوگوں سے ملنے میں ہچکچاتے ہیں یہ رعب بہ ہچکچاہٹ بری چیز ہے اور اس کا ازالہ ازبس ضروری ہے ۔ اس کے ازالہ کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ شخص بڑے لوگوں سے بہت زیادہ ملتا جائے یہاں تک کہ یہ احساس باقی نہ رہے اور بے دھڑک ملنے کی عادت ہو جائے کیونکہ عادت کے ذریعہ مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں ۔

اثرات اسباب حجاب کو ہم نے مختصراً بیان کر دیا ہے کہ وہ غرور، تعلی، جنسی احساسات و جذبات رجحان طبع، احساس کمزوری اور کوتاہ نظری ہو سکتے ہیں ۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ حجاب کس طرح اور کن علامات کے ذریعہ پہچانا جا سکتا ہے ۔ اس کی سب سے بڑی علامت چہرہ کا سرخ ہو جانا ہے جس کو میکش نے یوں بیان کیا ہے ۔ ؎

عارض گلگوں پہ سرخی بہ گئی گل بھی شرمائے جو شرما کر ہنسے

اس کے علاوہ محجوب کی نظریں بالعموم نیچی ہو جایا کرتی ہیں تنفس تیز ہو جاتا ہے ۔ ولیم جیمس کے اصول کے مطابق اگر ان حرکات کو روک دیا جائے تو جھینپ بھی رک جائیگی ۔ اس لئے جھینپ کے خیال کے ساتھ ہی ان حرکات کو روکا جائے تاکہ اپنے آپ پر قابو حاصل ہو جائے ۔

لیکن حجاب کا بالکلیہ استیصال ناممکن ہے کیونکہ یہ تاثرات کے ساتھ بہت زیادہ متعلق ہے اس کو ختم کرنے کی کوشش بالکل اس کوشش کے مثل ہے کہ ہم دوڑیں تو تیز لیکن تنفس کے تیز ہو جانے کو روکیں یا قلب کی رفتار حرکت کو بڑھنے نہ دیں قلب کی تیز حرکت اور دوڑنے میں ربط ضروری ہے اسی طرح جھینپ تاثرات سے ایسا ہی ربط رکھتی ہے ۔ جس کی بدولت اس کا پوری طرح ختم کر دینا ناممکن نظر آتا ہے ۔

اگر بفرض محال ہم اس کو روک سکیں تو یہ کامیابی کا دن انسانیت کی بدبختی کا دن ہوگا کیونکہ جہان سنگ ہوگا جس میں روحانیت پرورش پاتی ہے، بیش قیمت ذخیرہ ولٹ چکا ہوگا ۔

عبدالحمید عثمانی ال ال بی (آخری)

ہمارے ننھے شہزادے!

ہنگامِ بہاراں کے یہ آثار ہیں دونوں
آبادیٔ گلشن بے خار ہیں دونوں

اقبال وری صاف جبینوں سے عیاں ہے
ہر رتبۂ عالی کے سزاوار ہیں دونوں

آسودگیٔ قلبِ ولیعہد بہادر (مدظلہ)
انوارِ نگاہِ درِ شہوار (مدظلہا) ہیں دونوں

دادا (مدظلہ العالی) کی دعا نور کے سانچوں میں ڈھلی ہے
صنعت گریٔ حسن کے شہکار ہیں دونوں

اے وجد تری نظم کو ہنس ہنس کے سنیں گے
طفلی کی مئے ناب سے سرشار ہیں دونوں

سکندر علی وجد بی۔ اے۔ ایچ۔ سی۔ ایس

جدید افغانستان

انیسویں صدی میں برطانوی حکومت ہند اور روس کے درمیان وسط ایشیا، اور مشرق وسطیٰ میں مسلسل سیاسی کشمکش ہوتی رہی زار روس وسط ایشیا میں روسی شاہنشاہت کو وسیع کر رہا تھا ۱۸۶۷ء میں سمرقند و تاشقند پر قبضہ کیا گیا مقامی امیروں نے اطاعت قبول کر لی ۱۸۷۳ء میں خیوا بھی روسی شاہنشاہت میں شامل کر لیا گیا زار روس کی استعماری حوصلہ مندیاں ہندوستان کے سرسبز و شاداب اور زرخیز میدانوں پر قبضہ کرنے کی خواہشمند تھیں۔ روسی وسعت پذیری سے براہ راست ہندوستان و افغانستان کو خطرہ لاحق ہو رہا تھا برطانیہ بھی شمالی مغربی ہند کے فوجی استحکامات میں مصروف تھا برطانوی مدبر ایک جانب افغانستان کی تائید حاصل کر کے مشرق وسطی میں روس کی وسعت پذیری کو روکنا چاہتے تھے تو دوسری جانب وہ مشرق قریب میں ترکوں کی مدد سے روس کو مشرقی بحر روم میں داخل ہونے سے روکنا چاہتے تھے مشہور وزیر خارجہ برطانیہ پامرسٹن کی یہی حکمت عملی تھی کہ ترکوں کی اتنی امداد کیجائے کہ وہ زار روس کو بحر روم میں داخل نہ ہونے دیں اسی لئے جنگ کریمیا میں انگریزوں و فرانسیسیوں نے ترکوں کی مدد کی اور روسیوں کو شکست اٹھانی پڑی۔

روس اور ہندوستان کے درمیان افغانستان ایک مملکت فاصل Buffer state ہے اس لئے یہ دونوں استعماریت پسند دول حکومت افغانستان کو اپنے اپنے اثر کے تحت رکھنا چاہتے تھے اور ابھی تک یہی حکمت عملی کارفرما ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ گذشتہ صدی میں انگریزوں کو کابل میں اثرات قائم رکھنے کے لئے جنگیں کرنی پڑیں جس میں ان کو افغانوں کی غیر معمولی بہادری اور جانبازی کی وجہ شکستیں اٹھانی پڑیں۔ اواخر انیسویں صدی میں لارڈ رپن وائسرائے ہند نے افغانستان کے متعلق ایک صحیح حکمت عملی اختیار کی اور انہوں نے

وزیر ہند کو لکھا کہ "افغانستان کو فتح کرنا یا دو حصوں میں (کابل و قندہار) تقسیم کرنا ایسا ہی ہے جیسے چاند پر قبضہ کرنا یا اس کے دو ٹکڑے کر دینا" ان لڑائیوں میں بہادر افغانوں کی دھاک انگریزوں پر بیٹھ گئی اور انہوں نے پھر کبھی افغانستان سے بگاڑ کرنے کی ہمت نہ کی۔ اور دلجوئی و اطمینان آفرینی کی پالسی اختیار کی اور ایک کثیر رقم افغانستان کو بطور مالی امداد ۱۹۱۹ء تک دیتے رہے۔

امیر عبدالرحمن خان جدید افغانستان کے بانی امیر عبدالرحمن خان نے جو بہت زبردست مدبر اور قابل حکمران تھے افغانستان سے متعلق لارڈ رپن سے بدوران ملاقات کہا تھا کہ "ہم روس اور ہندوستان کے درمیان چکی کے دو پاٹوں کے بیچ آٹے کے مانند پسے جارہے ہیں اور ہم ایسی کیفیت کو برداشت نہیں کر سکتے افغان اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے عظیم ترین قربانی دینے پر آمادہ ہیں۔" اس اصول کے تحت امیر موصوف نے افغانستان میں انگریزی و روسی اثرات کا خاتمہ کر دیا تھا اور اپنی مستحکم مطلق العنان شاہی حکومت قائم کی تھی۔ انہوں نے ملک میں باقاعدہ نظم و نسق قائم کیا اور قبائل کی آپس کی خانہ جنگی کا خاتمہ کیا اور قوم کی بڑی حد تک اصلاح کی۔ قومی تنظیم کی گئی خزانہ میں رقم جمع کی گئی تعلیم کا بندوبست کیا گیا اور فوج کی باقاعدہ تربیت کی گئی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں امیر موصوف کا انتقال ہوا۔

امیر حبیب اللہ خان ان کے جانشین امیر حبیب اللہ خان ہوئے انہوں نے فوج کی اصلاح کی تنخواہوں میں اضافہ کیا اور برطانیہ سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ جنگ عظیم کے دوران میں جبکہ برطانیہ کے خلاف خلیفہ ترکی نے اعلان جہاد کر دیا تھا افغانی ملاؤں نے امیر موصوف پر زور ڈالنا شروع کیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دے دربار کابل میں نصر اللہ خان وزیر اعظم اور انکی پارٹی ترکوں کی تائید میں برطانیہ سے جنگ کرنے کی حامی تھی مگر امیر موصوف نے نہایت تدبر اور دانائی سے جذباتی سیاسیات کا مقابلہ کیا اور افغانستان کو جنگ سے علیحدہ رکھا۔

امیر امان اللہ خان سنہ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خان قتل کر دئے گئے بعض خاندانی مناقشوں کے بعد امیر امان اللہ خان نے اپنی شاہی کا اعلان کیا اور بعد ازاں قوم کے رجحان کو خانگی جھگڑوں سے ہٹانے کے لئے برطانوی حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ وہ افغانستان کی مکمل آزادی کو تسلیم کرے

وائسرائے ہند نے جواب میں تاخیر کی اس لئے ۱۹۱۹ء میں امیر امان اللہ خان نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور تیسری جنگ افغانستان کا آغاز ہوا۔ جنگ عظیم کے بعد برطانوی افواج تھکی ماندی واپس ہوئی تھیں کہ ان کو اس بلائے ناگہانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت ہندوستان میں سیاسی ہلچل مچی ہوئی تھی کانگریس جس میں ہندو مسلمان سب شریک تھے حکومت ہند سے متصادم ہو رہی تھی مسلمانان ہند حکومت سے برگشتہ ہو رہے تھے تحریک خلافت کا زور تھا۔ افغانوں نے تین محاذوں پر جنگ چھیڑ دی فیلڈ مارشل جنرل نادر خان نے محاذ خوست پر انگریزی افواج کے چھکے چھڑا دئے مسلسل لڑائیوں کے بعد بھی انگریزوں کو افغانوں کے خلاف کوئی قطعی کامیابی کی توقع نہ تھی اور گاندھی جی بھی افغانی پہاڑوں میں ہندوستانی افواج کو تباہ کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے راولپنڈی میں صلحنامہ طے پایا جس میں حکومت ہند نے تمام افغانی مطالبات کو تسلیم کر لیا امیر موصوف نے ہز مجسٹی کا خطاب اختیار کیا اور افغانستان کی مکمل آزادی کا اعلان کیا گیا۔ زرامداد بند کر دی گئی

امیر امان اللہ خان کے اصلاحات جنگ آزادی کی کامیابی کے بعد امان اللہ خان نے تیزی سے اصلاحات نافذ کرنا شروع کر دئے سپاہ میں تخفیف کی گئی تنخواہیں کم کر دی گئیں جنرل نادر خان نے اس کی مخالفت کی جس کے باعث وہ سفیر پیرس مقرر کئے گئے تھے۔ امان اللہ خان نے سب سے بڑی سیاسی غلطی یہ کی کہ ماحول اور قومی روایات کا صحیح اندازہ لگائے بغیر جدید اصلاحات نافذ کردئے قوم اس کی متحمل نہ ہو سکی اور فوراً ردعمل شروع ہو گیا امیر موصوف نے اندازہ لگایا کہ ملا حکومت پر بہت حاوی ہیں لہذا ان کا اثر توڑنے کے لئے انہوں نے تمام ملاؤں کو دربار میں طلب کیا اور ان کا خوب مذاق اڑایا اب ملا ان کے دشمن ہو گئے۔ وہ رضا شاہ پہلوی شاہ ایران اور کمال اتاترک مرحوم کی تقلید کر کے سیاست کو مذہب سے علٰحدہ کرنا چاہتے تھے مگر ماحول سے عدم واقفیت کی وجہ سے ان کو ناکامی ہوئی یہ وہ زبردست غلطی تھی جس کے باعث ان کو تخت و تاج سے دست بردار ہو جانا پڑا۔ افغانی ملا قوم پر پوری طرح چھائے ہوئے ہیں مذہبی پیشواؤں کی حیثیت سے ملاؤں کا اثر حکومت و قوم دونوں پر مسلط ہے ان کا مذاق اڑانا گویا قوم کی مخالفت بلاوجہ مول لینا تھا۔ ملاؤں نے امیر موصوف کے خلاف زبردست پروپگنڈا شروع کر دیا سفر یورپ کے دوران میں ملکہ ثریا کی بے پردہ تصاویر کی اشاعت نے ملاؤں کو موقع دیا کہ

وہ اپنی توہین کا انتقام لیں اس لئے انہوں نے افغانوں کی غیرت قومی کو اکسایا اور شاہ کے خلاف ناپاک پروپگنڈا شروع کیا۔ سفر یورپ کے دوران میں امان اللہ خان نے شاہ فواد ہز مجسٹی وکٹر ایمول شاہ اٹلی، مسٹر ہیپن صدر فرانس اور ملک معظم کنگ جارج پنجم آنجہانی سے شاہی ملاقاتیں کیں واپسی میں کمال اتاترک و رضا شاہ پہلوی سے طویل ملاقاتیں ہوئیں

سفر یورپ اور امیر موصوف کا زوال یورپ کا سفر کرکے امان اللہ خان نے مغربی تہذیب کی ظاہر شان وشوکت سے متاثر ہو کر جدید مغربی اصلاحات کا ایک باقاعدہ پروگرام بنایا وہ افغانستان واپس آئے اور ملک میں مذہبی سماجی و تمدنی اصلاحیں تیزی کے ساتھ جاری کردیں چغہ، جبہ، عمامہ اور شلوار کو ترک کرکے افغانوں کو سوٹ پہننے اور ہیٹ لگانے کے احکامات دئے گئے عورتوں کو بے پردہ ہونے کا بھی حکم دیا گیا۔ ان اصلاحات نے افغانوں میں امیر موصوف کے خلاف نفرت کی لہر دوڑادی ملاؤں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آتش بغاوت بھڑکائی۔ شریف امرا دربار سے نکالدئے گئے تھے۔ عہدہ دار راشی اور ظالم تھے فوج دل برداشتہ تھی ان وجوہات کی بنا پر بغاوت کامیاب ہوگئی متعدد معرکوں کے بعد بچہ سقہ نے کابل پر قبضہ کرلیا اور امان اللہ خان کو افغانستان چھوڑنا پڑا۔

نادر خان اس وقت جنوبی فرانس میں نادر خان جو امان اللہ خان کی حکومت سے ناراض ہو کر نیس میں مقیم و بیمار تھے اخبارات میں امان اللہ خان کی فراری، بچہ سقہ کے مظالم کا حال پڑھا کرتے تھے ان کے دل میں قومی درد تھا وہ افغانستان کو اس ظالم کے پنجہ سے نجات دلانے کے لئے حالت بیماری میں وطن واپس آئے اور نہایت عزم و استقلال کے ساتھ متعدد معرکوں کے بعد بچہ سقہ کو شکست دیکر قتل کیا اور اپنی قومی حکومت قائم کی۔ نادر خان اپنی عظیم المرتبت شخصیت، تدبر اور غیر معمولی بہادری کی وجہ سے کامیاب ہوئے۔

نادر شاہ کا دور حکومت ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو نادر شاہ غازی کی بادشاہت کا اعلان کیا گیا تمام سرداران قبایل نے اطاعت قبول کی۔ بدامنی لوٹ مار غارتگری قبایلی انتشار تفرقہ و خانہ جنگی دور کی گئی۔ ملک میں امن و امان قائم کیا۔ شاہ کے بھائیوں نے نظم ونسق کی اصلاح میں بڑی مدد دی۔ منظم و مستحکم حکومت قائم کی گئی

رشوت ستانی کو بند کرنے کے لئے تمام عہدہ داروں سے قرآن شریف کا حلف لیا گیا۔ نشہ بازی ممنوع قرار دی گئی نادر شاہ اشتمالیت و استعماریت کے خلاف تھے وہ آزاد قومیت کے علمبردار تھے۔ انھوں نے وطنیت کی اساس پر تمام قبائل کو متحد کر کے متحدہ قومیت قائم کی اور حکومت نے تعمیری پروگرام مرتب کیا قوم و ملک ترقی کی شاہ راہ پر گامزن ہو رہے تھے کہ جدید افغانستان کے اس قائد کو کسی نوجوان نے ۱۹۳۳ء میں شہید کر دیا۔

ہزمجسٹی ظاہر شاہ غازی | نادر شاہ کے بعد ان کے ولی عہد ظاہر شاہ تخت نشین ہوئے شاہ کے چچا سردار ہاشم خان وزیر اعظم اتالیق مقرر ہوئے محمد ظاہر شاہ ۱۹۱۴ء میں کابل میں پیدا ہوئے اور ۷ر نومبر ۱۹۳۱ء میں سردار احمد خان کی صاحبزادی امیرہ بیگم سے شادی کی ایک بھائی اور دو بہنیں ہیں وزیر تعلیمات جو نہایت قابل مدبر ہیں ان کے بہنوئی بھی ہیں۔

طریق حکومت | افغانستان کی حکومت دستوری شاہی ہے اقتدار اعلیٰ ذات شاہانہ اور پارلیمنٹ میں مرکوز ہے ۳۱ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کو نادر شاہ نے ملک کو رائل چہرہ یعنی "اصول اساس" عطا کیا جس کی بناپر حکومت قومی دستور پر قائم ہے موجودہ شاہ نے دستور کے مطابق ۸ر نومبر ۱۹۳۳ء کو شاہی حلف اٹھایا پارلیمنٹ کو دستور سازی و قانون سازی کے اختیارات حاصل ہیں یہ دو ایوانوں پر مشتمل ہے ایوان بالا سینٹ کہلاتا ہے جس کو افغانی زبان میں "مجلس عمالیہ عیاں" کہتے ہیں ایوان زیرین نیشنل اسمبلی کہلاتا ہے جس کو "شرح ملی" کہتے ہیں۔ سینٹ میں ۴۰ اراکین ہوتے ہیں جو شاہ کے نامزد کردہ ہوتے ہیں اور تاحیات مقرر ہوتے ہیں یہ اکثر و بیشتر سرداران قبائل ہوتے ہیں۔ نیشنل اسمبلی کے ۱۲۰ اراکین ہوتے ہیں جو باقاعدہ طور پر قوم کے منتخبہ ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ مئی اور اکتوبر میں اجلاس کرتی ہے ایک گرانڈ اسمبلی بھی قائم کی گئی ہے جو چار سال میں غیر متواتر طور پر اہم مواقع پر عظیم تر مسایل پر بحث کرنے کے لئے شاہ کی جانب سے طلب کی جاتی ہے۔ اس کو "لوجرگہ" کہتے ہیں افغانستان پانچ بڑے صوبوں میں تقسیم ہے کابل، مزار شریف، قندہار، ہرات اور بدخشاں ۴ چھوٹے صوبجات بھی ہیں۔ جو سمت مشرق، سمت جنوبی، فراح اور میمنہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ہر صوبہ پر مرکزی حکومت کی جانب سے

صوبہ دار مقرر ہے جو نائب الحکومت کہلاتا ہے۔ چھوٹے صوبوں کے صوبہ دار کو حاکم علاقہ کہتے ہیں امور داخلہ کے تصفیہ کے لئے ہر صوبہ میں دو مجالس قائم کئے گئے ہیں ایک مجلس عاملہ دوسرے مجلس مشاورت مجلس مشاورت کے ارکان منتخبہ ہوتے ہیں اور صوبہ کے مقامی امور کا تصفیہ کرتے ہیں اور مرکزی حکومت کے احکامات کی پابندی بھی کرتے ہیں۔ ۱۰ ہزار سے زائد کی آبادی رکھنے والے شہروں میں مجالس بلدیہ بھی قائم ہیں سرداران قبایل ملک میں امن وامان قائم رکھتے ہیں۔

مملکت کا مذہب اسلام ہے اور حکمراں کا حنفی المذہب ہونا لازمی ہے سررشتہ امور مذہبی کے تحت تمام مساجد کا انتظام ہوتا ہے۔ کابینہ میں بشمول وزیر اعظم گیارہ ارکان ہوتے ہیں۔ ہر وزیر کے تحت ایک ایک محکمہ ہوتا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ محکمہ جنگ، امور خارجہ، امور داخلہ، محکمہ تعلیم، محکمہ زراعت محکمہ تعمیرات، محکمہ مالگذاری، محکمہ حفظان صحت، ٹپہ و ٹیلگرافات۔

طرز تعلیم | ہز اکسلنسی سردار علی محمد خان سفیر متعینہ لندن نے افغانستان کی حالیہ ترقیات پر ایک مختصر مقالہ لکھا ہے اسمیں سردار موصوف تعلیم پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ افغانستان میں تعلیمی ترقی کی داستان بہت دلچسپ ہے دفتر تعلیمات ۱۹۰۶ء میں قائم کیا گیا تھا گذشتہ ۳۰ سال میں تعلیمی ترقیات کے تین دور گذرے ہیں پہلا دور ۱۹۰۶ء تا ۱۹۲۰ء اس حصہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حبیبیہ کالج قائم کیا گیا اور اعلیٰ تعلیم ملک میں پھیلنے لگی لوگ عام شک وشبہ سے دیکھ رہے تھے کہ اس کا ملک میں کیا نتیجہ نکلے گا۔ دوسرا دور ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۰ء جسمیں طریق تعلیم کو محض تبدیلی کی خاطر بدلا گیا اور ابتدائی تعلیم بجائے مادری زبان کے جرمنی وفرانسیسی زبان میں دی جانے لگی جس کی وجہ سے تعلیمی ترقی کی رفتار سست پڑگئی تیسرے حالیہ دور میں تعلیم کی تنظیم جدید کی گئی۔ موجودہ حکومت نے ملک میں تعمیری طرز تعلیم کی حکمت عملی اختیار کی ہے۔

افغانی طرز تعلیم کی خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ روایاتی قدیم مساجد کے درسگاہوں کو برقرار رکھا گیا ہے جو ہر گاؤں اور ہر بڑے شہر کے گلی کوچوں میں پائے جاتے ہیں ان کی اس اصول پر تنظیم کی گئی ہے کہ وہ باقاعدہ تحتانی مدارس بن گئے ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ۷ تا ۱۱ سال کے

طلبار اور ۱۱ تا ۱۴ سال کے طلبار کے مدارس علیحدہ رکھے گئے ہیں مادری زبان ذریعہ تعلیم ہے پشتو اور ایرانی زبانیں ملک میں بولی جاتی ہیں ایرانی زبان میں علمی کتب کا ترجمہ کیا گیا ہے نصاب طب کا ترجمہ ایرانی میں ہوچکا ہے ابتدائی تعلیم بالکل مفت اور لازمی ہے ۔ ثانوی مدارس کو مدارس " رشدیہ " اور فوقانی مدارس کو مدارس " ادادیہ " کہتے ہیں ان مدارس میں چار چار سال علی الترتیب تعلیم ہوتی ہے ۔ طب، انجینیری، تجارت اور بنکنگ وغیرہ ملکی زبانوں کے مدارس مردوں کے لئے اور عورتوں کے لئے نرسنگ و امور خانہ داری کے مدارس قائم ہیں ۔ مدارس صنعت و حرفت میں طلبار کے لئے طعام و قیام کا مفت انتظام ہے ۔ کابل میں ایک یونیورسٹی " دارالفنون " کے نام سے قائم ہے ۔ طلبار کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور فزیکل کلچر پر بڑی توجہ کی جاتی ہے ۔ تعلیم بالغان کا بھی پرچار کیا جارہا ہے

عدلیہ کی بھی تنظیم جدید کی گئی ہے شرع شریف افغانی قانون کی بنیاد ہے محکمہ قضار ہر ضلع میں پایا جاتا ہے مقامی عدالتیں کل ۱۰۶ ہیں ہر صوبہ میں ایک عدالت العالیہ قائم ہے تمام صوبہ جات میں ۱۹ عدالتیں ہیں ۔ کابل میں سپریم کورٹ آف اپیل قائم ہے جہاں صوبہ جات سے اپیل کی جاسکتی ہے اور یہیہ عدل گستری کی انتہا ہے ۔

پیداوار خام و مصنوعات افغانستان کا بیشتر حصہ پہاڑی ہے جہاں معدنیات اور تیل کے خزانے پوشیدہ ہیں قدرت نے نہایت فیاضی سے مالامال کردیا ہے ۔ اگر حکومت قومی سرمایہ لگاکر ان کا استعمال کرے تو ملک بہت جلد ترقی کرسکتا ہے بعض بہت ہی سرسبز و شاداب علاقے ہیں جہاں میوے ترکاریاں کثرت سے پیدا ہوتے ہیں ۔ انگور، انار، سیب، انجیر کی افراط ہے میوہ برآمد بھی کیا جاتا ہے ۔ شمالی علاقہ میں تیل، گھوربند وادی میں کوئلہ، ہرات میں پٹرول، پنجہ شیر وادی میں چاندی کی کانیں پائی گئیں ہیں ۔ بدخشان، نعمان، کنار کے پہاڑوں میں سونے کی کانیں ہیں ۔ کابل کے قریب چند کارخانے ہیں جو دیا سلائی، بٹن، بوٹ اور سامان چرم بناتے ہیں ۔ ایک " مشین خانہ " بھی ہے جو آلات حرب، جراب، فوجیوں کے بوٹ اور کپڑے تیار کرتا ہے ۔ یہ کارخانے سرکاری ہیں ۔ افغانستان ہندوستان سے کپڑے، بوٹ، شکر اور چمڑے و چاندی کے ذخائر درآمد کرتا ہے اور ساگوان میوہ، چمڑا، شطرنجیاں اور

اون برآمد کرتا ہے۔ ملک میں ریلیں نہیں ہیں چند پختہ سڑکیں پائی جاتی ہیں کاروانوں و لاریوں کے ذریعہ تجارت ہوتی ہے۔

فوج | محل وقوع کے لحاظ سے افغانستان کی فوجی اہمیت بہت زیادہ ہے فوجی تعلیم ضروری ہے ہر سال نوجوانوں کو فوجی تعلیم کے لئے طلب کیا جاتا ہے جس کی میعاد دو سال ہے آٹھ سال تک محفوظ فوج میں کام کرنا پڑتا ہے۔ ١٠ سال اور ٦٥ سال کی درمیانی عمر والے اشخاص کے لئے فوجی تعلیم لازمی ہے۔ امن کے زمانے میں فوج کی تعداد ایک لاکھ رہتی ہے۔ محفوظ فوج دس لاکھ ہوگی۔ چونکہ آبادی جنگجو ہے انکی بہادری و دلیری مسلمہ ہے۔ تمام قبایل کو مسلح کیا گیا ہے ایسی صورت میں ملک کی مدافعت فوج کے ساتھ پوری آبادی کرسکتی ہے۔ توپ خانہ، ہوائی بیڑہ و پیدل فوج سب جدید آلات حرب سے مسلح ہیں۔ کیڈٹس کے لئے ایک فوجی کالج بھی قائم ہے۔

تجارت | افغانی تجارت خارجہ زیادہ تر روس سے ہوتی ہے جس کا اوسط ٥٠ فی صد ہے جاپان سے تجارت کا اوسط ٢٠ فی صد ہے جاپانی افغانستان میں تجارت کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں افغانستان میں جاپانی مال ہندوستان کے راستہ سے آتا ہے جاپانی گتہ داروں نے کابل میں سرکاری عمارات، جدید گیاس پلانٹ کمیلے، ریزروائرس، بجلی گھر اور جدید قسم کے فیکٹریاں بنانے کا گتہ بھی حاصل کیا تھا۔ ١٩٣٥ء میں امیر امان اللہ خان نے افغانستان و جرمنی کے درمیان تجارتی معاہدہ بھی کیا تھا مگر اب وہ معاہدہ کالعدم ہوگیا ہے۔ کئی جرمن ماہرین فن افغانستان میں ملازم ہیں، جنمیں ڈاکٹر بلڈو جی سی یس کابل میں سرکاری طور پر ذرایع حمل و نقل کے اضافہ اور سڑکوں کی تعمیر کے لئے ٹھیرے ہوئے ہیں کئی جرمن اساتذہ کابل کیڈٹس کالج میں ملازم ہیں۔ جرمن انجنیرس اور ڈاکٹرس و ماہرین فن ملک میں بہت با اثر ہیں۔ ترکی اساتذہ، ڈاکٹر و ماہرین فن بھی افغانستان میں ملازم ہیں۔ افغانستان میں ایک "قومی شرکت آسامی بنک" قائم ہے جس کے ڈائرکٹر عبدالمجید خان ہیں اس بنک کا سرمایہ آٹھ کروڑ افغانی ہے اور اس بنک نے چمڑے، پٹرول، شکر، میوہ و کپڑے سرکاری ٹھیکے پر لے رکھے ہیں۔ یہ بنک ملک کی معاشی ترقی اور اقتصادی امور کا واحد ضامن ہے اس بنک نے روس سے ایک تجارتی معاہدہ کیا ہے جس کے رو سے

روس افغانستان کو مصنوعات، اور مشنری فراہم کرے گا اور اس کے بدلے افغانستان روس کو اس مال کی مساوی قیمت کے پیداوار خام برآمد کرے گا۔ یہ معاہدہ افغانستان کے حق میں مفید ثابت ہوا۔

عام ترقیات | ۱۹۳۷ء میں کابل میں ایک ادبی انجمن قائم ہوئی ہے۔ جو ایک رسالہ سالنامہ کابل، ہر سال شائع کرتی ہے جس میں ممالک غیر سے خارجی تعلقات اور خارجی سرمایہ کی تفصیلات ہوتی ہیں۔ اس میں خارجی مشیروں کے نام بھی درج ہوتے ہیں اور ان کے نوعیت کار کو بھی واضح کیا جاتا ہے۔ حکومت افغانستان نے مارچ ۱۹۳۷ء سے یہ اہم کوشش شروع کردی۔ ہے کہ ایران و ترکی کے مانند افغانستان بھی حکومت کے زیر نگرانی معاشی ترقی کرے۔ قوم کی معاشی زندگی حکومت کی سرپرستی میں ہے افغانی قومی بنک جو ۱۹۳۰ء میں قائم کیا گیا تھا ملک کے تمام ذرائع پر قابض ہے۔ اس بنک نے کابل میں جدید کارخانے قائم کئے ہیں جو درآمد ہونے والے اشیار کو تیار کرتا ہے۔ ملک کو خود کفیل بنانے کا مستحسن اقدام شروع کردیا گیا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ دار ملک میں صنعتی و معاشی ترقی کے لئے سرمایہ لگانے پر آمادہ ہیں مگر حکومت اس کو قومی مفاد کے خلاف خیال کرتی ہے اور دوسرے یہ کہ بہت زیادہ غیر ملکیوں کا افغانستان میں آجانا افغانی قوم کو پسند نہیں اس لئے حکومت کو احتیاط کرنا پڑتا ہے موجودہ حکومت کی حکمت عملی بڑی ترقی پر ہے ملک میں ذہنی بیداری پیدا ہو رہی ہے تعلیم کی عام اشاعت سے سیاسی شعور پیدا ہوچکا ہے اور قومیت کا احساس پایا جاتا ہے۔ قوم ابتک قرون وسطیٰ کی زندگی بسر کرتی ہے مگر تعلیم یافتہ حضرات و سرکاری عہدہ دار عصریت پسند ہیں۔ پختہ سڑکوں پر بس چلتی ہے جس سے مسافروں کی آمد و رفت میں سہولت ہوگئی ہے ملاؤں کے اثر کی وجہ سے سماجی اصلاح مشکل ہے مگر پھر بھی مغربی تعلیم کی عام اشاعت نے قوم میں احساس بیداری پیدا کردیا ہے اور سماجی اصلاح کی جانب تعلیم یافتہ نوجوان توجہ کررہے ہیں۔
ترکی لیڈی ڈاکٹر عورتوں کا علاج کرتی اور طبقہ نسواں میں روشن خیالی پھیلاتی ہیں۔ الغرض افغانستان میں عام بیداری کی لہر جاری وساری ہے

سیاست خارجہ | افغانستان ہمیشہ سے ایک امن پسند ملک رہا ہے اس کے عزائم جارحانہ نہیں ہیں ہندوستان اور سویٹ روس کے درمیان واقع ہونے سے اس کی خارجی حکمت عملی

یہی رہی کہ دونوں ممالک سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے جائیں۔ کابل میں اگر کبھی روسی سفیر تعلقات بڑھانا شروع کرتا ہے تو برطانوی سفیر اس کو گوارا نہیں کرتا اور جب برطانوی سفیر اپنے اثرات وسیع کرنا چاہتا ہے تو روسی سفیر اس کو پسند نہیں کرتا۔ لندن و ماسکو کے تعلقات کا ہمیشہ اثر کابل میں محسوس ہوتا رہتا ہے۔ انقلاب روس کے بعد لینن آمر روس کی حکمت عملی یہ تھی کہ افغانستان وایران اور ترکی کا ایک معاہدہ ہو جائے اور یہ دول روسی اثر کے تحت رہ کر برطانوی اثرات کا خاتمہ کر دیں۔ اسی سلسلہ میں افغانستان و روس اور افغانستان وایران اور ایران و روس کے معاہدات بھی ہوئے تھے بالشویک اثر بہت جلد زائل ہوتا گیا۔ ایران وافغانستان نے جلد محسوس کر لیا کہ روس کے عزائم خطرناک ہیں وہ اشتمالیت کو تمام دول اسلامیہ میں پھیلانا چاہتا ہے اس لئے روس کا صرف معاشی اثر باقی رہا اور سیاسی اثر سب ختم ہوگیا۔ اشتمالیت کے بڑھتے ہوئے خطرات کا مشرق وسطیٰ میں مقابلہ کرنے اور ہندوستان کی روسی حملہ سے مدافعت کرنے کی غرض سے برطانیہ نے یہ کوشش شروع کر دی کہ دول اسلامیہ کا ایک اتحاد قائم کیا جائے۔ نازیت اور فسطائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے اور دول اسلامیہ کو یورپی استعماریت کا شکار ہونے سے بچانے کے لئے اسلامی مدبر اعظم کمال اتاترک مرحوم نے ترکی ایرانی سرحدی تنازعہ کا خاتمہ کر دیا اور اپنے اثرات کو استعمال کر کے عراق و ایران اور افغانستان و ایران کے قدیم سرحدی تنازعوں کو ختم کر دیا ترکی کمیشن نے سرحدات کی حد بندی کر دی شیعہ سنی مسئلہ کمال اتاترک اور رضا شاہ پہلوی کی کوششوں سے مشترکہ اسلامی قومیت کے مقابلہ میں ختم ہوگیا۔

افغانی ایرانی سرحدی تنازعہ ختم ہونے کے بعد ہی شیعہ سنی اختلافات مٹا دئے گئے اور جب ایک اسلامی فضا پیدا ہوگئی تو کمال اتاترک نے ترکی عراق ایران وافغانستان کے ایک میثاق کی تحریک کی۔ ترکوں عربوں کے تعلقات خوشگوار ہو چکے تھے سنہ ۱۹۳۷ء میں ان ممالک کا ایک میثاق طے پاچکا جو میثاق سعدآباد کہلاتا ہے۔ افغانی قوم کو ترکوں سے دلی محبت ہے وہ اور ایرانی اور عرب ترکوں سے اسلامی رشتہ میں منسلک ہیں اس لئے سواد اعظم اسلامیہ ترکوں کی قیادت میں متحد ہیں اگر ترکی یورپی جنگ میں مجبوراً اٹلی کے حملہ کی وجہ سے شریک ہو گئے تو دول سعدآباد اسکی پوری پوری مدد کریں گے اور یہ معاہدہ جنگی میثاق بن جائیگا ایرانی افغانی افواج ترکوں کے دوش بدوش لڑکر دشمنان اسلام کو شکست فاش دیں گی ممکن ہے افغانستان ترکی کی جانب سے جنگ عالمگیر میں آئندہ شریک ہوگا۔ اقوام اسلام کا اتحاد دول اسلامی کی کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

خواجہ معین الدین بی۔ اے

پشیمانی

اے خوشا وہ دن کہ جب تجھ سے ملاقاتیں نہ تھیں
ایسے مشکل دن نہ تھے ایسی کٹھن راتیں نہ تھیں

جب دلِ ناداں یوں بے طرح بھر آتا نہ تھا
آتشِ غم تیز کرنے والی برساتیں نہ تھیں

شب کے سناٹے میں چپکے چپکے رو لینا نہ تھا
آنکھ میں آنسو نہ تھے لب پر مناجاتیں نہ تھیں

جب حریمِ دل میں روشن ہی نہ تھے غم کے چراغ
چاندنی راتیں تھیں ایسی چاندنی راتیں نہ تھیں

مخدوم محی الدین ام۔ اے

انگلستان اور اصلاحِ مذہب

انگلستان کی قدیم برٹن قوم نہایت ناشائستہ اور غیر مہذب تھی اور اس کا معیار رہائش بہت ہی ادنیٰ قسم کا تھا۔ جب رومن حکومت کا اس جزیرہ پر قبضہ ہوگیا تو اس جزیرہ میں کچھ ترقی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ شہنشاہ کانسٹن ٹائن (Emperor Constantine) کے عہدِ حکومت میں تمام سلطنتِ روم میں عیسائی مذہب کو شاہی مذہب تسلیم کرلیا گیا اس وقت جزیرہ برطانیہ میں بھی عیسائی مذہب کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس جزیرے کے لئے ایک برٹش گرجا گھر (British Church) قائم کیا گیا جہاں کے پادریوں نے قریب کے جزیرے آئرلینڈ میں پہنچ کر عیسائی مذہب کی اشاعت شروع کی۔

سلطنت رومہ کے خاتمہ کے بعد انگلستان پر مختلف قوموں نے حملہ کیا جس سے عیسائی مذہب کو نقصان پہنچا چنانچہ انگریزوں کے آنے پر یہ مذہب بالکل غائب ہوگیا۔ کیونکہ قدیم انگریز عیسائی مذہب کے سخت مخالف تھے اور قدیم برٹن قوم کی طرح آفتاب مہتاب وغیرہ کی پرستش کرتے تھے۔ انہی قدیم دیوتاؤں کے نام پر انگریزی زبان میں ہفتہ کے دنوں کے نام رکھے گئے۔

پاپائے اعظم گریگری کے عہد میں اگسٹائن مع دیگر چند پادریوں کے انگلستان میں اشاعت مذہب کی خاطر آیا ۵۹۷ء میں تھینٹ (Thanet) کے مقام پر یہ قافلہ اترا۔ اس وقت انگلستان کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا۔ اگسٹائن نے اتھیلبرٹ کے دربار میں عیسائی مذہب کی اشاعت کی اتھیلبرٹ نے بہ آسانی عیسائی مذہب کو قبول کرلیا اور رعایا کی ایک کثیر تعداد بھی عیسائی ہوگئی۔ اگسٹائن کو کینٹربری کے مقام پر گرجا گھر بنانے کی اجازت دی گئی اور وہ وہاں کا پہلا بڑا پادری (First Arch Bishop of Canterbury) مقرر ہوا۔ چنانچہ اب تک کنٹربری کا اسقف تمام عیسائی انگلستان کا صدر ہوتا ہے۔

یتھلبرٹ کی لڑکی کی شادی نارتھمبریا کے بادشاہ ایڈون (Edwin) کے ساتھ ہوئی اور وہ ایک پادری مسمی (Paulins) پالنس کو ساتھ لے گئی جس نے ایڈون کو عیسائی بنایا۔ پالنس یارک کا پہلا بڑا پادری۔ First Arch Bishop of York ، بنا۔ چنانچہ کنٹربری کے چرچ کے بعد دوسرے نمبر پر انگلستان میں یارک ہی کے چرچ کی عزت ہوتی ہے۔

رفتہ رفتہ عیسائی مذہب کو ترقی ہونا شروع ہوئی۔ چنانچہ قریب کی بعض ریاستوں نے اس کی مخالفت کی اور عیسائیوں کے ساتھ برا برتاؤ کیا۔ چنانچہ ریاست مرسیا کے بادشاہ پینڈا کو عیسائی مذہب پسند نہ آیا اس نے ایڈون کو قتل کیا جس سے عیسائی مذہب کو ضرر پہنچا مگر خود پینڈا کے قتل سے اور ایک آئرلینڈ کے پادری مسمی ایڈن (Aiden) کی دوبارہ تبلیغ سے اس کی اشاعت خوب ہوئی کچھ عرصہ بعد عیسائی مذہب کا کوئی مخالف نہ رہا اور مرسیا کے باشندوں نے اسے قبول کیا اور اس طرح یہ مذہب تمام انگلستان میں پھیل گیا۔

انگلستان میں دو قسم کے پادریوں کے ذریعہ عیسائی مذہب کی اشاعت ہوئی ایک تو وہ جو روم کے پادری اگسٹائن کے ہمراہ آئے تھے اور دوسرے وہ جو آئرلینڈ کے پادری ایڈن کے ہمراہ آئے تھے روم اور آئرلینڈ کے چرچ جدا گانہ طریقہ پر عمل کرتے تھے اور دونوں کے مذہبی اصولوں میں کچھ کچھ اختلافات تھے۔ اس فرق کے باعث تمام انگلستان میں ایک مذہب پھیل جانے پر دو مختلف قسم کے رواج عمل میں آتے تھے اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے ۶۶۴ء میں (Whitley) وائٹ لی کے مقام پر ایک عظیم الشان مذہبی مجلس Synod طلب کی گئی جس کا صدر نارتھمبریا کا بادشاہ اوسوی (Oswy) مقرر ہوا۔ آئرلینڈ اور روم دونوں قسم کے کلیساؤں کے رسم و رواج کے متعلق بحث مباحثہ سننے کے بعد اوسوی نے روم کے چرچ کے موافق فیصلہ کر دیا اور یہ طے کر دیا کہ انگلستان کے سارے کلیسا روم کے کلیسا کی تقلید کریں۔

یہ بڑے معرکہ کا فیصلہ تھا۔ اس کے ذریعہ انگلستان کا روم سے مستقل تعلق ہو گیا جو اس زمانے میں تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ وائٹ لی کی بڑی مجلس کے چار سال بعد ایک مشہور یونانی عالم مسمی تھیوڈور

(Theodorge) کنٹربری کا بڑا پادری مقرر ہوا اس نے انگریزی چرچ کا انتظام بالکل رومن طریقہ پر کرایا۔ اس کے بعد پادریوں کی قوت میں بہت اضافہ ہوا۔ چونکہ یہی لوگ تعلیم یافتہ ہوتے تھے اور لوگ ان کی عزت بھی کرتے تھے عموماً اہل کلیسا اپنی حکومت کے ممتاز عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ اس طرح پادریوں کے اختیارات کے اضافہ کے معنی یہ ہوئے کہ پاپائے اعظم کا اختیار بھی بہت بڑھ گیا اور وہ اپنے آپ کو خدا اور مسیح کا نمائندہ کہنے لگا۔

نارمنوں نے انگلستان پر قبضہ کیا تو اس کے ہر بادشاہ نے یہ کوشش کی کہ پوپ کے اقتدار کو کم کیا جائے۔ اور ادھر پوپ کی یہ خواہش رہتی تھی کہ کلیسائی اقتدار کو تمام حکومتوں پر حاوی کرنے کی کوشش کی جاتی رہے تاکہ جس بادشاہ کو چاہے علحدہ کر دے۔

ولیم آف نارمنڈی نے انگلستان کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد کلیسائی تنظیم کے سلسلہ میں پوپ کے اقتدار کو کم کرنے کی خاطر مندرجہ ذیل قوانین نافذ کئے :-

(۱) بغیر بادشاہ کی اجازت کے انگلستان میں پوپ کے اقتدار کو تسلیم نہ کیا جائے۔

(۲) پوپ کا کوئی فرمان یا حکم بادشاہ کی بغیر اجازت حاصل نہ کیا جائے۔

(۳) پوپ کو اس کا اختیار نہیں کہ بغیر بادشاہ کی منظوری کے کسی شخص کو جو بادشاہ سے وابستہ رہے خارج از ملت کر دے۔

(۴) ملک میں بغیر شاہی اجازت کے کوئی مذہبی مجلس منعقد نہیں کی جا سکتی۔

ان احکامات کے نفاذ کے بعد شاہی اقتدار بہت بڑھ گیا۔ امرا کی طرح اساقفہ بھی حلفِ اطاعت لیتے تھے۔

مگر ولیم احمر اور ہنری اول کے عہد میں انسلم صدر اسقف سے اس امر پر جھگڑا ہوا کہ جدید تقرر پر اسقف عصا، انگوٹھی اور عشائے ربانی بادشاہ کے ہاتھ سے لے یا پوپ سے، اور بادشاہ کی اطاعت کرے یا نہیں۔ چونکہ انسلم بادشاہ کی اطاعت کا مخالف تھا اس لئے رسم تشریف پاپا کے حکم سے ہی عمل میں آئی اور ۱۱۰۶ء میں مصالحت نامہ کے ذریعہ یہ طے پایا کہ اساقفہ کا تقرر بادشاہ کے سامنے پوپ کے حکم سے

عمل میں آئے اس طرح پوپ کا اقتدار پھر بڑھنے لگا ۔

اس کے بعد ہنری دوم کے عہد میں ٹامس بیکٹ کے قتل سے پوپ کے اقتدار کو اور تقویت ہوئی اور پوپ انگلستان کو اپنی جاگیر سمجھنے لگے ۔

جان منحوس نے یہ کوشش کی تھی کہ پوپ کے حکم کو نہ مانے مگر وہ پوپ کے خارج از ملت کرنے سے ڈر گیا اور خود کو پوپ کے حوالہ کر دیا۔ جس سے پوپ کے اقتدار کو انگلستان میں بہت اہمیت حاصل ہو گئی اس طرح کے اقتدار سے پوپ ناجائز فائدہ اٹھاتے رہے۔ ان کو کلیسائی معاملات میں غیر معمولی مداخلت کا موقع مل گیا۔ اسی زمانے سے تمام کلیسائیوں کے تقررات میں وہ اپنے اثر کو کام میں لانے لگے جس کے باعث بہت سے غیر ملکیوں کو کلیسا میں ملازمت کرنے کا موقع ملا اور اس طرح کثیر رقم رومہ جانے لگی یہ پادری چونکہ غیر ملکی ہوتے تھے لہذا انھیں ملک سے کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی۔ ۱۳۰۵ء سے ۱۳۷۷ء تک پوپ فرانس میں رہنے لگا ۔ اس عرصے میں جتنے بھی پوپ ہوئے وہ اکثر فرانسیسی تھے ۔ جب فرانس اور انگلستان کے تعلقات کشیدہ ہوئے تو انگریزی قوم نے فرانسیسی پوپ کے اقتدار کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ اور اس طرح پوپ کی وقعت کم ہو گئی ۔

پوپ کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ۱۳۵۱ء میں Statute of Provizers نافذ ہوا جس کی رو سے اہل کلیسا کے تقرر کا اختیار بجائے پوپ کے شاہ انگلستان کو حاصل ہو گیا ۔

۱۳۵۳ء میں Statute of Provemunixe نافذ ہوا اور غیر ملکی عدالتوں میں خاص طور پر پوپ کی عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کی ممانعت کی گئی لیکن ان قوانین کو سختی کے ساتھ نافذ نہیں کیا گیا کیونکہ اس وقت پوپ کے ایڈورڈ سوم سے اچھے تعلقات تھے ۔

پادری اور دوسرے راہبین کچھ عرصے تک تو سادہ زندگی بسر کرتے رہے لیکن مال و دولت کی فراوانی کے ساتھ انہوں نے اپنی دینی اور سادہ زندگی چھوڑ کر دنیوی کاروبار میں حصہ لینا شروع کیا رفتہ رفتہ عیش پسند اور آرام طلب ہو گئے ۔ چنانچہ Grey Frias اور Black frairs نے جو اپنی تمام زندگی غریبوں اور محتاجوں کی خدمت اور مذہب کی اشاعت میں صرف کرنے کا وعدہ کرتے تھے ۔

کچھ دن تک تو اچھا کام کیا مگر یہ بھی آرام طلب ہو گئے جس کے بعد سے (Friar) فقیر کے معنی بیکار اور سست کے ہو گئے۔

چودھویں اور پندرھویں صدی میں صرف فقیروں ہی میں نہیں بلکہ تمام کلیساؤں میں بہت سے عیب نمودار ہونے لگے پادریوں نے جن کی زندگی کا مقصد مخلوق خدا کی خدمت کرنا تھا اب دنیوی عیش و آرام کے سامان فراہم کرنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کرنے لگے۔ خود پاپائے اعظم اس قدر دنیادار ہو گیا تھا کہ اس میں اور اٹلی کے شہزادوں میں کسی قسم کا فرق نظر نہیں آتا تھا چنانچہ اب پوپ خدا کا نائب اس معنی میں نہ تھا کہ لوگوں کو صحیح راستہ بتائے بلکہ وہ اب عیش پرستوں کا رہنما ہو گیا تھا۔ پوپ کے خزانے کے لئے مختلف قسم کے حیلوں سے روپیہ وصول کیا جاتا تھا۔ کچھ دنوں تک روم کو چھوڑ کر پوپ فرانس کے رنگین شہر میں جا کر رہنے لگے تھے یہ زمانہ انگلستان اور فرانس کی جنگ صد سالہ کا زمانہ تھا جس کی وجہ سے ان کی وقعت اور کم ہو گئی۔

وکلف نے جو یارک شائر کا باشندہ اور اکسفورڈ کا پادری اور معلم تھا پوپ اور ملازمین کلیسا کی بدعنوانیوں کی سخت مخالفت کی۔ اس نے پوپ کے خلاف لوگوں کو تلقین کی اور اس کی عیاشیوں کا کچا چٹھا بلا خوف و خطر کھولنا شروع کیا۔ وکلف نے سب سے پہلے انجیل کا ترجمہ کیا تاکہ ہر شخص انجیل کو سمجھ سکے اور پادریوں کے دھوکے سے بچے۔ اس کے پیرو غریب مبلغ Poor Priests کہلاتے تھے لیکن فرائرس نے اس کے خلاف پروپگنڈا کیا کہ "وہ تخم فساد کا بونے والا ہے" مگر جب اس نے نظریہ تبدیل دم و لحم یا قلب ماہیت کے فلسفہ سے انکار کیا تو عوام اس سے برگشتہ ہو گئے اس کو اور اس کے پیروؤں کو فضول گو اور بکواسی (Lallards) کہنے لگے۔

اس کی کوشش کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ عوام کی اکثریت جاہل تھی ان کی ذہنیت اور خیالات میں وسعت نظری پیدا نہ ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ اس کی تعلیم کو نہ سمجھ سکے گر وہ کلیسا سے بھی بدظن ضرور تھے۔ صرف اسی کی تعلیم کا نتیجہ تھا جس پر لوتھر نے اپنے خیالات کی بنیاد رکھی۔ گو آگ بظاہر بجھ گئی تھی مگر اس کی چنگاریاں آہستہ آہستہ اپنا کام کر رہی تھیں۔ وکلف سب سے پہلا پروٹسٹنٹ شخص ہے

جس نے پوپ اور اس کی کارروائیوں کے خلاف علی الاعلان اعتراض کیا اور لوگوں کو سیدھا راستہ بتایا جس کی وجہ سے اسے The Morving Star of Reformation کہتے ہیں۔

وکلف کے انتقال کے بعد بھی اس کے پیروؤں کا زور رہا مگر لنکاسٹر خاندان کے افراد نے جو کلیسا کی مدد سے تخت نشین ہوئے تھے اور اس کی دوستی کے خواہاں تھے ان کے خلاف قوانین نافذ کئے حتیٰ کہ ان کے کئی رہنما جلا دئے گئے جس کی وجہ سے اس جماعت کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔

پوپ اپنے خزانہ کے لئے عیسائی ملکوں سے طرح طرح سے روپیہ لوٹتے تھے اور زر کے بدلے تمام گناہوں کا معافی نامہ دیتے تھے جسے Papal Bull کہا جاتا تھا اور اپنے خزانے مالا مال بنانے کے لئے مختلف قسم کے محصول لگا دیئے۔ جب تک لوگ ناواقف تھے اس وقت تک تو یہ سب ریاکاری خوب چلتی رہی یہاں تک کہ وکلف جیسے جوشیلے واعظ کی اصلاح کی کوشش رائیگاں گئی۔ مگر پندرھویں صدی کے آخر میں تمام یورپ میں نشاط جدیدہ Renaissance کی لہر پھیل جانے کی وجہ سے لوگوں کی آنکھیں کھلنی شروع ہوئیں۔ اور ان باطل عقیدوں اور بیہودہ توہمات پر لوگوں کا اعتقاد کم ہونے لگا۔ اور انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ پوپ کو روپیہ بھیجنے سے کچھ فائدہ نہیں سوائے اس کے وہ اسے عیش و عشرت میں صرف کرتے ہیں۔

ان ہی خیالات کا نتیجہ تھا کہ تمام یورپ میں مختلف مصلحین اٹھے اور اصلاح کی کوشش کی جس میں مارٹن لوتھر سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس نے بچشم خود روم جاکر کلیسا کی برائیاں دیکھی تھیں۔ اس کو معلوم ہوا کہ پوپ یہ کہہ کر چندہ وصول کر رہا ہے کہ "جو شخص اس کار خیر میں شریک ہوگا وہ اپنی تمام زندگی گناہوں سے بری ہو جائے گا۔" اس کے خلاف لوتھر نے ایک مضمون شائع کیا پوپ اس کی خبر پاکر بہت برہم ہوا اور اسے خارج از ملت کرنے کی دھمکی دی۔ مگر لوتھر ٹس سے مس نہ ہوا بلکہ اس نے اپنا احتجاج برابر جاری رکھا اس لئے اس کے پیرو پروٹسٹنٹ (Protestant) کہلانے لگے۔

اسی طرح دوسرے مصلحین کالون اور ناکس بھی پیدا ہوئے جن کا مقصد بھی مذہب کی اصلاح تھا۔

ان کا بھی خیال تھا کہ پوپ کو خدا اور مسیح کا نائب ماننا غلطی ہے حالانکہ انکے بعض اصول مختلف تھے فرانس کے ہوگنٹس (Hagencts) کالون ہی کے پیرو تھے اور اس کے شاگرد John Knox نے اسکاٹلینڈ میں مذہبی اصلاح کی اشاعت کی چنانچہ Presbyterian charch اور Puritans ۔ کالون ہی کے اصول کو مانتے ہیں ۔

۱۵۰۹ء میں انگلستان میں ہنری ہشتم تخت نشین ہوا اس وقت سارے یورپ میں مذہبی اصلاح کی لہر دوڑ رہی تھی مگر وہ اس کے خلاف تھا چنانچہ پاپائے روم کی حمایت میں اس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کی بنا پر پوپ نے اسے حامی مذہب (Defender of the faith) کا خطاب دیا مگر ہنری اس سے ناراض ہوگیا جبکہ پوپ نے اسکی مرضی کے موافق کیتھرائن کو طلاق دینے کی اجازت نہ دی اس پر پوپ کو دھمکی دینے کے لئے اس نے ایک قانون پارلیمنٹ سے نافذ کروایا جو Act of Annates کہلاتا ہے ۔ مقصد یہ تھا کہ انگلستان سے کسی قسم کا مذہبی ٹیکس پوپ کے خزانہ کو بھیجا جائے جب اس پر بھی پوپ اپنے فیصلہ پر قائم رہا تو ہنری نے ایک دوسرے قانون (Act of Appeals) قانون مرافعہ کے ذریعہ یہ طے کیا کہ انگلستان کے مقدمے ملک سے باہر فیصل ہونے کے لئے نہ بھیجے جائیں اور اس قانون سے فائدہ اُٹھا کر اس نے کنٹربری کے پادری کرینمر سے طلاق کی اجازت حاصل کر لی ۔ اور این بولین سے شادی کر لی ۔

پوپ کیرپمر پر بہت برہم ہوا اس نے فوراً اعلان کیا کہ این بولین سے شادی ناجائز ہے ۔ اب ہنری سمجھ گیا کہ پوپ سے جب تک قطع تعلق نہ ہوگا اس وقت تک اس کی خواہشات کی تکمیل نہ ہو سکے گی لہذا اس نے "قانون عظمت" (Act of Supermacy) کے ذریعہ اعلان کیا کہ آئندہ حکمران انگلستان ہی انگریزی کلیسا کے منتظم ہوا کریں گے ۔ اس قانون کو تسلیم نہ کرنا بغاوت سمجھا جاتا تھا اور سلطنت کے اعلیٰ کارکن یہ حلف لینے پر مجبور تھے ۔ اس طرح پوپ کے اقتدار کو کیتھرائن کے طلاق کی اجازت نہ دینے کی وجہ سے بہت بڑا دھکا لگا ۔

اب ہنری نے خانقاہوں (Monasteries) کے حالات کی جانچ کروانی شروع کی

ہر خانقاہ میں (Monks) راہب اور (Muns) راہبات رہتے تھے جو یہ عہد کرتے تھے کہ شادی نہ کریں گے اور اپنی زندگی مذہب کی اشاعت اور خدا کی راہ میں صرف کریں گے ۔ مگر ان میں ہر قسم کی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں ۔ ہنری نے پہلے چھوٹی اور پھر بڑی خانقاہوں کو توڑا اور ان کی سب جائدادیں فروخت کر دی گئیں ۔ جن لوگوں نے خانقاہوں کی جائدادیں خریدی تھیں وہ ہرگز یہ گوارا نہیں کرتے تھے کہ پوپ پھر انگلستان کے چرچ کا منتظم ہو جائے کیونکہ انھیں جائدادیں واپس کرنے کا ڈر تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی نوخرید جائداد کی حفاظت کی خاطر مذہبی اصلاح (Reformation) کے طرفدار ہو گئے ۔

گر ایک طبقہ مذہب میں کسی قسم کی تبدیلی گوارا نہ کرتا تھا اور اس نے بغاوت کی لیکن یہ بغاوت فرو کر دی گئی ۔ ہنری مذہبی اصولوں میں کوئی تبدیلی کرنا پسند نہیں کرتا تھا اس نے ایک شاہی قانون عقائد ستہ جاری کروایا جس میں پرانے کیتھولک مذہب کی خاص خاص چھ دفعات شامل تھیں ۔ ہنری کا منشاء تھا کہ پوپ سے قطع تعلق ہونے پر بھی لوگ اپنے پرانے مذہبی اصول میں کوئی ترمیم نہ کریں ۔ وہ انگریزی کلیسا کو پوری طرح پروٹسٹنٹ بنانا نہ چاہتا تھا ۔ وہ دل سے کیتھولک تھا اگر اس کا پوپ سے ذاتی معاملہ پر جھگڑا نہ ہوا ہوتا تو ممکن تھا وہ پوپ سے انگریزی کلیسا کے تعلق کو نہ توڑتا ۔

جب ہنری ہشتم کا انتقال ہوا تو اس کا کمسن لڑکا ایڈورڈ ششم بادشاہ ہوا ۔ حکومت ایک مجلس تولیت کی نگرانی میں تھی جس کا صدر اس کا ماموں ایڈورڈ سائمر ڈیوک آف سمرسیٹ تھا ۔ سمرسیٹ ہنری اصلاح کا تہ دل سے طرفدار تھا اور اس نے انگریزی چرچ کو پورا پروٹسٹنٹ بنانے کی کوشش کی پوپ سے قطع تعلق ہو چکا تھا سمرسیٹ نے اب مذہبی اصولوں میں بھی ترمیم شروع کی ۔ ہنری ہشتم کے زمانہ کا قانون عقائد ستہ (Statute of six Articles) جس کا یہ منشا تھا کہ مذہبی اصول قدیم ہی باقی رہیں منسوخ کیا گیا اور پادریوں کو شادی کرنے کی اجازت دی گئی ۔ کلیساؤں کے بت توڑ ڈالے گئے اور کھڑکیوں کے وہ شیشے جن پر قدیم زمانہ کے بزرگوں کی تصویریں تھیں توڑ دئے گئے اب تک عبادت لاطینی زبان میں ہوتی تھی مگر سمرسیٹ نے ایک نئی کتاب عبادت (New Prayer Book) انگریزی میں

شائع کی اور سب پادریوں کو اس کے استعمال پر مجبور کیا گیا اس کا خیال یہ تھا کہ عبادت لاطینی ز
کرنا جسے معدودے چند اشخاص سمجھ سکیں بالکل فضول ہے یہ نئی کتاب عبادت مذہبی اصلاح
اُصول پر تیار کی گئی تھی ۔

باشندگان ملک مذہب میں اس قدر زیادہ تبدیلیوں کے لئے تیار نہ تھے پوپ سے تعل
کو توسب نے پسند کیا مگر سالہا سال کے مروج مذہبی اصولوں میں ترمیم بہت کم لوگ چاہتے تھے
کی مذہبی ترمیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتھولک مذہب والوں نے (Devon shire) ڈیون شائر
شروع کی جو جلد دبا دی گئی ۔ کچھ عرصے بعد سمرسیٹ قتل کردیا گیا گو وہ مذہبی اصلاح کا حامی تھا مگر
اس کی مذہبی ترمیمات کے لئے تیار نہ تھا ۔

سمرسیٹ کے بعد ڈڈلے اول آف واروک (Dudley Earl of Warwick) نا
ہوا ۔ گو یہ مذہبی اصلاح کا دل سے طرفدار نہ تھا مگر خانقاہوں اور کلیساؤں کی دولت کو تصرف میں
کے لئے اس نے مذہبی اصلاح کے لئے خوب جوش دکھایا ۔ اس نے ایک دوسری کتاب ع
شائع کی اور اس میں پہلی کتاب سے بھی زیادہ پرٹسٹنٹ خیالات کا اثر پایا جاتا تھا ' بیالیس دفعا
قانون (Forty two Articles of Religion) نافذ کیا گیا جس میں لوتھر کے بنائے ہوئے
مذہب کے سبھی اُصول شامل تھے اس طرح انگریزی کلیسا ' رسومات اور اصول دونوں میں کلیۃً پرٹ
ہوگئے مگر باشندگان ملک کو ان تبدیلیوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی اور وہ مذہبی اصول زمانہ قدیم کی
طرح قائم رکھنے کے حامی تھے ۔

ایڈورڈ ششم کے انتقال کے بعد اس کی بہن میری تخت پر بیٹھی جو کٹر کتھولک تھی اور اس
تخت پر بیٹھتے ہی یہ ارادہ کرلیا کہ وہ انگریزی کلیسا ' کو پھر کتھولک بنانے اور مذہبی اصلاح کو حتی المق
روکنے کی کوشش کریگی ۔ اس نے فلپ دوم شاہ اسپین سے شادی کی جو خود کتھولک تھا ۔

میری نے ایڈورڈ ششم کے زمانہ کے شاہی قانون سب منسوخ کروا دیئے اور ہنری ششم
وقت کا قانون عقائد ستہ پھر جاری کرکے کتھولک مذہب کی دوبارہ اشاعت کی مگر اس نے صرف

اکتفا نہ کیا بلکہ وکیل پوپ پول (Cardinal Pole) کو انگلستان میں مدعو کیا جس کے سامنے پارلیمنٹ کے سب اراکین نے ادب سے جھک کر پوپ کی بے قدری کی معافی مانگی۔ اور قدیم رواج کے مطابق کلیساؤں میں بتوں کی پرستش شروع ہو گئی۔ پروٹسٹنٹ پادریوں کو نکال کر کیتھولک پادری مقرر کئے گئے اور پروٹسٹنٹ پادریوں پر طرح طرح کے ظلم کئے گئے مگر میری خانقاہوں کی جائدادیں واپس نہ دلا سکی کیونکہ ایسے کرنے میں شاہی خزانہ سے بہت سے روپیہ دینے کی ضرورت پڑتی اس طرح مذہبی اصلاح کا جڑ پیڑ سے خاتمہ نہ کیا جا سکا جو موقعہ پا کر پھر تر و تازہ ہو گیا۔ اس طرح اس ردعمل کا نتیجہ خود اصلاح مذہب کے لئے مفید ثابت ہوا۔

میری کی وفات کے بعد ایلزبتھ قید سے رہا ہو کر تخت نشین ہوئی سب سے ضروری کام اس وقت یہ تھا کہ انگریزی کلیسا، کا معقول انتظام کیا جائے۔ پروٹسٹنٹوں اور کیتھولکوں کے جھگڑوں سے ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے مذہبی معاملات سے دلچسپی نہ تھی لہذا اس نے چرچ کا انتظام بالکل سیاسی نقطۂ نظر سے کیا۔ وہ جانتی تھی کہ باشندگان ملک پوپ کے ماتحت رہنا بھی پسند نہیں کرتے لہذا اس نے اپنے باپ کی طرح قانون عظمت پاس کیا۔ ایڈورڈ ششم کے عہد کی کتاب عبادت شائع کی مگر ان الفاظ کو نکال دیا گیا جن سے قدیم مذہب والوں کے جذبات کو صدمہ پہنچتا تھا۔ قانون یکانگت (Act of Uniformity) کی رو سے کسی دوسری کتاب کے استعمال کی اجازت نہ تھی۔ ایڈورڈ ششم کا بیالیس دفعات کا قانون The 42 Articles of Religion پھر نافذ کیا گیا مگر اس کی تین دفعات جن پر قدیم مذہب کے پیرو خاص طور سے اعتراض کرتے تھے نکال دئے گئے۔ الزبتھ کا انتظام مستقل ثابت ہوا۔ اور آج کل انگریزی کلیسا کا انتظام بہت بڑی حد تک اسی کے مطابق ہے۔ اس کے اس انتظام سے ملک کو در اصل داخلاً اور خارجاً فائدہ ہوا ملک کے سب فرقے متحد ہو گئے اور پوپ کا اقتدار جاتا رہا اور موجودہ مذہب انگلستان کی ابتدا یہیں سے ہوئی جو Anglicanism کہلاتا ہے۔

ایلزبتھ نے مذہبی معاملات میں اعتدال سے کام لیا۔ اس کا منشا تھا کہ انگریزی کلیسا کل قوم کا ہو اور اس میں سب خیال کے لوگ شامل ہو سکیں۔ عام کلیساؤں میں تو سب کو مقرر شدہ کتاب عبادت

استعمال کرنا لازمی تھا مگر گھروں پر اس کی اجازت تھی کہ جو کتاب چاہے استعمال کریں مگر ان لوگوں کو جو عام کلیساؤں میں شریک نہ ہوتے تھے اپنی غیر حاضری کا تھوڑا سا جرمانہ دینا پڑتا تھا۔ مگر الزبتھ کی خواہش تھی کہ اس کے عہد میں ملک میں مذہبی شورش نہ ہو اس لئے اس نے ایک مذہبی عدالت High Commission Court قائم کی جس میں انگریزی کلیسائے کے خلاف شورش کرنے والوں کو سزا دی جاتی تھی۔

مگر کالون کے پیرو، پیورٹین (Puritsms) اس انتظام سے خوش نہ تھے۔ وہ رسومات کے قائل نہ تھے اور عبادت کے وقت خاص لباس کا استعمال غیر ضروری سمجھتے تھے اور اصلاح کی تحریک کو اور آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ ایلزبتھ ان سے ناخوش تھی اور یہ لوگ انگریزی کلیسا، سے علیحدہ ہو گئے یہی لوگ آگے چل کر کافر (Nonconformists) اور Dissenters کہلانے لگے۔

پروٹسٹنٹ مذہب کی اشاعت سے رومہ کے کلیسا، کی برائیاں سب پر روشن ہو گئیں تو پوپ نے اپنی عظمت کو برقرار رکھنے کی خاطر اس کی دوبارہ اشاعت کی کچھ برائیاں دور کی گئیں اور کچھ ترمیمات ہوئیں اور ایک جیسوئٹ جماعت (Order of the Jesuits) نے زور وشور سے اس کی تبلیغ کی مگر کامیابی نہ ہو سکی پوپ نے الزبتھ کو کافر ٹھیرایا اور کیتھولک لوگوں کو اس کے خلاف بغاوت کرنے کی تلقین کی جس پر بعض نے بغاوت کی اس پر ملکہ نے بھی سختی سے کام لیا اور جسوئٹ جماعت والوں کو ملک سے نکالدیا انگلستان کی مذہبی اصلاح کو مورخین سیاسی اصلاح (Political Reformation) کہتے ہیں۔

الزبتھ کے انتقال کے بعد اسٹوئرٹ خاندان برسر اقتدار ہوا۔ اور انگلستان اور اسکاچستان ایک بادشاہ کے تحت ہو گئے۔ جیمس اوّل پہلا اسکاچستان کا بادشاہ ہے جس نے انگلستان پر بھی حکومت کی۔ سترھویں صدی میں انگلستان میں خاص مذہبی جماعتیں تھیں ایک رومن کیتھولک جو اب تک پوپ کو خدا اور مسیح کا نمائندہ سمجھتی تھی دوسرے انگریزی کلیسائی جماعت (English Church Party) جو اصلاح کی طرفدار تھی نئی قائم شدہ انگریزی کلیسا، کی پیرو تھی۔ تیسری پیورٹین جو اصلاح کو اور بڑھانا چاہتی تھی مگر ان تینوں جماعتوں میں سے ہر ایک یہ سمجھتی تھی کہ اسے امداد حاصل ہو گی کیتھولک فرقہ کو اس وجہ سے کہ جیمس کی والدہ

کیتھولک تھی۔ انگریزی کلیساؤں کو اس لئے امید تھی کہ وہ انگلستان کا بادشاہ ہونے کی حیثیت سے انگریزی کلیسا، کا نگران اور مہتمم تھا بیورٹین اس لئے خیال کرتے تھے کہ وہ اسکاٹلینڈ سے آرہا تھا جہاں کا کلیسا انہی کے اصول کا پیرو تھا۔ مگر جیمس نے انگریزی کلیسا سے ہمدردی کی۔

جیمس کے ہاں پیورٹین جماعت نے عرضداشت پیش کی کہ کلیسا کے کچھ طریقوں اور کتاب عبادت میں ترمیم کی جائے تاکہ وہ انگریزی کلیسا میں شامل ہوسکیں جس پر ایک مجلس ہمپٹن کورٹ Hampton Court کے مقام پر جیمس نے طلب کی مگر کوئی فیصلہ نہ ہوسکا جس کے بعد وہ پیورٹین ہمیشہ کے لئے انگریزی کلیسا سے علیحدہ ہوگئے۔

کیتھولک مذہب والوں کو کلیسا میں شرکت نہ کرنے کی وجہ سے انہیں جرمانہ تو دینا پڑتا تھا مگر جیمس کے عہد میں یہ قوانین بہت سخت کردئے گئے جسکی وجہ سے جیمس کے خلاف انہوں نے سازش کی مگر پتہ چلنے پر انہیں ناکامی ہوئی اور ان کے خلاف اور سخت قوانین بن گئے۔

جیمس کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا چارلس اوّل تخت نشین ہوا جس کی شادی فرانس کے بادشاہ کی ہمشیرہ ہنریٹا میریا (Henrietta Maria) سے ہوئی تھی۔ ملکہ پکی کیتھولک تھی اور اس کا اثر اپنے شوہر پر بہت تھا جس کی وجہ سے چارلس کی بہت کچھ ہمدردی کیتھولک مذہب والوں کے ساتھ تھی جس کی وجہ سے وہ پروٹسٹنٹ پبلک میں ہردلعزیز نہ ہوسکا۔ اس کے علاوہ شادی کرتے وقت چارلس کو شاہ فرانس سے یہ وعدہ کرنا پڑا تھا کہ انگلستان کے کیتھولک مذہب والوں کو کچھ مراعات عطا کئے جائیں گے مگر انگلستان کے پروٹسٹنٹ کلیسا کی مخالفت کی وجہ سے چارلس اس وعدہ کو پورا نہ کرسکا اور اس وجہ سے فرانس کے بادشاہ سے اس کا جھگڑا ہوگیا۔

چارلس کا مذہبی معاملات میں مشیر لوڈ (Laud) تھا جو کنٹربری کا صدر اسقف تھا لوڈ تہ دل سے کلیسا، کی بہتری چاہتا تھا مگر وہ پیورٹین کا مخالف تھا جس کی وجہ سے اس نے ان پر سختی کا برتاؤ کیا اور مذہبی عدالت (Court of High Commission) سے سخت سزائیں دلائیں حالانکہ اس سے پیشتر اسی عدالت سے اتنی سخت سزائیں نہیں دی گئی تھیں۔ پیورٹین جماعت نے اس لئے اسے یہ کہکر

بدنام کرنا شروع کیا کہ وہ پروٹسٹنٹ مذہب کی آڑ میں کیتھولک مذہب کی اشاعت چاہتا ہے اور آخر کار اس کے ظلم سے تنگ آکر بہت سے پیوریٹن امریکہ میں جاکر بس گئے۔

چارلس کو اپنی بدعنوانیوں اور مطلق العنانی کے باعث تخت سے معزول اور قتل کردیا گیا جس کے بعد انگلستان میں جمہوری سلطنت قائم ہوئی۔ کرامول جو جمہوری سلطنت کا ناظم تھا پروٹسٹنٹ تھا اور تمام پروٹسٹنٹ ریاستوں کا سردار بننا چاہتا تھا۔ اس زمانہ میں ملک میں مذہبی فساد نہ ہوا کیونکہ ناظم سلطنت پروٹسٹنٹ تھا حکومت ملک کے نمایندے کرتے تھے۔

کرامول کے انتقال کے بعد جمہوری حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور پھر شہنشاہیت قائم ہوگئی اور چارلس اول کا لڑکا چارلس دوم تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ دراصل کیتھولک تھا مگر رعایا کے خلاف ہونے کے خوف سے انگریزی چرچ کی رسومات کے مطابق عمل کرتا تھا اس نے ڈوور کے خفیہ صلحنامے کے بعد وعدہ کے مطابق کیتھولک رعایا سے کچھ رعایت برتنی شروع کی اور ایک اعلان بریت (Declaration of Indulgencies) شائع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ جملہ مذاہب کو پوری طرح آزادی دی جائے اور مذہب کے لیے حکومت کی طرف سے کوئی سختی نہ ہو۔ گو بادشاہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ ملک سے مذہبی منافرت کو دور کرنا چاہتا ہے مگر باشندگان ملک اس کا مطلب سمجھ گئے۔ اور پارلیمنٹ نے اس کی مخالفت کی جس کی وجہ سے اسے اپنا اعلان واپس لینا پڑا اس کے بعد قانون آزمایش (Test Act) پاس کیا گیا جس کے مطابق عہدہ ملنے سے پہلے تمام سرکاری عہدہ داروں کی آزمایش کرلی جاتی تھی کہ وہ قائم شدہ چرچ کی رسومات کے مطابق ہی عمل کرتے ہیں یا نہیں۔

اس قانون کی وجہ سے ڈیوک آف یارک (آئندہ جیمس دوم) نے اپنے امیر البحر Lord High Admiral کے عہدہ سے استعفا دیدیا کیبل کے دو وزیروں کو بھی اپنے عہدوں سے علٰحدہ ہونا پڑا اور بقیہ تینوں وزیروں کو بادشاہ نے برخواست کردیا۔ اس طرح کیبل کی انجمن وزرار کا خاتمہ ہوگیا۔

چارلس سوم کی وفات کے بعد اس کا چھوٹا بھائی ڈیوک آف یارک تخت نشین ہوا جس نے قانون آزمایش

(Test Act) کے سلسلے میں استعفار دیدیا تھا وہ علانیہ کیتھولک مذہب کا حامی تھا اور اسے تخت سے محروم رکھنے کی کوشش ناکام رہی تھی۔ حالانکہ اس نے تخت نشینی کے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ میں "انگریزی کلیسا" کو کسی قسم نقصان نہیں پہونچاؤں گا" مگر اپنے عہد حکومت میں اس کا ہمیشہ یہی خاص مقصد رہا کہ کیتھولک مذہب کی خوب اشاعت کی جائے حالانکہ وہ بخوبی واقف تھا کہ کیتھولک مذہب کی طرفداری کرنے سے رعایا اس کے خلاف ہو جائے گی اور اس نے اپنے والد کا مذہب اور سیاست کے سلسلہ میں مخالفت کرنے کا انجام بھی دیکھا تھا اور اس کے بھائی چارلس دوم کو صرف رعایا کی خواہش کے مطابق کام نہ کرنے کی وجہ سے تخت سے علٰحدہ ہونا پڑا تھا حالانکہ وہ بھی باپ اور بھائی کی طرح کیتھولک تھا۔ مگر جیمس دوم کو رعایا کی مخالفت کی کوئی پروا نہ تھی اور اس لئے ملک میں زبردست انقلاب حکومت ہوا۔

قانون آزمائش کے مطابق صرف انگریزی کلیسا کے پیرو ہی سرکاری عہدہ دار ہو سکتے تھے جب جیمس نے دیکھا کہ اس سے کیتھولک لوگوں کی بڑی حق تلفی ہوتی ہے تو اس نے اس قانون کو منسوخ کرنا چاہا مگر پارلیمنٹ نے مخالفت کی اب جیمس نے یہ دلیل پیش کی کہ ضرورت پڑنے پر بادشاہ اپنے اختیار سے قوانین منسوخ کر سکتا ہے اس خاص (Dispensing Power) کا استعمال کرکے اس نے کیتھولک اور پیوریٹین مذاہب والوں کے خلاف جتنے قوانین تھے منسوخ کر دیئے۔ رعایا نے اس کی مخالفت کی کیونکہ بادشاہ کے قوانین منسوخ کرنے کے اختیار کو تسلیم کرلینے سے دستوری حکومت کا بالکل خاتمہ ہو جاتا تھا۔ اس نے رعایا کی مخالفت کی پروا نہ کی اور کیتھولک لوگوں کو فوج اور دربار میں بڑے عہدے دیئے صرف یہی نہیں بلکہ اس نے پاپائے روم کو مدعو کرکے انگلستان میں اس کا سرکاری استقبال کیا انگریزی کلیسا کے مخالفین کے خلاف جملہ قوانین منسوخ کئے گئے۔ ظاہر ہے کہ ان سب کارروائیوں سے ملک میں پھر پوپ کا اقتدار بڑھا پیوریٹن مذہب والوں کی توہین ہوتی اور پھر جھگڑے ہوتے لہذا رعایا نے اس کی مخالفت کی۔

جیمس جامعات میں بھی کیتھولک خیالات پھیلانا چاہتا تھا کیونکہ نہیں کے تعلیم یافتہ نوجوان ہی

آئندہ زندگی میں قوم اور ملک کے رہنما ہوتے ہیں اسی لئے جب اکسفورڈ یونیورسٹی کے میگڈیلین کالج کے مہتمم اعلیٰ کا عہدہ خالی ہوا اس وقت جیمس نے ایک کیتھولک مسمی پادکر کا اس عہدہ پر تقرر کردیا۔ یونیورسٹی کے ممبروں نے اس کی مخالفت کی کیونکہ اس عہدہ کے لئے منتخب کرنے کا اختیار صرف انہیں ممبروں کو تھا۔ چنانچہ ملک میں اس قدر جوش پھیلا کہ پارکر کے واسطے مہتمم اعلیٰ کے مکان کا قفل کھولنے کے لئے کوئی لوہار تیار نہیں ہوتا تھا۔ جیمس نے زبردستی پارکر کو میگیڈیلین کالج کا مہتمم اعلیٰ بنایا اور اکسفورڈ یونیورسٹی کے جن ممبروں نے اس کی مخالفت کی تھی ان کو برطرف کردیا' مگر رعایا نے ان کا تہ دل سے استقبال کیا اور ملک کے مالدار لوگوں نے بہت عزت کے ساتھ ان کو اپنے ہاں جگہ دی۔

جیمس نے اپریل ۱۶۶۸ء میں دوسری مرتبہ اعلان بریت Declaration of Indulgence شائع کیا کہ انگریزی کلیسا کے مخالفین کے خلاف جملہ قوانین منسوخ کئے گئے۔ اور پادریوں کو حکم تھا کہ ہر مقام پر کلیساؤں میں اس طرح اعلان کو سنائیں اس پر کنٹربری کے پادری اور دیگر چھ پادریوں نے ملک جیمس کے پاس ایک درخواست پیش کی کہ کم از کم خانۂ خدا میں تو قوانین کی تنسیخ کا اعلان نہ سنایا جائے مگر جیمس نے اسے اپنی توہین سمجھ کر ان سات پادریوں کے خلاف شورش کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا مگر عدالت نے ان کو بے گناہ ثابت کرکے رہا کردیا اور رعایا نے اس خبر کو سن کر خوب خوشی منائی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل ملک اس سے کتنے ناخوش تھے اور انگریزی کلیسا کے خلاف حملہ کو ہرگز برداشت نہ کرسکتے تھے۔

ان تمام مصیبتوں پر بھی رعایا خاموش تھی کیونکہ وہ ان مصیبتوں کو عارضی سمجھتی تھی کیونکہ جیمس لاولد تھا مگر جب اس کو لڑکا پیدا ہوا تو رعایا کو اندیشہ ہوا کہ اس کی تعلیم و تربیت کیتھولک طریقہ پر ہوگی لہذا انہوں نے جیمس کے داماد ولیم آف آرنج (William of Orange) کو بلایا۔ ولیم اور اس کی بیوی مری دونوں پکے پروٹسٹنٹ تھے۔ چنانچہ اہل انگلستان کی درخواست پر وہ کچھ فوج لے کر انگلستان آیا اور تمام رعایا نے اس کا ساتھ دیا بادشاہ کا کوئی ساتھی نہ تھا بادشاہ نے چند دل خوش کن وعدے کئے مگر رعایا نے

ایک نہ سُنی جس پر وہ فرانس بھاگ گیا۔

اب پارلیمنٹ نے یہ اعلان کیا کہ جیمس تخت سے علیحدہ ہوگیا ہے لہذا ولیم اور مری تخت کے مشترکہ مالک ہیں۔ اس شاندار انقلاب حکومت The Glorious Revolution کے بعد ولیم اور مری تخت نشین ہوئے اور پارلیمنٹ نے ایک قانون حقوق (Bill of Right) نافذ کیا جس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ "کوئی کیتھولک یا جس کی شادی کیتھولک سے ہوئی ہو انگلستان کے تخت شاہی کا حقدار نہیں ہوسکتا۔"

ولیم کے بعد ملکہ این تخت نشین ہوئی وہ بھی انگریزی چرچ کی حامی تھی اور اس کے بعد خاندان ہوذر بھی اسی کا پیرو تھا لہذا انگریزی کلیسا یعنی پروٹسٹنٹ مذہب قومی مذہب ہوگیا۔

اصلاح مذہب سے نہ صرف انگلستان بلکہ ہر پروٹسٹنٹ ملک میں پوپ کا اقتدار زائل ہوگیا۔ گو بعض کیتھولک بادشاہوں نے ملک انگلستان کے پروٹسٹنٹ طبقہ پر زیادتیاں کیں اور اس کو دبانے کی کوشش کی مگر یہ تحریک آگے بڑھتی گئی۔ ملکہ الزبتھ نے اس کو بالکل سیاسی نقطۂ نظر سے ملک کا قومی مذہب بنایا اور اس میں ہر قسم کے طبقہ کو شریک کرنے کی کوشش کی تاکہ اس انگریزی کلیسا کی وجہ سے ملک کو امن حاصل ہوا اور ولیم اور میری کی تخت نشینی کے وقت بادشاہ کے مذہب کے متعلق تصفیہ ہوگیا چنانچہ اب تک بادشاہ اور عہدہ دار بلکہ ملک کی تقریباً سب آبادی اسی مذہب کی پیرو ہے۔ اس کی وجہ سے ملک کی تجارت کو بھی ترقی ہوئی کیونکہ پوپ کا اقتدار باقی نہ رہا تھا کہ مشرق کا ایک ملک کو اجارہ دیدے اور مغرب کا ایک ملک کو اور دنیا کی من مانے تقسیم کرے۔ غرض اصلاح کا انگلستان پر سیاسی معاشی، معاشرتی حیثیتوں سے بہت اچھا اثر پڑا۔

احمد عبدالرشید خان سال سوم

اِلتجا

بہار آئی ہے جانِ بہار آجاؤ
مرے حبیب مرے غمگسار آجاؤ

ہر ایک ذرّہ مسرت سے رقص کرتا ہے
فضا زمانے کی ہے نغمہ بار آجاؤ

میں جانتا ہوں گلہائے رنگ رنگ کے راز
دل اس فریب حسیں کے نثار آجاؤ

سُبک خرام نسیمِ بہار کی سوگند
نہ آزماؤ مرا اعتبار آجاؤ

مری نگاہ سے لازم نہیں حجاب تمہیں
ادا سے جھوم کے مستانہ وار آجاؤ

شفق کے جلوۂ رنگیں میں گنگنائیں گے
وہ آئی شام لبِ جوئبار آجاؤ

ہنسی خوشی کے غنیمت ہیں چند ہی لمحے
مزاجِ وقت کا کیا اعتبار آجاؤ

شراب و شعر بھی تم کو بھلا نہیں سکتے
نفس نفس کو ہے اب انتظار آجاؤ

مجھے بھی عرضِ تمنا کی جرائتیں ہوں نصیب
یہ التجا ہے کہ بس ایک بار آجاؤ

قبول التجا

وہ آئے طور کے جلووں کو شرماتے ہوئے آئے
جہانِ آرزو کو آج گرماتے ہوئے آئے

حیات افزا تبسم جانفزا ہونٹوں پہ رقصاں ہے
ہزاروں بجلیاں رگ رگ میں دوڑاتے ہوئے آئے

فضائیں تیرتی ہیں نغمۂ مدہوش کی موجیں
ربابِ چنگ کے تاروں کو تڑپاتے ہوئے آئے

مجھے بادِ بہاری کی طرب انگیز موجوں میں
گرفتارِ جنوں کرنے کو بہکاتے ہوئے آئے

فضائیں چھاگئیں برق و شرر کے چار سو جلوے
صبا کے دوش پر زلفوں کو بکھراتے ہوئے آئے

کسی نے کہدیا تھا ہوش سے بیزار ہے دنیا
حریمِ ناز کے پردوں کو سرکاتے ہوئے آئے

چمن پابوس ہوتا ہے بہار آنکھیں بچھاتی ہے
ادا سے مسکراتے پھول برساتے ہوئے آئے

مہِ کامل تری بے کیف یہ مے باریاں کب تک
وہ آئے چاندنی راتوں کو شرماتے ہوئے آئے

بہکتے، آہ بھرتے، ہر قدم پر زیر لب ہنستے
فسانہ اُلفتِ رفتہ کا دُہراتے ہوئے آئے

عزیز احمد (عثمانیہ)

غزل کا مطالعہ

وَلی سے لیکر اقبال تک اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ کتنے غزلگو شاعر پیدا ہوئے ہوں گے؟ شعر گوئی کے اتنے طویل زمانے اور شاعروں کی اتنی کثیر تعداد نے اُردو ادب کو کیا چیزیں ودیعت کیں؟ ایک دلچسپ سوال ہے۔ اس سوال کا جواب اُردو ادب کی ایسی مکمل تاریخ دے سکتی ہے جو تنقید کے جدید ترین اصُولوں کے ساتھ لکھی گئی ہو۔ لیکن جب ہم نہ ایسی کوئی تاریخ دیکھتے ہیں اور نہ اس کی طرف اہل ادب کا رجحان پاتے ہیں تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے' اور ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہم اپنی تمام خود سرائیوں کے باوجود میدان ادب میں دوسری قوموں سے بہت پیچھے ہیں۔ فرانس انگلستان اور امریکہ نے سینٹ بی وو' سینٹبری اور امرسن پیدا کیا لیکن ہمارا وطن ابھی غزل کے متعلق جو اُردو شاعری کی اہم ترین صنف ہے' اس جھگڑے میں پڑا ہوا ہے کہ وہ کوئی اچھی صنف ہے یا نہیں؟ ادبی تاریخ کی اس کسمپرسی کے مختلف وجوہات ہیں جنھیں میں چھیڑنا نہیں چاہتا لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے تمام ادبی خدمت گزاروں کے کمالات کی ایک جامع تاریخ لکھیں اور اصولی ترتیب و تدوین کریں' تاکہ اس کے ذریعہ ہمارے اصناف سخن کے متعلق ہم کو ایک مستقل رائے قائم کرنے کا موقعہ حاصل ہو' اور ہم اس ایقان پر آئندہ ترقی کی عمارت کھڑی کر سکیں۔

یہ سوچا جا سکتا ہے کہ غزل کی حد تک کیوں اس کا مربوط اور دقیق مطالبہ نہیں کیا گیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ادبی تاریخ لکھنے' تنقید کرنے اور غزل پر غور و فکر کرنے کا خیال بہت دنوں کا نہیں ہے' اور جب یہ حال میں پیدا ہوا تو ایسے وقت پیدا ہوا جبکہ غزل کی وقعت کو اچھے غزلگو شعراء

موجود ہونے کے باوجود گھٹا دیا گیا تھا۔ اس کا دوسرا اہم جواب یہ ہے کہ غزل کا مطالعہ حقیقتاً ایک مشکل اور پیچیدہ مطالعہ ہے۔ اس کے لئے وقت اور زحمت گوارا کرنا ہماری موجودہ عجلت پسند اور سہل انگار دنیا کو پسند نہیں۔ ہمارے تنقید نگار عموماً انھیں چیزوں پر غور کرتے ہیں جن میں اُن کا دل لگتا ہے، اور جس چیز کی طرف اُن کی طبیعت راغب نہیں ہوتی اسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں یہی نہیں بلکہ سب کی دلچسپیاں ایک سی ہو گئی ہیں۔ موجودہ دور کے رُجحانات زیادہ تر نظم نگاری اور نظم پسندی پر مائل ہیں۔ تنقید نگار بھی اسی مذاق کا ہو گیا ہے، اور غزل پر دل لگا کر کام نہیں کرتا۔

بہ اعتبار تکمیل و تنقید، ہماری غزل ا ہماری شاعری، ایک مشکل صنف ہے، اور اگر یہ ادعا کیا جائے کہ ساری دنیا کی شاعری میں اس کے جیسا (Form) شاید ہی مل سکے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس کا آغاز تو جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے "معشوق سے بات چیت" کے انداز پر ہوا، عام نظریں غزل میں اس سے زیادہ نہ کچھ دیکھتی ہیں اور نہ دیکھنا چاہتی ہیں، لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے۔ جس وقت سے غزل اردو شاعری میں داخل ہوئی اُسی وقت سے اس میں داخلی شاعری کی رُوح کارفرما ہو گئی۔ ہم اس وقت یہ مسئلہ اُٹھا سکتے ہیں کہ غزل داخلی شاعری کی حدود میں داخل ہے یا نہیں؟ اس کا قطعی جواب شاید نہ دیا جا سکے، لیکن غزل گوئی کی نوعیت اور ادبی تاریخ کے اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل گوئی اگر مکمل داخلی شاعری نہیں تو کم از کم اس کی بعض خصوصیتوں کو اپنے اندر جذب کرنے والی ضرور ہے۔ ابتداء سے آج تک غزل کی تنقید میں اس بات کی تحقیق کرنا ضروری ہے کہ غزل گو شاعر کی رسم پرستی، محدودگی، اور خارجی رنگ کے باوجود، اس کے کلام میں وہ داخلی عنصر کتنا ہے جو نفسیاتی نقطۂ نظر سے ہر ذی حس انسان کے دل میں موجود رہتا ہے؟ اگر غزل گوئی ایک مسلسل عمل ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ احساسات، خیال، اور نظر کا ایک مربوط، اور مکمل نقشہ بھی ہے۔ ہندوستانی شاعروں کے جذبات کی ایک نفسیاتی اور مسلسل تاریخ، انسانیت اور آداب کے ایک جُز کی بہت دلآویز تاریخ بن سکتی ہے۔

اگر یہ بحث چھڑ جائے کہ یہ مکمل تاریخ کس طرح مرتب کی جا سکتی ہے تو بات بڑھ جائے گی،

اس لئے مختصراً اتنا کہہ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اگر سینٹ بی وو کے بتائے ہوئے بعض اصولوں کو اختیار کیا جائے گا تو بڑی آسانی ہوگی۔ ان میں سے دو اہم ہیں، ایک تو یہ ہے کہ شاعر کے سوانح، ذاتی رجحانات، اعتقادات اور تعلقات کا جدید علوم کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے، دوسرے ان واقعات کی اس کے کلام سے مطابقت کرنے کی دقیق کوشش کی جائے۔

ایک عام قاعدہ ہے کہ ادبی تاریخ میں ادوار، حصے، اجزا، قائم کئے جاتے ہیں۔ زمان و مکان کے اعتبار سے ممکن ہے یہ ضروری ہو لیکن رفتارِ خیال اور فطرت انسانی کی ہم آہنگی کے اعتبار سے میں ادبی تاریخ کی اس جراحی کا قائل نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے غزل میرے نزدیک اپنی اصلیت، بنیادی اُصول اور تعمیر میں ہمیشہ ایک رہی "معشوق سے بات چیت" کے نظریے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ سودا اور غالب، میر اور حالی، مومن اور اقبال کی غزلگوئی میں فرق ہے لیکن یہ فرق زیادہ تر زبان اور پیرایہ بیان کا ہے، ماہیت خیال کا نہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جدید زمانے میں غزل کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں عشق و عاشقی کے مضامین کے علاوہ، فلسفہ، نفسیات، فطرت پرستی، تصوف، اخلاق، وغیرہ کے مضامین بھی شامل ہوگئے ہیں۔ اگر الفاظ اور اصطلاحات کے تعین سے معنی میں کوئی فرق پیدا ہو سکتا ہے تو خیر، ورنہ میرا خیال یہ ہے کہ ولی اور اقبال کی خیال آرائی فطرت اور زندگی کے میدان میں کچھ زیادہ اختلاف کے ساتھ جلوہ فرما نہیں، فرق روح اور فطرت میں نہیں اسکے قالب اور ظہور میں ہے۔

جب ولی یہ کہتا ہے ۔۔۔

ہر ایک سوں متواضع ہو، سروری یہ ہے　　سنبھال گشتیٔ دل کو، قلندری یہ ہے

اور جب اقبال پکارتا ہے ۔۔۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر　　کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

کیا ان دونوں شعروں میں جذبے کی نوعیت ایک سی نہیں ہے؟ اگر ہے تو پھر ہمارا کیا استدلال ہو سکتا ہے کہ ہم ولی کے جذبے کو خارجی اور اقبال کی آواز کو داخلی ثابت کریں۔ یہ درست ہے کہ

ایک شعر لیکر شاعروں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن میرا کہنا یہ ہے کہ غزل میں قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کر دینا کہ اس کا شعر بغیر جذبے یا احساس کے لکھا جاتا ہے، ایک علمی غلطی ہے۔

سراج کا شعر ہے ؎

آب رواں ہے حاصلِ عمرِ شتاب رو — لوح فنا میں نقش نہیں ہے شباب کا

اور امیر کہتا ہے ؎

عمر برق و شرار ہے دنیا — کتنی بے اعتبار ہے دنیا

غالب صدا دیتا ہے ؎

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ان اشعار میں، خیال کی ہم آہنگی پر اُس کے اسباب اور اثر پر غور کئے بغیر، یہ حکم لگا دینا کہ غزل گو شعرا یکساں اور پامال مضامین باندھ دیتے ہیں اور ان میں زیادہ احساس نہیں ہوتا کوئی درست تنقید نہیں ہوگی۔

غزل میں کسی شاعر کے جذبے سے متعلق صحیح نتیجے پر پہنچنا بہت دشوار ہے۔ اسکی مختلف وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ غزل گو شاعر کا کلام ریزہ خیالی کی وجہ سے جذبات اور احساسات کا ایک منتشر مجموعہ ہوتا ہے۔ اس مجموعے کو ترتیب دینا، خیالات کا تجزیہ کرنا، رجحانات کا علحدہ علحدہ مقام مقرر کرنا بہت مشکل کام ہے۔ دوسری اہم وجہ خود غزل کی نوعیت اور فطرت ہے۔ غزل میں ایک قسم کی رمیدگی، اخفا، اختصار، اور گریز پایا جاتا ہے۔ کبھی تو شاعر کسی خیال کو صاف زبان میں ادا کرتا ہے مثلاً

نہیں آتی تو ان کی یاد برسوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
(حسرت موہانی)

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومن)

کبھی اسے یہ رنگ دیتا ہے ؎

ہے عالم محبت تصویر بے نیازی — اے یاد روئے جاناں ہاں تیری دلنوازی

معشوق کی یاد اور وجود کو شاعر جب راست اور واضح الفاظ کے ذریعے اپنا بناتا ہے تو اس کی تاثیر اور ہوتی ہے، جب اسے ایک پہلودار انداز سے بیان کرتا ہے تو اس کی نوعیت کچھ اور ہوجاتی ہے، ان دونوں صورتوں میں ہمیشہ اس امر کا امکان رہتا ہے کہ نقاد، نوعیت خیال سے زیادہ پیرایۂ بیان کے طلسم میں اسیر ہوجائے کیونکہ غزل میں سب سے بڑا کمال طرز ادا ہے۔

ایک شعر ہے ـــ

بہت ناتواں ہے صدا ساز دل کی　　تجھے اور نزدیک آنا پڑے گا
(وفا)

اس میں رمیدگی، اخفا، اختصار کا جو رنگ ہے، اسے ذوق سلیم بہ آسانی محسوس کرسکتا ہے۔ اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔

جگر کہتا ہے ـــ

ہنسی پھر اُڑنے لگی عشق کے نسانے کی　　نقاب اٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی

تو یہ کس بلیغ انداز سے عشق کے بلند درجہ، اور فضائے زمانہ کی پست خیالی کا مقابلہ کرتا ہے اور دنیائے خطار کا حسن کے ہاتھوں علاج کرنا چاہتا ہے۔ یہ غزل کا ایک شعر ہے مگر اس میں مختلف نظموں کی گنجائش موجود ہے۔ جب یہ اشعار شاعر پر القا ہوئے ہوں گے، اور جب اسکی زبان نے انہیں دنیا والوں پر ظاہر کیا ہوگا تو کیا اسوقت شاعر ایک عالم کیف و تاثر میں نہ ہوگا؟ کیا خبر ہوسکتی ہے کہ ایک جذبہ جو دیوان کے صفحہ اول پر ہے، اور دوسرا جذبہ جو صفحہ آخر پر ہے نفسیاتی نقطۂ نظر سے دراصل شاعر کے ایک واحد خیال کی دو حدیں ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ایسے اشعار کے ذریعے جذبے اور احساس کی وسعت اور حدود کا انکشاف کیا جائے؟

اس کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ غزل گو شاعر کے بہت سے اشعار کبھی اس کے جذبات کے مکمل ترجمان معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کا ایک ذاتی غم، زندگی کا کوئی اہم واقعہ مدتوں تک اس کے دل میں دبا رہتا ہے اور برسوں کے بعد کسی عام شعر کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ نقاد کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اثر اور اس کے اظہار کی اس طویل مدت اور موہوم تعلق کو سمجھ سکے۔

یا اس کی نشاندہی کرسکے کہ فلاں شعر شاعر کی زندگی کے فلاں جذبے یا واقعے سے متعلق ہے۔ نظم میں اتنی رمیدگی نہیں ہوتی، اس لئے نظم کے ذریعہ شاعر کے نقطۂ نظر کا اندازہ کرنا نسبتاً آسان ہوجاتا ہے۔

میں نے ابتک جو بحث کی وہ حسب ذیل تین امور واضح کرنے کے لئے کی ۔

ایک تو یہ کہ غزل کو ابتدا سے انتہا تک ایک تسلسل خیال فرض کرنا ضروری ہے ۔ متقدمین، متاخرین کے جدا جدا دور اور رنگ کا احساس پیدا کرکے ہماری شاعری کے بہتے ہوئے دھارے میں رکاوٹیں نہ پیدا کی جائیں،

دوسرے غزل کے مطالعے کو جدید اصول تنقید پر مبنی رکھنا چاہئے ۔

تیسرے اس پیچیدگی اور دشواری کا اندازہ کئے بغیر فیصلے کردینا صحیح طریقہ استخراج اور استدلال نہیں ہے، کیونکہ غزل کے اشعار اپنی نوعیت کے اعتبار سے نقاد کے لئے ایک "طلسم راز" سے کم نہیں ہوتے ۔

اب میں غزل کی چند اُن خصوصیتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو حالیہ رجحانات شاعری کے ذریعے مشخص کی گئی ہیں۔

غزل کی پہلی خصوصیت اس کا ممتاز وجدانی رنگ ہے ۔ بسا اوقات واقعی اور حقیقت پسند شاعری کی جاتی ہے، کہیں ایک پیامبر، ناصح، مبلغ، مصلح کی حیثیت سے نغمہ سرائی ہوتی ہے، کبھی فلسفہ پیش کیا جاتا ہے؛ غزل میں ایک خاص انداز سے ان سب امور کی روح جاری وساری رہتی ہے لیکن غزل گو کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان پر اپنی بے خودی اور مدہوشی کی اوڑھنی بھی اڑھا دے۔ عریاں شعر، راست خیال، واضح جذبہ، غزل کا عمدہ موضوع نہیں ہے۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے

ایک سادہ اور رواں شعر ہے لیکن اس میں وجدانی رنگ نہیں ۔ اس کے برعکس جدید رجحانات کے اعتبار سے

اصغر کا یہ شعر —

صور و منصور و طور' ارے توبہ ایک ہے تیری بات کا انداز

یا اس زمین میں غالب کا نقش اول —

نہ گل نغمہ ہوں' نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اس لئے غزل کے عمدہ اشعار میں شمار ہوسکتے ہیں کہ ان میں فطرت کے وحدت عمل اور انسان کی شکست رنگین کو بڑے وجدان کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔

فانیؔ کا شعر ہے —

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے' خواب ہے دیوانے کا

بندش اور بے ساختگی کے اعتبار سے یہ اچھا شعر ہے مگر اصغر کے اس شعر کو یقیناً زیادہ پسند کیا جائیگا جو اسی مضمون کا ہے —

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی کچھ خواب ہے' کچھ اصل ہے' کچھ طرزِ ادا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ اس میں وجدان اور بے ساختگی زیادہ ہے۔ دوسرا مصرعہ تو شعر کی جان ہے۔

غزل کی دوسری صفت وسعت خیال اور نظر کی بلندی ہے۔ اس خوبی کا مطالعہ کرتے ہوئے شاعر کے جدا جدا اشعار پر غور کرنا درست نہیں بلکہ بہ حیثیت مجموعی یہ دیکھنا ہے کہ شاعر کے خیال اور اسکی نگاہ کا مقام کیا ہے' وہ کس جگہ پہنچ کر شعر کہتا ہے۔ خیال اور نظر کی متعدد صفتیں ہوسکتی ہیں۔ بلند لطیف' شوخ' رنگین' عمیق' عالمگیر' انفرادی' وغیرہ۔ لیکن ان سب صفتوں میں شاعر کی معراج نظر کا اندازہ لگانا ضروری ہے۔ غالبؔ ایک مقام کا شاعر ہے' داغؔ کسی اور سطح کا۔ اثیرؔ کسی اور بلندی پر ہیں' جگر کی منزل کچھ اور ہے' اقبال کا خیال ہمیشہ آسمانوں کی سیر کرتا ہے' فانیؔ زندگی کی محرومیوں میں گھومتے ہیں۔ اصغر خیال پر روحانیت کے چھینٹے دیتا ہے۔ جوشؔ حسن کے پر لگا کر اڑتے رہتے ہیں۔ یہ گلشن شعر کے مختلف پھول ہیں' اور اپنا جدا جدا رنگ رکھتے ہیں' لیکن ان سب کے پیچھے ان کا "مقام" جھلکتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے غزل کے شعر کو ہم ایک چھوٹا کیمرا (Pinhole Camra)

تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے باریک سوراخ سے شاعر کی شخصیت اور تخیل کی وسیع فضا کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

غزل کی تیسری خصوصیت ایک قسم کی " Indirectness " یعنی بلاواسطہ کیفیت ہے جو باوجود ظاہری ربط و تعلق کے شاعر کو خیال سے بلند رکھتی ہے۔ غزل کا عمدہ شعر وہ ہے جو اپنی رمیدگی، اختصار اور اخفا کے ساتھ ساتھ شاعر کو اس میں پوری طرح سمویا ہوا نہیں بلکہ اس سے بلند تر رکھے۔ جس خیال میں شاعر پوری طرح سما جائے اور یہ معلوم ہو کہ اس نے اپنے لئے ایک زنداں پیدا کر لیا ہے، اور اس خیال کی حد بندی سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو وہ خیال نسبتاً کم درجہ رکھے گا۔

امیر کہتے ہیں ۔

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں مٹا ہوا سا نشان سر مزار ہوں میں

اس شعر میں خیال کا تعین اسے محدود کر رہا ہے۔ پھر دوسرے شعر میں کہتے ہیں۔

ے پڑا ہے دستِ اجل مجھ پہ لاکھ بار مگر نکل گیا ہوں تڑپ کر وہ بے قرار ہوں میں

اس میں خیال کی زیادہ وسعت اور عدم تحدید ہے۔

فانیؔ اپنے متعلق کہتے ہیں :-

ہوں مگر کیا، یہ کچھ نہیں معلوم میری ہستی ہے غیب کی آواز

اس میں امیر سے زیادہ آزادی اور وسعت ہے۔

اقبال انسان کو اس کی نگاہ بلکہ خود اس کے وجود کے لئے یہ منظر دکھاتے ہیں ۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں!

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" کا یہ منظر غور کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس پر عشق کے امتحان کا اضافہ!

ان مثالوں سے آپ پر خیال کی تحدید اور عدم تحدید کا ایک نقشہ واضح ہو گیا ہوگا۔ جدید اصولوں کے اعتبار سے شاعروں کو اشارے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاعری کسی بات کا ایک اشارہ ایک تحریک ہوتی ہے خصوصاً غزل کا شعر۔

غزل کی آخری صفت جو یہاں قابل بیان ہے وہ اسکی "غنائیت" ہے۔ غزل گو کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ وہ اپنے خیال اور بیان دونوں میں ایک قسم کا ترنم رکھے "خیال کا ترنم" سمجھنا قدرے دشوار ہے۔ جملہ آرٹ کا موضوع حسن ومسرت ہے۔ اگر اس کی پابندی کی جائے تو خیال خوبصورت ہو جاتا ہے لیکن غزل گو کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ اس کے حسن پر ترنم کا بھی اضافہ کرے۔ وفا کا شعر ہے ــــ

ترا عشق، اور اس قدر درد ہلکا! ذرا غم کی لے کو بڑھانا پڑے گا

جگر کہتے ہیں ــــ

قفس کے سامنے بجلی کچھ اسطرح چمکی نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی

اصغر کا شعر ہے ــــ

آلامِ روزگار کو آساں بنادیا جو غم ہوا، اُسے غمِ جاناں بنادیا

پہلے شعر میں "غم کی لے کا بڑھانا" دوسرے میں "آشیانے کی تصویر" تیسرے شعر میں "غم جاناں بنادیا" کا ٹکڑا ترنم خیال ظاہر کر رہا ہے۔ بغیر موسیقیت کے غزل ایک بے جان لاش ہے۔ آجکل غزل کا لکھنا اسی لئے دشوار ہے کہ شاعر کے دماغ پر علوم وفنون کی ترقی اور مغرب ومشرق کے اثرات کے ساتھ ساتھ آرٹ کے جدید رجحانات کا بھی دباؤ پڑ رہا ہے۔ اس وقت شاعرانہ خیالات خود بخود لطیف اور وسیع ہوتے جارہے ہیں، جس قدر ان میں وسعت ہو رہی ہے اسی قدر "اسلوب بیان" کی حد تک شاعر کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، کاش یہ محسوس کی جائیں!

حالات کے اعتبار سے یہ بھی ضروری ہے کہ غزل کے اوزان اور بحروں میں کچھ تبدیلی ہونی چاہئے۔ ابتدائی زمانے میں اس قسم کے نمونے ملتے ہیں۔ مثلاً سراج کے ہاں ایک عجیب مستزاد ہے ـــ

تجھ زلف کی یہ باس کہ جب سے ختن میں ہے نافۂ آہو، پُرمشک خطا ہیں

ہر غنچۂ دل تنگ ہوا پھول چمن میں اے شوخ سمن بو تجھ رخ کی ہوا میں

ہو خار سا اس کی پلک تجھ کف پا کوں ہے تجھ میں نزاکت از بسکہ سراپا

جس وقت رکھے پاؤں تو ن بلبل کے نین میں اے دلبر گلرو اس ناز و ادا ہیں

یہاں تک تو غزل کی صفات کا ذکر تھا اب اس طرح بھی غور کرلینا ہے کہ جدید شاعری کی وسیع تر فضا میں غزل پر اور کیا اثرات پڑ رہے ہیں؟

آج کل یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شاعر کے تصورات اور نگاہ باطن کے پیچھے زندگی اور کائنات کی ایک ذہنی تصویر ہونی چاہیئے۔ جب تک شعر کے پیچھے رنگ نہو، کوئی پس منظر نہو، شعر "وسیع خلا میں پیر مارنے" تک کے برابر ہو جاتا ہے۔ اس "ذہنی تصویر" کی شیکسپیر نے نہایت خوبی سے وضاحت کی ہے ـــ وہ کہتا ہے ـــ

"شاعر کی آنکھ، ایک عمدہ اور دیوانہ وار گردش میں
آسمان سے زمین، اور زمین سے آسمان پر نظر دوڑاتی ہے
اور جب تخیل، ان چیزوں کو جو نا معلوم ہیں مشخص اور متعین
کرتا ہے، اس وقت شاعر کا قلم انھیں ایک شکل و نمود
بخشتا اور ایک ہوائی نہیں کو ایک مقام اور نام عطا کرتا ہے"

ان سنہری الفاظ میں شاعری کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس سے بہتر ممکن نہیں ہے۔ غزل میں شاعر کی آنکھ کے لئے "زمین و آسمان کی دیوانہ وار گردش" لازمی ہے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ موجودہ غزل، اقتضائے حال کے مطابق حقیقت پرستی، اور نفسیاتی مطالعہ پر مبنی تو نہیں، لیکن اس کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ شاعری حقائق کی تلاش کا نام ہے اور غزل

حقائق کا نغمہ ہے۔ شاعری نفس انسانی اور جذبات کی ترجمانی ہے' غزل جذبات کا گیت" ہوتی ہے"
اگر ہم غزل کا نام" جذبات کا گیت" ہی رکھدیں تو بہت مناسب ہوگا۔

تیسری صورت غزل میں آزادی خیال کی ہے۔ موجودہ دور حریت پسندی کا دور ہے۔
آزادی کی اس دوڑ میں موجودہ انسان زماں و مکاں سے آگے ہو جاتا اور خدا سے شوخیاں کرنے لگتا
ہے۔

بعض قدیم مشرب کے لوگ غزل کو تغزل محض سے تعبیر کرتے ہیں' لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے
صرف حسن وعشق کی باتوں سے موجودہ غزل کا معیار بلند نہیں ہوتا۔ ولی' سودا' میر' انشا' مومن' داغ
امیر' غالب سبھی نے' غزل میں اپنے تخئیل کو محبت کی دنیا میں محصور نہیں رکھا۔ جیسے جیسے حالات موافق
ہوتے گئے" تصورات اور مشاہدات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ غزل کو
"نغمہ کائنات" بنادیا جائے۔ اسکی فطری نوعیت' اس کا ہر انوکھا سانچہ' اسکی نرالی طرز ادا اس امر کی
متقاضی ہے کہ غزل کو معراج کمال پر پہنچا دیا جائے۔

رازِ درونِ سینہ ام' نغمۂ کائنات گشت رفت بہ ہر ربابِ نے' نالۂ دل گدازِ من

عبدالقیوم خان باقی ام۔ اے
لکچرار ادبیات اُردو

رباعی

تو نے کس کس دل کو دکھایا ہے تجھے کیا معلوم
کس صنم خانہ کو ڈھایا ہے تجھے کیا معلوم
ہم نے ہنس ہنس کے تیری بزم میں اے پیکر ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

مخدوم محی الدین

کون!

تجلیات کے پردے اٹھا رہا ہے کون!
یہ میری روح کو مضطر بنا رہا ہے کون!
دل و دماغ پہ میرے یہ چھا رہا ہے کون!
تصورات کی دنیا بسا رہا ہے کون!
حیاتِ نو کے یہ نغمات گا رہا ہے کون!
جہانِ نو میں یہ مجھ کو بلا رہا ہے کون!
شراب و شعر کی ہیں مستیاں فضاؤں میں
یہ بادۂ مئے الفت لنڈھا رہا ہے کون!
یہ کس کے فیضِ تبسم سے ہنس رہا ہے جہاں!
حسیں کنول کی طرح مسکرا رہا ہے کون!
سہانی رات ہے اور مسکراتی ہے دنیا
جہاں سے درد و الم کو مٹا رہا ہے کون!

ہر ایک چیز پہ اک بیخودی سی طاری ہے
شراب حسن سے بیخود بنا رہا ہے کون!
بھڑک رہی ہے مرے دل میں آگ الفت کی
سہانے، عشق کے نغمات گا رہا ہے کون!
فضائیں کوندرہی ہیں یہ بجلیاں کیسی
رخِ مبیں سے یہ گیسو ہٹا رہا ہے کون!
حریم ناز سے اُٹھ کر یہ آ رہا ہے کون!
یہ کائنات کو رنگیں بنا رہا ہے کون!
جمالِ طور کا منظر ہے میری نظروں میں
نقاب رخ سے اُلٹ کر یہ آرہا ہے کون!
یہ کائنات ہے مسرور کس لئے نیّر
مسرتوں کا خزانہ لٹا رہا ہے کون!

محمد علی نیّر بی۔اے (ابتدائی)

مولانا محمد علیؒ کی شاعری

مولانا محمد علیؒ ، بلاشبہ سیاسیات کے مردِ میدان تھے۔ ان کی سیاست سے ہندوستان نے عموماً اور مسلمانوں نے خصوصاً بڑا فائدہ اُٹھایا۔ جنگ آزادی کے وہ بہت بڑے سپہ سالار تھے سیاست ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ ہندوستان کو مکمل آزادی دلانا اور انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانا ان کا واحد مقصدِ حیات تھا۔ اس کے لئے وہ جئے اور اسی جدوجہد میں انہوں نے اپنی آخری سانس لی۔

مولانا محمد علیؒ کی یہی عام تصویر ہے جو ان کے نام کے ساتھ سامعین یا قارئین کے تخیل میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن کم لوگ ہیں جو ان کی دوسری صفات سے واقفیت رکھتے ہوں۔ وہ بڑے جامع صفات آدمی تھے۔ سیاست، صحافت، خطابت، مذہب اور ادب یہ سب چیزیں انکی ذات میں عجیب طرح گھل مل گئی تھیں۔ مذہب اور خصوصاً اسلام جس کے وہ سچے پرستار اور بے مثل فدائی تھے، انکی زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز تھا۔ انگریزی زبان پر ان کی قدرت مسلم ہے اور، کامریڈ کے مضامین اس کے شاہد عادل ہیں۔ میکبتھ اور اوتھیلو وغیرہ پر ان کی تنقیدیں انکے صحیح اور پاکیزہ ادبی ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔ ہمدرد کے مضامین اور مقالوں کے لئے اردو زبان ان کی ممنون ہے۔ لیکن ان کی عظیم الشان سیاسی خدمات نے ان تمام چیزوں کو پس پشت ڈالدیا ہے اور آج لوگ محمد علیؒ کو ایک بہت بڑے سیاسی قائد اور رہنما ہی کی حیثیت سے یاد رکھتے ہیں۔

بعض تصانیف اور کتابیں دنیا میں محض اس لئے زندہ رہتی ہیں کہ ان کے لکھنے والے بڑے آدمی تھے۔ ایسی کتابوں کا مطالعہ صرف اسی لئے کیا جاتا ہے کہ ایک بڑے آدمی کے

خیالات معلوم کئے جائیں ۔ ان کتابوں کو اگر یہ عزت حاصل نہ ہوتی تو وہ کبھی کی ناپید ہوجاتیں اور کوئی ان کا نام تک نہ لیتا ۔ لیکن جوہر کی شاعری کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کرنا ، ادب ناشناسی ہے ۔ جوہر کی شاعری میں بذات خود ایسے بہت سے جوہر ہیں جو اردو ادب میں اپنی مستقل جگہ پیدا کرنے کے دعویدار ہیں ۔ محمد علیؒ اگر سیاسی رہنما نہ بھی ہوتے تو ان کا کلام شوق سے پڑھا جاتا اور اردو ادب میں یادگار رہتا ۔

جوہر کی شاعری پیشہ ورانہ شاعری نہیں ، محض تفنن طبع کا بھی نتیجہ نہیں ، اور نہ ہی آورد کے بل پر عالم وجود میں آئی ۔ جوہر کی شاعری ایک حساس دل کی پکار ، ایک دردمند اور دلفگار قلب کی دھڑکن اور ایک چشم گریاں کے بہتے ہوئے آنسو ہیں ۔ درد و اضطراب کے وہ نالے اور وہ آہیں ہیں جنھوں نے بے اختیار زبان قلم سے نکل کر اشعار کی صورت اختیار کرلی ہے ۔ اس کے لئے انہیں نہ ستائش کی تمنا ہے اور نہ نفریں کا ڈر ۔ جو دل میں ہوتا ہے بے تکلف نکل پڑتا ہے ۔ شروع سے آخر تک کلام جوہر کا مطالعہ کرجایئے کہیں آورد کا نام نہیں ۔ دل کے گھٹے ہوئے جذبات ہیں کہ نوک قلم سے نکلے پڑتے ہیں اور ان میں جوہر کا دل تڑپتا نظر آتا ہے ۔ اس سے خود انہیں ایک گونہ تسکین ہوتی ہے اور ان کا دل ہلکا ہوجاتا ہے ۔ جیل میں نظربندی کے زمانے میں ، قرآن کریم کی تلاوت کے بعد اگر کسی چیز سے انہیں تسکین ہوتی ہے تو یہی شاعری ہے ۔ گو خود جوہر اسے اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لئے بتاتے ہیں ، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اسی تڑپ کا لٹریچر سے بڑا گہرا تعلق ہے ۔

جوہر کی شاعری رسمی شاعری نہیں ۔ ان کی شاعری تین عناصر کا ایک عجیب خوش گوار امتزاج ہے ، سیاست ، مذہب اور محبت ۔ محمد علیؒ نے جس وقت ہوش سنبھالا ہے ، اجڑی دلی کے آسمان کے آخری ستارے رام پور کے افق سے نور برسا رہے تھے ۔ داغؔ جیسا اُستادِ سخن اور خدائے زباں رام پور میں داد شعر وسخن دے رہا تھا ، کم عمری میں جوہر اس جہاں استاد کی خدمت میں اکثر باریاب ہوا کرتے تھے ، خود فرماتے ہیں " میں نہ صرف شعر وسخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں اسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار رہا ہوں " داغ کی زبان اور شاعری کا اثر جوہر کی شاعری پر پڑنا ضرور تھا ، بعض مقامات پر یہ رنگ نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے ۔

گلہ اے دل ابھی سے کرتا ہے عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے
قلزمِ عشق میں گرا سو گرا اس کا ڈوبا نہیں ابھرتا ہے
وہی دن ہے ہماری عید کا دن جو تری یاد میں گذرتا ہے

سن بھی لیتا ہے حالِ دل وہ شوخ آتے ہیں ڈھنگ مگر ستانے کے
تجھ سے سیکھے کوئی ستم ایجاد طرز عشاق کے ستانے کے
نارِ نمرود اک یہی نہ سہی سو طریقے ہیں دل جلانے کے

جوہر کو اسلام اور حضرت سرور کائناتؐ (اُمی وابی وروحی فداک) کی ذاتِ اقدس سے سچا عشق تھا، وہ پہلے مسلمان تھے اس کے بعد سب کچھ، پہلے وہ محمدؐ کے فدائی تھے اور بعد میں سیاسی، وہ سُنتِ نبوی کے متبع تھے اور اسی کو اپنے لئے باعث صد فخر سمجھتے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ ان میں اور ترقی کرتا گیا، اور وائٹ ہال میں جب گول میز کانفرنس کے اجلاس کے دوران میں نماز کا وقت آگیا تو لوگوں نے ایک ہی مجاہدِ حق کو دیکھا جو قبلہ رو ہوکر زمین بوس ہو رہا تھا۔ قبلۂ عشاق مدینہ منورہ کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی تو دین مصطفےٰ کے دیوانے کے دل سے دربار نبویؐ میں جذب وکیف کے عالم میں ہدیۂ نیاز پیش ہوتا ہے۔

سنگِ در تک تو بہر کیف رسائی بخشی دیکھوں کیا کیا مرے سرکار کو منظور ہے آج
رقصِ بسمل کی ذرا دیر اجازت دیجے حسن مسئول نہیں عشق بھی مجبور ہے آج
عشق خود بدعت وسرمایۂ صد بدعت ہے رحم کر رحم کہ عاشق ترا بیمار ہے آج

ایک غزل کا مقطع ہے ؎

نہیں معلوم کیا ہو حشر جوہر کا پر اتنا ہے کہ ہاں نام محمدؐ مرتے دم وردِ زباں پایا

ایک اور غزل کا شعر ہے ؎

کیوں اپنے نبیؐ پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لئے ہے

حضرات اہل بیتؓ اور خصوصاً حضرت حسینؓ سے جوہر کو بڑی عقیدت تھی۔ سیاسی جدوجہد اور حق کی لڑائی میں وہ حضرت حسینؓ کو اپنا امام سمجھتے ہیں۔ متعدد اشعار میں انہوں نے حضرت حسینؓ کی خدمت میں اپنی نذر عقیدت پیش کی ہے۔

پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؓ کو خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لئے ہے

اور یہ شعر توبقول مولانا عبدالماجد، اُردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؎

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

شکرِ حق ہے کہ ابھی حق کی حمایت کے لئے جان دینے کو ہیں موجود غلامانِ حسینؓ

رمضان کا مہینہ مسلمانوں کے پاس بڑا خیر و برکت کا مہینہ ہے، تمام رحمتوں اور برکتوں کا اس مہینہ میں نزول ہوتا ہے۔ اہل دل اور صاحب ایمان بزرگوں کو رمضان کے روزوں اور اس کی نمازوں میں ایک خاص کیف محسوس ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی زبان سے اس تاثر کی کیفیت سنئے۔۔۔۔

"اسی اثنا میں رمضان المبارک کی برکات و نصائم کا ورود ہوا۔۔۔۔۔ اس کے بعد ہی مقام خلوت و انزوا کی کیفیتوں اور انجمن در خلوت کی خود رفتگیوں کا عالم کچھ اس طرح طاری ہوا کہ دنیا جہاں کی ساری صحبتوں اور انجمنوں سے دل بے پروا ہو گیا۔ علی الخصوص عشرۂ اخیرہ کی شبہائے تمنا اور روزہائے انتظار کی بخششوں اور کامرانیوں سے دل نے جو جو سعادتیں اور چشم و گوش نے لطف دید و ذوق سماع کی جو جو دولتیں لوٹیں، نہ دنیا کی کوئی زبان ان کی ترجمانی کر سکتی ہے نہ سامعہ استقرار سماع رکھتا ہے۔ البتہ حسرت رہی تو یہ رہی کہ کاش پوری زندگی کی وسعت کسی طرح ان دس راتوں میں آجاتی اور ساری عمر اسی عالم میں بسر کر جاتے۔

شب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

جب اس مہینے کے رخصت کا وقت آتا ہے تو ان برکتوں اور سعادتوں سے فیض یاب ہونے والے تڑپ جاتے ہیں، چنانچہ اسی تڑپ کے ساتھ جوہر رمضان کو وداع کرتے ہیں ؎

تجھ سے تھیں وابستہ امیدیں تمام دافع صد یاس و حرماں الوداع
کارواں خیر و برکت چلدیا رہ گئے سب دل میں ارماں الوداع
شدت غم سے زباں گر بند ہے تو ہی کہدے چشم گریاں الوداع

آخری شعر تو شاعرانہ فن کاری اور مصوری کا ایک بے مثل نمونہ ہے۔ شدت غم سے جب زبان گنگ ہوجاتی ہے، منہ سے بات نہیں نکلتی، چشم گریاں سے جانے والے کو الوداع کہنا، یاس وحسرت اور انتہائی غم والم کو مجسم کر دکھانا ہے!

منصور حلاج کی تلمیح جوہر کو خود اپنی طبیعت کے لحاظ سے بہت پسند تھی۔ راہ حق میں تکلیف اٹھانا، جان، مال اور عزت، غرض ہر قسم کی قربانی کرنا، محمد علیؒ کا حصہ تھا۔ بغیر قربانی کے نہ کوئی قوم بنی ہے اور نہ کبھی بنے گی۔ سب کچھ قربان کردینے کے بعد بہت کچھ حاصل ہوتا ہے! حق و صداقت کے لئے مٹنے والے جوہر نے اس تلمیح کو نئے نئے اور اچھوتے انداز میں باندھا ہے اور اردو ادبیات میں قصۂ دار و رسن کو ایک نئی شان کے ساتھ زندہ کردیا ہے

جوہر نہ کیوں یہ رسم کہن زندہ کر چلیں دار و رسن کے گرچہ نہوں بانیوں میں ہم

ملتی نہیں کسی کو سند امتحاں بغیر دار و رسن کے حلم کو سمجھو صلائے دوست

یہ بھی کیا پیروی حق ہے کہ خاموش ہیں سب ہاں انا الحق بھی ہو، منصور بھی ہو دار بھی ہو

سنتے ہیں یہ بھی ایک بزرگوں کی رسم تھی اس دور اعتدال میں دار و رسن کہاں

سن لیجے خلوتوں میں انا الحق کا ادعاء سولی پہ چڑھ سکے وہ نعرہ زن کہاں

ہے رشک کوں یہ ہم کو سردار دیکھ کر "دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

"آپ فرمائیں گے، کیا خوب مصرعہ لگایا ہے، یہ خاکسار عرض کرے گا، کیا خوب اظہار حقیقت کردیا ہے !"

جوہر کا دل عشق و محبت کا خزینہ تھا، عزیزوں اور دوستوں سے ان کی محبت قابل رشک تھی ۔" لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار تھیں، چاروں جان و دل سے بڑھ کر محبوب ۔ جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان، بیاہی ہوئی، آمنہ دق میں مبتلا ہوئی ۔ جو دوسروں کی اولاد کے لئے تڑپ جاتے والا تھا، خود اپنی نازوں کی پالی لخت جگر کے لئے یہ خبر سن کر کیا کچھ نہ پھڑ پھڑایا ہوگا ! دل پر کیا کچھ نہ بیت رہی ہوگی ! بیٹی سے عالم خیال میں کہتے تھے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

دوا درمن کی انتہائی تدبیریں تو عزیب بے حوصلہ والدین بھی کر ڈالتے ہیں، پھر وہ باپ جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا ہو، وہ شکل تک دیکھنے سے مجبور !

امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا جو ہر ایک حال میں امید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے اور اپنی نور نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ، رو رو کر اور گڑ گڑا گڑ گڑا کر عرض معروض کرنے لگ جاتے ہیں ؎

تو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے قرآں میں کیا تخرج الحی من المیت مذکور نہیں
تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

اب اس کے بعد جو شعر ہے، اس کے پڑھنے سے پہلے، اولاد رکھنے والے کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اللہ اللہ ! جیل سے نکلے تو جسے گودوں میں کھلایا تھا، اسے قبر میں بھی اتارا !"

محمد علی چھندرواڑہ جیل میں نظر بند تھے، یک بیک خبر پہنچی کہ غلام حسین چل بسے "کون غلام حسین؟

کامریڈ کی ایڈیٹری میں محمد علی کے دست و بازو، انگریزی کے زبردست انشا پرداز۔ کامریڈ کے بند ہوجانے کے بعد نیو ایرا کے ایڈیٹر۔ اچھے خاصے جوان تندرست۔ سرِ شام لکھنؤ میں، ایک پبلک جلسے سے چلے آرہے تھے کہ قضا نے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آکر ٹکر دی، اور یہ رونق صحافت و سیاست رخصت! محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے تو نالۂ موزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین	کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے	ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے
اے مرے رند، بادۂ حق کے	ابھی دو چار خم پیئے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی	کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ	ساتھ ہم کو بھی گر لئے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی ہے۔ شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کسی قسم کی تیاری، نہ کوئی اہتمام، کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور و فکر، نہ اصلاح نہ ترمیم، بس جو دل میں آگیا جھٹ کہہ گزرے۔ یہی حال نثر کا ہے، یہی حال نظم کا ـــــ"

تسلیم و رضا جوہر کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے، سعدی "رضائے خود مطلب تا رضائے دوست" کے مصداق وہ ہمیشہ رضائے دوست کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ بلا از دوست عطاست، و از عطا نالیدن خطاست، شکایت بہت کم زبان پر آتی ہے۔ دوست کی ظلم پروری، دوست کی بے مہری اور جفا شعاری کو وہ اپنے لئے باعث صد رحمت سمجھتے ہیں، راضی بہ رضا رہتے ہیں اور دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھتے ہیں ؎

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزہ دیکھ	دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ
ہے سنت ارباب وفا صبر و توکل	چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامان رضا دیکھ

جورِ بے جا کا نشانہ بنے اور آزمائش دوست کے لئے منتخب ہونے پر اپنے آپ کو مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں ؎

دلا خوش ہو نشانہ ہے اگر تو جورِ بے جا کا　　یہ کیا کم ہے کہ تجھ کو مستحقِ امتحان پایا

طغرائے امتیاز ہے خود ابتلائے دوست　　اس کے بڑے نصیب جسے آزمائے دوست

وفاداری بشرطِ استواری ان کے پاس عین ایمان ہے ؎

چیز ہی ایسی وہ کیا ہے کہ رکھیں جان دریغ　　کیا اب اتنا بھی نہ ہو پاس وفاداری کا!

رونمائی کے لئے وہ نقدِ جان لاتے ہیں، لیکن پھر بھی اپنی کم مایگی کا انہیں احساس ہے، ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں ؎

رونمائی کے لئے لایا ہوں جاں　　شاید اب تو چہرۂ انور کھلے!

شعر کیا ہے، فداکاری، جاں سپاری اور فدائیت کی بے مثل تصویر ہے!

جنس گراں تو تھی نہیں کوئی مگر یہ جاں　　لائے ہیں ہم بھی رونق بازار دیکھ کر

نقدِ جاں نذر کرو دیکھتے کیا ہو جو ہر　　کام کرنے کا یہی ہے تمھیں کرنا ہے یہی

غمِ جاناں کو وہ اپنا عزیز ترین مہمان سمجھتے ہیں، اور مہمان کی شکایت کرنا آدابِ محبت و مروت کے خلاف ہے ؎

ہرگز نہ ہوا سے دل غمِ جاناں کی شکایت　　کرتا ہے بھلا کوئی بھی مہماں کی شکایت

شبِ ہجراں کی بھی شکایت کرتے ہوئے انہیں لاج آتی ہے کہ ؎

وہ یہ نہ کہیں گے کہ تمھیں موت نہ آئی　　کس منہ سے کریں ہم شبِ ہجراں کی شکایت

حاصلِ عمر نثار رہ یار کرنے کے بعد بھی وہ خوش نہیں ہوتے اور سمجھتے ہیں کہ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے ؎

میں کھو کے تری راہ میں سب دولتِ دنیا سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہو

اپنی شاعری کے سلسلے میں مولانا نے لکھا تھا "کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدانِ اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوقِ نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی، تاہم طبیعت کا میلان خلافِ دستورِ عام زہد و ورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا دو برس کسی اور کے خیال نے، مگر یہ آخری خیال بھی با عصمت تھا...."

"کسی اور" کے با عصمت خیال کے چند نمونے بھی دیکھتے چلئے ؎

زلف رہنے دو نقاب ذرا رخ محبوب سے ہٹا لینا
آج جی بھر کے دیکھ لینے دو کل گو دل کھول کر ستا لینا

قیدِ گیسو سے بھلا کون رہے گا آزاد تیری زلفوں کا جو شانوں پہ بکھرنا ہی سہی

تجھ سے دردِ ہجر کہتا کون، کس کی تھی مجال فتنۂ صد حشر خوابیدہ تری چتون میں تھا

عشق کی تعریف میں سینکڑوں شعرا نے ہزاروں شعر لکھے ہیں، عشق کی تشریح، توضیح، اور تحمید میں ہر ایک نے اپنے اپنے رنگ میں بہت کہا ہے۔ جوہر کا یہ شعر دیکھئے، ہزاروں اشعار اور سینکڑوں دیوان نثار ہوئے جاتے ہیں ؎

عشق ہی باعثِ تکوینِ جہاں ہے غافل تو نے سمجھا ہے کہ اک شغل ہے بے کاری کا!

عشق کی اس سے بڑھ کر تعریف نہیں کی جا سکتی کہ پوری کائنات کا مدار اسی جذبہ شریف و لطیف پر ہے۔ "باعثِ تکوینِ جہاں" کہہ کر جوہر نے اسے اُردو کے ضرب المثل نشتروں میں داخل کر دیا ہے۔

عشقِ مجازی کے بعد، جب عشقِ حقیقی کا چسکا لگا تو عالم ہی اور تھا۔ بقول مولانا عبدالماجد، لوہا تپ کر، دہک کر، لال انگارہ بن جائے تو لوہا باقی ہی کب رہ جاتا ہے۔ جوہر اب عالمِ معانی و حقائق کی سیر کر رہے تھے، ان کی شاعری الفاظ و حروف کی اب کہاں رہ گئی تھی، تنہائی کے سب دن تھے

تنہائی کی سب راتیں تھیں، ہر آن تسلی تھی، ہر لحظہ تشفی ہے

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں　　اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے ہر آن تشفی ہے　　ہر وقت ہے دل جوئی ہر دم ہیں مداراتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت　　اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں　　بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

اسی وجد و کیف کے عالم میں دیکھئے عشق و محبت، سرمستی و سرشاری کے کیسے کیسے جام عنایت ہوتے ہیں ہے

ہے روح بھی نثار، بدن بھی نثار یار　　دل بھی فدائے دوست، جگر بھی فدائے دوست
کیا جائیں کوئے یار میں یوں اذنِ غیر سے　　ہے انتظار، دیکھئے کب تک بلائے دوست

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو　　باقی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

اک تو جو مہرباں ہو تو ہر اک ہو مہرباں　　اور یوں نہ ہو بلا سے کوئی مہرباں نہ ہو
ہم کو تو ایک تجھ سے دو عالم میں ہے غرض　　سب بدگماں ہوا کریں تو بدگماں نہ ہو
اس دردِ لاجواب کی کیونکر کروں دوا　　وہ حال دلنشیں بھی تو مجھ سے بیاں نہ ہو

ترا وہ مبتلا ناکام سمجھا جس کو دنیا نے　　اسی کو سرخرو دیکھا اسی کو کامراں پایا

اہل خرد سرگشتہ و حیراں پھرا کرتے ہیں، لیکن کچھ حاصل نہیں ہوتا، اہل جنوں ایک آہ رسا کھینچتے ہیں اور دونوں عالموں کی منزلیں طے کر جاتے ہیں، اسی لئے جوہر کہتے ہیں ہے

عقل کو ہم نے کیا نذر جنوں　　عمر بھر میں یہی دانائی کی

قربان جائیے اس عقل کے اور اس صاحب خرد کے جس نے اپنی عقل جنوں کے حوالے کردی، شعر نہیں

اسرار اور رموزِ محبت کا ایک بے پایاں سمندر ہے !

جوہر کی شاعری ایک تاثر خاص کا نتیجہ تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اشعار سوز و گداز، تڑپ و بے چینی، دل گرفتگی اور حرماں نصیبی کے مرقع ہیں ۔ غلط نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ان کی شاعری کا عام رنگ ہی یہی ہے ۔ ذیل کے اشعار کیا ہیں، سوزِ نہانی اور نیش دروں کے جلتے ہوئے انگارے ہیں ؎

شانِ رحمت مجھے دکھلا کہ ہو تسکین کا نزول　　دلِ جوہر ہے یہ یارب جبل طور نہیں!

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش　　تھی راتِ یاس اور دلِ ناصبور تھا

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو　　مگر اے ہم نفس دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے

نہیں معلوم آئی تھی یہ حیا کم بخت کو کس سے　　کہ حسرت نے مرے داماں میں آ کے منہ ڈھانکا

ہم اس کی راہ میں مرنے کی دیکھتے رہے راہ　　ذرا سا کام تھا، وہ بھی اجل سے ہو نہ سکا

ہم نے دل بھر کے کچھ اس طرح نکالے ارماں　　کہ پھٹکتا نہیں دل جا کے اب ارماں کے پاس

طاقت پرواز ہی جب کھو چکے　　پھر ہوا کیا گر ہوئے بھی پر کھلے
چاک کر سینہ کو پہلو چیر ڈال　　یوں ہی کچھ حال دل مضطر کھلے!

اگلی سی اب وہ زعم کی طغیانیاں کہاں　　شب بھر میں کیا بھری ہوئی ندی اتر گئی

شاید کہ آج حسرت جوہر نکل گئی
اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

خود ہی بیٹھے ہیں یاں تو اٹھنے کو
اب گئے دن وہ ناز اٹھانے کے

کبھی جوہر کے پہلو میں بھی آتش فشاں دل تھا
پر اب کی بار جو دیکھا تو یوں ہی سا دھواں پایا

ذکاوت اور ذہانت کو مجسم اگر کسی نے دیکھا ہے تو وہ محمد علی کی ذات تھی ۔ ان کی ذکاوت و ذ
کی سینکڑوں داستانیں لوگوں کو اب تک یاد ہیں ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے ذہن میں کوئی موزو ر
آتا اور وہ چپت کرنے سے باز نہ رہتے' چست کرتے اور خوب چپت کرتے اور بعض اوقات
بھی مزے لیتا جس پر ایسی پھبتیاں چست کی گئی ہوں ۔ ان کی شاعری میں بھی اس کی مثالیں ملتی
اگرچہ بعض اوقات اس کے پیچھے ان کا وہی سوز دروں کارفرما رہتا ہے جو طنز کی انتہائی صو
اختیار کرلیتا ہے ؎

قید میں اور اتنی بے باکی
سب یہ لچھن ہیں مار کھانے

خوف غماز' عدالت کا خطر' دار کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

سب کی ہو کر نہ رہی ایک کی تو اے دنیا
کون گرویدہ ہو تجھ سی زنِ بازاری کا

"جوہر کو معلوم تھا کہ ان کی غفلت شعار امت ان کے بعد ہی ان کے جوہر پہچانے گی ۔ او
یہ نعمت عظمیٰ چھین لی جائے گی تو ان کے لئے زمانے میں ماتم بپا ہو جائے گا ۔ موت بھی کر
نصیب ہوگی ۔ میدانِ سیاست کا مردِ مجاہد آخری وقت تک اپنا فریضہ انجام دیتا ہوا' و

سینکڑوں میل دور، سات سمندر پار، یہ کہہ کر کہ "آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا یا اپنی جان اسی سرزمین میں دے کر...." اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دے گا۔ یہ شاعرانہ تعلی نہ تھی!" مالک نے بندہ کی لاج رکھ لی، جنوری ۱۹۳۱ء کی پانچویں اور شعبان ۱۳۵۰ھ کی بدر ہونی شب میں عین اس وقت، جب روئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی اقبال کی، زندگی کی، مغفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے، مشیت الٰہی نے یہ نعمت عظمیٰ دنیائے اسلام سے واپس لے لی! ... شاید اس لئے کہ اس کے ہم قوم اور ہم وطن اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے تھے! آزادی، محمد علیؒ کے ملک کو کیا ملتی، محمد علیؒ کی روح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا لوٹا ہوا دل، ہزاروں داغ کھایا ہوا دل لے کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گیا!"

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر مر کے جوہرؔ آپ کے جوہر کھلے

"بعد وفات جب ایک عالم ماتم و شیون سے گونجنے لگا تو صاحب معارف مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان ہی اسی مصرع کو رکھا تھا ع

ماتم یہ زمانے میں بپا تیرے لئے ہے

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا، یا تعزیت نگار کو، عجب نہیں دونوں کو ہوا ہو[1] !"

سید مبارز الدین احمد۔ بی۔ اے (آخری)

---

[1] "صدق" لکھنؤ

آتشِ نمرود

دل کے فانوس میں جلتے ہوئے ارماں کی قسم
آتشِ غم سے جھُلتے ہوئے ایماں کی قسم

ہر طرف غیظ کی چادر سی بچھی جاتی ہے
ابنِ آدم کے لئے آگ لگی جاتی ہے

غازیٔ عشق کی تسکین کو ہجراں کے صلیب
زہر کے جام جوانی کے پیمبر کو نصیب

تیغِ آشفتہ سری، سچ کے مجاہد کے لئے
خنجرِ ناقدری علم کے زاہد کے لئے

سرِ منصورِ علم، حق کے نگہبانوں کا
دستِ چنگیز، نشاں سوختہ سامانوں کا

حوصلے گردشِ دوراں کے خدنگوں سے شہید
سرِ امید پہ لہرائی ہوئی تیغِ یزید

ہر عمل کے لئے قانونِ دو عالم کے حصار
چہرۂ شوق پہ تقدیر کی ٹھوکر کا غبار

زندگی، ضبط و تعلق کی کشاکش میں اسیر
شور کرتی ہوئی زندانِ اجل کی زنجیر

رقص پھر سر پہ دہکتے ہوئے انگاروں کا
نام روشن رہے جلتے ہوئے سیاروں کا!

چرخِ آدم سے ہے دریوزہ گرِ صبرِ خلیلؑ
امتحاں لیتے ہیں انساں کا دو عالم کے کفیل

کیا اسے شعلۂ بے دُود نہیں کہتے ہیں؟
کیا اسے آتشِ نمرود نہیں کہتے ہیں؟

محمد عبدالقیوم خان باقی
ایم۔ اے

سفارش

(روسی فسانہ)

کیلاش ناتھ، جو مدارس وسطانیہ کا صدر مہتمم تعلیمات تھا اور اپنے آپ کو بہت سخی اور منصف مزاج سمجھتا تھا ایک روز اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا ایک غریب مدرس دیا نرائن سے باتیں کر رہا تھا۔

"نہیں، منشی دیا نرائن" وہ کہہ رہا تھا۔ "تمھاری علٰحدگی ناگزیر ہے اب تم اسکول ماسٹر کی حیثیت سے اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ تمھاری آواز اب اس قابل نہیں رہی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھاری آواز کسی طرح خراب ہوگئی؟"

"ایک دن مجھے بہت پسینہ آرہا تھا۔ میں گرمی اور پیاس سے بے چین تھا۔ چنانچہ اس حالت میں، میں نے برف کا شربت پی لیا۔ بس اسی روز سے میری آواز بیٹھ گئی" مدرس نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

"مجھے اس بات کا بڑا ملال ہے کہ ایک ایسے شخص پر، جس نے پندرہ برس تک مدرسہ کی خدمت کی ہے، یکایک ایسی آفت نازل ہوگئی۔ اتنی ذرا سی غلطی سے ساری عمر کی محنت اکارت ہوگئی — مگر اب یہ بتاؤ کہ تم آئندہ کیا کرنا چاہتے ہو؟"

مدرس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کیا تمھارے گھر بار اور بیوی بچے بھی ہیں؟" صدر مہتمم نے پوچھا۔

"جی ہاں، بیوی اور دو بچے ہیں۔" مدرس نے جواب دیا۔

کچھ دیر کے لئے بالکل سکوت چھا گیا۔ ناظم تعلیمات میز پر سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا اور اضطراب کے

عالم میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں" وہ بولا۔ "ایک مدرس ہونا تو اب تمہارے لئے دشوار ہے اور نہ تم ابھی وظیفہ ہی کے لائق ہو مگر تم کو تمہاری قسمت پر چھوڑ دینا اور یہ کہدینا کہ جو کچھ تم اپنی بہبود کے لئے کر سکتے ہو کرو، ایک نامناسب بات ہے ہم تم کو اپنا آدمی سمجھتے ہیں تم نے پندرہ سال تک ملازمت کی ہے۔ اس لئے تمہاری مدد کرنا ہمارا فرض ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح تمہاری مدد کریں ــــ تم خود ہی سوچو کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں تم خود کو میری جگہ تصور کرو اور بتاؤ کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں"۔

پھر خاموشی چھاگئی۔ صدر مہتمم تعلیمات کسی خیال میں مستغرق ہو کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ دیا نرائن بھی افسردہ اور پریشان بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔ یکایک صدر مہتمم تعلیمات کے چہرے پر شگفتگی نمودار ہوئی اور وہ اپنی انگلیوں کو حرکت دینے لگا۔

"مجھے تعجب ہے کہ میں نے پہلے اس امر پر کیوں غور نہیں کیا؟" وہ بعجلت کہنے لگا۔ "آئندہ ہفتے میں ہمارے دفتر کے منتظم (ہیڈ کلارک) وظیفہ پر علحدہ ہو رہے ہیں اگر تم چاہو تو میں اس کی جگہ تم کو مامور کر سکتا ہوں۔" دیا نرائن اس اچانک خوشخبری سے مسکرانے لگا۔

"اچھا تو بس اس جگہ کا فیصلہ ہو گیا۔" صدر مہتمم تعلیمات بولا۔ "تم آج ہی درخواست لکھ کر پیش کرو"۔

دیا نرائن کے چلے جانے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ اب اسکول ماسٹر کا افسردہ اور غمگین چہرہ اس کے سامنے موجود نہ تھا جس کو دیکھ دیکھ کر وہ پریشان ہو رہا تھا۔ اور یہ بات بھی معقول تھی کہ اُس نے دیا نرائن کو منتظمی (ہیڈ کلارک) کی خدمت پر متعین کرنے میں اپنی دانائی، شرافت اور عدل پروری کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن یہ مطمئن اور خوشگوار کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ کیونکہ جب وہ گھر گیا اور دسترخوان پر بیٹھا تو اس کی بیوی سروپ رانی نے اس سے کہا۔ "ہاں تم نے سنا! میں بھولی جا رہی تھی کل لچھمی مجھ سے ملنے آئی تھی اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے ایک نوجوان آدمی کی سفارش کردوں۔ کیونکہ آپ کے دفتر میں ہیڈ کلارک (منتظمی) کی جگہ خالی ہونے والی ہے۔

"ہاں - لیکن اس کے لئے میں ایک شخص سے وعدہ کرچکا ہوں -" صدر مہتمم نے کہا - اور اس کے چہرے پر غصّے کے آثار ہویدا ہو گئے - "اور تم کو میرا اُصول معلوم ہے - میں سفارش سے کبھی کسی کو ملازمت نہیں دیتا -"

"میں جانتی ہوں تمھارا اُصول - لیکن پھپی کے لئے تمھیں اپنا اصول توڑنا پڑے گا - وہ ہم لوگوں سے اپنے رشتہ داروں کی طرح محبت کرتی ہے اور ہم نے آج تک اس کے لئے کچھ نہیں کیا - انکار کرنے کا خیال نہ کرو - اس طرح تم اس خاتون کے جذبات کو مجروح کروگے اور میرے احساسات کو بھی صدمہ پہنچے گا -"

"وہ کس کی سفارش کر رہی ہے ؟" صدر مہتمم تعلیمات نے پوچھا -

"شنکر پرشاد کی !" بیوی نے جواب دیا -

"شنکر پرشاد ـــ ! کیا یہ وہی شخص ہے جس نے سال نو کی تقریب پر تماشا کیا تھا ؟ ـــ کیا یہ وہی شخص ہے ؟ ـــ ہرگز نہیں !" صدر مہتمم نے کھانے سے ہاتھ اُٹھا لیا اور کہا - "کبھی نہیں ہوسکتا -"

"لیکن کیوں نہیں ؟" سروپ رانی نے متمنی انداز میں پوچھا -

"ذرا سوچو تو پیاری کہ اگر ایک آدمی خود ملازمت تلاش کرنے نہیں آتا بلکہ عورتوں سے سفارش کراتا ہے تو وہ محض بیکار ہے - میں پوچھتا ہوں کہ وہ میرے پاس خود کیوں نہیں آیا ؟"

کھانا ختم کرنے کے بعد صدر مہتمم تعلیمات صوفے پر بیٹھ کر اخبارات اور خطوط پڑھنے لگا -

"پیارے شوہر، ایک بار تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم انسان کے دل کی باتیں جانتے ہو اور آدمی کو خوب پہچانتے ہو - اب اس کو عملی طور پر ثابت کرنے کا موقع آیا ہے - شنکر پرشاد، جو میری دانست میں ایک بہت ہی شریف نوجوان ہے دو ایک روز میں تم سے ملاقات کرنے آئے گا - اور ہیڈ کلرک (منتظم دفتر) کی جائداد کے لئے تم سے استدعا کرے گا - وہ ایک شریف اور نیک آدمی ہے اگر تم اس معاملہ میں ذرا بھی دلچسپی کا اظہار کرو تو تم کو میرے کہنے کی صداقت معلوم ہو جائے گی -"

اس کے بعد کوئی دن ایسا نہیں گذرا کہ صدر مہتمم تعلیمات کے پاس شنکر پرشاد کی سفارش کے خطوط نہ آئے ہوں۔ ایک صبح خود شنکر پرشاد گھر پر ملنے آیا۔

"میں کاروباری معاملات میں لوگوں سے یہاں نہیں بلکہ دفتر میں ملاقات کرتا ہوں۔" صدر مہتمم تعلیمات نے اس کی درخواست کو دیکھ کر جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"جناب۔ معاف فرمائیے۔ لیکن میرے دوستوں نے یہی مشورہ دیا کہ میں آپ کے دولت کدے پر حاضر ہوں۔"

"ہوں"! صدر مہتمم تعلیمات نے جوان آدمی کے نوکدار جوتے کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جہاں تک مجھے یقین ہے تمھارا باپ ایک متمول آدمی ہے اور تم کو ملازمت کی ضرورت نہیں ہے مجھے پہلے یہ بتاؤ کہ تمھیں کس بات نے مجبور کیا کہ تم اس خدمت کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرو ـــ تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی تنخواہ بہت کم ہے۔"

"تنخواہ کی مجھے فکر نہیں ہے۔ یہ ایک سرکاری ملازمت ہے اور اتنا ہی میرے لئے کافی ہے۔"

"ہوں ـــ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی مہینے میں تم اس خدمت سے عاجز آکر چھوڑ دو گے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے امیدوار ہیں جن کے لئے یہ خدمت زندگی کا بہت بڑا سہارا ہو سکتی ہے متعدد غریب لوگ ہیں جن کے لئے . . . ."

"جناب میں اس ملازمت سے کبھی بیزار نہ ہوں گا" شنکر پرشاد بولا۔ "میں اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کروں گا۔"

صدر مہتمم تعلیمات کے لئے یہ جواب توقع سے زیادہ تھا۔

"ہاں یہ تو بتاؤ" اس نے نفرت آمیز تبسم سے کہا۔ "تم نے اپنی درخواست سیدھی میرے پاس کیوں نہیں بھیجی اس سلسلہ میں عورتوں کو کیوں تکلیف دی؟"

"مجھے اس کا علم نہ تھا کہ یہ بات عالی جناب کو ناگوار گزرے گی" شنکر پرشاد نے جواب دیا "لیکن اگر عالی جناب سفارشی خطوط کو اہمیت نہیں دیتے تو میرے پاس سارٹیفکٹ بھی موجود ہے"
اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر صدر مہتمم کے سامنے پیش کیا۔ صداقت نامے پر گورنر کے دستخط موجود تھے۔ ہر لفظ سے یہ پتہ چل رہا تھا کہ کسی خاتون سے پیچھا چھڑانے کے لئے گورنر نے اس پر بغیر پڑھے ہوئے دستخط کر دیئے ہیں۔

"اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں اس کی عظمت کے آگے سر تسلیم جھکاتا ہوں" صدر مہتمم تعلیمات نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "کل اپنی درخواست بھیج دو۔ اس کے سوا تمھیں کچھ اور کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے"

شنکر پرشاد کے چلے جانے کے بعد صدر مہتمم تعلیمات پر ایک افسردگی چھا گئی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اپنی شکست کا حد درجہ احساس ہے۔

"کس قدر ذلیل حرکت ہے!" اس نے ادہر ادہر ٹہلتے ہوئے کہا اس کی خواہش پوری ہو گئی — خواہ وہ کسی طرح بھی ہوئی ہو — ناکارہ — عورتوں سے سفارش کراتا ہے۔!"

صدر مہتمم اس دروازے کی طرف تیزی سے بڑھا جدھر سے شنکر پرشاد گیا تھا لیکن اس کی پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ سامنے سے مہتمم خزانہ کی بیوی اندر داخل ہو رہی ہے۔

"میں صرف ایک منٹ کے لئے آئی ہوں، آنے والی خاتون نے کہنا شروع کیا۔ "بیٹھ جایئے اور ذرا توجہ سے سنئے۔ ہاں تو مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی ماتحتی میں ایک خدمت خالی ہونے والی ہے۔ اس سلسلہ میں آج یا کل ایک نوجوان شنکر پرشاد نامی آپ سے ملنے آئیگا۔" خاتون کہتی رہی۔ اور صدر مہتمم تعلیمات اس کو اس انداز سے دیکھتا رہا جیسے وہ اب بیہوش ہوا چاہتا ہے وہ دیکھتا رہا اور سنتا رہا۔ اور زبردستی مسکراتا رہا۔

دوسرے روز جب منشی دیانرائن مدرس آیا تو بہت دیر کے بعد صدر مہتمم تعلیمات نے اپنے ہوش و حواس پر قابو پایا تاکہ دیانرائن حقیقت حال بیان کرے۔ وہ پہلے بہت ہچکچایا۔ سلسلۂ خیال منتشر ہوگیا۔ اور پھر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح گفتگو شروع کرے اور کیا کہے۔ وہ اسکول ماسٹر سے معذرت کرنا چاہتا تھا۔ حقیقت کا اظہار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اسکی زبان ' ایک بادہ خوار ' کی مانند رُک گئی۔ اس کے کان کے پردے پھٹنے لگے ' اور اس خیال سے اسکے دل اور دماغ میں غصّے اور نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے ' کہ اس کو ایک بہت ہی مکروہ اور بعید از انصاف طرزِ عمل اختیار کرتا ہے اور پھر وہ بھی اپنے ہی دفتر میں اپنے ہی ماتحتوں کی موجودگی میں۔

اس نے یکایک میز پر زور سے ایک گھونسا مارا ' پھر کھڑا ہوگیا اور غصے سے چلا اٹھا میرے پاس کوئی خدمت نہیں ہے میرے پاس کوئی ملازمت نہیں ہے۔ بس مجھے زیادہ نہ ستاؤ مجھے زیادہ پریشان نہ کرو۔ براہ کرم مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" اور یہ کہتا ہوا وہ کمرے سے نکل کر چل دیا۔

محشر عابدی
ایم اے

رباعی

آ اے حسن کے تاجدار آیا آیا
آ اے یار آ اے غمگسار آیا آیا
آ اے کہ جہاں ان دور ہو لشکر چھیڑ
ہاں ہم نفس بہار آیا آیا

مخدوم محی الدین

چراغِ گورِ غریباں

پُرانی بات ہے ــــــــــــــ

بہادر شاہ ظفر دہلی کے تخت پر جلوہ فرما تھے ــــ تھے تو نام ہی کے بادشاہ۔ لیکن لال قلعہ میں پھر بھی رونق تھی ــــ قلعہ شہزادوں، شہزادیوں اور بیگمات سے آباد تھا۔

ایک شام کو ــــــــــــ

شہزادہ جواں بخت ٹہل کر ٹھنڈی ہوا کا لطف اُٹھا رہے تھے انھوں نے دیکھا کثیف برقعہ ڈالے ایک عورت آہستہ آہستہ آرہی تھی۔

اُس زمانے میں قلعہ میں جانے کے لئے کوئی دشواری نہ تھی امیر و غریب ہر مصیبت زدہ بہ آسانی اندر جا سکتا تھا کھڑے کھڑے شہزادے نے دیکھا،

وہ نقاب پوش عورت ایک دوشیزہ معلوم ہوتی تھی اور انہیں کی طرف آرہی تھی۔

جواں بخت نے ٹہلنا بند کر دیا۔

دوشیزہ سیدھی ان کے پاس آئی اور جھک کر آداب بجالائی

"کیا بات ہے؟" ــــ شہزادے نے پوچھا

"حضور" ــــ دوشیزہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا ــــ "بڑی مصیبت میں پڑ کر حضور کے پاس آئی ہوں"

شہزادے نے سنا بڑی رسیلی اور درد بھری آواز تھی ــــ

"کہو!" شہزادے نے کہا

"میرے آقا!" ——— دوشیزہ نے کہا "میرے والد کو کوتوال نے گرفتار کر لیا ہے"

"کیوں؟"

کچھ دیر ہچکچا کر، دوشیزہ کی چمپاسی انگلیوں نے نقاب الٹ دیا ——— ایک برق سی کوندگئی جس سے جواں بخت کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ یہ تھا دوشیزہ کا ملکوتی حسن!

اس کی آنکھیں شہزادے سے ایک لمحہ کے لئے ملیں اور جھک گئیں ——— دوشیزہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میری وجہ سے" ——— اس نے رکتے رکتے کہا۔

شہزادے کی پیشانی پر بل پڑ گئے

دوشیزہ کا پتہ اور باپ کا نام پوچھ کر شہزادے نے اس کو رخصت کر دیا۔

دوسرے ہی دن کوتوال شہر شہر سے نکال دیا گیا اور دوشیزہ کے بوڑھے باپ کو رہا کر دیا گیا۔

بات پرانی ہو گئی ———

شہر دہلی میں غدر کی آگ دہک رہی تھی۔ انگریزوں نے دہلی کا محاصرہ کر لیا تھا۔

قلعہ میں ماتم بپا تھا۔

مغلوں کے لئے یہ قیامت کا وقت تھا ——— جواں بخت سوچ رہے تھے، اب اس قلعہ میں کس کی حکومت ہوگی؟ تخت پر کون بیٹھے گا؟

اوہ!

شہزادے سے کچھ فاصلے پر ایک نقاب پوش عورت کھڑی تھی ——— نقاب اٹھتے ہی شہزادے نے دیکھا ——— وہی ———

"کہو، کیا بات ہے؟" ——— شہزادے نے پوچھا ——— "آج میں کیا کر سکتا ہوں؟ اب تو ———"

دوشیزہ نے بات کاٹ کر کہا ——— "آپ دہلی سے نکل چلئے"

شہزادہ خاموش تھا ـــــ

دوشیزہ نے پھر کہا ـــ "ابھی وقت ہے ـــ میں آپ کو لے چل سکتی ہوں ـــ

"تم ؟" ـــ شہزادے نے استعجاب سے پوچھا ـــ "دہلی کا چاروں طرف سے محاصرہ کرلیا گیا ہے ۔ تم کیسے جا سکو گی ؟"

دوشیزہ کا چہرہ شرم سے ـــ نہ معلوم کس وجہ سے سرخ ہو گیا ۔

پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا ـــ "اس طرف کے پہرہ داروں کے افسر نے ـــ میری خاطر ـــ میرے معاوضہ میں آپ کو ـــ" جواں بخت سکتہ کے عالم میں کھڑا تھا ۔

"تم ـــ میرے لئے ـــ" شہزادہ نے حیرت سے پوچھا ـــ "یہ کرو گی ؟"

دوشیزہ نے شہزادہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ـــ "عورت، مرد کے لئے کیا نہیں کرسکتی ہے ؟"

"عورت ـــ مرد ـــ ! اوہ !" شہزادے کا سر چکرا رہا تھا ۔ شہزادے نے کہا "تم کل آنا !"

دوشیزہ جھجکی، اور ـــ چلی گئی ۔ وہ کل نہ آئی ۔ دوسرے ہی دن دہلی فتح ہو گئی ۔

بہادر شاہ معہ شہزادوں کے ہمایون کے مقبرہ میں گرفتار ہو گئے اور پھر خونی دروازے کے باہر ـــ شہزادے قتل کردئے گئے ۔ سلطنت کی بنیاد لاشوں ہی پر رکھی جاتی ہے ۔

اس خوفزدہ بھیڑ میں سے انگریزی فوج کے سپہ سالار نے دیکھا ـــ ایک دوشیزہ کو آہستہ آہستہ شہزادے کی لاش کی طرف آتے ہوئے ۔ اس نے آکر جواں بخت کے قدموں سے کچھ خاک اٹھا کر سر پر ڈال لی اور ـــ سپہ سالار، فوج، بھیڑ اسے نہ روک سکی، نہ پکڑ سکی ۔ بعد ازاں کئی برس تک شہزادے جواں بخت کی سیدھی سادی سفید قبر پر روزرات کو ایک عورت چراغ جلا جایا کرتی تھی ۔

ایک عرصہ دراز کے بعد صبح گھومنے والوں نے اسی قبر پر ایک بڑھیا ـــ خستہ حال ـــ کو مرے ہوئے، پڑے دیکھا ۔

دیکھا ـــ اور چل دئے ۔

(ترجمہ) **محمد علی نیر بی ۔ اے** (ابتدائی)

اُلجھنیں

کچھ روز تک تو نازشِ فرزانگی رہی
آخر ہجومِ عقل نے دیوانہ کردیا

دنیا اغراض و مقاصد کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ کسی ذی روح کا کوئی فعل بغیر غرض کے مکمل نہیں ہوتا۔ ہمارے ہر فعل و عمل میں ضرور کچھ نہ کچھ ہمارے ذاتی اغراض و دلچسپیوں کا کھوٹ شامل رہتا ہے۔ اِن کو ان سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ بے غرض محسن شاذ و نادر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ دیوتا ہوتے ہیں انسان نہیں ہوتے۔ ان کو انسان کہنا ان کی توہین ہے۔ محبت جیسا لطیف، مقدس اور پاک جذبہ بھی غرض کی آلودگی میں مبتلا رہتا ہے۔ اس روحانی چیز کو مادیت میں لپیٹ دینا خود ایک زبردست اخلاقی جرم ہے۔

ہر چیز ختم ہونے کے لئے شروع ہوتی ہے۔ عموماً ہر واقعہ کی ابتدا بڑی خوش آئند اُمید افزا اور دلچسپ ہوتی ہے۔ جس کی شان نزول کو دیکھکر مستقبل ایک درخشاں خواب معلوم ہونے لگتا ہے۔ ہم ان سنہرے سپنوں میں کھو جاتے ہیں۔ کچھ دنوں تک ہمیں تصور میں گم ہوجانے کا اچھا خاصہ مرض ہوجاتا ہے۔ محویت ہم پر آٹھوں پہر طاری رہتی ہے۔ اس دورے سے ذرا سا افاقہ بھی ہمیں پسند نہیں آتا۔ مگر دیکھتے دیکھتے یہ خواب و خیال کی بستی اجاڑ ہوجاتی ہے۔ ہم زمانہ کے انقلاب کے قائل ہونے لگتے ہیں۔ اس وقت ایک ایسی ٹھوکر لگتی ہے کہ ہم ایک دم سے ہشیار ہو جاتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ حقیقت میں ہم جس دور سے گذر رہے تھے وہ خواب تھا۔ ہم پر جو کچھ بیت گئی وہ ایک افسانہ سے زیادہ اہمیت دینے کی واردات نہیں ـــ

تم ایک مطمئن، سکون آمیز، خوشگوار زندگی بسر کرتے رہتے ہو۔ تمہارا یہ سکون چشم فلک میں کھٹکنے لگتا ہے۔ تمہارے جیون کا یہ استقلال اس کو بیچین کر دیتا ہے۔ اور وہ کسی زبردست انقلاب کے پتیر سے سونچتا رہتا ہے جس سے تمہاری زندگی میں ہلچل مچادے۔ تمہاری حیات کے اس متین و باوقار سمندر میں ایک تلاطم ہو جائے۔ تمہاری جیون نیا ہچکولے کھانے لگے۔ تمہارا سکون اضطراب سے بدل جائے۔ اور وہ چپ بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا رہتا ہے۔ اس کو مزہ آتا ہے کسی کے ستانے میں۔ وہ تمہارے کرب و اضطراب کو دیکھ کر کتنا مغرور ہو جاتا ہے۔ ایک پتھر سے زیادہ سخت، ایک چٹان سے زیادہ مضبوط۔ ایک قلعہ سے زیادہ محفوظ، جس میں تمہاری آواز نہیں پہنچ سکتی ــــ ایک سنگدل انسان کی طرح فلک بھی اس کا مجاز ہے کہ اس کو زخموں پر نمک چھڑکنے میں لطف آئے۔ قتل کر کے تڑپتا دیکھنے میں لذت ملے۔ دل توڑ کر صدائے شکست کان لگا کر بڑی سنجیدگی اور حوصلہ سے سنے۔ وہ بھی مضطرب کر کے مطمئن اور بیقرار کر کے قرار پاتا ہے۔ بقول جگر ؎

وہ دل کو توڑ کے بیٹھے تھے مطمئن کہ انھیں
شکست شیشۂ دل کی صدا نے لوٹ لیا

مگر اس طرح لوٹنے کا اتفاق کم ہوتا ہے۔

بعض ایسی باتیں ہیں تم میں، جن کو تم خود نہیں جانتے۔ مگر دنیا تم سے زیادہ جانتی ہے جیسے تم آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر اس کو بکیسر اپنا ایک بے عیب نقشہ سمجھتے ہو کیونکہ وہ تمہاری آنکھیں ہیں جن سے تم اپنی صورت دیکھ رہے ہو۔ وہی صورت جب "لوگ" دیکھتے ہیں تو اس میں ہزاروں ہی عیب نکالتے ہیں۔ "یہ دوسرے کی نظریں" ہیں۔ اس لئے تم کبھی اپنی نظروں پر بھروسہ نہ کرو۔ وہ تمہیں دھوکہ دیتی ہیں ــــ اسی پر غور کرو تم سے کوئی وعدہ خلافی کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، کسی ضرورت سے مجبور ہو کر تمہاری خواہشوں کو ٹھکرا دیتا ہے۔ تو تم کو اس کا یہ فعل اچھا نہیں معلوم ہوتا ــــ لیکن جب تم سے خود ایسی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں تو تم کو تمہاری اس حرکت کے قابل گرفت سمجھنے کا بھولے سے بھی خیال نہیں آتا ــــ تمہارا ہر برے سے برا فعل بھی تمہاری نظروں میں اچھا ہے، لیکن دوسروں کی تنقیدی نظریں ان کی جانچ کرتی ہیں۔ انھیں پرکھتی ہیں، ان میں نقائص ڈھونڈتی ہیں۔

تمہارے کردار کو ایسی ہی آنکھوں کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ دنیا تمہیں اپنے نقطۂ نظر سے جانچتی ہے ۔ جیسی وہ ہے ویسی ہی اس کی نظریں ۔ کسی اندھے نے لنگڑے سے سوال کیا کہ تیری چال کیسی ہے ؟ اس کا جواب کیا ہو سکتا تھا اس کے سوا جیسی تو دیکھتا ہے ۔

دلوں کی تعمیر میں بڑی دیر لگتی ہے ۔ بڑی مدت تک اس کا یقین نہیں آتا کہ کس کا خلوص ہم سے واقعی سچا ہے ۔ کیونکہ یہ دنیا جھوٹی، غرضی اور مکار بہت ہے ۔ جب دلوں کی تعمیر ہو جاتی ہے یہ درخت بڑے آرزو ارمان سے بن سنور کر اپنی پھبن دکھاتے ہوئے پروان چڑھتا ہے تو پھر اس کو آندھیوں کے بے پناہ جھکڑ ہلانے لگتے ہیں ۔ اس کی جڑیں کمزور ہونے لگتی ہیں ۔ دیکھتے دیکھتے یہ امیدوں، آرزوؤں، تمناؤں، آشاؤں کا قیمتی سرمایہ اس کی زد میں آجاتا ہے جس کو انقلاب زمانہ کہتے ہیں ۔ جو اسی دنیا کی ایک نہایت ضروری دلچسپ اور اہم چیز ہے برے کے ساتھ اچھا زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ یہ قدرت کے کھیل ہیں ۔ دنیا ایک اسٹیج ہے جس پر ہر شخص اپنی اداکاری فن کارانہ حیثیت سے دکھاتا چلا جاتا ہے تاوقتیکہ اس کی زندگی ختم ہو جائے ۔ کبھی زہر بھی تھوڑا تھوڑا کھانے سے جزو بدن ہو جاتا ہے ۔ کوئی غصہ کو پی جانے کا عادی ہوتا ہے ۔ کوئی تکلیفوں اور مصیبتوں کو ہنستے ہوئے ٹال جاتا ہے ۔ اس سنسار میں دل کو موم نہیں پتھر بنانے کی ضرورت ہے ۔ فرض تمہارے لبوں کے لئے خشک الفاظ منتخب کر لیتا ہے ۔ فرض کا احساس تم کو سنگدل، بے مہر اور زود رنج بنا دیتا ہے ۔ سچ تو ہمیشہ ہی کڑوا ہوتا ہے لیکن میرے خیال میں اس کی یہ تلخی اس کی بقا کے لئے ضروری ہے ورنہ جھوٹ کی طرح یہ بھی ہر دلعزیز اور عام پسند ہوتا تو اس کی پھر کوئی قدر و قیمت ہی نہ ہوگی ۔ جھوٹی باتیں کتنی دلفریب ہوتی ہیں ۔ کوئی تمہاری تعریف کرتا ہے اس میں سب جھوٹ ہی جھوٹ بھرا ہے مگر تم کو اس پر ایمان لانے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا لیکن ٹھنڈے دل سے غور کرو تو اس کے بیان میں ذرا بھی صداقت نہیں ہے ۔ جس طرح مٹھاس پر مکھیاں بہت آتی ہیں جھوٹ بھی سب کو پیارا ہوتا ہے ۔ ارے نہیں ہرگز اس کا یقین نہ کرنا یعنی یہ کہ تمہارے منہ پر جو تمہاری تعریف ہوتی ہے وہ سچی ہوتی ہے ۔ اگر وہ کہنے والا سچ مچ وہی کہدے جو حقیقت میں "تم ہو" تو آج وہ تمہارے دل پر نہیں چڑھ سکتا ۔ جھوٹ میں فریب ہوتا ہے اور اس کے نظر فریب جال میں تم پھنس جاتے ہو مگر جب یہ دھوکہ کی ٹٹی اٹھ جاتی ہے تو تم کو اپنی حقیقت کا علم ہونے لگتا ہے ۔ دنیا کی چکنی چپڑی باتیں دل کو تو لبھا لیتی ہیں لیکن روح، ان انسانی ہتھکنڈوں سے خوب واقف رہتی ہے ۔ جس طرح بیوقوف مریض معمولی سی تکلیف کیلئے بھی

غیر معمولی دوا استعمال کرلیتا ہے غرض ؎

ستمہائے گردوں مفصل نہ پوچھو ۔۔۔ کہ سر پھر گیا ماجرا کہتے کہتے

مجبوریاں بعض وقت انسان کو کتنی مصیبت میں ڈالدیتی ہیں۔ باوجود اپنی ہنگامہ کن مصروفیتوں کے دنیا اس کو جینے نہیں دیتی ملنے جلنے والوں کا تانتا لگ جاتا ہے۔ بعض ان میں سے ایسے ہیں جن سے وہ ملنا نہیں چاہتا۔ ان سے وہ جھوٹی وضعداری نباھتے ہوئے ملتا ہے بظاہر اخلاق برتتا ہے۔ دل نہیں ملتا۔ صرف آنکھیں ملتی ہیں۔ بات چیت سے سمجھنے والے کیلئے اس کے دل کی حالت معلوم ہوتی جاتی ہے محض زبانی جمع خرچ رہتی ہے۔ کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ اگر اس کے دل کو اس وقت ٹٹول کر دیکھا جائے اس کے من سنسار میں کچھ ہلچل ہی نہیں ہوتی۔ وہ سکوت و سکون کا متمنی ہوتا ہے۔ دنیا سے بھاگنا چاہتا ہے۔ اطمینان قلب کا جویا ہے۔ لیکن دنیا اس کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ وہ جھنجھلا کر کسی ایسی جگہ چلے جانے پر آمادہ ہوجاتا ہے جہاں کوئی نہ ہو — نجانے یہ کس نے کہدیا تھا کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ خوب! سماج اور سوسائٹی کو ایک ایسے خشک مزاج انسان سے بھلا کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ اسکی زبان پر جو الفاظ آتے ہیں دل ان کی ترجمانی سے انکار کرتا ہے اور سوسائٹی اس کو مکار بنا دیتی ہے۔ اسکی طبیعت دوست احباب سے ایسی ہی بے نیاز ہوجاتی ہے جیسے بہشت میں داخل ہوکر انسانی آبادیوں کی روح یکلخت بھول جاتی ہے۔ دل کی گہری اور اندھیری بھپتیاں اسکی زندگی کو کبھی تلخ اور شاذ و نادر ہی رسیلا بنا دیتی ہیں۔ اسکے خیالات میں الجھن سی پیدا ہوتی ہے۔ یہ جیون کبھی کبھی اسکے لئے اداس، پھیکا اور بے رونق سا ہوجاتا ہے۔ اسکی حالت کچھ اس طرح کی ہوجاتی ہے ؎

دم لینے کی طاقت ہے بیمار محبت میں ۔۔۔ اتنا ہی غنیمت ہے مومن کا سنبھل جانا

تخیل کی انسانی زندگی پر زبردست حکومت ہے۔ یہ خیال کی دنیا کیا کچھ نہیں کرسکتی۔ ہمارا تخیل بادلوں کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے۔ ایمن برق کی سی بےچینی اور تڑپ ہے۔ ہم کو کسی پہلو چین نہیں رہتا۔ آج ہم کو ایک چیز بہت پسند آتی ہے۔ لیکن کل اسکی نسبت ہمارا نظریہ بالکل بدل جاتا ہے۔ ہم آج وہ نہیں ہیں جو کل تھے۔ ہماری زندگی کی ہر کروٹ میں کتنا عجیب و غریب تلون ہے۔ مگر یہ ہمارا کوئی کیرکٹر نہیں۔ ہمارا کردار بھروسہ کے قابل ہی کب ہیں اگر وہ اس طرح قوس و قزح کی طرح رنگ بدلیں۔ مذہب اخلاقی زندگی کا ایک ضابطہ ہے اور اخلاقی زندگی کا انحصار کردار پر ہے۔ استقلال اچھے کردار کی روشن دلیل ہے — اف — یہ دنیا نہیں ایک پرکیف ہنگامہ ہے۔ سوچنے والے کے لئے اسکی پہنائیوں میں کیا نہیں ہے۔ کہاں تک سوچیں، کس کس کو سوچیں بس اکبر کے اس دلنشین تخیل پر یہ داستان بے ربط ختم کردی جاتی ہے۔ ؎

پیارا ہے فقط اللہ کا نام، آرام اسی سے روح کو ہے ۔۔۔ اور یوں تو حوادث بے حد ہیں، دنیا میں بہت افسانے ہیں۔

جہاں بانو بیگم۔ ام۔ اے

بازگشت!

"نہیں شیام اس بے کیف زندگی سے میرا دل اُچاٹ ہوگیا ہے۔ اس معاملے میں تم اصرار مت کرو۔ مجھے اس جگہ سے چلا ہی جانے دو۔ شاید باہر کی دنیا میرا استقبال زیادہ گرمجوشی سے کرے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ مجھے ایک زرین موقعہ دیرہا ہے اور اگر میں اسے قبول نہ کروں تو یہ میری انتہائی حماقت ہوگی"

"جب والدین کی محبتیں اور ایک مانوس جگہ کی کشش ہی تمھیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی تو پھر میں بھی روکنا نہیں چاہتا۔" شیام نے کہا اور فوراً ہی موضوعِ گفتگو کو بدل دیا۔ سوشیلا اور شیام اس وقت شام کی مختصر سی تفریح میں مصروف تھے۔ سوشیلا نے شیام کے اس انداز کو بہت پسند کیا۔ وہ دراصل اپنے جانے کے متعلق زیادہ دیر تک گفتگو نہ کرنا چاہتی تھی اور حتی الامکان ایسی باتوں سے بچنا چاہتی تھی جو ان کے درمیان شکر رنجی پیدا کرسکتی تھیں۔ اُس نے ممنونیت کے گہرے احساس کے ساتھ شیام کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے دوسری باتوں میں مصروف ہوگئی۔

سوشیلا نے تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ایک مقامی اسکول میں ملازمت اختیار کرلی تھی گو اس کے والدین اُس کی مدد کے محتاج نہ تھے تاہم وہ اپنی مدد آپ کرنا چاہتی تھی۔ اُسے اپنا بار والدین کے کاندھوں پر ڈالے رکھنا گوارا نہ تھا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ وہ متعدد بار اس سے شادی کرلینے کا اصرار بھی کرچکے تھے۔ سوشیلا دراصل اس بات سے بہت گھبراتی تھی کہ اُس کو کسی بات پر مجبور کیا جائے۔ اُس کی فطرت پابندیوں اور مجبوریوں سے بیزار تھی۔ وہ شادی نہ کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے نہیں کہ شادی نہ کرنا فیشن میں داخل ہوچکا تھا۔ بلکہ صرف اس لئے کہ وہ آزادی اور خودمختاری کے خوش گوار احساس سے چند دنوں اور مستفید ہونا چاہتی تھی۔ اُس کی فطرت میں بے چینی اور انقلاب پسندی کا عنصر زیادہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ

ہر صبح اور ہر شام اُس کے لئے کوئی ذراسی تبدیلی لے کر آئے۔ لیکن اس کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی تھی۔ اس کی صبحیں اور شامیں ایک ہی طرح شروع ہوتیں اور ختم ہو جاتیں۔ کبھی کوئی قابلِ ذکر تغیر رونما ہی نہ ہوتا۔ اُس کا ایک معین نظام العمل تھا جس کے تحت وہ صبح سے شام تک حرکت کرتی رہتی۔ صبح کو ماتاجی کے ساتھ ایک ہی طرح کا ناشتہ کرنا۔ نصاب کی فضول اور غیر دلچسپ کتابیں لے کر اسکول جانا۔ دن بھر بدتمیز اور کند ذہن لڑکیوں کے پیچھے دماغ پاشی کرنا پھر شام کو تھکے ہارے دل و دماغ کے ساتھ گھر واپس آجانا چار پائی کر کمرے میں مطالعہ کرتے رہنا۔ یا پھر شیام یا کوئی اور ملنے جلنے والا آگیا تو چند باتیں کر لینا اور کبھی کبھی اُس کے ساتھ جنگلوں میں چہل قدمی کے لئے نکل جانا۔ یہ تھا سوشیلا کا نظامِ زندگی جس سے وہ بیزار ہو چکی تھی اور فطرتاً اُس میں تبدیلی کی خواہاں تھی۔ وہ شیام کو بہت پسند کرتی تھی۔ وہ دونوں بچپن کے ساتھی تھے اور انھوں نے اپنی تعلیم بھی ایک ہی ساتھ ختم کی تھی۔ تعلیم کے اختتام پر سوشیلا نے ایک اسکول میں اور شیام نے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ شیام نسبتاً زیادہ آسودہ زندگی بسر کر رہا تھا اور اپنے گردوپیش سے نالاں نہ معلوم ہوتا تھا۔ فرصت کے زیادہ تر اوقات وہ مطالعۂ کتب یا سوشیلا کی صحبت میں گزار دیا کرتا تھا۔ سب جانتے تھے اور غالباً خود سوشیلا بھی جانتی تھی کہ شیام کے دل میں اُس کی کتنی وقعت اور محبت ہے۔ لیکن نہ تو اب تک شیام نے اپنی محبت کا اظہار سوشیلا سے کیا تھا اور نہ ہی سوشیلا نے کبھی اس کو ایسا موقع دیا تھا۔ تاہم وہ اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ شیام اکثر سوچتا کہ جب سوشیلا اس کی بیوی ہو جائے گی تو اُس کی زندگی میں کیسی خوشگوار رنگینی اور بلندی پیدا ہو جائے گی۔ وہ اس خیال کے تحت اپنے گھر اور اُس سے ملحقہ چھوٹے سے چمن کو ہر وقت زیادہ خوبصورت بنانے کی کوشش کرتا رہتا تاکہ وہ سوشیلا کی پذیرائی کے قابل ہو سکے۔ سوشیلا بھی اکثر تو نہیں لیکن کبھی کبھی سوچا کرتی کہ وہ شیام کی بیوی بن کر کیا واقعی ایک دلچسپ اور قابلِ حصول زندگی کا آغاز کر سکتی ہے۔ پھر اُس کا تصور اُس کے سامنے شیام کے گھر اور باغیچے کو پیش کر دیتا۔ ایک مختصر سا خوبصورت، صاف ستھرا مکان۔ گلاب اور چنبلی کا چھوٹا سا خوشبودار چمن، ایک یا شاید دو بچے، ایک شوہر، ایک پلی ہوئی بلی سادہ زندگی کی کفیل مختصر سی آمدنی چند بے غرض احباب اور اُن کو سنبھالے ہوئے ایک مسلسل اور غیر منقطع محبت کا پائیدار رشتہ۔

سوشیلا کی تنوع پسند اور ارمان پرور روح زندگی کے اس مضمحل کن خاکے سے گھبرا اٹھی۔ وہ
واقعی قابل قدر شئے ہے۔ لیکن یکسانیت محبت کی موت ہے۔ سوشیلا کو ایسا محسوس ہوتا کہ اس نوع
میں افسردگی اور اضمحلال کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ پانی پانی سب ایک — لیکن بظاہر سمندر کے
چشمے کے پانی میں کتنا بڑا فرق ہوتا ہے۔ چشمے کا پانی زیادہ ساکن زیادہ شیریں اور زیادہ فائدہ بخش
اس کے برخلاف سمندر کے پانی میں خوبصورتی اور کشش زیادہ ہوتی ہے۔ محبت بھی مختلف قسم کی ہوتی
کوئی سمندر کے پانی کی طرح غیر دلچسپ، مضمحل اور ساکن۔ ایسی محبتوں میں کوئی اپیچ سرگرمی
نہیں ہوتا۔ ایک ناقابل تشریح یک رنگی انہیں محیط کئے ہوتی ہے — سوشیلا سمجھتی تھی کہ وہ شیا
اس لئے پسند کرتی ہے کہ اُس نے ابھی تک اس سے اظہار محبت نہ کیا تھا اور ایک اچھے ا
طرح خاموشی سے محبت کئے جا رہا تھا۔ ادھر یہ احساس اور ادھر انہی دنوں اسکول کی ہیڈ مس
اس کی مخالفت ہوگئی۔ گو کہ وہ اپنی خدمت پر مستقل تھی اور علٰحدگی کا کوئی خوف نہ تھا تاہم اب وہ
زندگی سے کافی بیزار ہو چکی تھی اور کسی طرح اسے زیادہ عرصے تک جاری رکھنے کے لئے تیا
انہی دنوں قریب کے شہر کا ایک معمولی گھرانا بغرض تفریح اُس کی بستی میں آیا ہوا تھا۔ ایک دن
تعارف اس گھرانے سے ہوگیا۔ گو یہ اتفاقی بات تھی تاہم سوشیلا کی صحبت کو ان لوگوں نے بہت پ
اور اپنے ہاں شام کی چاء پر مدعو بھی کیا۔ دوسرے دن صبح کو جب وہ سو کر اٹھی تو اسے ایک ا
سواد تحریر سے اُس کی نگاہیں آشنا نہ تھیں۔ اُس نے اسے کھول کر پڑھا تو حیرت و مسرت سے اُ
چہرہ جگمگا اُٹھا۔ یہ ایک ملازمت کا پیش کش تھا جو اُسے مذکورۂ بالا خاندان کی طرف سے وصول ہوا تھا
صاحب خانہ نے لکھا تھا کہ اُن کی دو چھوٹی لڑکیاں ہیں جنھیں وہ اچھی تعلیم و تربیت دینے کے خوا
ہیں۔ مدت سے انھیں ایک اتالیق کی تلاش تھی اور اُن کا خیال ہے کہ اس سوشیلا سے زیادہ ا
کے لئے کوئی اور موزوں نہیں ہو سکتا — سب سے زیادہ اچھی بات یہ تھی کہ یہ لوگ اُسے جو م
دینے پر آمادہ تھے وہ اُس کی موجودہ آمدنی سے تقریباً دُگنا تھا " زمانہ ہر ایک کو ایسے زرین مو
نہیں دیا کرتا " سوشیلا نے سوچا " مجھے اس پیشکش کو فوراً قبول کر لینا چاہیئے۔" اس ارادے سے کے

اُسے شیام کا خیال آیا تو اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ شیام کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی کا برتاؤ کر رہی ہے" لیکن آخر اس میں بے انصافی کی کونسی بات ہے" اُس نے اپنے دل کو تسکین دیتے ہوئے سوچا" شیام نے آج تک اپنے احساسات سے مجھے بیگانہ رکھا ہے اُس نے کبھی اپنے دل کی بات واضح طور پر مجھ سے نہیں کہی۔ اُسے دراصل مجھ سے کوئی توقع ہی نہ رکھنا چاہیے۔ سوشیلا خیالات کی رو میں یونہی چلی جارہی تھی" اور پھر کیا معلوم میں بھی اُس سے محبت کرتی ہوں یا نہیں مجھے کوئی موقع ہی نہیں ملا کہ اپنے تاثرات کا اچھی طرح اطمینان کروں۔ ہوسکتا ہے کہ میں جسے جذبۂ محبت کہہ رہی ہوں وہ صرف ایک جذبۂ پسندیدگی ہو۔ ہم دونوں بچپن کے ساتھی ہیں ساتھ رہنے سہنے سے ایک طرح کا اُنس پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ صرف ذرا سے اُنس کی بنا پر عمر بھر کے لئے پیمان وفا باندھ لینا توبڑی حماقت ہے یوں بھی شیام کی اور میری طبیعت میں بڑا فرق ہے۔ وہ مجھے خوش نہیں رکھ سکتا اُس کی فطرت کا جمود اور سکون مجھے بھاتا ہی نہیں۔ پتھر کی مورتیں خوبصورت اور بے ضرر ہوسکتی ہیں لیکن اُنھیں کوئی جی جان سے چاہ نہیں سکتا۔ شیام کو بھی ایک پیاری سی پتھر کی مورت کہا جاسکتا ہے۔ میں تو زندگی اور حرارت کی طالب ہوں اور اُس میں جوش، اُپج اور گرمی حیات کا کوسوں پتہ تک نہیں۔ اس کی گفتگو کیسی سرد اور بے اثر ہوتی ہے۔ جیسے سردیوں کے موسم میں کوئی برف کھاکر خوش نہیں ہوتا۔ یونہی میرا دل بھی اُس کی باتیں سن کر آسودہ نہیں ہوتا۔ میں ایک سیماب فطرت لڑکی ہوں اور وہ ایک سنجیدہ امن پسند شہری آہستہ آہستہ باتیں کرنے والے لوگ مجھے مطلق پسند نہیں۔ ماتاجی کے باتیں بھی میں صرف اسی وجہ سے کان دھر کر نہیں سُنتی کہ وہ ہمیشہ دھیمی آوازیں بولتی ہیں اس بستی میں میری زندگی ایک ایسے تاریک گھر کے مانند ہے جس میں بجلی کے قمقمے تو بہت سارے ہوں لیکن اُن کو روشن کرنے والا کوئی نہ ہو۔ جو لوگ بھی اس گھر میں داخل ہوتے ہیں وہ سب کے سب بدقسمتی سے تاریکی پسند واقع ہوئے ہیں وہ نہیں جانتے کہ میری فطرت میں نور کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ وہ میری تاریکیوں ہی کو سکون بخش تصور کیے ہوئے ہیں اور اُنھی کی تعریفوں کے گیت گاتے رہتے ہیں۔ مجھے ان غیر مکمل تعریفوں سے ذرا سی بھی خوشی نہیں حاصل ہوتی مجھے ایک ایسے ہیرو کی تلاش ہے جو مجھے اس تاریک اور افسردہ ماحول سے کھینچ کر باہر

نکال لائے ــــ میری ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ کوئی مجھے زمانۂ قدیم کے شہزادوں اور سورماؤں کی طرح
چاہے ۔ میری اور اُس کی دوستی مہینوں اور برسوں میں جاکر استوار نہ ہو بلکہ ایک ہی دن اور ایک ہی لمحے
میں یہ ساری منزلیں طے ہو جائیں ۔ مثلاً میں اس پر بھی آمادہ ہوں کہ جس گھر میں میں رہتی ہوں اُس میں
آگ لگ جائے ۔ بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہ رہے ۔ شعلے چاروں طرف سے مجھے گھیر لیں اور میں حیران
و پریشان بالکوں پر کھڑی نیچے مجمع پر حسرت بھری نگاہیں ڈال رہی ہوں اور امداد کے لئے چلا رہی ہوں۔
عین اُس وقت میرا سورما مجمع کو چیرتا پھاڑتا آگے بڑھے ۔ آگ کے خوفناک دھکتے ہوئے شعلوں میں
بے دھڑک گھس جائے اور بجلی کی سی تیزی سے ۔ مجھے اُٹھا کر صاف بچا لے جائے ہوش درست ہونے
پر میں اپنے محسن کا شکریہ ادا کروں اس وقت ہم دونوں کی نظریں ملیں اور دو دلوں کے درمیان دوستی اور
محبت کا مستحکم پل تعمیر ہو جائے یا پھر ایسا ہو کہ میں کسی سنسان اور غیر آباد ندی پر اشنان کے لئے جاؤں
اتفاق سے میرا پاؤں پھسل جائے اور میں گہرے پانی میں غوطے کھانے لگوں عین اس وقت دفعتاً ایک
سوار گھوڑا اُڑاتا ہوا وہاں پہونچے ۔ آن کی آن میں وہ گھوڑے سے اُتر کر ندی میں کود پڑے اور بے باکانہ
مجھ ڈوبتی کو بچا لے ۔ اور یوں مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لے ۔ دراصل میری فطرت اسی
قسم کی پرجوش، بے باک اور یکایک پیدا ہو جانے والی محبت کی طلبگار ہے ۔ شیام ایک سیدھا سادھا
نوجوان ہے ۔ اُسے محبت کرنا آتا ہی نہیں وہ تو صرف پرستش اور عبادت کر سکتا ہے ۔ اُس نے مجھے کبھی
اس طرح نہیں دیکھا کہ میں اُس کی نظروں کے سامنے مجبور ہو کر کانپنے لگ جاؤں ۔ اُس نے مجھ سے
ایسی بات نہیں کہی جس سے میرے قلب وجگر میں آگ سی لگ جائے ۔ اُس کے پہلو میں دل ہے ہی
نہیں ۔ برف کی ایک قاش ہے ۔ اور میرا یہ حال کہ سونے کی طرح تپائے جانے اور چاندی کی طرح
پگھلائے جانے کے لئے بیتاب ہو رہی ہوں سوز اور تپش کی آرزومند ہوں ۔ یہ چیزیں مجھے شیام میں
نہیں مل سکتیں ۔ نہیں نہیں ۔ میں شیام سے محبت نہیں کرتی ۔ اچھا ہوا کہ آج میں نے اپنے آس پاس کے
تصورات پر ایک نظر ڈال لی ۔ ورنہ خدا جانے چند وقتی جذبات میری کس طرح غلط رہبری کرتے ــ
اب مجھے ایک بہترین موقع ہاتھ آگیا ہے ۔ میں ان لوگوں کے ساتھ شہر جاؤں گی ۔ نئی زندگی، نئے ماحول

اور نئے لوگوں سے واقفیت حاصل کروں گی۔ جب میں کالج میں تھی تو پرنسپل صاحبہ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ اس بچی کی فطرت میں بڑی بڑی قابل قدر صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میری نئی زندگی مجھے اس کا موقع دے کہ میں اپنی فطرت کی اُن قابل قدر صلاحیتوں کو نمایاں اور اُجاگر کرنے میں کامیاب ہوسکوں ممکن ہے میری قسمت میں بڑے بڑے کارنامے انجام دینے لکھے ہوں۔ یہ تو ایک مانی ہوئی بات ہے کہ خاص لوگوں کا طبقہ ہمیشہ عوام ہی میں سے پیدا ہوتا ہے ۔ شاید میں بھی ایک بڑی بھاری ادیب بن جاؤں۔ میرے مضامین ملک بھر میں تعریف و تحسین کے ساتھ پڑھے جائیں۔ شاید میں ایک کامیاب مقرر بن جاؤں۔ میری تقریریں اخباروں میں چھپیں اور انھیں سُننے کے لیے دُور دور سے لوگ آئیں۔ کوئی بات بعید از قیاس نہیں ہے انسان کو اگر موقع ملے تو وہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ گرے نے ایک مرتبہ ناسمجھ دیہاتیوں کی قبروں پر ماتم کرتے ہوئے کہا تھا " خدا جانے ان میں ایسے کتنے ہوں گے جن کو اگر موقع ملتا تو اپنے زمانے کے ملٹن اور شکسپیر ہوسکتے تھے۔ موقع دراصل بڑی چیز ہے اور یہ ہر وقت اور ہر ایک کو نہیں ملا کرتا۔ قسمت کا بنانے بگاڑنے والا مجھ پر خاص طور پر مہربان معلوم ہوتا ہے جبھی اُس نے مجھے ایسا عمدہ موقع عنایت کیا ہے۔ شہری زندگی گوناگوں تبدیلیوں اور جدتوں کا ایک سلسلہ ہوتی ہے اس قسم کی زندگی میرے لئے بہت موزوں ہے۔ ماتا جی میرے یوں چلے جانے سے برہم تو ضرور ہونگی لیکن لوگوں کو منالینے اور خوش کردینے کے بھی مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ پہلا معاوضہ ملتے ہی میں انھیں ایک نہایت نفیس فرکوٹ جس کی انھیں ایک زمانے سے خواہش ہے خرید کر بھیجوں گی۔ ہر ہفتہ طویل اور محبت بھرے خطوط لکھا کروں گی۔ یہ خیال کہ اُن کی بیٹی ان سے اتنی دور رہ کر بھی ایسی محبت کرتی ہے ماتا جی کو خوش کردے گا۔ اور اگر یوں دیکھا جائے تو میری زندگی تو میری اپنی ہی ہے۔ مجھے اُس کے بنانے بگاڑنے کا پورا اختیار ہے۔ ماتا جی خواہ مخواہ مجھے اس اختیار سے کیوں محروم کریں۔ پتاجی تو کافی روشن خیال ہیں۔ راہ عمل میں میرے اس طرح بے باکانہ قدم اُٹھانے سے وہ بہت مسرور ہوں گے۔ اب لے دے کر ایک شیام رہ جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرا اس خیال سے دل دکھتا ہے کہ وہ میرے یوں چلے جانے سے بالکل بے دل اور افسردہ خاطر ہوجائے گا۔ خیر اس کے لئے

میں کیا کر سکتی ہوں میں ایک ایسے بہترین قسمت آزمائی کے موقع کو ذرا سے خیال کی بنا پر خیرباد نہیں کہہ سکتی میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف خیالات کی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں اور مستقبل سے بے پروا ہو کر حال کی دلچسپیوں میں کھو جاتے ہیں ۔ میں عملی زندگی کو بہ نسبت اس قسم کی خیالی زندگی کے زیادہ پسند کرتی ہوں ۔ شیام بھی کوئی فرشتہ تو ہے نہیں ۔ چند دن میں مجھے بھول جائے گا ۔ بہرحال میرے ارادے کو ہر صورت میں پورا ہونا چاہئے ۔" سوشیلا جب تصورات اور خیالات کی اس دنیا سے باہر آئی تو اس کی فطرت میں عزم و ارادے کی سختی پیدا ہو چکی تھی ۔

ماتاجی اس کے اس ارادے سے حسب توقع سخت برہم ہوئیں " مانا کہ معاوضہ زیادہ ملے گا" انہوں نے کہا ،، لیکن ایک مستقل جگہ کو چھوڑ کر وطن اور عزیز و اقربا سے دور ایک ہنگامی کام پر جانا انتہا درجے کی بے وقوفی ہے" ۔ مگر سوشیلا نے ایک نہ سنی ۔ جس استقلال کا ماتاجی ذکر کر رہی تھیں وہی سوشیلا کے لئے سب سے زیادہ غیر دلچسپ اور ناقابل برداشت تھا ۔

سوشیلا نے اپنی قدیم ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور نئی خدمت قبول کر لی ۔ وہ لوگ اتوار کی شام کو روانہ ہونے والے تھے اور انھوں نے سوشیلا کو لکھ دیا تھا کہ وہ وقت پر اسٹیشن پہونچ جائے ۔

سوشیلا دن بھر اپنا اسباب باندھتی رہی اور تین بجے تک اپنے کاموں سے پوری طرح فارغ ہو گئی ۔ وہ اپنی والدہ سے ایک طویل مدت کے لئے علٰحدہ ہو رہی تھی اس لئے اُسے چاہئے تھا کہ جو وقت بچ رہا ہے وہ انھیں کی صحبت میں صرف کرے ۔ لیکن اس نے سوچا کہ ماتاجی پھر کچھ وعظ و نصیحت شروع کر دیں گی ۔ اسے بے وقوف ، ناتجربہ کار اور کم فہم کہیں گی اور اپنی انتہائی کوشش اسے روک رکھنے میں صرف کر دیں گی ۔ چنانچہ اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ اُن کے پاس جائے ہی نہیں ۔ وہ اپنے کمرے میں پڑی گھر کی پلی ہوئی بلی سے کھیلتی رہی اور یہ ظاہر کرتی رہی کہ وہ کام میں مصروف ہے ۔

شام کے قریب شیام بھی آ گیا ۔ اُس کی آواز سن کر وہ برآمدے میں نکل آئی ۔ شیام کچھ مضمحل سا نظر آ رہا تھا لیکن وہ مسلسل باتیں کئے جا رہا تھا ۔ شاید اُس کی کوشش یہ تھی کہ اُس کا اضمحلال کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے لیکن سوشیلا نے اُس کی آنکھوں کی اتھاہ گہرائیوں میں رنج و الم کی جھلکیاں دیکھ لیں اور اس کا دل اُس کے لئے بیتاب ہو گیا ۔

ایک لمحے کے لئے پہلی مرتبہ اسے خیال آیا کہ شاید وہ غلطی کر رہی ہے۔ شاید اسے بعد میں پچھتانا پڑے" یہ عجیب بات ہے" اُس نے سوچا" کہ دنیا تو سکون عافیت کے لئے بیتاب ہو رہی ہے اور میں اُس سے یوں بیزاری ظاہر کر رہی ہوں۔ لیکن اُس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے آپ کو آگے سوچنے سے روک دیا۔ وہ جو کچھ کر چکی تھی اس پر تنقید کرنا نہ چاہتی تھی۔ شام نہایت ہی خوبصورت تھی سوشیلا نے گھر کے قدیم ملازم کے ساتھ اسباب کو اسٹیشن روانہ کر دیا اور خود شیام کے ساتھ پیدل جانے پر آمادہ ہو گئی۔ اُس نے پتاجی سے اجازت چاہی انھوں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیتے ہوئے رخصت کیا۔ ماتاجی دروازے تک رخصت کرنے کے لئے آئیں۔ سوشیلا کا دل بے قابو ہونے لگا جب اُس نے دیکھا کہ ماتاجی کی آنکھوں میں آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے چمک رہے تھے۔ اُس نے اپنی نگاہیں اُن کے چہرے پر سے ہٹا لیں گویا کہ اُس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اُس نے جلدی سے سلام کیا اور شیام کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ کوئی پانچ منٹ تک اُسے یہ احساس رہا کہ ماتاجی کی نظریں اُس کا تعاقب کرنے میں مصروف ہیں۔ لیکن اس نے پیچھے نظر ڈال کر اپنے اس احساس کو یقین سے بدلنے کی کوشش نہ کی وہ ماتاجی کے آنسوؤں سے بہت ڈرتی تھی" اور اب تک تو" اُس نے سوچا" آنسو اُن کے رخساروں پر بہنے بھی لگے ہوں گے۔" کوئی دس منٹ کے بعد اُس نے پیچھے نظر ڈالی اُس کے مکان کا دروازہ اُس کی نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ اُسے اس بات سے یک گونہ اطمینان ہوا پھر اُس نے شیام کی موجودگی کو نمایاں طور پر محسوس کیا۔ ماتاجی کے آنسوؤں کے تصور نے اُسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ اُسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ شیام اسٹیشن تک اس کے ساتھ چل رہا ہے۔ اُس نے شیام پر ایک نظر ڈالی۔ وہ کھویا ہوا سا تھا اور کچھ سوچتا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ گفتگو شروع کرتے ڈر رہی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کی کوئی بات شیام کے دل کو تکلیف پہونچا جائے۔ لیکن زیادہ عرصے تک خاموش رہنا بھی نامناسب تھا چنانچہ اُس نے کہا۔" موسم دو ایک دن سے کس قدر نظر فریب ہو گیا ہے۔" شیام کے تصورات اس وقت تمام تر اپنی اندرونی ہستی اور اپنے پوشیدہ جذبات سے متعلق تھے۔ اُسے مطلق پسند نہ آیا کہ اس وقت کوئی بیرونی اور خارجی چیزوں کے متعلق اظہار خیال کرے۔ اُس نے سوشیلا پر ایک نظر ڈالی جس میں ہلکی سی ملامت چھپی ہوئی تھی۔ سوشیلا کو فوراً احساس ہوا کہ موسم کے متعلق اظہار خیال کرنے کا یہ کوئی بہترین موقع نہ تھا۔ اس وقت جب کہ وہ شیام کی تمام تر آرزوں اور تمناؤں سے بے پروا ہو کر اپنے لئے ایک بالکل نئی زندگی منتخب کر چکی تھی اسے کوئی حق نہ تھا کہ صرف اپنی روح کو سکون پذیر کرنے کے لئے فضول باتیں شروع کر دے اور دوسرے

تاثراتِ قلبی کا مطلق خیال نہ رکھے ۔ وہ شرمندہ سی ہوگئی اور ندامت اُس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کے بعد اُس نے کچھ اور کہنے کی کوشش نہ کی ۔ ان کا راستہ ایک جنگل میں سے ہو کر گذرتا تھا ۔ اس راستے کے دونوں جانب جنگلی بادام اور برگد کے طویل القامت درخت کھڑے تھے جن میں کوّں اور چیلوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے ۔ کبھی کبھی گلہریاں پیڑوں پر دوڑتی نظر آتی تھیں بحیثیت مجموعی منظر نہایت خاموش اور پرسکون تھا ۔ خاموشی ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی ۔ اب کی شیام کی باری تھی ۔ اُس نے کہا " تو سوشیلا یوں تم نے اپنے لئے ایک نئی زندگی منتخب کرلی " ؟ وہ سراپا ایک علامت استفہامیہ معلوم ہو رہا تھا ۔ سوشیلا نے تصور بھی نہ کیا تھا کہ ان کی گفتگو اس طرح یکایک اس قسم کا پہلو اختیار کرسکتی تھی ۔ کبھی اُسے خیال تک نہ گذرا تھا کہ اُس کا سیدھا سادھا شیام ایسی ظالمانہ قوت سے اُسے لاجواب کرسکتا تھا اُس نے حیرت کے ساتھ شیام کی طرف نظریں اُٹھائیں اُس کے چہرے پر سنجیدگی اور سکون تھا ۔ سوشیلا نے محسوس کیا کہ اُسے کچھ نہ کچھ جواب دینا ہی چاہئے چنانچہ اس نے کہا " ہاں شیام یوں ہی سمجھو "۔

" بغیر سوچے سمجھے تم نے وہ چیز قبول کرلی جسے حاصل کرنے کا تمھیں موقع مل گیا ؟ " " نہیں تو ۔ میں نے اس مسئلے پر کافی سے زیادہ غور کیا ہے "۔

" مگر ایک ہی زاویۂ نظر سے ۔ سوشیلا تم نے کبھی زندگی کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہے ؟ "۔

" تم ایسی انوکھی باتیں کیوں کر رہے ہو ۔ اپنی حد تک تو میں سمجھتی ہوں کہ میں زندگی کو اچھی طرح جانتی پہچانتی ہوں "

شیام مسکرانے لگا ۔ اُس کی نگاہیں دور اُفق پر جمی ہوئی تھیں اور سوشیلا نے محسوس کیا کہ وہ زمانۂ قدیم کے شہزادوں سے کسی طرح کم نہیں ہے ۔ اُس کا دل عجیب عجیب اندیشوں سے دھڑکنے لگا ۔

" سوشیلا تم کیا جانو کہ زندگی کیا ہے ۔ تم تو خود اپنے آپ سے بھی واقف نہیں ہو "

" تم ایسا کیوں کہتے ہو شیام ؟ "

" اس لئے کہ میں تمھیں جانتا ہوں "

" تم کیا جانتے ہو ؟ تمھیں کیا معلوم کہ میں کیا ہوں "

"تم ایک تبدیلی پسند ننھی سی روح ہو ـــ اور تغیرات کو محبت کے لافانی احساس پر ترجیح دیتی ہو ـــ
" سوشیلا کی حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ شیام تو ایک دیوتا کے مانند تھا کہ اُس کے دل کی باتیں پڑھ سکتا تھا۔
" مگر میں اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ ہر شخص کو واقعات اور اتفاقات کا خیر مقدم کرنا چاہئے شاید مجھے ایسا اچھا موقع پھر نہ ملے۔ میں اس زندگی سے تنگ جو آگئی ہوں " سوشیلا کا جواب بے ربط تھا۔ شیام ایک منٹ تک غور سے اُسے دیکھتا رہا پھر اُس نے کہا " سوشیلا تم جانو ـــ میں تمھاری مخالفت نہیں کرسکتا۔ تاہم اتنا جانتا ہوں کہ اگر ہم دونوں چند دن کے لئے کسی خوبصورت اور دلچسپ مقام پر چلے جائیں تو یہ ایک اچھی خاصی تبدیلی ہوسکتی ہے۔ اور اس تبدیلی کے بعد ہم تازہ دل و دماغ کے ساتھ ایک دوسرے کو زندگی کے معنی سمجھا سکیں گے " وہ ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ سوشیلا کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ نظریں اُٹھا کر شیام کو دیکھے۔ اُس نے کہا " ہمیں تیز چلنا چاہئے۔ کہیں ٹرین چھوٹ نہ جائے " شیام نے جواب میں اپنی رفتار تیز کردی اور خاموش رہا۔ سوشیلا کو اس سے بڑا دکھ ہوا۔ کاش آج وہ وقت پر اسٹیشن نہ پہونچے۔ ٹرین چھوٹ جائے۔ اُسے سوچنے سمجھنے کے لیے ایک دن اور مل جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے تمام باتوں پر اچھی طرح غور ہی نہیں کیا ہے۔ شیام اس قدر تیز کیوں چل رہا ہے؟ وہ اتنا خاموش کیوں ہے؟ کاش وہ کچھ اور کہے۔ سوشیلا کے دل کی خواہش پوری ہوگئی ـــ شیام کا پاؤں ایک کانٹے دار جھاڑی میں اُلجھ گیا تھا اور اُس نے اپنا پیر آزاد کرنے میں پورے پانچ منٹ صرف کردئے۔ سوشیلا نے بھی چلنے کے لئے جلدی نہ کی۔ وہ خاموش کھڑی شیام کے پیروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آخر کار اُس نے کانٹے کو نکال پھینکا وہ اپنی جگہ پر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اور ایک عجیب آواز میں اُس نے کہا " سوشیلا میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں " اُس کی آنکھوں میں بجلیاں چمک رہی تھیں۔ سوشیلا کو اس بات کا ایک زمانے سے یقین تھا لیکن اسے آج تک اس کا علم نہ تھا کہ یقین کے بھی مختلف درجے ہوتے ہیں۔ اُسے اس امر کا شعور پیدا ہوا کہ انتہائی یقین اُسے آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ سوشیلا کی نظریں شیام کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے اس بات کا مطلق احساس نہ تھا کہ غیر شعوری طور پر اُس کی نگاہیں شیام کی محبت پاش نظروں کا جواب نہایت ہی جوش اور ولولے کے ساتھ دے رہی ہیں۔ اس کے بعد ان کی زندگیوں میں پہلی مرتبہ وہ لمحہ آیا جس کے متعلق اگر کہا جائے کہ آسمانی ہستیوں سے علٰحدہ کرکے انسانی زندگیوں میں نفوذ کرایا جاتا ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

جب وہ اسٹیشن کے قریب پہونچے تو ٹرین روانہ ہو چکی تھی۔ سوشیلا کا اسباب پلیٹ فارم پر رکھا تھا۔ اور اس کا بوڑھا ملازم پریشان کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک ڈبے میں سے کچھ لوگ ہاتھ سے اس کی طرف کچھ اشارے کر رہے تھے۔ لیکن سوشیلا کو نہ ٹرین کے جانے کی پرواہ تھی اور نہ اُن لوگوں کے اشاروں کا مطلب سمجھنے کی خواہش۔ کیونکہ ابھی ایک لمحہ پہلے اُس نے زندگی کا مطلب نہایت ہی نمایاں اور واضح طور پر سمجھ لیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ٹرین نظروں سے اوجھل ہو گئی تو سوشیلا نے ملازم کو سامان واپس گھر لے جانے کا حکم دیا اور خود شیام کے ساتھ اُسی راستے پر لوٹ گئی جس سے کہ وہ آئی تھی۔ اس وقت تک مغرب ہو چکی تھی اور چاند میں روشنی آ گئی تھی شام کی ہلکی ہلکی ہوائیں درختوں کی ٹہنیاں ہل رہی تھیں اور پرندے اپنے آخری گیت گا رہے تھے۔ کچھ دور سے جلی ہوئی مٹی اور راکھ کی سوندھی ارماں پرور خوشبوئیں آ رہی تھیں سوشیلا نے محسوس کیا کہ ہر چیز اور ہر منظر میں ایک نئی جاذبیت پیدا ہو چکی ہے۔ خود اُس کی اپنی ہستی اُسے پہچانی نہ پڑتی تھی اُس میں ایک عجیب دلنواز تغیر ہو گیا تھا —— وہ خاموشی سے چلے جا رہے تھے اور اُن کی خاموشیاں گفتگو سے زیادہ معنی خیز تھیں۔ جب کبھی وہ بات کرتے تو ان کے الفاظ محبت اور چاہت کی گرمی سے لطیف سے لطیف تر ہو جاتے اور پھر مجبوراً انھیں گفتگو کا خیال ترک کر دینا پڑتا۔ ان کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ایک ہلکی سی بھولی بسری مسکراہٹ قہقہہ بن جانے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ شام کے بڑھتے ہوئے دھندلکے ہیں انھیں گھر کی راہ دکھانے کے لئے آسمان پر چاند جگمگا رہا تھا اور زندگی کا راستہ بتلانے کے لئے اُن کے دلوں میں محبت کا نور چمک رہا تھا۔

آنسہ رابعہ اکبر حسن بی۔اے (ابتدائی)

میر حسین علی خاں صاحب متعلم سال چہارم کی بے وقت موت ایک دردناک سانحہ ہے۔ ڈوبتے ہوئے بھائی اور باپ کو بچانے کے لئے اس نوجوان نے اپنی جان دی۔ ان کی موت ہمارے لئے ایثار و قربانی کا ایک نمونہ ہے۔ مرحوم ان چند خاموش نوجوانوں میں سے تھے جن کو صرف اپنے کام سے کام رہتا ہے۔ وہ ایک نہایت حلیم، بردبار اور شریف الطبع طالب علم تھے ہنگاموں سے ہمیشہ دور رہتے۔ دل و دماغ کی بے شمار عمدہ صلاحتیں قدرت نے انھیں ودیعت کی تھیں۔ افسوس کہ یہ گل ناشگفتہ یوں ہی مرجھا گیا۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے فقط

تنقید و تبصرہ

خواتین دکن کی اُردو خدمات

مؤلفہ نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ ضخامت ۲۹۱ صفحے۔ تقطیع چھوٹی۔ قیمت (عـ۸) پتہ سید عبد الرزاق تاجر کتب عابد روڈ۔

ہاشمی صاحب کو نسوانیات سے کافی دلچسپی ہے اور اس موضوع پر اس سے پہلے ان کی دو کتابیں "خواتین عہد عثمانی" اور "خیابان نسوان" شائع ہو چکی ہیں۔ دکنی خواتین نے اُردو کی سرپرستی، شعر گوئی و نثر نگاری، خطابت، صحافت اور انجمنوں کے ذریعہ اردو کی جو خدمات انجام دی ہیں انھیں زیر نظر کتاب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے! اور ان خواتین کے مختصر حالات زندگی بھی درج کئے گئے ہیں اور ان کی نظم و نثر کے نمونہ بھی دیئے گئے ہیں اور اپنے طور پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد سے علم و ادب کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہے اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری خواتین اس "بقعۂ نور" سے کسب ضیاء کرنے میں کسی اور سے پیچھے نہیں ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے جناب ہاشمی صاحب کی یہ کوشش لائق تحسین ہے۔ کتاب میں بعض خامیاں بھی ہیں۔ چند ایسی خواتین کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے جن کا مستقبل درخشاں ہے۔ لیکن جن کی نوخیز کوششیں ابھی محتاج تعمیر ہیں۔ شائد اس سے ہمت افزائی مقصود ہو۔ لیکن اچھا ہوتا اگر ہاشمی صاحب کچھ دن بعد اس موضوع پر قلم اٹھاتے جبکہ ان خواتین کی کوششیں بار آور ہوتیں۔ کتابت وطباعت کی

بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں۔ بحیثیت مجموعی کتاب قابل مطالعہ ہے۔

آسان اُردو

مرتبہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد۔ ضخامت ۱۶۱ صفحے تقطیع چھوٹی کتابت طباعت بہتر۔ قیمت ۸ ر۔ پتہ انجمن ترقی اُردو حیدرآباد۔ بجارہ روڈ حیدرآباد دکن۔

انجمن ترقی اُردو حیدرآباد نے بالغوں کی تعلیم کے لئے ایک سلسلہ درس قائم کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں بعض بزرگوں اور مشاہیر کے حالات اور چند مفید کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ لاسلکی، حفظان صحت اور شہریت وغیرہ جیسے عنوانات پر پُراز معلومات مضامین ہیں۔ حصۂ نظم کا انتخاب بھی اچھا ہے۔ زبان سلیس و آسان ہے۔ ہماری تمنا ہے کہ یہ سلسلہ کامیاب ثابت ہو۔

بربطِ ناہید

مرتبہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی ام۔ اے (عثمانیہ) ضخامت ۱۶۴ صفحے کتابت طباعت اچھی۔ قیمت ندارد، مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔

یہ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کا بیشتر حصہ مختلف اوقات میں اکثر رسالوں میں چھپ چکا ہے۔ یہاں ان کو کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ ادبی دنیا میں کافی متعارف ہیں۔ ان کا اپنا ایک اسلوب بیان ہے۔ یہ مجموعہ بڑا دلچسپ ہے۔ جب تک ختم نہ ہولے کتاب ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ ان خطوط میں سے بعض میں سوز و گداز ہے تو بعض شوخ اور بعض اصلاحی پہلو لئے ہوئے۔ بعض خطوط میں کالج کی زندگی پر بڑے پرلطف انداز میں تبصرہ کیا ہے بعض میں سماجی مسائل پر تنقید بھی ہے لیکن اس انداز میں کہ مخالف بھی بغیر لطف اٹھائے نہیں پڑھ سکتا۔ زبان نہایت لطیف و رنگین ہے۔ خیالات میں بلا کی روانی ہے۔ گو بعض جگہ تسلسل قائم نہیں رہا مگر خطوط میں ربط و تسلسل کی تلاش ہی بے کار ہے یہ کتاب ادب لطیف میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

شاعر کی دنیا

مرتبہ محمد عظیم الدین صاحب محبت بی۔ اے (عثمانیہ)۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۶ کتابت وطباعت اچھی۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔ قیمت ندارد۔ پتہ ام۔ اے دین۔ روبرو نظامت کروڑگیری حیدرآباد دکن۔

فاضل مرتب نے اس کتاب میں جدید حیدرآباد کے چالیس شعرا کا منتخب کلام

جمع کر دیا ہے اور بقدر معلومات اپنے انداز میں حالات زندگی بھی بیان کئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس انتخاب سے حیدرآباد کے جدید شعری رجحانات پر ایک حد تک روشنی پڑتی ہو لیکن اس سے ذوق سلیم کی تشفی نہیں ہوتی۔ جناب محبت کی کوشش مشکور ہوتی۔ اگر انتخاب میں ذرا احتیاط سے کام لیا جاتا۔ شعر و سخن کی خدمت کے لئے حیدرآباد میں ایک وسیع میدان موجود ہے۔ کیا اچھا ہو اگر ہماری منتشر کوششیں ایک ہی مرکز کے ذریعہ کسی ٹھوس کام میں صرف ہوں۔ لمحاتِ فرصت میں مطالعہ کے لئے یہ کتاب بہرحال موزوں ہے۔ آج کل مؤلف کی تصویر کی اشاعت ایک ادبی بدعت ہے اور اس کتاب میں بھی یہ "بدعت حسنہ" موجود ہے۔

"ا۔خ"

کلیہ کی خبریں

خصوصی جلسہ تقسیم اسناد

بتاریخ ۱؍ ردے ۱۳۵۰ف جنرل ہزہائی نس حضرت والا شان نواب اعظم جاہ بہادر پرنس آف برار و ولی عہد دولت آصفیہ کی خدمت میں جامعہ کی جانب سے ال۔ال ڈی کی اعزازی ڈگری پیش کی گئی۔ یہ تقریب جامعہ کی تاریخ میں ہمیشہ یادر ہے گی۔ اس تقریب میں مشاہیر علما عہدہ داران سرکاری اور دیگر معززین مدعو تھے۔ حضرت ولی عہد بہادر کی آمد پر طلبا، نے پرجوش تالیوں سے آپ کے استقبال کی عزت حاصل کی۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر معین امیر جامعہ نے حضرت والا شان کا تعارف کراتے ہوئے آپ کی ملکی خدمات اور علمی شغف کا تذکرہ فرمایا۔ رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر امیر جامعہ نے پرجوش نعرہائے تصفیق کی گونج میں ہزہائی نس کی خدمت میں ال ال ڈی کی اعزازی ڈگری پیش فرمائی۔ حضرت ولی عہد بہادر نے اس موقع پر نہایت ہی فصیح و بلیغ تقریر فرمائی۔ آپ نے طلبا، کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "جب تک ہم نیک نیتی سے علم کی تلاش میں لگے رہیں گے مذہب کی ہدایت اور باہمی مروت اور حق شناسی کے راستہ پر چلتے رہیں گے اور جب تک جذبات و خواہشات پر قابو رہے گا اس وقت تک ہماری کوششوں کی ناکامی کا اندیشہ نہیں ہو سکتا اور بفضل خدا ہمارے قدم امن و مسرت کی جانب بڑھتے رہیں گے" حضرت ولی عہد بہادر کا یہ ارشاد گرامی ہمارے لئے مستقل ہدایت ہے۔

جلسہ کے اختتام پر پُر تکلف عصرانہ دیا گیا تھا۔ یہاں بڑی دیر تک طلبا، نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ شہزادۂ برار کی خدمت میں حاضر ہوتے اور **Autograph**

حاصل کرتے رہے حضرت والاشان نے ان عقیدت مندانہ جذبات کی قدر فرماتے ہوئے نہایت لطف و محبت سے اپنا Autograph عنایت فرمایا۔ چھ بجے حضرت ولی عہد بہادر و دیگر اراکین خانوادۂ آصفی مراجعت فرما ہوئے۔

عشائیہ بتاریخ ۹ ہردے ۱۳۵۰ف بروز چہار شنبہ ہز ہائی نس پرنس آف برار کے اعزاز میں طلبائے جامعہ کی جانب سے عشائیہ کے انتظامات نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کئے گئے تھے۔ حضرت والاشان نے ازراہ مکرمت بحیثیت مہمان خصوصی طلبائے جامعہ کی دعوت قبول فرمائی۔ امراء و عہدہ داران و دیگر سربرآوردہ شہری بھی مدعو تھے عشائیہ کے بعد ڈاکٹر والاشان اور دیگر مہمانوں نے جلسہ موسیقی میں شرکت فرمائی یہاں حضرت والاشان کی خدمت میں مہتمم مدیر مجلۂ عثمانیہ کا ایک سٹ پیش کرنے کی عزت حاصل کی کوئی بارہ بجے رات یہ تقریب کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔ ہز ہائی نس نے ازراہ طلباء نوازی ابوالمکارم محمد فہیم الدین صاحب معتمد عشائیہ اور اکبر علی ناصری صاحب معتمد جلسہ موسیقی کو دو بیش قیمت طلائی گھڑیاں عنایت فرمائیں ہم ان دونوں برادران جامعہ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

انتخابات اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس سال کی انتخابی مہم ایک یادگار واقعہ ہے صدارت کے لئے تین امیدوار تھے کالج کے کھلتے ہی اس انتخابی مہم کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور ہر فریق پورے جوش کے ساتھ سرگرم عمل تھا۔ بالآخر اس جوش اور سرگرمی نے ایک ناگوار صورت اختیار کرلی محمد عمر مہاجر صاحب جو صدارت کے امیدوار تھے آخری دن دست بردار ہونے سے انتخابات کی ساری کارروائی شور و غوغے کی نذر ہو گئی نتیجتہً انتخابات کو ایک غیر معین مدت تک ملتوی کردیا گیا ہے

نئے تقررات یہ امر عثمانین کے لئے نہایت مسرت و خوشی کا باعث ہے کہ ڈاکٹر سید حسین صاحب جامعہ کے نئے پرنسپل مقرر ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف سے کالج کا ہر طالب علم واقف ہے

مسٹر سید حسن رضوی بی-اے نائب مدیر حصہ اردو

مسٹر غلام غوث خان بی-ایس-سی نائب مدیر حصہ انگریزی
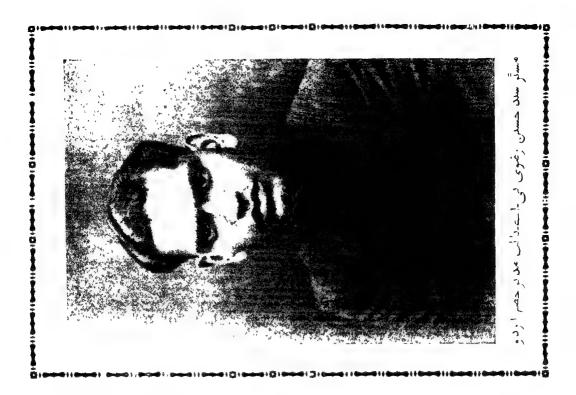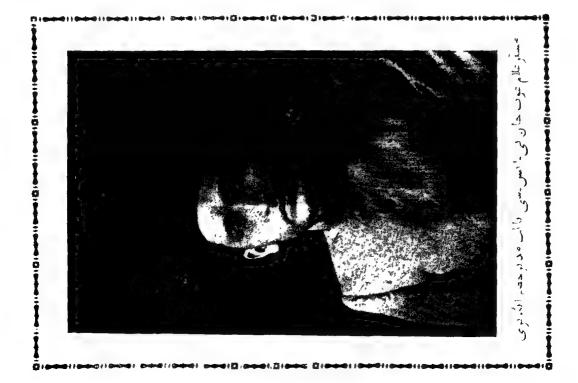
آپ نے طلباء کی ہر موقع پر مدد کی ہے ڈاکٹر صاحب جامعہ عثمانیہ کے ان مایہ ناز سپوتوں میں ہے جنھوں نے مادر جامعہ کی خدمت کو اپنا شعار بنا لیا ہے ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پر خلوص مبارکباد پیش کرتے ہیں ۔

سید عبداللطیف صاحب رضوی لکچرار معاشیات کا تقرر مددگار ناظم نظامت اعداد و شمار پر ہوا ہے آپ نہایت خلیق و ہمدرد استاد تھے ۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی خدمات نئے عہدہ کے لئے بھی اتنی ہی مفید ثابت ہوں گی ۔ آپ کی جگہ مولوی محمد ناصر علی صاحب ام ۔ اے (عثمانیہ) کو ترقی دی گئی ہے اور مولوی امتیاز حسین صاحب بی ۔ کام (الٰہ) کا تقرر بحیثیت جونیر لکچرار کیا گیا ہے ۔ ہم ان دونوں حضرات کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں ۔

جنگ کے سلسلہ میں پروفیسر ہارڈنگ کی خدمات حاصل کئے جانے کی وجہ سے مسٹر ڈی ایس کرشنن حصہ انگریزی کے مشیر ادبی مقرر ہوئے ہیں ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں ۔

ڈاکٹر وحید الدین جامعہ کے ممتاز سپوت ہیں ۔ شعبہ انگریزی میں لکچرار مقرر ہوئے ہیں آپ ہماری جامعہ کے طیلسان ہیں اور جرمنی سے فلسفہ میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے ۔ آپ نے مجلہ عثمانیہ حصہ انگریزی کی ادارت کے فرائض بھی انجام دئے ہیں ۔ ہم انھیں پُر خلوص مبارکباد دیتے ہیں ۔

ہم ڈاکٹر قادر الدین خاں صاحب ام ۔ ایس سی (عثمانیہ) کا خیر مقدم کرتے ہیں جنھوں نے لندن سے حال ہی میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی اور ڈی ۔ آئی ۔ سی کی ڈگریاں نہایت امتیاز کے ساتھ حاصل کی ہیں آپ کے تحقیقاتی کام کی لندن یونیورسٹی کے اساتذہ نے بڑی تعریف کی ہے ۔ آپ کو اسی کام کی وجہ سے دوران جنگ میں لندن میں ٹھیرنے کی اجازت دی گئی تھی ۔ شعبہ حیوانیات میں آپ لکچرار کے فرائض انجام دے رہے ہیں ۔ ہم انھیں دلی مبارکباد دیتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ وہ اپنے تحقیقاتی کام اسی طرح جاری رکھیں گے ۔

تعزیت ادارہ اپنے عمیق جذبات رنج و غم کا اظہار کرتا ہے کہ مولوی حمید احمد صاحب انصاری سابق مہتمم جن کو وظیفہ پر علحدہ ہو کر کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا یکایک ۔۔ حرکت قلب کے

بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ قیام جامعہ سے اب تک مرحوم نے جامعہ کی نہایت پُرخلوص خدمت کی تھی۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

کھیل طلبہ عام طور پر اب کھیلوں میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں مختلف ٹیموں کی حالت اس سال نسبتاً اچھی ہے بین الجامعاتی فٹ بال ٹورنمنٹ میسور میں ہماری ٹیم نے سیمی فائنل جیت لیا ہم اس کامیابی پر ٹیم کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ مسرت کی بات ہے کہ اس سال اتھلیٹک اسپورٹس چمپین کپ جامعہ نے حاصل کیا کپتان اس کوشش کے لئے قابل مبارکباد ہیں۔

اسپورٹس کمیٹی جناب نائب معین امیر جامعہ کی کوششوں سے اس سال ایک اسپورٹس کمیٹی قائم کی گئی ہے جس میں علاوہ صدر کپتان اور معتمد صاحبان کے اقامت خانوں کے سوذب صاحبان اور اقامت خانہ کا ایک نمایندہ شریک ہے اس کمیٹی کے صدر مولوی ثناء اللہ صاحب فزیکل انسٹرکٹر اور معتمد شمس الدین صاحب فاروقی کپتان اسپورٹس مقرر ہوئے ہیں یہ کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی ہے کہ جامعہ کے کھیلوں میں شرکت کے لئے زیادہ سے زیادہ طلباء کو راغب کرے اور حتی الوسع کھیلوں کا معیار بلند کرے ہم متوقع ہیں کہ یہ کمیٹی ہماری شکایات کو جلد سے جلد دور کردے گی۔

کلیہ انجنیرنگ جناب حسن لطیفی صاحب کلیۂ انجنرنگ کے صدر مقرر ہوئے ہیں۔ صاحب موصوف کلیہ کے معاملات میں نہایت سرگرمی و دلچسپی کا اظہار فرما رہے ہیں چنانچہ آپ کی کوششوں سے بزم انجنیرنگ قائم کی گئی ہے جس کے صدر حسن علی حیدری صاحب متعلم بی۔ ای (سال سوم) اور معتمد رشید سبحانی صاحب متعلم بی۔ ای (سال دوم) منتخب ہوئے ہیں۔ بزم کا افتتاحی جلسہ آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر وزیر تعمیرات کی صدارت میں منعقد کیا گیا تھا۔ فنی تقریروں و مباحثوں کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا جا رہا ہے بزم میں طلبا نے کافی دلچسپی لی ہے ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ نئی بزم کامیاب ہو اور دوسروں کیلئے قابل تقلید بنے

سید حسین رضوی
نائب مدیر

	CAPTAINS.	SECRETARIES.
Cricket:	Mr. S. M. Hosain	Mr. Malik Arjun Patel
Football:	,, Khalillah	,, Badruddin
Hockey:	,, Mujtaba Yar Khan	,, Saif Ali Baig
Tennis:	Mr. Abdul Wahab	....
Swimming Club:	Mr. Mohd. Abdul Hamid Khan	....
Boarding Club:	Mr. Fareed Mirza	....
Volley Ball:	Mr. Muzharuddin	....

Before concluding we must express our gratitude to Mr. Wahidur Rahman, Honorary Treasurer of our Magazine for his invaluable advice and counsel given from time to time.

GULAM GOUSE KHAN STUDENT.
M. Sc. (FINAL).
Joint Editor, English Section.

Husain was very popular among the students as a Proctor, and his appointment is therefore specially welcome to the students.

We welcome Dr. Qadruddin Khan, who has joined the staff of the Zoology department. His academic career both at Osmania University and at London was brilliant. He was awarded the Ph. D. degree of London University in 1940. His work in Entomology has been recognised as highly original. We hope that he will continue to advance the study of this vital branch of Zoology.

Games.

Contrary to the remarks made by certain critics the standard and the extent of the athletic activities of the University have been steadily rising during the period under review.

Our cricket team played several matches with other teams. Malik Arjun Patel, Secretary of the team arranged these matches. Our cricket team won the H.U.C C open tournament and we offer our congratulations to the skipper. We hope that the present standard will not only be maintained but will also be improved under the leadership of our provost Mr Hosain Ali Khan, President of the University Cricket Club.

We are very happy to record that our foot-ball team won the semi-final match at Mysore in the Inter University Tournament. On heartiest felicitations are due to the captain, Shaik Mohammed Khalilullah and his team.

The following are tha office bearers of the various games. The University has high expectations of them.

An At Home was given in honour of His Highness after the convocation. The Princes and Princesses graciously gave their autographs to the students who sought them. His Highness was quite at home with the students. The day of His Highness's arrival was a red letter day for us, and shall ever remain fresh in our memories. The students gave a dinner in honour of His Highness in the Address Hall. The nobles of the State and Members of the Executive Council were also invited. The students gave a warm reception to His Highness on his arrival.

A music party was arranged after dinner at which His Highness with Sir Akbar Hydary, Nawab Mehdi Yar Jung and other distinguished guests was present. His Highness was very much delighted with the arrangements of the music party done at short notice by Professor Sayeedud-din President, Music Association. His Highness was very pleased with the performance of Mr. Rauf, and old boy of our University. His Highness graciously announced two prizes. The recepients of the prizes are Mr. Fahimuddin, Secretary for dinner arrangements and Mr Akbar Ali Nasri Secretary for music arrangements. We congratulate them for this honour conferred on them by His Highness.

Obituary.

We express our deep sorrow at the demise of our late Registrar, who was very popular with the students, and had rendered great services to the University.

Appointments.

It is very gratifying to see that Dr. Syed Husain, has been appointed Registrar of our University. Dr. Syed

COLLEGE NEWS.

After the summer vacation our academic year commenced in Amardad. Residence in the hostels was made compulsory for the first year students, hence an appreciable majority of students began to stay in the hostels. Consquently the pressure on buses was considerably reduced. Two more hostels had to be opened with greater number of facilities.

As usual with the commencement of the first term, election activities began, which absorbed for a time the entire attention of the students. Three candidates were nominated and confirmed for the office of the president of the Students' Union, but elections were postponed due to some unforeseen factors.

The election has, since then, taken place; and we offer our congratulations to Mr. Mohammad Omar Mahajir who has been elected to the presidential chair.

Special Convocation.

A special feature of the current year was the special convocation for the presentation of an honorary degree of LL. D to so distinguished a person as His Highness the Prince of Berar. This event is of great significance in the history of our University, and in doing this honour the University is itself honoured. On the 7th of Dai. 1350 F. the Righ Honorable Sir Akbar Hydari, Chancellor of the University had the honour of presenting the degree to his Highness the Prince of Berar.

away——Have those westerners forgot their bacons and oysters to condescend to such a 'vulgar repart'.

The number of girls —— well painted, well dressed, mischievous and adventurous increases.

"Favours to none, to all she smiles extends,
Oft she rejects but never once offends."

Some now appear and now disappear in a mysterious way—— amid some dark alleys of the benighted rendezvous. Some loiter assuming a reserved seemly virtue, most advertently displaying all their beauty and grandeur created out of long hour's ordeal of their toilets.

Look, their comes a bevy. They appear like the three goddesses who went down the valley to Paris, who sat in judgement over the 'Apple of Discord. They have come to see who proves the fairest. They are too dangerous: Do not speak and let them pass...... .

The March of civilization !! We must not stay.

GHYASSUDDIN KHAN, M. A. (PREVIOUS).

vacantly from behind the glasses appearing to understand and stare at nothing. A semblance of mild smile playing upon his lips. Clean shaven! ——— In this time of his age? He has a walking stick under his arms; it appears to have been use drarely. His hands are clasped together behind his back. And there he goes—his huge belly heralding, as it were, his approach. Why does he thus expose himself to the censure of others. A revolving chair is the right place for him. What is he doing here? Taking a walk? Does he hope to reduce his unnecessary fat? Well, any how it is at too high a price.

There, a little high over the horizon the sun disappears: a phenomena of atmospheric refraction the scientists would say.

Now those uninteresting persons who are past the busy-day of their life depart: those who had been here to take a walk; those, to breathe in a full draught of the fresh air travelling from far beyond the distant strands. The life upon Juhu becomes more wild, more gay as the moon rises and whips the prodigal waves back to the firm solid land. The basements of the coastal pleasure-resorts a few hours hence shall once more be washed by the sounding sea; and Juhu shall be lost to appear tomorrow once more out of the waves. What is there?... those lights: O, I see ...... They are so dreadfully hungry. The evening's indulgences have increased their. appetites enormously. Like a hunter they rush to the spot and take what 'fare' they could. How naturally do they gulp down what they shall never even in their dreams reconcile them selves to turn and look at. They are jostling their way ahead, elbowing each other

O cursed spite......... Don't look at it. Who shall chase her out of the Eastern skies! O, War! O, Hitler...... .. .. How ridiculous—cowardice: It is after all an innocent 'Moth'. It is on its pleasure trips, I suppose? Five rupees! ... for a round of Juhu. That is too much. I think it is more pleasant to hear the droning of friendly plane over head than to sit in its tail and miserably fail to contemplate how far the world has really progressed. Thrilling? Nay, thrills have no charm for us Non-violent satyagrah is our national 'R.A.F'! Train yourselves for the emergency.

Behold: it is descending low——— and lower still -— it is hardly a few feet above that. What is that? The sun is dazzling. Its reflection is almost blinding. It is a girl riding, her horse knee-deep in water. She is alone: how daring! What shall she do if the waves like the Noah's Deluge rise and sweep her away? The ladies shall shriek and throw themselves in their lovers' arms. How Neptune shall be cursed and a Hercules' advent expected! Coming out of no-where a gallant youth shall swim to her rescue. Like wild fire the news shall spread all along Juhu. All in their various 'habits' shall rush to gaze vacantly where life struggles with youth. The Hercules shall return carrying his pretty find, painted and flat on his mighty arms. They shall lay her on the sand. All shall feel the drama of the situation. He shall bend over her as the man of the moment. She shall slowly come back to her senses. Their eyes shall meet: certain gratitude conveyed and received in their glances ——more powerful than the words can be ever expected to be...... then a romance. Fantasy! All.

Here is a personality: A prominent belly, sagging over his slacking knees. A double chin. Small eyes gazing

of it........... There is the Radio station. It is from here that Rafique Gaznavi broadcasts his ecstatic rhapsodies ——a strange combination of the Eastern and Western music. And there the aerodrome, a vital point: a nerve centre of modern India. If Hitler resolves to take India under his 'protection' this shall be the first military objective that shall be bombarded by the *Luft waffe* ...... Hasten from here ; this is not a place for us

Here at last is Juhu.

How magnificient, beautiful, how wide and distant is the shore. The coast is covered all over with high palm trees: little cottages, homely and unpretentious, rise between them. Now and again heavy clouds of dust start from the neighbouring road that runs alongside of the coast and settle on these thatched roofs. As far as the eye could reach it is life—bubbling life and youth. Here are no social barriers: Europeans, Indians, Hindus and Muslims, Parsees and Christians, men and women, young and aged alike, how freely do they move together. What a place for our leaders to preach unity, equality and fraternity ! I suppose they have never heard of Juhu.

What a goodly pair! But, lo, they appear to be of different nationalities. They throw down their cloths and in their swimming costumes hand in hand they go towards the waves. Why, there are already several pairs exulting in their aquatic play. Whenever the water is splashed, whenever a nymph rises out of the waves and gives a good shake to her head, the tiny drops of water dissipate, coloured crimson, red and blue as the mild rays of the setting sun pass through them. The waves......— Hark, there is some droning overhead. Most probably, certainly it is a german bomber. The time is out of joint,

Bombay has always been famous for its hospitality. It is at Bombay that westerners get down and first breathe the Indian air, standing upon the Indian soil under the Indian skies. It is to Bombay that truants run and lovers elope. And again it is at Bombay that Australians make a stay in times of war.

Come, let us to Bombay and see for ourselves what it really is. I know, my gentle reader, what you want me to speak about. Well there is nothing to blush: you are dying to hear something about Juhu: then out with it.

Juhu is just round the corner.

Sunday is the day, and 'Bombay Central' the place to start from. From Central to Santa Cross, and to Juhu from Santa in a motor bus .... That disgusting drudgery—tickets, guards, conductors and dust.

These electric trains: why, after all they run as softly as anything. What noise? .... a guitar. O, what is wrong with them? What are they making all this mess about? They are drunk. Shameful! Prohibition!...... smuggling—sham, that is the word for it. The Puritans closed the theatres all over England when they rose to power; America went dry when women predominated the American life: they wanted to keep their boys good and well-behaved; and prohibition came into force when B. G. Kher left the dark, recesses of the Bombay High Court for the bright and well-lighted chambers of the Government Secretariate.

These buses...... pre-war—out of it: where are our Leylands? Jolting like a cart—rotten; let us not think

EAST AND WEST.

EAST AND WEST :—When do we think of that. It is seldom I suppose. We think of the east when

"The morn in russet mantle clad,
Walks over the dew on yon high eastern hills."

and when Phoebus emerging forth in his power looks everything out of the sky and holds sharp uninterrupted empire from his throne of beams. We think of the west, when that part of heaven is shot red by the setting sun, when the sky is all a-glimmering and purpled grey. Of East and West together we think when we have to applaud or decry the blessings or evils of the western civilization and then at once we say 'East is East and West is West—and never the twain shall meet.' The East stands for Buddhism, Confuciauism. Despotism, Fanaticism and for everything that is gorgeous, beautiful and romantic. The West stands for science, atheism, and for everything modern and destructive.

Bombay was the first of the Indian cities which behaved in a strange manner. Years before H. E. the Viceroy held his levees at simla, the fate of Bombay was decided by the whims of the Western monarchs. It was given, they say, in dowry to a Portuguese Princess who married a Prince of England. How strange! how like a tale of the Arabian Nights. But it is true, that is an irony of fate............Hush ...... let us keep that secret.

value of national language and a national literature with its cultural and linguistic associations was felt. Hence, the Osmania University, a unique institution, came into existence as an embodiment of self-conciousness and self-realisation. The emergence of this unique institution is an expression of the national awakening.

It is with regret we see that Lord Curzon's educational policy was to curtail it, if possible, and crush the national influences in the schools and colleges managed and controlled by Indian agencies. All these go to prove that the system of Indian education was not so designed as to produce an atmosphere where thoughts of freedom might grow and flourish. It has, in fact all these years stood so isolated from the needs and wishes of the people that now people have come to realise it as an anachronism Vigorous attempts are, therefore being made to revolutionise it or to overhaul it. It is being sought to bring it, more and more, into conformity with India's political, social, cultural and economic life. Its over-literary aspect is sought to be balanced by giving it a vocational bias, and its literal aspects is being balanced by giving it a practical turn. One purpose, however, it has served admirably. It has provided a volume of discontent amongst its products, which has been a great political asset in the growth of Indian nationalism. The majority of the students has left the schools and colleges thoroughly dissatisfied with them and this factor has always been made use of by the agitators, politicians, and statesmen, who sought to build a new India. Only indirectly, therefore, it has served the cause of Indian nationalism. Otherwise it has never placed before the students any positive ideal of national unity, national regeneration and national reconstruction.

GULAM GOUSE KHAN,
M. Sc. (Final).
Joint-Editor, English Section.

Even when the Universities were founded in the presidency towns of India their object was, besides others, to impart such a secular education as may qualify the youth of India for admission into the civil and medical services of the East India Company. Thus motives of all kinds entered into the making of the educational system in India, but nowhere do we see that it aimed at removing mass illiteracy, at making Indians full of political aspirations or creating in then a feeling of oneness. It was essentially a system devised by an Imperial power for keeping its hold permanently on its subjects. But one might say that though what has been said above might be quite true of the educational system as desired by the East India Company, it might not be of the system as it was reformed, and modified when the crown took over the government of the country. I however do not think that the system has changed in essentials, though it has been tinkered with so often. Throughout these years it has remained not only unresponsive but even hostile to to the growth of Indian Nationalism. If this had not been so why should every strong wave of national feeling in this country have produced its own type of national education. In the last part of the nineteenth centuary we had a type of national education favoured by the Brahmo Samaj and other organisations in the country. In the days of the partition of Bengal we had the Bengal Society of national education. Again Mahatma Gandhi in his non-cooperation campaign asked the students to leave the school and colleges. During those days there sprung up again national schools and colleges at several places in India, the aim of which was to impart national education as opposed to the official education provided in the schools and other colleges controlled by the state. The

Mr. Sh: Mohammed Khalilluah

B A. (Osmania).

An all round sportsman. He is now the University's Foot-ball Captain and also he is Ex-Secretary of the Foot-ball Club. Ex-Captain of Athletic Sports Club and the University sports Championship holder in 1348.

Mr. Syed Mohammed Hussain

B A. (Osmania).

Cricket Captain.

whom it is a sin and shame to have any frienly intercourse. Our bitterest enemies could not desire more than, that we should propagate a system of learning which excites the strong feelings of human nature against ourselves. The spirit of English literature on the other hand cannot but be favourable to the English connection. Familiarly acquainted with us by means of literature the Indian youth should cease to regard us as foreigners. They speak of great men with the same enthusiasm as we do. Educated in the same way, interested in the same subjects, engaged in the same pursuit with ourselves they will become more English, just as the Roman provincials became more Romans than Gauls or Italians."

From this it is evident why English was made the medium of instruction in schools and colleges, why the need of the study of English literature was so much stressed, why study of Indian languages and the allied classics was relegated to a negligible position. This was done for no other reason than that to which Lord Macaulay gave expression in his famous minute, " we must do our best to form a class who may be interpreters between us and the millions whom we govern, a class of persons Indian in blood and colour, but English in taste, in opinions, words and intellect." Thus the underlyingmotive of the educational system in India was to anglicise us. It was not only this, but something worse than this. The extracts from letters of Lord Maculay to his father clearly show that the educational system in India was brought to subserve Imperial and Christian interests. It was intended to keep Indians well satisfied with their position as a subject nation in the British Empire, to make them turn their backs upon their own culture and their religion and to make them think of British Raj as a great heaven-sent blessing.

of this are not far to seek The educational system in India, *from the day of its inception till the* present *day* has been strangely out of touch with the genius of Indians and with their social, economic, political and cultural needs. It has been so because it has been imposed from without, and has not sprung up as it were from the soil. It has been an artificial product and not a spontaneous growth. Education is not worth its name unless it is national. The country will not be loser if a bonfire is made of most of our available text books.

National education wants and implies an Indian outlook, and a devotion with a thirst for knowledge. Reorientation of the existing system will not satisfy our needs A revolution is needed in existing system.

The motives of those who laid the foundation of the Educational system in India, were not altruistic or philanthropical, but these were of crude expediency or those of sheer exploitation. That this is so would be clear to any one who goes through a handy little book "Education in India under the East India Company", by Major B. D. Basu. In the first place its was not a national system in any sense of the word.

Sir Charles E. Trevelyan who was a strong advocate of Occidentalising Indian education as against giving it a national, indigenous bias, said, "But what will be thought of that plan of national education which would revive them and make them popular, which would be perpetually reminding the Mohamedans that we are infidel usurpers of some of the fairest realms of the faithful and the Hindoos, that we are unclean beasts, with

But this mighty stream of Indian Nationalism was reinforced by many currents from abroad. The history of modern Europe did much to strengthen the aspirations of Indian Natianalists, and the Russo-Japanese war and the Tuko-Italian war fired the political ambitions of Indians a great deal.

From 1914 till the emergence of Mahatma Gandhi, Indian Nationalism remained more or less quiescent. Indian nationalists of almost all shades of opinion were unanimous in their desire to help England win the war. But soon the martial law atrocities in the Punjab and the inadequacy of the reforms, inaugrated in India fanned the flame of Indian feeling and what has happened during the last eight years is contemporary history, into the details of which one need not enter. Yet from this brief survey in India of the origin and development of Indian Nationalism some facts stand out clearly. Indian Nationalism has always stood for two things—political independence and the Educatianal reconstruction of India. It has therefore meant the attainment of Purna Swaraj, fiscal autonomy, independence in foreign relations. cultural unity, Indianisation of the services, control over the military, a new type of education suited to the social, economic and cultural needs of the country and a faith in Hindu-Muslim unity.

But the question is, has the educational system in India promoted the growth of Indian Nationalism at any step?

I think the answer to the question is very simple, direct and unequivocal. It has never done so directly and it has done only a little indirectly. And the causes

nount of selfrespect which they had lost by the injudi-ous criticism of the Christian missionaries in India. he writings of Ram Mohan Roy, Rabindra Nath Tagore ı Bengal, those of Ranade in Maharashtra, of Sir Syed hmed Khan in Upper India, of Madame Blavatsky and her Theosophists in Madras, also brought about a ew awakening. But all this happened before 1905. In le meantime the Indian National Congress was founded hich, for some years at least gave expression to the emands of Indian Nationalism in a very cautions, sober, nd moderate way.

From 1905 to 1914 Indian Nationalism remained very ggressive. In the seething cauldron of Indian Nationa-sm of those day went many ideologies. There was the oycott of the British goods, there was the National ducational movement independent of, but not in opposi-on to the government, there was a new note of national elf-assertion in the press, there were the Extremists ho believed in wresting power from the government by orce rather than by means of constitutional agitation, here were the religious revivalist, the Mother worship-ers and Vedantists. Who harnessed their spiritual ervour to the task of national reconstruction, there ere advocates of organised rebellion, and terrorists who elieved in the cult of the bomb and the revolver, there ere advocates of constructive nationalism who thought hat national progress should be based on social efficiency nd eductional reconstruction, and there were the mode-ates who thought that India's salvation lay in its faith n Englands' sense of justice and fairplay and its peace-ul political evolution.

THE EFFECT OF THE EDUCATIONAL SYSTEM IN INDIA ON THE GROWTH OF INDIAN NATIONALISM.

IN the first place it is necessary to trace the beginning of Indian nationalism and the causes thereof. The first of these was the English education imparted in the schools and colleges established by the British and Christian missions in India. This made the students familiar with the Western notions of liberty and freedom and impelled them to desire freedom for their own country. Then there was the personal contract with British teachers and professors, who gave students some idea of the spacious life of a freeman, as compared with the restricted life of a member of a subject nation. The missionaries too helped, though negatively. They subjected the religions and philosophies of India to such a ruthless criticism that some thoughtful Indians were led back to them to discover for themselves the truth or otherwise of the objections brought against them. The result was that when they studied them at first hand they found in them much to flatter their national self-esteem and pride. They found in them spiritual and metaphysical truths of worth not only for their own country but also for the other countries of the world. These were further supplemented by the labours of some European scholars who read the religion and philosophical works of Indians and finding in them lofty speculations and high moral appeal translated them into their own languages. This restored to the Indians some

What occasion is there for grumbling and
thanksgiving at the good and bad (of this world).
Because none would always be surrounded
by sorrow.
Don't be puffed up at the kindness
of your beloved, O Hafiz! 15
For neither the mark of kindness nor
the trace of tyranny would last.

KHOOSRO.

An Ode.

We, who have lost our hearts, are restless.
We are burning (in the fire of love).
The fire of love has set us ablaze.
We have been slendered in the lane
of our beloved.
O sweet heart! there is no occasion for mercy. 5

You rain arrows from your eyes and they will
pierce our hearts as we are your prey.
We sacrifice our lives for a single glimpse of you.
Never do we entertain any hope of winning your
lips (kiss) and your lap (embrace).
O Paradise seeker you know and your Honris,
We will not abandon our own beloved (our
sweetheart is even more charming than a
Houris). 10

We are the dust of his lane,
And like Khoosro lie down in his lane
as a token of his rememberance.

SAEED AHMED MINAI,
INTERMEDIATE *(Senior)*.

My song is charming,
My high and low notes are heart stirring,
It (my song) acts like a bell for the Caravan.
The attractor and creator of mischief
O you visitor of sanctuary!
Tread faster for our destination is not far off. 46

HAFIZ.

An Ode.

Glad tidings have reached me
  that the days of sorrow would not last.
Those (days of happiness) did not last,
  so these, too, would not last.
Though I have become humiliated
  in the sight of my beloved
Yet my rival too would not
  always remain honourable like this.
O possessor of wealth!
  win over the hearts of the poor, 5

For the store-house of money
  and the treasure of coins would not last.
O Candle! despise not communion with the moth.
For the affair would not last till morn.
The angel of the secret world
  has given me the glad tidings
That none would be disappointed
  at the door of His generosity. 10
It is written in letters of gold
  on the blue tablet of the sky,
That nothing but the gentle deeds
  of the generous would last.

Even in the moonlit night
You run as fast as a meteor,
Your eyes are unacquainted with sleep.
Tread faster for our destination is not far off. 16

You are a sailing Cloud,
You are a boat without sails,
You, like Khizr, know all roads,
You surmount every obstacle,
You are a piece of the driver's heart.
Tread faster for our destination is not far off. 22

There is warmth in your nose string
There is music in your pace.
Without food and water,
You travel day and night.
You are never content to be at one place
Tread faster for our destination is not far off. 28

Your evening is in Yemen;
Your morning is in Qaren.
You are the sand of your native place
Your foot is as light as Jasmine.
Tread faster for our destination is not far off. 33

You are the gazelle of Khoten.
The moon discontinued its journey
And rested behind the hillock.
The dawn broke in the East
And tore open the garment of night.
The Wind blew in the forest.
Tread faster for our destination is not far off. 40

SOME THOUGHTS FROM THREE MASTER SINGERS IN PERSIAN.

In these prose translations I have endeavoured to compress the gist of some short poems by great and talented poets like Hafiz, Ameer Khoosro and Iqbal. This article is intended particularly for that category of readers which is unable to enjoy Persian literature. The task of, at first hand, evaluating the merits and demerits, should there be any, of the poems is left to the critical faculty of the readers themselves.

(Saeed).

IQBAL.

The Camel-driver's Song.

O my wandering camel!
O my deer of Tartar!
O my little and plenty!
O my everlasting Wealth!
Tread faster for our destination is not far off.

You are very captivating and charming,
You are a very beautiful beloved,
You put to shame even the Houris and Laila,
You are the daughter of the desert.
Tread faster for our destination is not far off. 10

In the heat of the Sun
You plunge into the mirage,

It is also said that irreligion is the cause of the evils of to-day. But what is religion itself? To refer again to Julian Huxley; "Religion is a way of experiencing the impact of the outer Universe on the personality as a whole: the Universe and human personality being what they are, this way of experience will always involve some feeling of sacredness." This is a truly glib definition of religion, but it can be expanded into a volume.

But the West has discarded the idea of sacredness. Every experience of the impact of the outer universe on the personality is considered in terms of the gross metal, gold or silver. The feeling of sacredness must not, however, impair the sense of values. Refraining from the dogmatism and fanaticism of the Middle Ages, and approaching life in such a frame of mind as to be always open to conviction, will alone provide the individual with a soil wherin the seeds of scientific humanism can be planted.

Humanity as a whole, has been overrun by Science. Huge laboratories are built and millions of lives are spent and lost in testing how we can harness and concentrate electrical, chemical and mechanical forces. But it must be admitted that we have pitifully neglected the correspondingly important problem of harnessing the powers and activities of human nature. Unless and until Humanity is directed along purely constructive channels, without allowing this or that imperfect idea to go spreading patchily over our small world, civilization will either stagnate or collapse, and cannot even dream of realizing its possible evolutionary destiny.

P. PRABHAKAR RAO.
LL.B., (PREVIOUS).

The monstrous Materialism, which has been deified into a God, has brought untold misery upon several millions. For, man after all is a spiritual being; not a living money-bag jumping from profit to profit and "breaking the backbone of the human races in its financial leapfrog."

Some political philosophers try to shift the blame on to Capitalism. They contend that the monopoly of the material wealth of the world by a select few and the exploitation of one class by another, of one nation by another, inevitably leads to a revolution which breaks out in such tremendous outbursts as we are witnessing today. The remedy, they say, lies in a communist state. But the working of Communism in Russia has clearly shown the incompatibility of such an ideal and method. Yet it remains as the greatest effort that mankind has ever made to establish a perfectly classless society. The Russians, however believe that they are passing through a transitional stage and that they are progressing towards a perfectly socialist state.

But it must be remembered that Communism is concerned only with one side of life-namely, the economic aspect; and it is made an end in itself. Life is many-sided and a harmonious development of all these aspects make a perfect individual, and hence a perfect Humanity. Thus furnishing the economic aspect of life cannot do away with inequality and ensure full life. Julian Huxley has aptly said, "If there is one thing which is obvious, it surely is that economic aims are not a final end in themselves. To be prosperous is a prerequisite to innumerable other activities; but prosperity is not the chief measure by which we should measure success."

WHITHER EUROPE?

TODAY we are passing through the greatest crisis the world has ever known, and probably that which history has never before recorded. The hideous devil-dance and mutual slaughter that we are witnessing on the battlefields of Europe and Africa is but a sad reflection on the so-called Western civilization which had dazzled the world by its superficial achievements. The very fabric of world-thought which has been woven for the last so many centuries is being torn to pieces. "The world is offered to the West. She will destroy it if she does not use it for a great creation of man. The materials for such a creation are in the hands of Science, but the creative genius is in man's spiritual ideal."

This is the great message that Dr. Tagore has given to the West. Even Sir Maurice Gwyer has declared, "In the present nightmare world, the doctrines which you and those who think with you have taught and practised, are in deadly peril; and we are witnessing an attempt to assassinate reason, to prescribe tolerance and to crush the human spirit beneath a monstrous Materialism.

What is the cause of this blatant failure on the part of the West? The European countries can sign peace treaties but they cannot give peace. The causes are not far to seek.

We were again on our way and the increased number in the buses made us much happier and we sang our chorus songs with the fullest strength. Harmonium the only moving musical friend was doing complete justice.

Lights were on when we entered the city. We were a cause of fun to the people in the streets who gazed at us with wide-open eyes and laughing faces. It was exactly 7-45 p. m. when we reached the Hostel to help ourselves in the Dining Hall.

Such are the joys of excursions conducted under such ideal conditions with the company of many friends and Hostel-mates. They certainly develop a spirit of co-operation and corporate life. These excursions provide a happy diversion to the routine activities of Collegiate Life.

S. AHMED HUSSAIN
(JUNIOR INTERMEDIATE)
Osmania University.

---

held. Harmonium and Tabla were the accompaniments. The best performance was that of Qayum and Omar. Those who knew not the elements of music were also made to sing and we had a splendid time in making fun of them. Last of all we had the "Qawali" which was a very fine performance, soon after, tea was served and the singing party came to an end.

It was past five when we left the Guest House for Himayat Sagar to the tune of our chorus songs.

The clouds had cleared from the face of the sun and although the time was past 5-15 yet the sun was very hot. We could not enjoy ourselves much here. Only a few of us swam in the water and we were little interested in them.

Now the sun was going down and the hot shining ball changed itself to a pale yellow globe, throwing a beautiful reflection on the calm, glassy waters of the Himayat Sagar.

Slowly the day was coming to an end and we settled in our buses for the Hostel. On the way we met with a heavy shower of rain which quickly passed away enlivening our spirits and we were jolly again. Soon after, unfortunately, the engine of the first bus suddenly stopped working and in spite of our and the drivers' efforts she had decided not to move.

At last it was decided that the people in that bus should get themselves accommodated in the remaining two buses.

in the earth alike. Their magnificient thrones and their vast empires are all destroyed. Their achievements are no more than of historical and academic interest. History has calmly and quietly digested them all.

Owls shriek where once trumpets were blowing, dogs bark where once cannons were roaring, darkness rules where once the stately palace was studded with lights, and a solitary silence pervades through the great place of the past.

The sun was now up in the sky and it was ten O'clock when we left the place with a sad but proud look.

Now we were on the way to Osman Sagar. It was nearly eleven when we reached the Guest House. Soon after, we went to the garden. We had a very fine time there, some of us swimming, some sitting on the rocks, some lying on the lawn and a few singing some songs.

"Our life exempt from public haunt
Finds tongues in trees, books in running brooks
Sermons in Stones and good in everything."

After spending some of our time happily in the garden we returned to the Guest House at about 12-30. Here we met our beloved Warden Mr. Wahidur-Rahman, who with his usual kindness and sporting spirit had decided to spend a few hours amongst us forgetting for the occasion that he is a professor.

Lunch was arranged immediately and we had a very delicious meal. By 2 p. m. we returned upstairs. Carpets were laid in a big hall where a Music Party was to be

Time had played its part; after a long reign, the Sultans of the Deccan had passed away leaving behind a sweet memory of their rule, now buried within the four walls of the domes. All these remnants are only of an archaeological importance to a student of Indian History.

Their kingdom was destroyed; they are no more, but the grandeur of their rule, their valour and the culture they established is ever-green in our memory. With a sorrowful recapitulation of the events of their regime and with sad and wet eyes we left the place at 9 a. m. and proceeded to the fort. "If you have tears, prepare to shed them now" were my words.

The long-standing walls of the fort, their dead silence, their broken images and their faded colour were all reminscent of their golden rule.

God's vassals drop and die
And sword and shield
In bloody field
Doth win immortal fame.

After getting up a number of steps and wending through a number of turnings we managed to climb to the "Balahisar."

"Is this the place where Abul Hasan once ruled? Is this where he held his Darbar during the siege and are these the strong walls that stemmed Aurangazib's invasions?" These are the first and foremost questions with which every one is afflicted. Really those days were great. But Ah! they are no more. Aurangazib is dead, Abul Hasan and the Qutub Shahis are buried

A TRIP TO OSMAN SAGAR.

(On the occasion of a trip made by the Students of Hostel 'B', on Sunday the 28th July 1940).

IT was on one of the fine mornings we woke up to start on a jolly visit to our ever loved Osman Sagar, one of the beautiful lakes of the Nizam's Dominions and a pleasure resort. We had our breakfast earlier than usual and were ready by 6-30 a.m. but the buses arrived late. After an unbearable impatience "Here the buses are" was the joyous out-burst. Within fifteen minutes we settled ourselves in the buses and happily drove towards the west.

The day was cloudy; the road was silent; and a very pleasant breeze was shaking the green leaves around. We started our pet chorus:—

" Ae Matlai Osmania College Ke Sitaro
Himmat Na Kabhi Eelm Ki Tehsil May Haro. "

We passed through many thorough-fares, turnings giving expression to our joyous spirits; and the way-farers were gazing at the running buses with mixed admiration; perhaps they remembered their great college days and similar happy excursions.

It was 8 a. m. when we reached the domes of Golconda. The sun was still hiding behind the white clouds and a grave silence shadowed the quiet domes.

Schopenhauer did not gain much fame in his life, the reason being that the major part of his philosophy was pessimism which was supposed to be destructive, but the secret of his popularity was his Aesthetics and the poetic method of expression and explanation. The redeeming element in his philosophy is that it consists in a great part of valuable literature, it is for this reason that the dryness of philophy is not felt by his readers.

The rest of Schopenhauer's days was spent in journeying and afterwards as unsuccessful professor in Berlin. He went to Frankfort in 1831 and settled down there. He died on the 31st of September 1860. He was a bachelor throughout his life.

He is dead, but his pessimistic philosophy consoles, even today, all those who are oppressed and troubled by the struggles of the world.

"ABID" (OSMANIA).

---

reason that Schopenhauar attached great importance to the fine arts. The love and study of æsthetics is the only thing by which one can be relieved of all the cares and anxieties. The fine arts help to change the appearance of life at least, if not its reality. Although æsthetics has a high place in Schopenhauer's philosophy, he himself gives more importance to ethics than to æsthetics.

The bane of life as Schopenhauer thinks, is luxury and selfishness. Manly nature is cruel, cowardly and lewd; He thought that all the virtues exhibited by man are a different form of selfishness, because he is afraid that none should ill treat him in return if he behaved ill with others. The reason of man's being unsuccessful inspite of all the efforts exerted by him was his miseries, which is his fate. Therefore Schopenhauer says "If we wish to be freed from miseries, it is through the philosophy of Renunciation and Asceticism." Schopenhauer teaches us Asceticism and the purity and refinement of the soul.

Many refuse to believe him a philosopher because of his being a pessimist, but his philosophy of Aesthetics is a valuable thing in the philosophical world. Neitzsche thinks his philosophy of Renunciation cowardly and pessimism as the enemy of mankind. Burgson has said that Schopenhauer has viewed life from one side only; his own life was a great misery. He went through great unevenness of life and he himself was of a bad nature. Strange was it that the world and atmosphere around him did not coincide with his ideas. For these reasons he made his life an example and give it to the world.

introduction was that Schopenhauer began to describe and expand the theories of Goethe and introduce them to the public at large. Besides this, he published a book entitled "The world as Will and Idea."

He abhorred Jewism and Islam, because these religions did not conform with his melancholic sagacity. His pessimism was very dear to him. He believed in none of the modes of Government. Real popularity was gained by Schpenhauer in 1848 when the revolution of Germany proved a failure. It was then that Schpenhauer's writings had a relieving effect on the Germans who were then under great influence of terror and disappointment.

From Schopenhauer starts a new movement in the history of philosophy. It was believed that everything in nature was meant for the betterment of humanity. Hegel was the standard-bearer of this philosophy, but Schopenhauer was opposed to this philosophy. He viewed the 'Accomplished Nature' as a blind force. Life in the real sense was to him an arbitary will of nature and the universe was not based on any rational system. (He was out and out a monotheist). He thought that the creation was a plague and that the foundation of life a mischief.

Schopenhauer is well appreciated for his philosophy of Aesthetics. He believed that if love, beauty, the fine arts and religion, did not exist, then the sorrows of life and bitterness of the world would have been greater. He believed life to be a net of difficulties and sorrow. In his view, deep poetic interest, thought and beauty were the things to free the sorrows of life. It was for this

SCHOPENHAUER

ARTHUR Schopenhauer, the greatest thinker of his age, was born in Danzig on the 22nd of February, 1788. His father was a well-to-do trader. Both his parents were Dutch. His mother was a well-known novelist and had gained much fame. His father wanted him to follow in his footsteps and so sent him to France in preparation for his future. It is said that after two years, when he returned from France, he had almost forgotten German, and it seemed as if French had become his mother tongue. He then went to England, Switzerland and Austria, and attained a mastery over the English language. He felt proud if any one mistook him for an Englishman. He was influenced by the intelligence and character of the English people. He hated Bigotry and prejudice.

His father forced him to learn his trade, and against his will he joined a traders' office in Hamburg in the year 1805. Shortly after his father died, and he left his job which had been a failure. He started studying the classics. In 1809, he joined the Gottingen University to study medicine, not to amass wealth but to quench his thurst for knowledge. He turned towards philosophy in 1810 and because of his independant ideas, and frank criticisms, he gained an exalted position for himself. In Gottingen University he had the learned Schulze as his professor who taught him the theories of Aristotle, Spinoza, Plato and Kant, In 1813, he was awarded the Doctorate in Philosophy, and was introduced to Goethe, the German poet, the same year. The result of this

hand it shows the greatness of man's mind shows, on the other hand, how pitifully week and helpless he is against nature, because man will not be spared during that cataclysm: Life, therefore, is a struggle in which man is the loser.

But man does not desire to lose in the struggle. He is helpless as regards the objective world. But there is one thing over which nature has no control; and that is the Human Mind. Man takes advantage of this, and creates for himself,

> " Forms more real than living man,
> Nurslings of immortality "

HAFIZUDDIN AHMAD
STUDENT OF M. A. (ENGLISH)

---

scheme underlying those facts. The third dimension is not absolutely an unknown factor here. The play of Hamlet affords us a good illustration and clearly bears out my point. We know not only what Hamlet actually does, but also the motives behind his actions. The spiritual as well as the intellectual stock of the creatures of the world of poetry is laid bare before us, and we sit as Olympian Gods watching and understanding the struggles of the creatures of our own making from a "Pisgah Sight".

The creation of a world of this kind to which we can transport ourselves whenever we desire, is a spiritual necessity for us. After a careful and reverent study of Science, the impression that is left on our minds is that man is after all a very insignificant being in this universe. We cannot with any basis of truth, claim that he is the centre of interest in the whole universe. The whole civilisation that man has built up, the world of artistic beauty that he has created, the world of thought and spirit that he has made for his own recreation and pleasure, all these are moving on, and continue to move on the slender axis of the Solar System, which may at any moment give way. We are certainly not fools if we anticipate a time when the earth would grow cold and its movement slow down to stillness, and life becomes extinct. Nor even if we anticipate a huge cataclysm which would annihilate all trace of humanity from existence. The fact has to be faced squarely that nature is yet our Master in the struggle against death. The prophecy of Lord Birkenhead that it is quite possible to bring about a world - wide cataclysm by releasing the pent-up energy of a gallon of water, while on the one

of the latter. The poetic world is really the actual world seen through a glass, which is coloured with the spiritual history of a soul. The facts of the poetic world are the facts on a higher plane, — on a higher spiritual plane. It is this that gives poetry that ring of universality, that ring of infinity which is often claimed for it. The result is that the longings and regrets which are common daily occurrences in this mundane world become, when transmitted to the world of poetry, the "infinite longings," and "infinite regrets" of a higher spiritual world. The pleasure that we get after a study of Othello lies in the fact, that whereas from a worldly point of view everything is a defeat for him, from the spiritual point of view, it is all success. In Macbeth we see the way a soul goes to hell. It is not so much the death of Macbeth, as his spiritual degradation which absorbs our attention. The calm and serene pleasure that we derive after a study of the "Silver Box" is of the same nature. We do not enjoy the misfortunes of Jones and his wife as misfortunes but as profound and inexorable facts of a strange world, which unfolds to us the spiritual struggles of these two characters.

Another aspect of this world of poetry is the sense of completeness which it has, and which is lacking in the actual world. In the actual world, we find, at best, facts and events which occur in succession. We cannot, with an air of finality, say that we know the scheme underlying these facts, however much we know about them. We cannot even say whether there is a scheme at all behind the show of this world. We can only know the facts of the surface, - two dimensional facts: the third dimension is an unknown quantity to us. But in the world of poetry we find not only facts but also

ugliness and the beauty which come under his survey, and give them equal value. For him all these are "facts." While dealing with these he has to relentlessly curb the play of his moral sense along with the play of his aesthetic sense.

But these two senses, being essential parts of our spiritual being, cannot be so easily ignored. It is necessary that to satisfy ourselves wholly, these two senses should also be satisfied. A series of realities, therefore, which satisfied our sense of the actual, and which are also based upon a moral as well as an aesthetic valuation of the facts of life, is alone capable of satisfying us wholly, and this we find in poetry.

It should be clearly borne in mind that the moral as well as the aesthetic valuations are necessary for poetic truths. This raises the rather hackneyed question whether morality has any place at all in the world of poetry. The answer to this question has been obscured by much loose thinking over the subject. Morality has certainly an eminent place in the world of poetry, if by morality is meant not a moral code which flourishes under a religious system, but a sense of moral values, a sense of good and evil which pervades the out-look of an average human being. Facts which are revolting to this sense have no legitimate place in the world. As for the other value, the aesthetic value, it is an aspect of poetry which cannot be emphasised too much. In fact it is the essence of poetry. The world of poetry is a world which satisfies us, a world after our own heart. It is not the world as it is, but as it ought to be. The realities of the world of poetry are different from the sordid realities of the actual world in this, that the former are the ideal

POETRY AND SICENCE.

THE claims of poetry for a substantial share in a scheme of liberal education were never seriously disputed except in the latter half of the nineteenth century, when Huxley and others contended that it should be for Science and not for poetry that such claims should be made. Men of letters of the eminence of even Matthew Arnold, could not persuade these dogmatists that their contentions were based upon a meagre understanding of the nature of poetry and upon a mistaken valuation of the achievements of Science. The Scientists of to-day are wiser because they have come to know the scope of their field of activity, and with their wider and deeper understanding of the nature of Science, they admit that the claims of poetry are fully justified. The difference in the attitudes of persons like Betrand. Russell and Huxley over this question is fundamental and clearly bears out the point under discussion.

The main reason for this change in the outlook is that people have come to realise that poetry touches us at a higher point than Science. The world of Science is the world of reality, the world that we are born into, where we see beauty and ugliness, good and evil, mixed up in a strange disorder. There is no moral code, no aesthetic code, which nature observes. It goes on working out its own course, regardless of any sense of these things. The Scientist has to deal with this kind of reality, and in dealing with it, he has to take into consideration both the evil and the good, both the

pled and the mutilated in their misery and solitude; though at times she shuddered at the horrible scene that the war presented before her eyes—some moaning with the agony of death at one place and some with parched lips murmuring to themselves at others amidst the roar of the cannons.

Once when the troops were garrisoned in a fort a bullet found way to this knight's heart and he lay breathing his last

Magnet rushed to him and wept over the misfortune that had befallen her and all the time gazed at the man who lay before her. She began to contemplate the past.

All of a sudden a roar of cannon was heard and a shell found its way to the weeping lady and she too joined her husband in death. When the war was over and the French were victorious their bodies were found clinging together.

Thus departed the souls of the two who, though dead, will always live in the memory of the French.

MOINUDDIN HASAN OSMANY,
B.Sc. FINAL.

---

was always quite indifferent towards what was said by the teacher. All his thoughts were centred round one object—Magnet. He was not a student to shine at the school, but a young man, an ardent lover who aspired to be independent and to make a home for Magnet.

At last he had to leave the school and search for a suitable profession. Now his prospects seemed gloomy enough and he lost all the hopes that he had cherished so long.

Luckily in the autmn of, 1914, the Great War broke out, and France began to mobolize and recruit men for active service. He enlisted himself as Lieutant ir the army and was, soon after the training, given command of detachment.

Herrick's uncle seeing that he was in service and had quite a bright future before him, at last consented to give him his daughter in marriage. And on the eve of the seventeenth birthday of Magnet, the fates of the two were bound together, and the officer's most blissful dreams were realised. After the marriage ceremony was over Monsieur and Mrs. Anselmo with others moved into a country house, and the possession of this house was assigned to the newly married couple.

But not even a month had passed before Herrick was called for active service. After three months he was made a Captain and awarded the Legion of Honour for the services he had rendered to his country. Magnet's conscience did not allow her to keep aloof while her husband was away from home—fighting for liberty. What could she do except look after and console the crip-

By and by he recollects the time when he wandered from door to door and the family—consisting of one elderly man, Monsieur Anselmo, an old lady, Madame Anselmo and their only daughter, Magnet as was the nick-name of the girl aged about thirteen--pitied him and engaged him as a servant.

Little Magnet's manners were charming and she had an air of delicacy about her. On the day preceding the first Christmas morning there stopped at the door a carriage from which got down an handsome lad, Robert Herrick, still in his teens and very active and promising in appearance, followed by two other people who were obviously his parents.

Great interest was evinced in the household at the unexpected visit of Monsieur Anselmo's brother-in-law and his family. Guests were seen at the house even long after the end of Chrismas. The girl and the newly arrived cousin passed their time together and it was not long before each of them began to feel a sort of attachment for the other. They would sit together the whole day talking over matters that were of common interest; at one time by the bank of the lake—their legs half dipped in water—and at another time on the cliff of the neighbouring hills everlooking the house. At last both of them began to feel the warmth of the rising sun, and mutual confidence and love took root in their bosoms.

As the guests, after a long stay at this lovely place, wished to return home, they were prevailed upon to give up the idea. The boy who had been up till now taught at home was sent to a public school with the girl. But, Herrick would sit in the class gazing at Magnet and

In the other corner of the city we see lofty buildings —dwarfing their neighbours—in which are housed ball rooms, operas and theatres crowded with people who are wont to frequent these places to shake off the worries of the day. The cars are hissings through noisy streets with tender ladies at the wheels, wearing their hair in curls and dressed in the softest, perfumed apparel. They are blushing and ever concious of the gazes that are stolen at their smiling faces. The whole city seems to be in commotion.

Not far from this bustle are huddled together the slums of the poor who live to wait upon the rich whose motto is to live and ignore the interests of the poverty—stricken. Their small establisments cannot even afford them protection from the dizzle.

Suddenly thunders roar and lightning flashes and rain begins to pour in torrents. Busy streets become lonely and nothing is visible except the white screen of shower enveloping the huge buildings.

At this dead hour of the night is seen an old man, James Cox by name, drenched to the skin, groping his weary way through the dusk to any place of refuge. His eye catches sight of his past dwelling and retracing his steps he makes for it. With great difficulty he makes his way through the thicket that barred his way, and after the lapse af twelve years seeks protection under its roof. The past unrolls itself before his eyes and a mixed feeling of joy and sorrow sweeps across his face—joy perhaps at reaching the place again, and sorrow at finding himself homeless and seeing that not a taper is burning in the dark rooms.

THE TRAGIC END.

IN a solitary corner, quite cut off from the interior of the big city, by a vast stretch of land, stands the magnificient building ever casting its shadow in the moonlit nights on the still, blue water of the lake. Though twelve years have elapsed since the house was left unclaimed, the plants are still green and laden with fruits and flowers that exhale sweet fragrance. They have been spared the ultimate decay up till now, perhaps to remind the passers-by of the past when the garden was the favourite haunt the occupants of the house which perched on the top of a hill commands awe and sympathy of those who ever happen to come in contact with its dwellers.

For more than five decades the light escaping through its shutters directed travellers to their distant homes and changed the fatigue of their journey into joy of returning to their hearth. But now its sight makes such thoughts crowd upon their imaginations as are most painful and calculated to present the most gloomy view of life. The road winding its way to the portico is strewn with dried leaves and branches of the trees and is almost blocked in some parts. The doors are jammed round the hinges, the furniture is covered with dust and the only sound that echoes in the house is that of owls and pigeons who have made it their abode.

developing and extending their military powers. The enormous preparedness made by Britain and France made no impression whatever on Hitler. He went on with his policy of self assertion and unscrupulousness in matters of treaties concluded with his neighbours until at last on September 1st of last year the storm that was *brewing* burst and the inevitable happened in Europe. The putting of right against might had been going on for long and the actual clash occured. For months and months war clouds had been gathering thick and now the hope that a peaceful solution might be possible, has been rudely dashed to the ground. The dispute between Germany and Poland took a monstrous shape and war was the inevitable result. To fulfil her Treaty obligations to Poland, Britain had to declare war on Germany.

It is accepted on all hands that England had every moral justification for entering the war, for Hitler's ambitions are believed to be senseless and endless. As a result of this conflagration, civilisation would receive a set-back, because the money to be used up in nation-building purposes would have to be used in the prosecution of the war. Innocent men and women would be killed. The English people think that Nazism is dangerous to world peace. England is now taking drastic steps to check Nazi aggression. England now is unwilling to give back the Colonies to Germany on the plea that it would not be possible on the part of Germany to administer them properly. Mr. Chamberlain the ex-premier said, "I must see the end of Hitler and his Nazism."

ABUL HASAN,
Intermediate (Junior).

in Germany and the poor to leave the country. Poor jew ! he finds no home. But he can thrive anywhere by his amiable manners and outstanding intelligence. His non-warlike habits have, however, made an out-cast of him. His original home is Palestine ; but there also the Arab gives him no peace

The Nazis are trying to re-establish the position which Germany enjoyed before the Great War (1914–18). To a great extent they seem to have been successful in their plans. Germany maintains now a very formidable army, navy and air force. In October 1933 Hitler left the League of Nations. In many of his speeches and writings (Mein Kampf) Hitler has announced that he is determined to tear the Treaty of Versailles to pieces, for it was based on no principles of justice and morality. Thus Hitler having freed himself from the League of Nations, is firmly determined to repair all the damages that the Treaty of Versailles has done. He captured Rhineland in 1936, swallowed Czechoslovakia in 1938, committed the rape of Austria in 1938 and only a few months back that of Poland. The Polish Corridor and Danzig are now his. He is also demanding the return of his lost Colonies in Africa, and the East Indies. He has refused to pay the war debts. It seems by his programme that he is planning to conquer the whole of Europe by 1941. Hitler has gone from success to success, so that during the short period of two years Germany has grown so powerful that her very name strikes terror into the peaceful hearts of the other nations.

The other powers of the world watched the phenomenal growth of Hitler's strength with awe and mistrust. They prepared themselves for every exigency by hurriedly

study his character and life because the history of a party is often the history of its leaders. He is a hot headed soldier with an extra ordinary gift of oratory. The Germans, one and all, look up to him for guidance and inspiration. When he was about twenty five years old, the world war of 1914 broke out and he enlisted with the Bavarian infantry. His remarkable intelligence and inexhaustible energy raised him to the position of the leader of the Nazis.

During the election of 1933 Adolf Hitler was elected as the Chancellor of the German Reich and thus he established his Nazi dictatorship. He was now free to do all that he desired to do. The jewish employees were forced to resign their posts or were mercilessly hounded out of the country for they were looked upon as the inveterate enemies of Germany. The Germans were made to boycott jewish shops and as a result of this many of the jews were ruined.

The jews are a peace loving, and law-abiding people. They are shrewd business-men and are very rich and economical. Their main draw-back is that they are not warlike. They did not take an active part in the Great War (1914--18). The whole trade banking and the press after the Great War were in their hands. Hitler hated them as his view is that Germany should only be for the Aryans. So he drove them out of Germany. Once a jewish youth killed the German Ambassador in Paris. On this almost all the jewish shops were looted in Germany The jews were fined 1/10 of their wealth and were sent to the concentration camps. Hitler at the same time, realized that the wealth of the nation is in their hands. He wanted therefore the rich jews to stay

ORIGIN OF THE PRESENT WAR.

THE [illegible] Great War of 1911 is to [illegible]. But it [illegible] no credit on those who drew it up. It [illegible] asserted that it was drafted in a spirit of revenge. [illegible] politicians and statesmen of [illegible] that it was Germany that had brought [illegible] catastrophe.

Before the Treaty of Versailles was signed Poland was a part of Russia and Germany. But she was raised to the status of a full-fledged and independent state. Danzig was made a free city. The Polish-Corridor was created in order to cut off Germany from Prussia. Many German Colonies in Africa and *elsewhere* were wrested away by England and France. The Frontier Zones on the River Rhine were demilitarized. Saar, which is very famous for its coal mines was taken away temporarily with the stipulation that its future would depend upon a plebiscite after fifteen years. In 1935 it was decided to return it to Germany. Austria and Hungary were broken into five petty states i.e., Austria, Hungary, Czechoslovakia, Yugoslavia and Rumania. Heavy indemnities were imposed upon Germany as war debts. The Treaty of Versailles was regarded not only as a calamity but as an insult to the German nation, and it aroused strong opposition. The scheme of hacking Germany was carried out in spite of popular sentiment against it. One of the parties that was in opposition was the Nazi party under the leadership of Adolf Hitler. First of all, we shall

Science is Science, and Law is Law, and never the twain shall meet. But the twain have met in his personality. The younger brother is smart and sportive. He drives a car as daringly as an American girl. As they are freshers, their sphere of acquaintance is necessarily confined to a few bosom friends only.

This sketch will be misconstrued, and will probably be attributed to superciliousness on my part, if I do not mention myself in it. I do not know what others think of me. But I do know what I think of myself. Some of my friends are apt to look upon me as a mysterious, almost unintelligible fellow. The expression of a face that is always serious, the gesture of a smile that is almost melancholy, are the unmistakable reflection of a heart that is despondent in the midst of happiness, and a soul that is restless in the tumult of human existence. Some think that I am proud, others that I am unfriendly. I am neither of the two. My taciturnity is attributed to pride, and my love of solitude to unfriendliness. I live in a world which is far , far removed from this worl of painful realities.

M. NAIMUDDIN SIDDIQI, M.A.,

PREVIOUS.

scholar at the same time. But I am sure he will soon realize the incongruity of these two elements. He is the eminent son of an eminent father, and enjoys the reputation of being a highly principled and regular student.

Now I will acquaint you with a man who is a socialist, a Democrat, a Fascist, a war-monger, and a pacifist at the same time and in the same breath. His tongue is the most active instrument that was ever created by God or man. He was a notorious propagandist in his previous career. His local 'Fifth Column activities' have some what slackened after his joining the University. He is dangerous as an enemy, but more dangerous as a friend

I cannot resist the temptation of mentioning a particular friend of mine, who has very recently succeeded in emerging from obscurity. He was formerly very reserved, but has now developed a certain air of geniality.

He is an aristocrat, who is proud of his aristocracy, and has inherited all those characteristics which are peculiar to this class of society. A certain change in the atmosphere will make him more successful as a student. His nephew has very recently joined the University, and very little is known about his individuality. Sandwiched between these two is a gentleman whose enthusiastic activities as the manager of a famous literary organization led to the inevitable disappointment of a failure in the examination.

Have you seen the two spectacled brothers? If not, let me acquaint you with them. The elder brother is a plump, clear-complexioned young man. People say that

somewhat eclipsed him; but still his flexible movement, slim figure and sprightly gait retain their charm. His younger brother with his bald forehead and large innocent eyes, has robbed him of some of his attraction. But so long as [illegible] from the Arts College, he will continue to [illegible] undisputedly dominant personality.

Next to him [illegible] a hero who has won the [illegible] ment of a [illegible] speaker is unchallenged; but I would wish him to [illegible] more clearly between demagogy and [illegible]. He is a genius, [illegible] particular regard for conventions. He is capable of high achievements. I wish to see him on a loftier level of thought and action.

Who is this lean man emerging from the Law class? Observe his features well. He has a reddish brown complexion, and a somewhat [illegible]. The nose is the most prominent part of his body. He is a born politician. He has been the founder of many [illegible], some of which have died [illegible]. He represents a peculiar combination of [illegible] sincerity and youthful enthusiasm. He is a st[illegible] supporter of the greatest local association. [illegible] enthusiastic on some occasions. But don't laugh at him. He is one of my best friends, and will become a great statesman one day.

I do not know how to introduce this young gentleman to you. His recently spectacled eyes indicate a serious temper and a resolute mind. He is a sportsman and a

Thus, in an age when Iqbal has passed from his earthy existance we are in a state of great literary vaccum, having lost the control of a mastermind. Naturally therefore we place all our hopes on those who still hold communion with the Muses and offer India something lasting and valuable. Josh is one of those. But it is a pity that in this latest works our beloved poet seems to have diverted himself in other channels of work and thought. This change of atmosphere seems to have affected his poetic outlook too. What should we hope of him then? This is a question which haunts our minds when we examine the post—Iqbal period of our poetry.

ABDUL QAUM KHAN BAQI, M.A.,
RESEARCH SCHOLAR,
Lecturer, Urdu Dept.

unbalanced. In times of overflowing joy the rebellious words are conquered and move in their place without any sign of shuffling for adjustment and the poem unfolds as *naturally* as a flower whether it be an elaborate song or a simple strain. We acclaim Josh when his craftsmanship is under the spell of spontaneous inspiration.

The most striking element of Josh's art is what I should call his musical eloquence. A critic remarks "Whenever the lightest verse fulfils the musical law of its being and attains perfection of form, it enter into the "Universal dance." Many poems of Josh have this universal dance:—

اے ہم نشیں وہ جوشِ مئے ارغواں ہے آج   صہبا کی بوند بوند میں کون و مکاں ہے آج
جسم نثار موجۂ تسنیم و سلسبیل   بکھری ہوئی وہ کاکل عنبر فشاں ہے آج

Josh at his best is simple :-

میرے پہلو میں پھر وہ نازنیں ہے   جواب اس شب کا دنیا میں نہیں ہے
آج وعدہ ہے ان کے آنے کا   حسن دیکھو غریب خانے کا

This simplicity of form, this grace of poetic utterance finds expression in narration. In his "Princess of the Forest" we find him at his best, giving us in choicest possible language, a fleeting glance of Beauty on the rail road. Josh is a splendid narrator, so vivid and so simple

ادا سے یوں کسطرح آنکھیں کھولتی ہے نوعروس   منھ اندھیرے جیسے نرگس کی کلی بنتی ہے پھول
غنچۂ خاطر کی یا جس طرح کھلتی ہے گرہ   دل پہ یا جسطرح شوکیف پرور کا نزول

جسکے قدموں پر بہ خود فطرت کا سر   وہ پڑھے اور صبحدم سے ملنے کو نماز
مفت دو جانیں تلف ہوئے کو ہیں   سن رہا ہے اے خدائے بے نیاز!
مہرباں ہوا ہے انیس بیکساں   رحم فرما اے کریم کارساز
ابر میں ہے سنگباری کی گرج   آبگینوں کو دیکھ اے آبگینہ ساز

life down " to the last edge of the corner stone of death." But this is not the wail of the sufferer, it is the cry *non dolet*. The kind of violence which he shows in his verse is more symptomatic of his mental sorrows than of his physical affliction. Josh is made for joy, but he weeps for life. Men talk too highly of this strain exclusively at the expense of his real traits of genius. May we give a suggestion to Josh himself, to regard the work for which he is made !

Josh in his poetic workmanship.

To quote Alfred Noyes "Strength in art and Literature is nearly always accompanied by the ravishing delicacy of workmanship." Josh will survive many other poets, not because of the general excellence of his craftmanship, but his rare felicities. In many ways of course his style is faultless. He possesses nearly all those negative virtue which greater poets have often lacked. His sense of the light use of words, their associations and inner meanings, is often unerring, but somthing more than this is required to make the words flow and sing with that "inevitability," as of a natural law, which marks imperishable things. It was one of the greatest lyrical poets who said " that there must be somthing in the mere progress and resonance of words, some secret in the very motion and cadence of the lines, perceptible but undefinable," before we can say that the form is wedded to the spirit of poetry. Josh is a little uncertain at this point. In moments when Josh's mind is open to the blessing of heaven, we find him in a way labouring himself with the adjustment of words ; sometimes crude and sometimes high sounding. It is with some reluctance that we accept him here, who seems to be a little

thought like pearls in the sea. The following notes are a challenge to a few of our poets who so boldly flatter themselves by calling themselves "اهل نظر" (people of insight)

بوندیوں کا سلسلہ ہے اور ہلکے ابر سے بر رہی ہے اسطرح سبزے پہ کرنوں کی نگاہ
وقت گریہ جسطرح مکتوب غم لکھتے رہے آنسوؤں سے چھن کے آتی ہے سر کاغذ نگاہ

With such insight into the hidden beauties of thought Josh offers us a few figures of speech, which in their very beauty become assets to literature.

وصل کی راتوں میں اب اسطرح سے آتا ہے یاد هجر کے عہد ربوں کا گریۂ صبح و مسا
جیسے اکثر نیند میں کروٹ بدلتے وقت جوش کان میں آتی ہے ہلکی موج بارانکی صدا

These ecstatic songs of his, harmonise Beauty in the concrete, with the glories of Nature, and give us a concord of sublimity which is both love and spiritualism in one. The poet is seldom prepared to face the celestial beings and the heavenly abodes without a united soul, whose strength brings him to the home of God. Read his " Might of yesterday ":-

مسند زریں پہ "سر دلبراں" کے زمزمے تھے بہ انداز "حدیث دیگراں" کل رات کو
آرہی تھی جنبش مژگان عالم کی صدا یوں لب گل رنگ تھا افسانہ خواں کل رات کو
غیب کے پردے میں آوازیں مبارکباد کی آرہی تھیں کارواں در کارواں کل رات کو
سامنے تھی جلوہ گاہ کرسئی لوح و قلم اک دریچہ بن گیا تھا آسماں کل رات کو
فرشتے ہاتوں پر تھیں روشن ابد کی مشعلیں اسی اک منزل میں تھی عمر رواں کل رات کو
گردن میں جھکاتے ہی ابل پڑتے تھے جام گنگنا اٹھتا تھا یوں پیر مغاں کل رات کو
نازکرتی جسطرح گردوں پہ جاتی ہے دعا اٹھرہا تھا مشعلوں سے یوں دھواں کل رات کو
میں بھی لافانی ہوں مثل وجہ رب ذوالجلال دل کو ہوتا تھا بر رہ رہ کہ گماں کل رات کو
جوش کے پہلو میں تھیں ارض و سما کی نعمتیں جب اک تو ہی نہ تھا اے رازداں کل رات کو

Another phase of his poetry, though inferior to his worship of Beauty is his grim satire against the eccentricities of life. The key-note of it all is his spirit of truth and freedom, a concentration upon the realities of

in Beauty. Often the last note of the poem strikes the ears of fancy as the "call of youth," a living desire of life.

نظریں جو اٹھادے تو لرزنے لگے خورشید   ابرو کو جو بل دے تو ہو عقاب دو پارا
اللہ کرے وہ خم دشمن ایمان   جملے کسی سب جوش کے پہلو میں دوبارا

This "living desire" is one of the oft-repeated sayings that Josh has given to the world in his moments of oneness with the divine. It is this combined effort of Beauty-worship and youth that forms the ultimate poetic creed and the greatness of Josh.

Following the same strain we find him always ecstatic in his thought. He has something of an unquenchable fire in him against which all blemishes in life and literature shrivel up like crippled forms The peculiar merit of his ecstatic notes is not in their intense realism, for it is easy enough to exploit fact, nor is it in their metrical freedom, but it is something between the two a dream of what is behind the real, a song of what is beyond the said and the uttered. These songs of Beauty, youth and ecstasy, are sometimes thought to be a little "precious," or even exotic—dainties for the literary epicure, exquisitely painted butterflies emerging from cocoons of golden silk spun by the Muse's hand, rather than creatures of a cold, reflecting humanity.

Departing from the main characterstic feature of Josh, we come to a few of his other attributes, which serve as the handmaids of his poetry. Josh has a novel power of poetic observation and freshness of insight. We see a few glimpses of his visits to the regions of the unknown. This insight gives him a sort of musical eloquence, within which lie the treasures of untouched

Since the birth of Urdu poetry, the worship of Beauty was its very life and soul, but Josh, discarding the old conventionalities has given it a fresh colour, and new grace.

This has given Josh a unique liberty of both thought and expression, and it is in this freedom that Josh really commands respect. In the midst of his musical eulogies of Beauty, we find him rise to spiritual regions and utter some prophetic songs. Says he in the "Dawn of Youth."

جلو میں مستی و ہشیاری   طواف میں کائنات ساری
جمال کی زد پہ ذوق باری   نظر میں شان پیمبرانہ

Again that strain of thought makes him declare.

در حرم پہ خدائے الفت   قبول فرما مری عبادت
نہ دے مجھے مسجدوں کی دعوت   کہ دین میرا ہے شاعرانہ

Poetry is like the flight of a bird. We can look at her, flying far away on to the seas, but we cannot know her. For such a flight, poetry stands in need of ethereal wings. Josh has Beauty for his wings, and it is ultimately through the admiration of female beauty that he finds all his sublimities—all his great regions of flight, his great seas.

Passing on through these regions of poetry, Josh also possesses the spirit of youth, since as Goethe puts it, "Youth is the voice of Beauty." This spirit of youth is the essential attribute for a true lover of Beauty and Josh possess it in full. Throughout his vast works we find him approach the altar of Love and Beauty with a leaping heart, an enthusiasm of youth and ecstasy. Who would forget his immortal poem "یار پری چہرہ" the "fairy faced friend," addressed to Beauty in youth and youth

THE POET OF BEAUTY.

IQBAL is no more in our midst. A few minor minds who have but little significance are now trying to emerge from their obscurity and show themselves up by their own pretentious efforts. Some are trying to associate their names with the great Iqbal. Some are giving messages with only a phrase or two of their own, and some are nominating themselves as "اہل نظر", in their own poems addressed to the mighty mind.

In such a chaos of misguiding estimations it seems desirable to find some satisfaction from those who fortunately are with us, and show some signs of greatness. It is our first duty also to estimate their positions and ascertain the right perspective to their work.

Among the great poets of today, the first who deserves consideration is the well known Josh. In the present discourse, I will try to present a few of his genuine qualities as a poet.

To me, the first and the foremost quality of the poet is what I should call, the worship of Beauty. This attitude to the work of nature, and his devotion to its divinity, present Josh to the world as a poet of Beauty. Beatuy in the concrete, expressed through the form of woman is one of his most inspiring subjects. He is almost unsurpassed in his ecstatic admiration of feminine Beauty ; and that may be the result of the experience of his life. Beauty is always the religion of the poet, and Josh has given his life to the worship of that Beauty.

emanating from the leaves, the stones and the void are hushed. The twilight mount with all its environment has disappeared behind the sable curtain of Night, and the whole universe is analogous to a deserted hall which was a seat of revelry a little while ago.

Ah! how soon has the twilight mount receded, but I still see it in my memory which has preserved it as a coloured of my life.

S. M. TAQI HASHIMI, M.A..
EDITOR, ENGLISH SECTION,
Osmania Magazine.

---

touched by Nature's impulse. Thus, he is duly recompensed for his heavy toil by the solace, balm and blessings which descend upon him from above.

O, what is that swarthy multitude moving in the far-off pastures and meadows, which seem to lie at the foot of the twilight mount? Is it some creature? If it is, then its colossal size reveals that it does not belong to this world. Why has this black sinister monster so suddenly appeared on the scene at this moment? Has he any connection with the twilight mount? If he has, then the whole western horizon, alit with glow, is, in reality, a hell, as superstitious rural folk believe, inhabited by sinful and accursed spirits and monsters of every description, and this monster seems to have escaped from his place, due to some negligence of the watchful infernal angels, and landed upon this earth. But... ... . stay! see, he is approaching nearer and nearer. His shape constantly changes as he proceeds. Good heavens, it is a flock consisting of innumerable bleating sheep and frisking lambs driven home back by a singing shepherd, who, with his oaten pipe and fanciful surroundings, seems to be the "king of curds and creams" of the golden Arcadia, or, the God of this sylvan paradise—Pan! O late-comer, now I am able to conceive that it was for your reception that these hot preparations were made and that it was to inlay your romantic figure that all this imaginative setting was wrought by nature; for the culmination of her dusky splendour is marked by this pastoral scene! As the shepherd nears his hut, the glory of the twilight mount begins to vanish.

Now the winged warblers of heaven have ceased to chorus and with them all the mysterious voices

distant blue end—an end whose infinitude vies with that of the universe itself. The rapturous pensive gaze of a poet of nature, who is standing upon a mound, is fixed on the blue end which seems to un roll before his eyes the sanctimonious tomes of the eternities. He is inspired and now his attention is rivetted upon the zig-zag tracks of the forest which play hide-and-seek with the green bushes, the wild hedgerows and the clumps of trees, symbolizing the complicate ways and mess of this world that entwine and and involve human soul never to deliver it. The rippling brook, with its golden chinking pebbles, dallying with the dusky sky in her tranparent lap and singing a sweet and soothing lullaby that never ends unravels the mystery of the transparency of soul which catches the divine image. A shudder runs through the veins of the poet when he beholds the far-off lofty mountains--"those monstrous children of God"—whose peaks seem to endeavour to enter the portals of the sky or to point to the invisible and the unseen.

Oh, what a wonderful and marvellous transformation the Twilight mount has wrought upon the whole landscape! It holds out a message of jubilee to the tiller of the soil, Naturs's faithful and unspoilt son, the favourite of the poetic Muse and the true servant of humanity, whose humble cottage enshrines simplicity, innocence, virtue and contentment. His spontaneous joyous song, accompanied by the lilting melody of the lute of his comrade, joined by the echoes from the surrounding enchanted woods and glens, makes a distinct note in the majestic universal concert—the concert which does not contain the tunes created by musical instruments, but the harmonies arising from the string of sensations skilfully

row dales, which presents a fleeting and fast-changing panorama reminiscent of the universal instability and mortality. There the divine purifying fountains and the silvery mercurial streams move in their windy course serpent—like in the labyrinthine glades, fall like cataracts upon the soft ivory precipices, flow smoothly and calmly on the firmamental plain overgrown with the celestial flowers here and there—the dim stars,—and disappear for ever in the gaping profundity of the sky—the sacred founts in whose ambrosial water human imagination and soul dip to purify and invigorate her plumes before she sours up to regions unknown.

But alas, O Muse of Poetry, and, alas. O Mother Nature, your clarion call fell on deaf ears, and your inspiration is left unsought! The so-called apostles of culture and civilisation, the sages and the seers have forsaken you in preference for the deceptive illusions, strange phantoms, and fantastical airy appearances of work-a-day existence. They have reduced the world to the level of an inferno of perpetual din and commotion, of heart-rending cries and unceasing lamentations, of endless tortures, pains, and ordeals, instead of exalting it to the position of an Elysium of ever-lasting serenity and peace, of continuous mirth and laughter, of eternal comfort, pleasure, and enjoyment.

It is the selected few—the poets of nature, the tillers of the soil, the shepherds, and the whole world besides man—who, with devout zeal and religious enthusiasm, love adore, and worship you.

Now see the extensive verdant fields which touch the polychromatic fringes of the horizon mount at their

THE TWILIGHT MOUNT.

BEHOLD, it is the rosy sunset, and the everchanging clouds on the western horizon have gathered into the shape of a mountain, crimson bright and celestial-the Æonian Mount, the sacred and majestic hill lost in the ancient and mystic fables of Attica where the Sacred Nine were supposed to dwell !

Now the presiding deity is Poetry in whose awful presence stands her maid, Nature, folding her arms in reverence. The soft and gentle Zephyr, her messenger, is blowing westward, summoning, in melodious tunes, all the Beauties which attend upon Nature, to the sky-rocketting summit of the Twilight mount

Now see the boundless realm of Poetry, in miniature, in the glowing Occident—another designation for the Orient when it shifts to the west with all its morning twilight at dusk—in which the earth and the heaven, the natural and the super-natural are met and fused. It is a pendent glimmering world between the clay and the ether which serves as a golden ladder to the glorious and the sublime empyrean. It is tantamount to the divine beckoning from on high to the ordinary mortals below to contemplate the eternal leaving the ephemeral behind. But alas, it is passed unnoticed and uncared for by common humanity whose object it is to lose itself in the labyrinth of this sordid world !

Now look at the wide azure expanse, at the foot of the cloud mountain, with multicolourd hillocks and nar-

For garnering the things that we can see
And touch and barter fordull gold or bread.
Because we have lost all the mystery
That separates the living from the dead.

BY
PADMAJA NAIDU.

POVERTY

" *We are all poor*", said one in far Cathay,
' Tis true we are all poor, for what have we ?
Bankrupt of dreams we live from day to day,
Unknowing save of what the eye can see.

With so much wealth awaiting us we choose
To live in rags and mire and poverty :
Seeking to capture emptiness we lose
All that we might have had of ecstasy.

If we could have kinship with the sun and stars,
And share the glory of the sky and earth
Instead of lurking behind prison bars
Bereft of all that is our right by birth.

If We would leave the streets and alleyways
We could reach heights no feet have ever trod
And fill the moment of nights and days
With rapture that would make each man a god.

Do we remember when we sell for bread
The dreams that are our loveliest heritage,
That there are deeper hungers to be fed
And if these go unfed from age to age

The human race must perish and decay
And man's achievements crumble into dust ? ......
'Tis true what one did say in far Cathay,
We are all poor, but only through our lust

The purely Christian doctrine of the fall of man, his primitive glory and innocence and his corruption through sin, has greatly impressed Pascal Christianity is the only religion, says Pascal, which gives justice both to the dignity and the lowliness of man. He is neither a God nor a beast, but a God who has fallen to the state of a beast. Pascal's enthusiastic advocacy of the doctrine of original sin may be called the mystical moment of his thought. But it must be observed that we may well agree to the doctrine of the fall of man without giving ourselves to the Christian eschatology. A spiritual metaphysics may freely maintain the fall of the soul from its eternal bliss to a state of temporal bondage. This emergence of a soul in a time-process need not be ascribed to sin. Indeed to speak of sin on a super-sensual sphere is a misnomer. It is not original sin which is a mystery of mysteries but this temporal manifestation of something which is eternal.

BY
SYED WAHIDUDDIN.
B. A. (OSMAN)
P. H. D. MARBURG.

---

ignorance of some of our verities. Usually it happens that, unable to see the *rapport* of the two verities opposed to each other and believing that the assertion of the one means the exclusion of the other, they affirm the one and exclude the other. The exclusion is the cause of their heresy; and ignorance the cause of their objections."

What is man but paradox? The fall of man from his pristine glory of innocence to his corruption in sin plays a great role in determining the solutions which Pascal offers for the problems of human existence. Viewed in his original glory man takes part in divinity; viewed as he is here and now he is a miserable worm, more of a beast than a God. Suffering is a fact, and to explain this fact the Hindu Doctrine of Karma and the Christian Doctrine of the original sin have been ingenious solutions. Pascal freely admits that the suffering of man for the deeds of another is beyond understanding; but wonder of wonders this very irrationality is necessary to make us understand the otherwise unintelligible character of human suffering. "Strange it is that the mystery most remote from our knowledge, the transmission of sin, is a thing without which we cannot have any knowledge of ourselves Because it is without doubt that there is nothing which so much shocks our reason as the assertion that the sin of the first man has made culpable those who being so far from the source seem incapable of participating therein...........Certainly nothing repels us so rudely as this doctrine, and still, without this mystery, the most incomprehensible of all, we are incomprehensible to ourselves." Man is therefore suspended between Nature and Grace. By Grace he participates in God; by nature he is subject to corruption.

concludes for the validity of religion. If we gain we gain eternal life; if we lose we lose only the vanity of the world. "For it is of no purpose telling us that it is uncertain that we shall win and it is certain that we hazrd, and the infinite distance which is between the certitude to which one is exposed and the incertitude of our winning reduces to equal value the finite good to which one is exposed and the infinite which is uncertain. Such is not the case. Every player risks certainty for the uncertainity of winning; and neverthless he certainly hazards the finite against the uncertain winning of the finite without offending reason. Our proposition is therefore of an immense force when there is something finite to risk on play where the hazards of lose and gain are equal and there is something infinite to win." This is the famous argument, Pascal's wager. We have noted above that Pascal here combats these sceptics from their own logic. It must be said however that this pragmatic approach to religion is not free from danger. Religion can never be a risk. A scientific hypothesis can be a risk: the events can confirm it or repudiate it. Religion is based on certainity of feeling and sentiment. The religious consciousness of God is the consciousness of of existence without any moment of vacillation.

However fallacious be the application, Pascal hints at the dialectical character of truth, which was later made the pivot of the Hegelian system. He thinks that there is a system of truth where the seemingly opposed verities subsist in a state of hamony and reconciliation. The importance of dialectics for his religious thought cannot be exaggerated. "The source of all the errors is the exclusion of some verities; and the source of all the objections which the heretics raise against us is the

its values. All is vanity : human suffering is the only fact. Pascal's way to God leads through suffering and ennui. However opposed this philosophy of pain and suffering may be to another view which says *Yea* both to this world beyond, fully conscious of the ephemeral character of the world, and at the same time realising that the world, though no better than a shadow, is a shadow of something eternal, the fact remains that such an attitude as that of Pascal is also possible and in moments of luxury and worldliness it may well serve as an antidote.

We now come to the heart of the Pascalean thought, his religion· Pascal, like Kant and unlike the schoolmen, is emphatic in the rejection of any proofs of God's existence. God is accessible to sentiment and inaccessible to reason. Against atheists he argues that God is not the only mystery. "What reason have they in maintaining that one cannot be brought to life again? What is more difficult, to be born or to come to life again. That what has never been at any time should now come into existence, or that what has already been should be there again? Is it more difficult to come into being or to return to life. Custom makes the one easy and the absence of custom makes the other look impossible; a popular way of judging. Why cannot a virgin bear children? A hen does not lay eggs without a cock. Who has told us that the hen cannot form these germs as well as the cock?"

Pascal places himself in the world of atheists and their interests and argues with them from their own principles. A choice cannot be avoided. From the point of view of pragmatism, which is that of the atheists, he

e others seeing their own condition in them and regard-
g the one and the other with pain and despair and
aiting for their own turn." Thus no good in human
story is recognised; no human values are given their
e. All is suffering and misery or as the Preacher said,
anity, Vanity, all is vanity.

No wonder human suffering is of such metaphysical
portance for Pascal. What is Christianity without
e sufferings and humiliation of Christ. It is by the
fferings of a God-man that painters have been inspired.
ffering embraces in its very notion the idea of greatness.
aat something great should be subject to degradation
truly pathetic. Pascal is true to his Christian traditions
ien he brings human misery into the foreground. A
re sign of this undeniable suffering is the way man tries
forget himself in amusements. Diversions, says Pascal,
primarily intended to divert us from the miserable
nditions we are in to something external. "If man
re really happy, the less diverted he were, the happier
would be, as the saints of God." Human education is
based on the unconscious effort to divert man from his
n condition. Women and wealth, fame and popularity
serve the purpose of letting oneself go in things
ternal. "Take care! What is it to be a superintendent,
ancellor, premier, president but to be in a condition where
e has from the early hours a number of people coming
m all sides and not allowing one a single hour to think on
eself? And when such people fall into disgrace and
ire to their homes in the country, where they have
nty of goods and a number of servants to assist them
their needs, they are still miserable and forlorn; for
w they are free to think on themselves." This
itude, we must say, is really the negation of life and

simply meaningless without any reference to something higher. Look at the world without you and within you and see what momentous questions arise. "When I consider the small duration of my life absorbed in an eternity following and an eternity preceding, this small space which I occupy swallowed up in the infinite immensity of spaces that I ignore, I become frightened and astonished in finding myself here rather than elsewhere; for there is no reason for my being here rather than anywhere else, for my being in the present rather than at any other time. Who has thrown me here? By whose order and direction have this place and time been assigned to me?" Tremendous questions, no doubt, but woe to him whose absorption in the workaday monotony of life does not allow him to think of his own destiny.

What is man that Thou shouldst be mindful of him? His condition is misery and ennui. It is interesting to note that the psychological state of man which speaks so decidedly of human insignificance is boredom. We bore ourselves and the emptiness of our existence dawns on us. Ennui means complete dissatisfaction with all that is around us and a yearning for something higher. "Nothing is so unbearable to man as being in complete rest, without passions, without work, without amusement and without engagement. He therefore feels his nothingnes, his deserted state, his emptiness. Unceasingly there flows from his mind ennui, wistfulness, darkness, chagrin vexation and despair." Ennui is a fact of capital importance for Pascal. It shows what we are without God, shades and shadows. Pitiable is the human state which presents itself to the sick soul of Pascal." "Imagine a number of men in chains, and all condemned to death, some of whom are butchered before the eyes of others,

it." Scepticism which doubts itself, Pascal emphatically rejects. "We have an idea of truth which no scepticism can deny; we are helpless to prove everything which no dogmaticism can ignore."

This Man whose thought embraces the universe and who is in his turn engulfed in its immensity, what then is his place in it? The world where man's insignificance is all too evident is itself lost in the infinity of space. What is it but a tiny spark in the Cosmos? On the other side of man things become smaller and smaller till they are lost in nothingness." What then is man at last in Nature? A nothingness as regards the infinite, a whole as regards nothingness, a middle between nothingness and all. Infiinitely far from comprehending the extremes, the end of things and their principles are invincibly hidden for him in an impenetrable secret, equally incapable of seeing the nothing from which he is drawn and the infinite in which he is engulfed." He is placed within two infinites, the infinitely small and the infinitely great. All our faculties are likewise placed between the extremes." Our senses do not perceive anything of the extremes, too much of noise stuns us, too much of light dazzles us, too long a distance and extreme proximity hinder the view." This is alas the condition of men. He is driven from one extreme to the other, ignorant of the body, ignorant of mind, and completely in the dark about his own person, which is a combination of irreconcilables.

Man's indifference to the great things of life and beyond, and his sensitiveness to the least important show unmistakably how warped his nature has become. The duration of his life is but an instant and its course must hang on whether this life itself is the last word or is

upto this principle does not understand the force of reason. There are persons who act against these three principles, either taking everything capable of demonstration while failing to understand what demonstration is; or doubting everything yet not knowing when to resign; or resigning themselves in each and everything and ignorant where one to judge."

Pascal has in his own way tried to delimit the frontiers of rational knowledge. He comes to almost the same conclusion as Kant. For Kant reason contradicts itself when brought to face the ultimate problem. For Pascal "it is incomprehensible that God is, incomprehensible that He is not; that there be soul within the body, that we have no soul; that the world should be created, that it should not; that there be original sin; that there be none." Pascal's emphatic denunciation of rationalism has given rise to the interesting question; was Pascal a sceptic? That scepticism need not be irreconcilable with religion, is clear. Scepsis in the power of rational thought is sometimes the presupposition of a religious outlook. Pascal's scepticism is an attitude which has been for him indispensable in overcoming scientific errors. Reason, Pascal thinks, has a function of its own; in fact it gives glory to man; but it becomes itself irrational when it lays claim to exclusive validity. Pascal says again and again that thought (pensee) gives man supreme place in creation. "Reason commands us more imperiously than a master; for in disobeying the one we are unfortunate and in disobeying the other we become fools." What is man against the immensity of space but what is space against the infinity of thought? "I shall not gain in possessing the earth; in space the Universe comprehends me and swallows me like a point; by thought I embrace

this is the spirit of justice (justesse); the other comprehending a great number of principles without confusing them, and this is the spirit of geometry. The one is the vigour and the rightness of the spirit; the other its amplitude. One can well be without the other, the spirit can be strong and narrow and also broad and feeble."

The psychological division of human types corresponds to a parallel division of the human mind into sentiment and reason. Reason is simply a faculty of principles and definitions. The supra-sensual realities and the fineness of life are both inaccessible to it. Sentiment is no less reasonable; only its reasons are not intelligible to reason. "The heart (sentiment) has its reasons which reason cannot undeastand." Pascal is here on a safer way than many a modern psychologist Rcason is generally taken to be a capacity which alone can give knowledge. The feelings are presumed not to point to anything beyond themselves. Kant falls into the same error. He thinks that knowledge can be conceptual only; everything else is enthusiasm This is simply rationalism running amock. We may well maintain on the other hand that conceptual knowledge is not the only form of knowledge. God cannot be conceived but he can be felt. Even dreams sometimes give us premonitions. It is again a Cartesian error which placed the criterion of truth in the clearness and vividness of ideas It holds good only so far as we are playing on the surface of life. The deeper we go the darker the reality becomes and our conceptual faculty fails us. Sentiment for Pascal in contra-distinciion to reason takes us into extra-logical spheres. "We must learn to doubt where it is proper, be certain where we must, and resign ourselves where we must. He who does not act

interests itself in our being in time, its orgin and upshot. Augustine, Pascal and Kierkegaard were thinkers of existence par excellence. For them philosophy was primarily an investigation into the mysteries and agonies of existence. The same spirit can be discerned throughout the old Indian thought, which aimed at the salvation not only of a single life but of lives and deaths.

Blaise Pascal, whose thoughts on human existence have a freshness and vitality unimpaired by the passing away of generation, is a thinker who stands apart. His was a versatile genius, His contributions to mathematics and the natural sciences are safe in the history of scientific thought. A bigoted Christian, and advocate of the theology of Jansen, his views on theology and the philosophy of religion will not be welcome to most of us. But that is no reason why we should not pick out all that is living in his thougt and leave the dead to care for the dead.

Pascal interests himself in the different types of human mind. There is a Geometrical mind (l' esprit de la geometric)which proceeds from a premise to a premise. Given axioms it deduces undeniable conclusions. The intuitive mind (l' esprit de la finesse) looks on totality and wholeness. At a glance it finds out what it is all about. It does not go hand in hand with the logical mind. Each has a sphere of its own. The moment they go beyond their sphere, treat geometrically all the fineness of life and intutively all that is capable of being brought into definitions they expose themselves to ridicule. "There are therefore, two types of mind (esprit): one penetrating sharply and deeply the consequences of the principles,

PASCAL AND THE PROBLEMS

OF

EXISTENCE.

THE awakening of reflective thought is the beginning of philosophy. Aristotle, no doubt the supreme manifestation of the Greek speculative genius, took it to be a science of being *qua* being. The Aristotelian formulation clearly shows that the ontological problem cannot be neglected in any system worth its name. The Middle Ages remained true to the spirit of the master and allowed ontological problems an all important place in their great system. Unhappily the later development of philosophical thought in Europe, during the Renaissance and after, took a turn which though fruitful for experimental sciences, was disastrous in its consequences to philosophy. Psychology began to play a decisive role in human thought and psychological problems freely usurped the field. But from the early struggles of human thought there have been thinkers whose interest in philosophy was of a peculiar character. They strove for knowledge not for its own sake but for the sake of salvation. Their interest was limited to a partial form of being, existence in time. Existence now means, therefore, not being as such but only its temporal expression. especially with reference to human life and its experiences. Man finds himself launched in a time-process, stormed by misery and disease, threatened by death and annihilation. The Philosophy of Existence

---

* A Paper read in the Indian Philosophical Congress (Hyderabad 1939)

Doctor Mohammed Khaderuddin Khan

M. Sc. (Osman), Ph. D, D. I. C (London)

He is the first Hyderabadi to get the degree of Ph. D. in Entomology, and the youngest Entomologist in India & has recently joined the staff of the Zoology Department.

office will always remain as our cherished memory. We feel profound sympathy with his family in their bereavement.

We are highly grived at the accidental death of Mr. Mir Hussain Ali Khan, student of B.A. (Senior), The unfortunate accident, which occured in the course of snipe shooting, cost the lives of his father and brother too, and we cannot help feeling the frailty of human existence that is brought out by such accidents! Blessed be their souls and God's grace attend them! All our heart-felt sympathies are with their survivors.

We had requested the members of the University College for Women, in the previous issue, to evince greater interest in the English Section which had always been wanting their contributions, but we regret to announce that we did not receive any article from them to be published in this issue. We hope their co-operation with the institution will be forthcoming in the next term.

We are very glad to say that we received a sufficient number of articles this term, some of which were, owing to lack of space, withheld from publication and were kept for the next issue. We thank all the contributors for their co-operation.

It is hereby announced that a Maharajah Memorial Number will be immediately issued, which will contain articles upon the various aspects of the late Maharajah's life, both by the students of the University and the outsiders who had come intact with the late Maharajah.

EDITOR.

It is mostly "a congratulation" year. The appoint-
ent of Dr. Wahiduddin B.A. (Osman), Ph D. (Marburgh),
a lecturer in the English department evokes our hearty
ngratulations. Most of the senior students of the
niversity remember him as the ex-English Editor of
is Magazine and one of the best products of this
niversity and also of the University of Marburgh
hence he took his Ph. D. degree in Philosophy with
eat credit. He has obliged us by re-establishing his
nnection with the Magazine by contributing a philo-
phical article, entitled, "pascal and the problem of
cistence" which we publish in this issue.

Our sincere congratulations are also due to Messrs.
yed Abdul Latif Razvi, B. A. (Osman), M. A., LL. B.
Alig.), B. Sc. (London), and Nasir Ali, M. A. (Osman).
'he former was transferred with promotion from the
conomic Department of the University to the Directo-
ate of Statistics, to work as an Assistant-Director and
he latter was promoted to the vacant post of Lecturer-
hip in the Economics Department where he had been
itherto working as a junior Lecturer.

We thank Miss Padmaja Naidu for her contribution
f the poem, "Poverty," to the Magazine. She requires
o formal introduction to our readers as she is well-known
n Hyderabad as belonging to that famous family that
as produced "The Nightingale of India" whose sweet
nd melodious songs have richly filled the garden of
nglish poetry. Miss Naidu is a promising poetic genius
nd patriot as her poem itself suggests.

We are very sorry to record the death of Mr. Hameed
hmed Ansari, the retired Registrar of the University,
vhose tact, devotion and sense of duty during his term of

nation throughout his whole educational career, and has now become the pride and glory of our University and Hyderabad alike, by obtaining these distinguished honours. We have high hopes of his winning the Nobel Prize this year, and thus exalting the name of our University.

We sincerely welcome Dr. Mohd. Qadiruddin Khan, M. Sc. (Osman), Ph, D., D.I.C. (London), who has recently joined the staff of the Zoology Department. Taking his M. Sc. degree from this University in the first division in 1938, he proceeded to London for obtaining the Ph. D. degree in Economic Entomology. At the outbreak of the war when all the Indian students were asked to leave the United Kingdom or seek admission in other Universities outside London, his professor, J. W. Munro, assured the university authorities that Dr. Khan's work was of immense national importance to justify his retention there. At the request of the London University Joint Recruiting Board, he was attached to the War Office, Ministry of Food. He was also doing research for the Department Scientific and Industrial Research. His work is not only of great importance to the agricultural crops but is of the highest academic value, in recognition of which the London University awarded him the degree of Ph. D. in Entomology and the Imperial College the D.I.C. His name has also been proposed for the membership of the Royal Entomological Society, which, it is hoped, he will get in December. "His description of the grain weevils (grainpests)," says Dr. Richards about his work, "will lead to a definite improvement in their treatment of future text books." He is the first Hyderabadi to get this degree and the youngest Entomologist of India. We hope that he will continue to advance the study of this vital branch of Zoology.

EDITORIAL.

THE year, 1350 Fasli, is *annus mirabilis*' for Osmania University in that it had the great honour of conferring the Honorary Degree of Doctor of laws upon such an eminent personality of taste, culture and learning as His Highness the Prince of Berar, to whom our most sincere congratulations are due. We feel a curious satisfaction in the fact that our University outran the Aligarh Muslim University, which had lately the similar honour in conferring the Honorary Degree of Doctor of laws upon our beloved Prince. The occasion offered us a unique opportunity for establishing contact with His Highness, who has left ineffaceable impressions of his amiability and breadth of outlook on our minds. He was gracious enough to have an informal dinner with us. His Highness was pleased to award valuable prizes to Messrs. Fahimuddin, LL. B., (Previous) and Akbar Ali Nisari, B. A., (Junior) for their efficient management of the music party. We congratulate these fortunate gentlemen on their gaining the honour of princely favour.

We offer our hearty congratulations to Dr. Raziuddin Siddiqi, on his nomination as a candidate for the Nobel Prize in Physics this year, by virtue of his work upon the "Quantum Theory". It may be recalled that the Indian Institute of Science, last year, awarded him a prize for his research in Applied Mathematics and Physics during the last six years. Dr. Siddiqi was the most brilliant student, getting first class rank in every exami-

CONTENTS.

VOL. XIII. No. 3.

EDITORIAL.

THE year, 1350 Fasli, is *annus mirabilis'* for Osmania University in that it had the great honour of conferring the Honorary Degree of Doctor of laws upon such an eminent personality of taste, culture and learning as His Highness the Prince of Berar, to whom our most sincere congratulations are due. We feel a curious satisfaction in the fact that our University outran the Aligarh Muslim University, which had lately the similar honour in conferring the Honorary Degree of Doctor of laws upon our beloved Prince. The occasion offered us a unique opportunity for establishing contact with His Highness, who has left ineffaceable impressions of his amiability and breadth of outlook on our minds. He was gracious enough to have an informal dinner with us. His Highness was pleased to award valuable prizes to Messrs. Fahimuddin, LL. B., (Previous) and Akbar Ali Nisari, B. A., (Junior) for their efficient management of the music party. We congratulate these fortunate gentlemen on their gaining the honour of princely favour.

We offer our hearty congratulations to Dr. Raziuddin Siddiqi, on his nomination as a candidate for the Nobel Prize in Physics this year, by virtue of his work upon the "Quantum Theory". It may be recalled that the Indian Institute of Science, last year, awarded him a prize for his research in Applied Mathematics and Physics during the last six years. Dr. Siddiqi was the most brilliant student, getting first class rank in every exami-

Annual Subscription.

		Rs.
From Government	... ...	15
,,	Universities, other Institutions and State Officials ...	8
,,	General Subscribers	6
,,	Old Boys, Aided Societies and Reading Rooms	5
,,	Present Students, Osmania University	4
,,	Abroad	Fifteen Shillings.
,,	Old Students, Abroad	Ten Shillings.
,,	Single Copy	Two Rupees.

Note.—Registrations and V. P. P. Charges Extra.

Can be had of :—

OSMANIA MAGAZINE OFFICE

OSMANIA UNIVERSITY

HYDERABAD-DECCAN.

The Osmania Magazine

Vol. XIII

No. 3

THE

OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

of

The Osmania University

HYDERABAD-DN.

MANAGING EDITOR
AHMED KHAN B.A., (Osman)

EDITOR
SYED MOHAMMED TAQI HASHMI M.A.,

JOINT EDITOR
GHULAM GHOUS KHAN, B. Sc.

Vol. XIII **1940** **No. 3**

Printed at
THE AZAM STEAM PRESS,
HYDERABAD-DN.

THE

OSMANIA

MAGAZINE

1940

MANAGING EDITOR:

AHMED KHAN B.A. (OSMAN).

EDITOR:

SYED MOHAMMED TAQI HASHMI B.A. (OSMAN.)

JOINT EDITOR:

GHULAM GHOUS KHAN B.SC.